

تفسیر نمونہ مومنوں کی  
پیام قرآن

آیت الہدیٰ ناصر مکرم شیخ سید سید  
مولانا سید صفدر حسین نقوی  
مہتاب القرآن ٹرسٹ

زیر نظر  
آیتناصروم کارم شیرازی

تفسیر موضوعی  
جلد دوم

# پیام قرآن

نگارش

اہل قلم کی ایک جماعت

ترجمہ

علامہ سید صفدر حسین نجفیؒ

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 افضل مارکیٹ آروڈ بازار لاہور۔ 0321-4481214, 042-37314311

## جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب-----تفسیر موضوعی: پیام قرآن  
جلد-----دوم  
مؤلف-----آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی  
مترجم-----علامہ سید صفدر حسین نجفی اعلیٰ اللہ مقامہ  
فنی معاون-----قلب علی سیال  
کمپوزنگ-----فضل عباس سیال (المحمد گرافکس لاہور)  
سال اشاعت-----جون 2012ء  
ناشر-----مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور  
ہدیہ مکمل سیٹ (جلد اول تا دہم)-----3500 روپے

اس کتاب کی اشاعت کیلئے مدینۃ العلم فاؤنڈیشن کراچی نے بطور قرض  
حسن تعاون فرمایا ہے ہماری دعا ہے کہ خداوند عالم ان کی توفیقات خیر میں  
اضافہ فرمائے اور ان کے مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ ادارہ۔

### ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 0321-4481214, 042-37314311

[www.misbahulqurantrust.com](http://www.misbahulqurantrust.com)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## عرض ناشر

قارئین کرام!۔۔۔۔۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔۔۔۔۔ عرصہ دراز سے دور حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُر وقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

دور حاضر میں جب تفسیر قرآن کی بات ہو تو ذہن میں انہی کتب کا تصور آتا ہے جو عموماً صدرِ اول سے لے کر آج تک لکھی جا رہی ہیں کہ جن میں سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کے مطابق نوبت بہ نوبت ان کی تفسیر کی جاتی ہے۔ مگر تفسیر قرآن کا یہی ایک طریقہ نہیں ہے بلکہ اس کتاب الہی کی تفسیر کے پانچ طریقے ہیں۔ ۱۔ تفسیر مفرداتی ۲۔ تفسیر ترتیبی ۳۔ تفسیر موضوعی ۴۔ تفسیر ارتباطی ۵۔ تفسیر کلی۔

تفسیر کے پہلے دو طریقے عام طور پر متعارف ہیں۔ بلاشبہ تفسیر قرآن کا قدیمی طریقہ یہ رہا ہے کہ بالترتیب ایک کے بعد دوسری سورۃ کی تفسیر کرتے ہوئے پورے قرآن کی تفسیر مکمل کی جاتی ہے۔ لیکن آیت اللہ جعفر سبحانی اور آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی نے تفسیر کی ایک نئی روش اپنائی ہے کہ جس میں کسی اصل و فرع یا مضمون و عنوان سے تعلق رکھنے والی آیات قرآنی کو ایک مقام پر لاکر ان کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ چونکہ اس میں ہر عنوان اور موضوع کی جملہ آیات اور ان کی تفسیر یکجا کر دی گئی ہے، لہذا اس کو تفسیر موضوعی کا نام دیا گیا ہے۔

ادارہ ہذا کے ذریعے تفسیر موضوعی کا 12 جلدوں پر مشتمل پہلا سلسلہ (قرآن کا دائمی منشور) منظر عام پر آچکا ہے۔ تفسیر موضوعی کا زیر نظر سلسلہ (پیام قرآن) جو کہ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی سعی جمیل کا نتیجہ ہے، اس کی دس جلدیں (جلد اول تا جلد دہم) قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں۔

زیر نظر کتاب ”تفسیر موضوعی۔ پیام قرآن جلد دوم“ کا اردو ترجمہ علامہ سید صفدر حسین نجفی اعلیٰ اللہ مقامہ نے کیا ہے۔ جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کتاب کی اشاعت میں مدینۃ العلم فاؤنڈیشن کراچی نے بطور قرض حسنہ تعاون فرمایا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم و تحقیق حسبِ سابق ”مصباح القرآن ٹرسٹ“ کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اس گوہرِ نایاب سے بھرپور علمی و عملی استفادہ فرمائیں گے۔ اور ادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز و آراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔

مزید برآں مصباح القرآن ٹرسٹ کی ویب سائٹ تیاری کے آخری مراحل میں ہے۔ جون 2012ء تک آپ ہماری تمام کتب ہماری ویب

سائٹ [www.misbahulqurantrust.com](http://www.misbahulqurantrust.com) کے ذریعے گھر بیٹھے پڑھ سکتے ہیں۔۔۔۔۔ والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

## فہرست

### تفسیر موضوعی: پیام قرآن جلد نمبر 2

صفحہ نمبر	عنوان
39	۴۔ ”جنسی“ مفروضہ
40	۵۔ ”اخلاقی ضروریات“ کا مفروضہ
43	خدا شناسی کے دلائل برہان نظم
44	برہان نظم کی خصوصیات
45	برہان نظم کی بنیادیں۔
45	”نظم اور علم“ کا رابطہ
48	۱۔ انسانی تخلیق میں اس کی نشانیاں
49	الفاظ کے معانی
50	آیات کی تفسیر اور جمع بندی
50	سب سے پہلے ”نفسی آیات“
54	نظام تخلیق نہایت پیچیدہ اور نازک ہے
57	۲۔ جنین کے پروان چڑھنے میں خدا کی نشانیاں
59	الفاظ کے معانی اور تشریح
60	آیات کی تفسیر اور ان کی جمع بندی
60	جنین کی اسرار آمیز کائنات
64	چند وضاحتیں
64	۱۔ نقش بر آب
64	۲۔ تین تاریکیوں کے اندر
65	۳۔ امن کا مقام
65	۴۔ ”خَصِيْبَةٌ مُّبِيْنٌ“ یا کھلم کھلا جھگڑالو
16	خدا جوئی اور خدا شناسی قرآن کی روشنی میں
17	چند اہم اور بنیادی سوال
18	خدا جوئی کیوں؟
20	آیات کی تفسیر اور جمع بندی
20	ہر انسان کا پہلا فریضہ تحقیق ہے۔
26	نتیجہ
26	چند مزید وضاحتیں
26	اسلامی روایات میں مذہب کے عقلی ہونے کے اسباب
27	۲۔ متعصب دشمن
28	۳۔ عاطفی سبب
30	آیات کی تفسیر اور جمع بندی
30	شکر منعم، معرفت الہی کا زینہ ہے
33	شکر منعم اسلامی روایات میں:
34	۳۔ فطری سبب
35	چند توضیحات
35	۱۔ انحرافی توجیہات
36	۱۔ ”جہالت“ کا مفروضہ
37	۲۔ ڈر کا مفروضہ
38	۳۔ ”اقتصادی عوامل“ کا مفروضہ

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
96	۳۔ روح کی مختلف سرگرمیاں	66	۵۔ جنین کی غذائی سہولتیں
99	۴۔ انسانی مغز کا الیکٹرانک مغز (کمپیوٹر) سے تقابل	66	۶۔ جنین کی جنسی سر نوشت
99	۵۔ روح کی اصالت اور استقلال	67	۷۔ اسرار آمیز اور جلد انجام پانے والی تبدیلیاں
100	۶۔ قرآن مجید میں روح کی خصوصیات	67	۸۔ رحم کی مستقبل پر نگاہیں
101	۷۔ روح کے بارے میں آخری بات	68	۹۔ ہڈیوں کا لباس
	۵۔ انسان اور حیوان کی فطری اور غریزی ہدایت	68	۱۰۔ جنین باہر آتا ہے
102	میں اس کی نشانیاں	69	۱۱۔ بوقتِ ولادتِ محیر العقول تبدیلیاں
104	آیات کی تفسیر اور جمع بندی	70	۱۲۔ بچے کا رونا
104	استاذِ ازل!	71	۱۳۔ بچوں میں بالترتیب عقل اور حواس کی بیداری
110	چند ضروری وضاحتیں	72	۱۴۔ غذا پہلے، بچہ بعد میں
110	علوم جدید میں ”فطری“ اور ”غریزی“ ہدایت	74	۳۔ عالم حیات میں اس کی نشانیاں
116	۶۔ نیند اور بیداری میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں	76	الفاظ کے معنی اور تشریح
117	الفاظ کے معانی اور تشریح	78	آیات کی تفسیر اور جمع بندی
118	آیات کی تفسیر اور جمع بندی	78	حیات کی آفرینش، آفرینش کا شاہکار ہے:
118	تمہاری نیند خدا کی آیت ہے	83	مزید تفصیل
120	مزید تشریح	83	۱۔ زندگی ایک عظیم معمہ ہے:
120	نیند ایک مخفی مخلوق	84	۲۔ کیا انسان کوئی اور زندہ چیز بنا سکتا ہے؟
122	۷۔ زمین و آسمان کی وسعتوں میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں	88	۴۔ روح کی پیدائش میں اس کی نشانیاں
125	الفاظ کے معانی اور تشریح	89	الفاظ کے معانی اور ان کی تشریح
127	آیات کی تفسیر اور جمع بندی	91	آیات کی تفسیر اور جمع بندی
127	بلند آسمان آیتِ حق ہے	91	عالمِ تخلیق کا عجوبہ ----- روح
137	چند ضروری وضاحتیں	95	چند توضیحات
137	۱۔ آسمان کی عظمت اور وسعت	95	۱۔ روح کی ظاہری اور باطنی قوتیں
138	۲۔ زمین و آسمان پر حکم فرما بچے تلے تو انین	95	۲۔ کائنات کی اسرار بھری مخلوق --- روح

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
180	۳۔ ایک عظیم دانشور کا کلام	139	۳۔ سات آسمان
181	۴۔ پہاڑوں کی تخلیق کے بارے میں اعجاز بھری حدیث	141	۴۔ آسمان کی طرف نگاہ کیوں نہیں کرتے؟
182	۱۱۔ بادل، ہوا اور بارش کی پیدائش میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں	۸۔ سورج، چاند اور ستاروں کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں	
186	الفاظ کے معانی اور تشریح	143	آیات کی تفسیر اور جمع بندی
188	آیات کی تفسیر اور ان کی جمع بندی	146	سورج، چاند اور ستاروں کی قسم
188	دو اسرار بھری چیزیں۔۔۔۔۔۔ ہوا اور بارش	154	چند ضروری وضاحتیں
195	نتیجہ کلام	154	۱۔ سورج کیا ہے؟
196	چند ضروری وضاحتیں	155	۲۔ سورج کی عظیم برکتیں
196	۱۔ ہواؤں کی پیدائش اور ان کے فوائد	157	۳۔ چاند اور اس کی برکتیں
197	۲۔ بادلوں کی پیدائش کے اسرار اور بارش کا نزول	۴۔ سورج اور چاند کا ماحصوم کی روشنی میں	
199	۳۔ اسلامی روایات میں ہوا اور بارش کی حیثیت	158	۹۔ رات اور دن کی پیدائش میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں
203	۱۲۔ رعد و برق کی پیدائش میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں	160	آیات کی تفسیر اور جمع بندی
204	الفاظ کے معانی اور تشریح	163	شب و روز کا عجیب نظام
205	آیات کی تفسیر اور جمع بندی	163	چند ضروری وضاحتیں
205	رعد و برق کی پیدائش کے اسرار	168	۱۔ نور اور ظلمت کی اہمیت اور شب و روز کے فوائد
207	چند وضاحتیں	170	۱۰۔ پہاڑوں کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں
207	۱۔ جدید علوم کی روشنی میں برق و رعد کی پیدائش	172	الفاظ کی تشریح
208	۲۔ رعد و برق کے فوائد	173	آیات کی تفسیر اور جمع بندی
208	الف: آبپاشی	173	پہاڑوں کی برکتیں اور عجیب اسرار
208	ب: زہر پاشی	178	چند ضروری وضاحتیں
208	ج: غذا اور کھاد کا کام	178	۱۔ پہاڑ اور قرآن پاک کا علمی معجزہ
		۲۔ پہاڑوں کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمانِ ذیشان	
		179	

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
232	۱۵۔ نباتات اور میوہ جات میں پروردگار عالم کی نشانیاں	210	۱۳۔ سمندروں اور کشتیوں میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں
236	الفاظ کے معانی اور تشریح	212	الفاظ کے معانی اور تشریح
237	آیات کی تفسیر اور جمع بندی	213	آیات کی تفسیر اور جمع بندی
237	سبز درختوں کے پتے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!	213	سمندر اور اس کے عجائبات
249	چند ضروری وضاحتیں	217	چند ضروری وضاحتیں
249	۱۔ نباتات کی حیرت انگیز ساخت	217	۱۔ مختلف نعمتوں کا گھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سمندر
251	۲۔ نباتات کے فوائد اور برکتیں	217	۱۔ کشتی رانی
251	۱۔ بہترین غذائی مادہ	218	۲۔ کھانے پینے کا مواد
251	۲۔ ہوا میں تبدیلی	218	۳۔ گھاس اور دوا کی جڑی بوٹیاں
252	۳۔ لباس اور پوشاک	218	۴۔ معدنیات اور تیل کے ذخائر
252	۴۔ گھر اور اس کا اثاثہ	219	۵۔ توانائی کی پیدائش کا بہترین ذریعہ
252	۵۔ نباتاتی دوائیں	220	۶۔ مختلف زیورات
252	۶۔ چلتی ریت کے آگے رکاوٹ	220	۷۔ سمندروں کے ذریعہ موسم میں اعتدال
252	۷۔ کاغذ کی تیاری	221	۸۔ سمندری پانی سے طبی سہولتوں کا حصول
253	۸۔ موسم میں اعتدال	221	۹۔ روئے زمین کے پانی کا اصل منبع
253	۹۔ ذرائع آمد و رفت	221	۱۰۔ میٹھے پانی کا حصول
253	۱۰۔ خوبصورتی اور تزوینازی	221	۲۔ سمندر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عجائبات کا گھر!
253	۱۱۔ توانائی کا اہم منبع	223	۳۔ سمندر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کلام معصومین کی روشنی میں
253	۱۲۔ مختلف عطریات اور کیمیکل مواد	225	۱۴۔ سایہ کی تخلیق میں خلاق عالم کی نشانیاں
254	۳۔ نباتات کی بے شمار قسمیں	226	الفاظ کے معانی اور تشریح
254	۴۔ نباتات کی بولچھیاں	227	آیات کی تفسیر اور جمع بندی
257	۵۔ توحید منفل میں نباتات کی تخلیق کے اسرار	227	کیا سایہ بھی ایک عظیم نعمت ہے؟
260	۱۶۔ عمومی رزق کی پیدائش میں خالق کائنات کی نشانیاں	230	چند ضروری وضاحتیں
262	الفاظ کے معانی اور تشریح	230	اگر سایہ نہ ہوتا



صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
	۴۔ زبورِ عسل کی اور خدمات جو شہد سے بھی زیادہ	264	آیات کی تفسیر اور جمع بندی
305	تیتمتی ہیں	264	ہے اس خوانِ نعمت پر دشمن و دوست!
306	۵۔ شہد کی مکھیوں کی جسمانی ساخت بھی عجیب ہے!	273	چند ضروری توضیحات
308	۱۹۔ جانوروں کی تخلیق میں پروردگارِ عالم کی نشانیاں	273	۱۔ رزق کی دنیا میں مجیر العقول کا رنامے
311	الفاظ کے معانی اور تشریح	276	۲۔ کیا روزی تقسیم شدہ ہے؟
312	آیات کی تفسیر اور جمع بندی	278	۳۔۔۔۔۔ پھر یہ بھوکے کیوں ہیں؟
312	حیوانات کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟	279	۳۔ رزق میں وسعت اور تنگی
325	چند ضروری وضاحتیں	281	۱۔ پرندوں کی تخلیق میں خالق کائنات کی نشانیاں
325	حیوانی دنیا کے عجائبات	282	الفاظ کے معانی اور تشریح
325	۱۔ حیوانوں کا رام اور مطیع ہونا	283	آیات کی تفسیر اور جمع بندی
326	۲۔ جانوروں کا ہوش و خرد	283	پرندے تو تسبیح پڑھیں اور میں۔۔۔۔۔؟
	۲۰۔ جسمانی اعضاء کی تخلیق میں باری تعالیٰ کی	288	چند ضروری توضیحات
329	نشانیاں	288	۱۔ پرواز کا پچھیدہ فن
330	الفاظ کے معانی اور تشریح	289	۲۔ پرندوں کے ”عجائبات“ اور عجیب“ پرندے
332	آیات کی تفسیر اور جمع بندی	292	۳۔ پرندے، انسانوں اور ماحول کی خدمت میں
338	چند ضروری وضاحتیں	293	۴۔ پرندوں کے وجود سے توحید کا درس ملتا ہے
338	۱۔ اعضاء بدن کے عجائبات		۱۸۔ شہد کی مکھیوں کی زندگی میں خلاقِ عالم کی
338	۱۔ متغیر عدد	294	نشانیاں
339	۲۔ آنکھ کے سات طبقتے	295	آیات کی تفسیر اور جمع بندی
339	۳۔ روشنی کے سامنے حساسیت	295	آئیے شہد کا ملک دیکھیں!!
339	۴۔ تیز ترین تحرک	299	چند ضروری توضیحات
339	۵۔ سادہ اور لطیف پرزے	299	۱۔ شہد کی مکھیوں کا عجیب تمدن
339	۶۔ فلم بنانے کا مسئلہ	301	۲۔ پھلوں کے رس سے شہد سازی
340	۷۔ ضمنی طور پر کام کرنے والی مشینری	303	۳۔ شہد غذا بھی ہے اور دوا بھی ہے

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
340	۲۔ ہر فن مولا عضو..... زبان	341	۱۔ غذا کو دانتوں کے نیچے بھیجنا
341	۲۔ غذا کو لعاب دہن سے مخلوط کرنا	341	۳۔ غذا اور پانی کے نکلنے میں کمک کرنا
341	۴۔ غذائی مواد پر ضبط و اختیار	341	۵۔ منہ کی صفائی کا کام
342	۶۔ بولنے کا کام	344	۲۱۔ انسان کی اجتماعی زندگی میں ذات پروردگار کی نشانیاں
346	۲۱۔ انسان کی اجتماعی زندگی میں ذات پروردگار کی نشانیاں	347	الفاظ کے معانی اور تشریح
347	آیات کی تفسیر اور جمع بندی	347	انسان کی اجتماعی روح..... خدا کا بہت بڑا عطیہ
353	چند ضروری وضاحتیں	353	کیا معاشرہ کی روح ہوتی ہے؟

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## اہداء

- ان لوگوں کے نام جو قرآن مجید سے عشق کی حد تک محبت کرتے ہیں۔
- ان لوگوں کے نام جو اس چشمہ زلال سے زیادہ آب حیات نوش کرنا چاہتے ہیں۔
- ان لوگوں کے نام جو قرآن مجید کو زیادہ سے زیادہ جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔

- ۱۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد رضا آشتیانی
  - ۲۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد جعفر آملی
  - ۳۔ حجۃ الاسلام آقائے عبدالرسول حسنی
  - ۴۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد اسدی
  - ۵۔ حجۃ الاسلام آقائے حسین طوسی
  - ۶۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد محمدی
- کے تعاون اور ہمکاری کے ساتھ

## مقدمہ کی بجائے

## یہ سب قرآن کی تفسیریں!

ایک بھائی صاحب کہہ رہے تھے ”میں نے سنا ہے کہ قرآن مجید کے بارے میں تقریباً دو ہزار تفسیر لکھی جا چکی ہیں جب کہ قرآن مجید ایک حقیقت سے زیادہ نہیں ہے کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ اسلامی دانشور اور اہل علم و فضل..... خصوصاً اسلامی حکومت میں..... ایک جگہ مل بیٹھ کر قرآنی آیات کی تفسیر کا مسئلہ حل کر دیں؟“

تو میں نے کہا ”بھائی جان! آپ چند اہم نکات سے غافل ہیں۔

۱۔ ”ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ قرآن مجید کے کئی پہلو ہیں اور مختلف زاویے ہیں اور عظیم مفسرین میں سے ہر ایک اسے اس کے ایک خاص پہلو اور معین زاویہ سے دیکھتا اور اس کی تفسیر کرتا ہے، بالکل ویسے ہی جیسے ایک گراں قیمت شاخ گل کو ’باغ کا مالی‘ ایک بڑا ذریعہ آمدنی تصور کرتا ہے، ایک ’دار و ساز حکیم‘ اس نظر سے دیکھتا ہے کہ اس کے برگ و پتھڑیاں فلاں بیماری کے لئے مفید ہیں، اس کی لکڑی فلاں مرض کے لئے فائدہ مند ہے اور اس کے ریشے ایک مخصوص بیماری کیلئے کارآمد ہیں۔

اور شاعر اس نگاہ سے دیکھتا ہے کہ یہ شاخ گل اس کیلئے لطیف ترین اشعار کے الہام کا سبب اور ہنر شاعری کا حربی ہے۔ اس کے گل برگ معشوق کے رخسارے کی مانند اور اس کے غنچے محبوب کے دہن کی طرح ہیں۔ اس کا رنگ و بو محبوب کے رنگ و بو کی یاد دلاتے ہیں۔

جب کہ خدا پرست فیلسوف اس شاخ گل کے ایک ایک جز میں عظیم معبود کے آثار کو ملاحظہ کرتا ہے، دل کے کانوں سے اس کے ہر ذرہ سے حمد و تسبیح کی آواز سنتا ہے، اس کے نظم و ضبط اور لطافت و ظرافت کو دیکھ کر اس بے نشان ذات کی نشانیوں کا ادراک کرتا ہے اور بے خود ہو کر یہ شعر گنگنا نے لگتا ہے۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار  
ہرور عشق دفتری است معرفت کردگار

”یعنی ایک صاحب علم و ادراک شخص کی نگاہ میں سب زرختوں کا ایک ایک پتا معرفت پروردگار کی کھلی کتاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب، مفسر اور نکتہ پرداز اباب قلم قرآن مجید کو فصاحت و بلاغت کے پہلو سے دیکھتے ہیں، فیلسوف مفسر اور حکماء فلسفی نقطہ نظر سے مورخین اس کے تاریخی پہلو سے اور سائنس دان، دانشور قرآن کے آفاقی اسرار سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

معلمین اخلاق تربیت کے نہایت موثر دروس کے نقطہ نظر سے، فقہاء و قانون دان حضرات اس کے قانونی مسائل کی رو سے اور آیات الاحکام کے نقطہ نظر سے اور متکلمین مبداء و معاد کے سلسلے میں قرآن کے بلند معارف کے بارے میں بحث و تفسیر کرتے ہیں۔ خلاصہ کلام ع

ہر کسی سوزد بہ نوعی درغم جانا نہ ای

ہماری نظر میں ایسا کوئی شخص نہیں ہے جس نے قرآن مجید کو اس کے تمام پہلوؤں سے دیکھا اور اس کی تفسیر کی ہو، کیونکہ تمام علوم میں ماہر ہونا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

۲۔ قرآن مجید بحر اوقیانوس کی مانند ایک ناپیدا کنار سمندر ہے، ہر مفسر اس کی ”گہرائی“ کے ایک حصے تک رسائی حاصل کرتا ہے اور اپنے ساتھ گراں قیمت موتی لے آتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ غواصانِ بحر، کم گہرائی والے سمندروں میں غوطے لگا کر ”مروارید“ اور ”جواہرات“ حاصل کرتے تھے۔ لیکن سمندروں کی گہرائی تک پہنچنے کے وسائل جوں جوں کامل ہوتے گئے، اسی قدر غوطہ خور بھی پیش رفت کرتے گئے۔

اب سمندر میں نت نئی دریافتیں ہو رہی ہیں اور جدید سے جدید تر جواہرات و معاون تک رسائی حاصل ہو رہی ہے۔

بعینہ انسانی علم و دانش کی سطح فکری زمانے کے ساتھ ساتھ بلند ہوتی جا رہی ہے، محققین و مفسرین کلام الہی کے عمیق ترین اوقیانوس میں غوطہ خوری کیلئے دن بدن زیادہ سے زیادہ آمادگی پیدا کرتے جا رہے ہیں، ہر روز نئے نئے جواہرات و گوہر حاصل کر رہے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ اس تلاش و کوشش و سعی و جہد کا نقطہ اختتام ہرگز قابل تصور نہیں ہے کیونکہ کلام الہی بھی اس کی پاک ذات کی مانند غیر متناہی ہے۔

اور یہی بات تفاسیر کے مختلف النوع اور گونا گوں ہونے کے علاوہ ان کی کثرت کی وجہ بھی ہے۔

۳۔ علاوہ ازیں، حقائق کا انکشاف ہمیشہ افکار کی باہم ملاقات کی وجہ سے معرض وجود میں آتا ہے جس طرح پتھر

اور فولاد کے ٹکڑوں کے ٹکراؤ سے چنگاریاں اٹھتی ہیں۔ بنا بریں کتب تفسیر کی کثرت سے گھبرا نہیں جانا چاہیے بلکہ یہ قوت و طاقت کا ایک اہم نقطہ ہے جسے برقرار رہنا چاہیے۔

ہم نے تفسیر موضوعی کے میدان میں اترنے کے بعد اسی چیز کا بخوبی تجربہ کیا ہے کیونکہ ہم اس آسمانی کتاب سے جس قدر زیادہ آشنا ہوتے جا رہے ہیں، ہمارے ذہن میں قرآنی معارف و حقائق کے خزانوں کے دریچے اتنا ہی زیادہ کھلتے جا رہے ہیں۔ جو حقائق تفسیر ترتیبی میں اس حد تک منکشف نہیں ہوئے تھے وہ اب ہو رہے ہیں اور اس بات پر ہم خداوند منان کے سپاس گزار ہیں۔

وآخر داعوان ان الحمد لله رب العالمین

قم حوزہ علمیہ

ناصر مکارم شیرازی

ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ  
مُحَمَّدٍ وَاٰلِهٖ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاهِرِیْنَ لَا سِیَّمَا  
الِیْمَامِ الْمَهْدِی الْمُنْتَظَرِ. اَرْوَاحَنَا فِدَاہ۔



خدا جوئی۔۔۔ اور۔۔۔ خدا شناسی

قرآن

کی روشنی میں

تاریخ آغاز

۱۸۔ رجب المرجب ۱۴۰۸ھ

## چند اہم اور بنیادی سوال

ہر شخص مندرجہ ذیل سوالات کا جواب چاہتا ہے کہ:

ہم کہاں سے آئے ہیں؟

اب کہاں ہیں؟ اور کہاں جا رہے ہیں؟

ظاہری بات ہے کہ ان تین اہم سوالوں کے ساتھ ساتھ کچھ اور اہم سوالات بھی ہیں، اور وہ یہ کہ ”ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟“ کیا ہمارے آنے

کا کوئی مقصد بھی ہے؟ اگر کوئی مقصد ہے تو وہ کیا ہے؟

اور اس مقصد تک پہنچنے کیلئے ہمارے پاس کوئی اسباب ہیں؟

اس کائنات کا کوئی مبداء اصلی ہے؟ اگر ہے تو وہ کون ہے؟

اس کائنات کی ابتداء کب سے ہوئی؟

اور بالآخر اس عظیم مبداء کی شناخت کا کوئی راستہ ہے؟

یہ ہیں انسان کے اہم ترین سوالات!

ان سوالات کا جواب حاصل کرنے کیلئے صرف وہی لوگ خود کو پابند نہیں سمجھتے جو اس مادی زندگی میں اس حد تک غرق ہیں کہ سوائے ”

کھانے، پینے، سونے اور شہوت“ کے کسی اور چیز کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے اور ”جانوروں“ کی مانند ”عالم انسانی“ سے بے خبر ہیں۔

یادہ لوگ جو ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کیلئے کافی تگ و دو کر چکے ہیں لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے اور تھک ہار کر مایوس

ہو چکے ہیں۔

چونکہ ہمیشہ ”سوال“ ”حرکت“ کا سبب ہوتا ہے، یعنی جواب کی جانب حرکت کا، اور اس قسم کے سوالات جس قدر گونا گوں اور عمیق

ترتیب ہوں گے، جواب کی طرف حرکت بھی زیادہ وسیع اور زیادہ پائیدار ہوگی۔ اسی لئے ان عظیم سوالات کا خندہ پیشانی سے استقبال کرنا چاہیے۔

سوالات کی کثرت اور اہمیت سے گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ کھلے دل کے ساتھ ان کا استقبال بھی کرنا چاہیے۔

بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ انسانی عمر کا حاصل درحقیقت ان سوالات کا جواب حاصل کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، اور تمام

دنیا کے علماء، فلاسفہ اور سائنس دان غرض تمام دانش ور اس قسم کے اہم ترین سوالات کا جواب حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

ماہرین فلکیات کی یہ کوشش ہے کہ آسمان کی تخلیق اور ان پر حکم فرمانظام کی تشریح کریں۔ علم ارضیات کے ماہرین زمین اور اس کی

ساخت کے بارے میں جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔ انسان شناس، ماہرین نفسیات اور تمام وہ لوگ جنہوں نے انسانی اور اجتماعی علوم کا مطالعہ

کیا ہے چاہتے ہیں کہ اس عجیب و غریب موجود چیز کے بارے میں اپنی معلومات اکٹھا کریں جس کا نام ”انسان“ ہے۔

فلاسفہ کی سعی مسلسل یہ ہے کہ۔۔۔ عقل انسانی کے تقاضوں کے مطابق۔۔۔۔۔ کائنات کی ابتدا اور انتہا سے واقفیت حاصل

کریں۔ اگر مکمل طور پر نہیں تو کم از کم کسی حد تک تو یہ مسئلہ حل ہو جائے۔  
اس تمام گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ ”کائنات کے خالق“ کے بارے میں اور اس عظیم کائنات کے جس میں ہم رہ رہے ہیں، کے سلسلے میں اگر بحث کا سلسلہ قدیم الایام سے چلا آ رہا ہے تو اس میں تعجب نہیں کرنا چاہیے۔  
اسی بناء پر ہم اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں کہ اپنی حد امکان تک ہم بھی اس سوال کا جواب حاصل کرنے کی کوشش کریں کہ:  
”اس کائنات اور عالم ہستی کا مبداء کون ہے؟“  
اور اسے کیونکر پہچانا جاسکتا ہے؟“

## خدا جوئی کیوں؟

### اشارہ:

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ کوئی حرکت بغیر سبب اور موجب کے نہیں ہوتی۔ واضح سی بات ہے کہ اس کائنات کے مبداء کی شناخت کیلئے بھی کوئی حرکت کسی سبب اور موجب کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے فلاسفہ اور دانشوروں نے خدا جوئی کے تین بنیادی اسباب بتائے ہیں اور قرآن مجید نے بھی واضح طور پر ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(۱) عقلی (۲) فطری اور (۳) عاطفی

ان میں سے بعض اسباب کی پھر کئی اقسام ہیں۔ ہم سب سے پہلے ”عقلی سبب“ پر تفصیلی گفتگو کریں گے اور سب مل کر مندرجہ ذیل آیات کو دل کے کانوں سے سنتے ہیں:

۱- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ

(انفال/ ۲۴)

۲- لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ

(آل عمران/ ۱۶۳)

۳- لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ

(حدید/۲۵)

۴. يٰۤاَمْرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُجِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ  
عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ

(اعراف/۱۵۷)

۵. قَالَ هَلْ يَسْعَوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُونَ اَوْ يَنْفَعُونَكُمْ اَوْ يُضُرُّوْنَ ..... فَاِنَّهُمْ  
عَدُوٌّ لِّيْ اِلَّا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ

(شعراء/۴۲-۴۳-۴۴)

۶. فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُوْدَ

(حم السجده/۱۳)

۷. قُلْ اِيْمًا اَعْظَمُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفَرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا  
مَا بِصٰحِبِكُمْ مِّنْ جَنَّةٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ  
شَدِيْدٍ (سبا/۴۶)

ترجمہ:

- ۱۔۔ اے وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہو خدا اور رسول کی دعوت کا جواب دو، جب تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہاری زندگی کا سبب ہو۔
- ۲۔۔ خداوند عالم نے مومنین پر احسان کیا ہے (اور عظیم نعمت عطا کی ہے) جب کہ ان کے اندر انہی کی جنس سے پیغمبر مبعوث کیا جو کہ ان پر اس کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ اس سے پہلے وہ لوگ کھلی گمراہی میں تھے۔
- ۳۔۔ ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلائل دے کر بھیجا ہے اور ان کے ساتھ (آسمانی) کتاب اور (حق اور منصفانہ قوانین کی معرفت کا) میزان نازل کیا ہے تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں۔

- ۴۔۔ پیغمبرؐ انہیں نیکیوں کا حکم دیتا ہے، برائیوں سے روکتا ہے، پاک و پاکیزہ چیزوں کو ان کیلئے حلال کرتا ہے۔  
 ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتا ہے اور جو سنگین بوجھ اور زنجیریں ان کیلئے تھیں، اُن سے اٹھالیتا ہے۔
- ۵۔۔ (ابراہیمؑ نے) کہا کہ جب تم بتوں کو پکارتے ہو تو کیا وہ تمہاری آواز کو سنتے ہیں؟ یا تمہیں کوئی نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟۔۔۔۔۔ وہ سارے کے سارے میرے دشمن ہیں، سوائے عالمین کے پروردگار کے۔
- ۶۔۔ اگر وہ روگردانی کریں تو تم ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں ایسے صاعقہ سے ڈراتا ہوں جو عا د اور ثمود جیسا صاعقہ ہے۔
- ۷۔۔ کہہ دو کہ میں تمہیں صرف ایک نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ کہ دو، دو ہو کر یا ایک، ایک ہو کر خدا کیلئے قیام کرو، پھر اپنی فکر سے کام لو، تمہارا یہ ساتھی (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہرگز مجنون نہیں ہے وہ تو تمہیں (خدا کے) سخت عذاب سے ڈرانے والا ہے۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

ہر انسان کا پہلا فریضہ تحقیق ہے۔

ہر انسان کمال کا عاشق ہوتا ہے اور یہ جادوئی عشق تمام لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ البتہ ہر شخص اپنا کمال جس چیز میں دیکھتا ہے اسی کے پیچھے چل پڑتا ہے، جیسا کہ کچھ لوگ آب کی بجائے سراب کے حصول میں کوشاں رہتے ہیں، موہوم و خیالی اقدار کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور انہیں واقفیت اور حقیقت سمجھتے ہیں۔

کبھی اس صول کو ”حصولِ منفعت اور دفعِ ضرر“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کیونکہ اس کے لئے انسان خود کو اس بات کا پابند سمجھتا ہے کہ ہر وہ موضوع جو (سود و زیاں کے لحاظ سے) اس کی سرنوشہ اور انجام سے کسی قسم کا تعلق اور رابطہ رکھتا ہے، اس سے صحیح معنوں میں اپنا تعلق رکھے۔

البتہ اس عشق کو ”غریزہ“ کا نام دینا بہت مشکل ہے کیونکہ عموماً غریزہ ان امور کو کہا جاتا ہے جو انسانوں یا حیوانوں کے افعال میں کسی قسم کی سوچ اور غور و فکر کے بغیر موثر ہو۔ اسی لئے حیوانات کیلئے بھی لفظ ”غریزہ“ کا اطلاق ہوتا ہے۔  
 اسی لئے بہتر یہی ہے کہ اسے ”اعلیٰ تمایل“ کے نام سے یاد کیا جائے۔

بہر حال کمال اور معنوی و مادی منافع و مفادات کی طرف تمایل اور ہر قسم کے ضرر اور نقصان کو دور کرنے کی خواہش انسان کو اس بات

پر آمادہ کرتی ہے کہ احتمال کے مواقع پر بھی تحقیق سے کام لے۔

یہ احتمال جتنا قوی ہوگا اور وہ سود و زیاں جتنا عظیم ہوگا، انسان اس تحقیق کو اتنا ہی لازمی سمجھے گا۔

یہ بات قطعاً محال ہے کہ کوئی شخص اس بات کا احتمال دے کہ کوئی بات اس کے انجام میں اہم کردار ادا کر رہی ہے اور وہ اس سلسلے میں خود کو تحقیق کا پابند نہ سمجھے۔

خدا پر ایمان اور مذہب کی جستجو کا مسئلہ بھی یقیناً اسی قسم کے مسائل کے زمرہ میں آتا ہے، کیونکہ مذہب کے سلسلے میں انجام اور سرنوشت کے مسائل کی گفتگو ہوتی ہے، ایسے مسائل کی گفتگو جو انسان کے خیر و شر سے قریبی اور گہرا تعلق رکھتے ہیں۔

بعض لوگ اس مطلب کو مزید واضح کرنے کیلئے ایک مثال ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فرض کیجئے ایک شخص کسی دورا ہے پر کھڑا ہے اور وہ کہہ رہا ہے کہ ”یہاں ٹھہرنا قطعاً خطرناک ہے اور (ایک راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس راستے کا انتخاب بھی ہر حالت میں خطرناک ہے اور دوسرا راستہ نجات کا راستہ ہے“ پھر وہ ہر ایک کیلئے قرآن اور شواہد اور دلائل بھی بیان کرتا ہے۔

ایسی صورت میں ہر راہگزر خود کو اس بات کا پابند سمجھے گا کہ وہ اس بارے میں تحقیق کرے اور اس سے بے اعتنائی عم عقل کے مخالف ہے۔

مندرجہ بالا مقدمہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب ہم آیات مذکور کی تفسیر بیان کرتے ہیں۔

زیر بحث آیات میں سب سے پہلی آیت، پیغمبر اسلام کی اسلام کی طرف دعوت کی حقیقی حیات اور صحیح معنوں کی زندگی سے تعبیر کر رہی ہے۔ اس دعوت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے تمام تر مفاد ہم کو صرف ایک مفہوم میں سمو یا جاسکتا ہے اور وہ ہے ”حیات“ کا مفہوم، وہ حیات جو معنوی اور مادی دونوں طرح اور ہمہ جہاتی حیات پر مشتمل ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے یہاں ”حیات“ کی تفسیر خاص طور پر ”قرآن“ یا ”ایمان“ یا ”جہاد“ یا اس قسم کے دوسرے مفہوم سے کی ہے۔<sup>[۱]</sup> لیکن مسلم بات یہ ہے کہ حیات کا مفہوم وسیع ہے جو مذکورہ چیزوں کو بھی اور دوسری ان چیزوں کو بھی اپنے دائرہ میں لے لیتی ہے جس میں مادی اور معنوی دونوں طرح کی زندگی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

بہر حال اگر ہم میں سے کوئی شخص اس قسم کا دعویٰ کرے تو کیا ہم اُسے نظر انداز کر دیں گے؟ اور کیا ہم اتنا بھی نہیں کریں گے کہ اس کے بارے میں کسی قسم کی تحقیق کریں؟

مبہی وجہ ہے کہ قرآن مجید اس قسم کی تعبیر سے ان لوگوں کے اندر مذہبی تحقیق کے ملکہ کو بیدار کرنا چاہتا ہے جو اس کام کیلئے آمادہ ہوتے ہیں۔

”راغب“، ”مفردات“، میں لکھتے ہیں کہ ”استجابت“ درحقیقت جواب حاصل کرنے کیلئے کوشش کرنا ہے اور آمادہ ہونا ہے، اور چونکہ

[۱] تفسیر فخر الدین رازی جلد ۱۵ ص ۱۵۷، تفسیر المیزان جلد ۹ ص ۲۳، تفسیر روح المعانی جلد ۸ ص ۱۶۹، تفسیر قرطبی جلد ۴ ص ۲۸۲۵ میں یہ احتمالات ذکر کئے گئے ہیں۔

یہ موضوع عام طور پر جواب پر ختم ہو جاتا ہے، لہذا اجابت ” کے معنی سے تفسیر کی گئی ہے۔ [۱]

دوسری آیت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کو بیان کر رہی ہے جو خداوند عالم کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ہے۔ خدا نے مومنین کو یہ نعمت عطا فرمائی ہے اور پھر اس نعمت کی تفسیر میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تین اہم پروگراموں کو ذکر فرمایا ہے۔

۱۔۔ آیات خداوندی کی تلاوت (یتلوا علیہم آیاتہ) ۲۔۔ تزکیہ اور تربیت (وتزکیہم) ۳۔۔ کتاب و حکمت کی تعلیم (ويعلمہم الكتاب والحکمة)

اور ان تمام کا نتیجہ ”ضلال مبین“ (کھلی گمراہی) سے نجات ہے۔ (وان كانوا من قبل لغی ضلال مبین)

یہ سب تعبیریں اس لئے ہیں کہ لوگوں کو اسلام کی جانب متحرک کرنے کے اسباب کو اجاگر کیا جائے اور کم از کم ہر شخص خود کو اس سلسلے میں تحقیق کرنے کیلئے پابند سمجھے کیونکہ ممکن ہے کہ انسان کا بہت بڑا نفع یا نقصان امر میں مضمر ہو۔

”مذت“، ”ممن“ کے مادہ سے مشتق ہے اور بعض مفسرین کے مطابق ”کاٹنے“ اور ”قطع کرنے“ کے معنی میں ہے لہذا ”اجر غیر ممنون“ اس جزا کو کہتے ہیں جو کبھی منقطع نہیں ہوتی۔ اسی طرح ان چھوٹے چھوٹے قطرات کو جو شبنم کی مانند درختوں کے پتوں پر بیٹھتے ہیں (گوند کی مانند چھوٹے چھوٹے ذرے جن میں مٹھاس پائی جاتی ہے) کو بھی ”ممن“ کہتے ہیں۔

لیکن ”راغب“ کے بقول ”ممن“ دراصل اس پتھر کو کہتے ہیں جس کے ساتھ چیزوں کو تولا جاتا ہے۔ پھر اس کا اطلاق ہر عظیم اور گراں قدر نعمت پر ہونے لگا۔

جب اس لفظ کا اطلاق خداوند عالم کے بارے میں ہوتا ہے تو اس کے معنی نعمت عطا کرنے کے ہوتے ہیں اور جب انسانوں کے بارے میں ہوتا ہے تو غالباً اس کے معنی ایسی خدمت کے بارے میں بات کرنا ہوتے ہیں جو وہ دوسروں کے لئے انجام دیتے ہیں۔ اسی لئے پہلے معنی محبوب و قابل محبت ہیں اور دوسرے منفور اور قابل نفرت ہیں۔

تیسری آیت بعثت انبیاء کے ایک اور اہم ہدف یعنی ”عدالت اجتماعی“ کے طرف اشارہ کر رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے انبیاء کو تین چیزوں کے ساتھ آراستہ کیا ہے، سب سے پہلے تو وہ روشن دلائل ہیں جو ”معجزات“ اور عقلی دلائل، دونوں پر مشتمل ہیں۔ (لقد ارسلنا رسلنا بالبینات)

دوسری آسانی کتاب ہے جو تمام لوگوں کے معارف اور فرائض کو بیان کرتی ہے۔ نیز وہ میزان ہے جس کے ذریعہ سے حق اور باطل کو پرکھا جاتا ہے (خدائی قوانین، اقدار اور مخالف اقدار کا بیان جو نیکیوں اور برائیوں کے وزن کرنے کا معیار ہے۔) (وانزلنا معہم الكتاب والمیزان)

”میزان“ دراصل ”ترازو“ کے معنی میں ہے، یعنی وہ ذریعہ جس کے ساتھ چیزوں کو تولا جاتا ہے۔

[۱] البتہ تو جرح ہے کہ ”اجابت“ کا لفظ حرف جر کے بغیر متعدی ہوا ہے، جب کہ ”اجابت“ عام طور پر ”لازم“ کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔

عجیب بات ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں بعض مفسرین نے ”میزان“ کو اسی معنی میں لیا ہے جب کہ غالب مفسرین نے اس نظریہ کو مسترد کر دیا ہے اور کہا ہے کہ ”میزان“ سے مراد وہ ذریعہ ہے جس سے انسان عدالت کی کمی بیشی اور حق و باطل کو پہچان کرتا ہے۔ اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اس کی ”خدائی قوانین“ اور اقدار و مخالف اقدار“ کے معنی سے تفسیر کی جاسکتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ یہ امور آسمانی کتابوں میں مذکور ہیں، لیکن ان کا مستقل صورت میں ذکر کرنا ان کی اہمیت کی وجہ سے ہے۔ صورت حال خواہ کچھ بھی ہو، کیا یہ بات ممکن ہے کہ انسان یہ سنے کہ ایک شخص اس قسم کے تاریخ ساز حقائق کی طرف دعوت دے رہا ہو اور وہ خود کو اس بارے میں تحقیق کا ذمہ دار نہ ٹھہرائے؟

فخر الدین رازی کہتے ہیں کہ لوگوں کی تین قسمیں ہیں، ایک قسم وہ ہے جو ”نفس مطمئنہ“ کے مقام پر پہنچی ہوئی ہے، اسے بارگاہ ایزدی کے قرب کا شرف حاصل ہے اور کتاب خدا کے سوا کسی اور چیز پر عمل نہیں کرتی، خدا کے سوا اس کا کوئی اور ہدف اور مقصود نہیں ہوتا۔ وَأَنْزَلْنَا لَهُمُ الْكِتَابَ اسی قسم کے لوگوں کا ہدف ہے۔

دوسری قسم وہ ہے جو ”نفس لؤامہ“ کی حامل ہے، جس کا شمار ”صحاب الیمین“ میں ہوتا ہے ایسے لوگوں کے اخلاق اور معرفت کی پہچان کیلئے ایک معیار کی ضرورت ہے جس کے ذریعہ وہ افراط و تفریط سے بچے رہیں اور ”المیزان“ کی تعبیر ایسے ہی لوگوں کیلئے ہے۔ تیسرا گروہ وہ ہے جو ”نفس امارہ“ کا مالک ہے، اور أَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ (ہم نے لوہا نازل کیا) اس قوم کے لوگوں کیلئے جنہیں سزا کی ضرورت ہوتی ہے۔ [۱]

چوتھی آیت میں مختلف امور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، خصوصاً بعثت انبیاء کے سیاسی اور اجتماعی پہلو کو بھی اور آسمانی ادیان کے نزول کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ لوگوں کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت اور اتباع کی ترغیب دلانے کیلئے آنحضرتؐ کے کچھ اوصاف بیان کئے ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں: ”آپ انہیں نیکیوں کی دعوت دیتے ہیں، برائیوں سے روکتے ہیں، جو پاک و پاکیزہ چیز ہے ان کیلئے حلال اور جو خبیث و پلید ہیں ان کیلئے حرام قرار دیتے ہیں“ یہاں تک کہ فرمایا ”پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کندھوں سے اتارتے ہیں اور جو طوق و زنجیر ان پر تھے، انہیں ان سے اتارتے ہیں۔“ (وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ)

یقیناً یہ ایسے امور ہیں جو انسان کی تقدیر کو سنوارتے اور اس کے ارتقاء اور سودوزیاں کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں، حتیٰ کہ اس کا احتمال ہی کافی ہے کہ وہ انسان کو تحقیق پر آمادہ کرتا ہے۔

”اِصْرٌ“ (بروزن مصر) دراصل کسی چیز کو زبردستی باندھنے اور انہیں قید کرنے کے معنی میں ہے پھر اس کا اطلاق سنگین بوجھ اور ہراس بھاری کام پر ہونے لگا جو اس کو اپنی سرگرمیوں سے باز رکھے۔ اور پھر اسی مناسبت کے پیش نظر ان طنابوں، میخوں اور کیلوں کو بھی



”آصار“ کہا جانے لگا جس کے ساتھ ستونوں کو باندھتے ہیں۔ اسی مناسبت کی وجہ سے عہد و پیمان اور گناہ کو بھی ”اصر“ کہتے ہیں۔ [۱]

ارباب لغت اور صاحبان تفسیر کی تعبیروں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے، جس سے یہ استنباط کیا جاسکتا ہے کہ لفظ دراصل ”اصر“ اس سنگین چیز کو کہتے ہیں جو قیدی کے پاؤں میں باندھتے ہیں تاکہ وہ اس سے چل پھر نہ سکے (جسے ہم ”جولان“ کہتے ہیں) اس کا ”اغلال“ کے ساتھ ساتھ بیان ہونا اسی معنی سے مناسبت رکھتا ہے۔ اغلال کے معنی وہ طوق اور زنجیر ہیں جو قیدی کے گردن میں ڈالتے ہیں۔ پھر ”اصر“ کے کئی اور معنی بھی ذکر ہوئے ہیں جو اس کے اصلی معنی سے مناسبت رکھتے ہیں۔

اگرچہ بہت سے مفسرین نے اس آیت میں ”اصر“ اور ”اغلال“ کو گزشتہ امتوں میں محنت شاقہ یا مشکل اور پیچیدہ امتحانات کے معنی میں لیا ہے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ ان دونوں الفاظ کا ایک نہایت ہی وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم کے اسارت کی زنجیروں اور سنگین بوجھ کو شامل ہے، خواہ وہ ”جہالت“ ہو یا ”شہوات“، ”گناہ“ ہوں یا ”استبداد“ و ”استعمار“ اور اس قسم کی دوسری چیز، جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقدس وجود اور ان کی آزادی بخش تعلیمات کے صدقے میں اٹھالی جائیں گی۔

پانچوں آیت حضرت ابراہیمؑ بت شکن کی زبانی بیان ہوئی ہے جب انہوں نے بت پرستوں کو مخاطب کر کے انہیں اُن کے ان فتنج فعل پر سرزنش کی اور ان کی سوئی ہوئی عقلوں کو بیدار کرتے ہوئے فرمایا:

”جب تم بتوں کو پکارتے ہو تو کیا وہ تمہاری آوازیں سن لیتے ہیں؟ کیا انہوں نے کبھی تمہیں کوئی فائدہ پہنچایا ہے؟ یا وہ کسی کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں؟ کیونکہ کسی کی عبادت یا تو اس کے فائدہ اور مفاد پہنچانے کی وجہ سے کی جاتی ہے یا نقصان اور سزا سے بچنے کیلئے ا

یقیناً ان کے پاس ان سوالات کا کوئی مثبت جواب نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ اپنے ماسلف لوگوں کے دامن سے متمسک ہوں اور یہ کہیں: **بَلْ وَجَدْنَا آبَاءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ** (ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایسا کرتے دیکھا ہے اور بس ا)

اس قسم کی تعبیروں سے یہ بات بخوبی سمجھی جاسکتی ہے کہ نفع اور نقصان کا باعث ہی معرفت خدا کی طرف حرکت کا موجب بن جاتا ہے) صرف مادی نفع اور نقصان ہی نہیں، معنوی نفع اور نقصان بھی ہے جو اس سے بالاتر و برتر ہے)

زیر بحث آیات کی چھٹی آیت جس کا تعلق سورہ فصلت سے ہے، ہم پڑھتے ہیں کہ ”ولید بن مغیرہ“ جو زمانہ جاہلیت میں عرب کا مشہور شخص تھا اور مشکلات میں لوگ اس سے مشورے لیا کرتے تھے: اس سے ”ابو جہل“ نے پوچھا: ”محمدؐ جو کچھ کہتے ہیں وہ کیا ہے؟ جادو ہے؟ کہانت ہے؟۔۔۔۔۔ کیا ہے؟“ تو ولید نے کہا: ”پہلے مجھے اس کا جائزہ لینا چاہیے اور اس کی تحقیق کرنی چاہیے۔“ جب وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچا تو حضور اکرمؐ نے سورہ فصلت کی کچھ آیات پڑھیں اور زیر بحث آیت کو تلاوت فرمایا: ”اگر وہ روگردانی کریں تو آپ اُن سے کہہ دیں کہ میں تمہیں اس صاعقہ سے ڈراتا ہوں جو عباد اور شومود جیسا صاعقہ ہے“ (فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ

[۱] تفسیر مجمع البان جلد ۵ ص ۳۸۸ و تفسیر فخر الدین رازی جلد ۱۵ ص ۲۵، تفسیر روح المعانی جلد ۹ ص ۷۲، مفردات راغب مادہ ”اصر“ اور کتاب ”العین

عَادٍ وَمُؤَدَّ

یہ سن کر ولید لزرہ براندام ہو گیا اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہاں سے اٹھا، سیدھا گھر پہنچا اور گھر کا دروازہ بند کر لیا، حتیٰ کہ قریش کے سرداروں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ مائل بہ اسلام ہو چکا ہے۔ چنانچہ وہ اس کے پاس پہنچے اور وضاحت چاہی تو اس نے کہا ”میں ہرگز مسلمان نہیں ہوا، لیکن سچ بات یہ کہ محمدؐ کی باتوں میں بلا کی کشش ہے جس سے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ میری پیش کش یہ ہے کہ تم انہیں ساحر کہا کرو۔“

[۱]

کیا اس قسم کی تہدیدات (ان لوگوں کیلئے جو ایمان نہیں لائے) تحقیق کی طرف قدم اٹھانے کا باعث نہیں بنیں گی؟  
زیر بحث آیات کی ساتویں آیت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے تمام مخالفین کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں ایک مسئلے کی نصیحت کریں اور وہ یہ کہ ”وہ انفرادی یا اجتماعی صورت میں خدا کے لئے کھڑے ہو جائیں اور اپنی فکر کو کام میں لائیں تاکہ انہیں معلوم ہو کہ پیغمبر اسلامؐ نہ تو مجنون ہیں اور نہ ہی ساحر بلکہ وہ سخت عذاب الہی سے ڈرانے والے ہیں۔“ (اِنَّ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لِّكُمْ بَيْنَ يَدَيْهِ عَذَابٍ شَدِيْدٍ)

اس آیت کی تمام تعبیریں جچی تلی ہیں۔

”اٹھا“ کے ساتھ تعبیر، جو حصر کیلئے ہے (صرف ایک ہی چیز ہے)

”موعظہ“ کے لفظ کے ساتھ تعبیر، جو عام طور پر ایسے مقامات پر بولا جاتا ہے کہاں پر عقل کسی چیز کے متعلق فیصلہ کرتی ہے، لیکن چونکہ انسان اس سے غافل ہوتا ہے لہذا کوئی دل سوز شخص اسے نصیحت کرتا اور خواب غفلت سے جگاتا ہے۔

”قیام کی تعبیر پختہ مقاصد کی بجا آوری کیلئے مکمل طور پر تیاری کی علامت ہے۔“

”ثقی“ اور ”فُرَادِي“ کی تعبیر اس راہ میں اجتماعی اور انفرادی سرگرمیوں اور ہر قسم کی تلاش اور کوشش کی طرف اشارہ ہے (مسلم بات ہے کہ جب انسان تنہائی میں سوچتا ہے تو گہری سوچ ہوتی ہے اور اگر اجتماعی صورت میں غور و فکر کرتا ہے تو وہ کامل ترین سوچ ہوتی ہے، کیونکہ اسی صورت میں کئی افکار آپس میں مل جاتے ہیں اور ان دونوں کو ملا کر ایک نئی راہ نکلتی ہے جو بہترین راہ ہوتی ہے۔ [۲])

”تفکر“ کی تعبیر ان افکار کی طرف اشارہ ہے جو انسان کے اندر سے پیدا ہوتے ہیں اور واضح عقلی دلائل کی طرف راہنمائی

کرتے ہیں۔

[۱] بحار الانوار جلد ۷ ص ۲۱۱ اور دوسری تفاسیر (اصل حدیث تو بڑی مفصل ہے لیکن ہم نے اس کو خلاصہ کے طور پر پیش کیا ہے۔) اس کی تفصیل تفسیر نمونہ جلد ۲۰ میں ملاحظہ فرمائیں

[۲] بعض کہتے ہیں کہ ”ثقی“ کا لفظ ”مناظرہ“ کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ حق کی دریافت میں اس کا افرحہ ہے، جب کہ ”فُرَادِي“ کا لفظ تنہائی کے مطالعات کی طرف اشارہ ہے۔ بعض لوگوں کا احتمال یہ بھی ہے کہ ”ثقی“ کا لفظ ایسی سوچ کی طرف اشارہ ہے جو انسان دن کو دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر سوچتا ہے اور ”فُرَادِي“ ایسے افکار ہیں جو رات کو اور تنہائی کی حالت میں سوچے جاتے ہیں۔ (تفسیر فرطی جلد ۸ ص ۵۳ اور ۹۳)

”للم“ (تمہارے لئے) کی تعبیر اور وہ بھی ڈرانے کے مسئلے اور عذاب شدید کی طرف توجہ دلانے کے ساتھ مربوط ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہاں صرف تمہارے ہی نفع اور نقصان کی بات کی جا رہی ہے اور پیغمبر اسلام کا بھی صرف اور صرف یہی مقصد ہے۔ ان حالات کے ہوتے ہوئے بھی کیا ہم قرآن کی دعوت کو صحیح معنوں میں دعوت نہ سمجھیں، اس پر غور و فکر نہ کریں اور حق کو حاصل کر کے اس کی اتباع نہ کریں؟

## نتیجہ

مندرجہ بالا آیت اور اس طرح کی کئی اور آیات اس بات کا بخوبی پتہ دیتی ہیں کہ ”معرفت الہی“ کے راستے میں تلاش اور جستجو عقل کا تقاضا ہے۔ یہ اس بات کی غماز ہیں کہ خدا کی جانب دعوت دینے والے انبیاء و مرسلین کی دعوت کا کوئی عقل مند انکار نہیں کر سکتا اور دعوت بھی ایسی جس کا ہر ایک شخص کی تقدیر و انجام کے ساتھ گہرا تعلق ہو۔ یہ مذہبی تحقیقات کے اسباب کی پہلی سیڑھی ہے۔

## چند مزید وضاحتیں

### ۱۔ اسلامی روایات میں مذہب کے عقلی ہونے کے اسباب

۱۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ان کے ایک صحابی نے ”ضعفاء (مستضعفین) کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے اُسے یہ جواب دیا۔

”العیف من لہم ترفع الیہ حجة ولم یعرف الاختلاف فاذا عرف الاختلاف فلیس بمستضعف“ یعنی مستضعف وہ ہے جس کے پاس کوئی دلیل نہ پہنچی ہو، (دین و مذہب کے سلسلے میں) اسے اختلاف کا کوئی علم نہ ہو اور جب وہ اختلاف سے باخبر ہو گیا، تو پھر مستضعف نہیں رہا۔ [۱]

۲۔ یہی چیز حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

”من عرف الاختلاف الناس فلیس بمستضعف“ یعنی جس کو لوگوں کے اختلاف کا علم ہو گیا وہ مستضعف نہیں رہا۔ [۲]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب انسان اختلاف سے باخبر ہو گیا تو اس کی عقل تحقیق اور مطالعہ کے میدان میں پہنچا دیتی ہے، پھر وہ

[۱] اصول کافی جلد ۲ ص ۴۰۶ حدیث ۱۱ (باب المستضعف)

[۲] (۲) اصول کافی جلد ۲ ص ۴۰۶ حدیث ۱۱ (باب المستضعف)

مستضعف نہیں رہتا ہے۔ البتہ یہاں پر مستضعف سے مراد وہی ”فکری مستضعف“ ہے جسے ہم کبھی ”جاہلِ قاصر“ کے نام سے پکارتے ہیں۔

۳۔ ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

”اربعة تلزم کل ذی حجی وعقل من امتی، قبیل یارسول اللہ ماہن؛ قال استماع العلم وحفظہ ونشرہ والعمل بہ“ چار چیزیں ایسی ہیں جو میری امت کے ہر ذی عقل اور باشعور انسان پر لازم ہیں، علم و دانش کو کان لگا کر سننا، اسے یاد کرنا اس کی نشر و اشاعت کرنا اور اس پر عمل کرنا۔ □

اس طرح آنحضرتؐ نے کان لگا کر سننے اور تحقیق و جستجو سے کام لینے کو عقل و درایت کی علامت قرار دیا ہے۔

## ۲۔ متعصب دشمن

ہمیشہ آزاد منش اور آزاد طبع لوگ جو تحقیق حق کو عقل فریضہ سمجھتے ہیں، کے مقابلے میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو چگا ڈروں کی مانند چہرہ حق دیکھنے سے وحشت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر ان کے کانوں کے نزدیک خدا کی ندادینے والوں کی آواز پہنچ جائے تو وہ اپنے کانوں کو بند کر لیتے ہیں تاکہ حق کی آواز کو نہ سن پائیں۔

قرآن مجید نے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے کچھ لوگوں کے بارے میں خود نوح علیہ السلام کی زبانی یہ کیفیت بیان کی ہے۔ جب

حضرت نوح علیہ السلام نے رب العزت کی بارگاہ میں ان کے بارے میں شکایت کی:

”وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِيَتَّخِذُوا مَعِيَ مَرْحُومًا لَبِثُوا كَافِرِينَ فَاسْتَعْصَمُوا وَاسْتَكْبَرُوا وَاصْرَوْا وَاسْتَكْبَرُوا السَّيِّئِينَ“ جب بھی میں انہیں دعوت دیتا ہوں کہ ایمان لے آئیں اور تو انہیں معاف کر دے، تو وہ اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں اور اپنے لباس کو اپنے اوپر اچھی طرح لپیٹ لیتے ہیں۔ (تاکہ وہ میری آواز کو نہ سن سکیں یا میرے چہرے کو نہ دیکھ سکیں؟) اور اپنی تعصب آمیز مخالفت میں اصرار کرتے ہیں اور شدید استکبار کا اظہار کرتے ہیں۔ (سورہ نوح/ ۷)

مشرکین مکہ بھی گویا متعصب قوم نوحؑ کے وارث تھے، لہذا اس سے پیچھے نہیں رہے، قرآن ان کے بارے میں کہتا ہے:

”وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَتَسْعَوْا هَذَا الْقُرْآنَ وَالْعَوَافِيَهُ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ“ اور کافروں نے کہا اس قرآن کو کان نہ دو اور شور و دُشربا مچاؤ (تاکہ لوگ قرآن کی آواز کو نہ سن پائیں) شاید تم کامیاب ہو جاؤ۔ (حم السجدہ/ ۲۶)

اس قسم کے لوگوں کے پیر و گار ہر دور، ہر زمانے میں ہوتے ہیں اور وہ کبھی بھی مسائل کی تحقیق نہیں کرتے۔ یہ لوگ ایسے بے عقل اور احمق ہوتے ہیں جیسے چگا ڈر جسے آفتابِ عالمتاب کی روشنی سے خطرہ لاحق ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ تاریکی ہی میں اپنی زندگی گزار دیتے ہیں۔ ان کو اپنی جہالت پر فخر ہوتا ہے اور یہی لوگ ساری دنیا سے زیادہ محروم ہوتے ہیں کیونکہ وہ کھلم کھلا آفتابِ عالم کے دشمن ہوتے ہیں۔

## ۳۔ عاطفی سبب

اشارہ:

ایک مشہور ضرب المثل ہے کہ: ”أَلَا نَسَانُ عَمِيدُ الْإِحْسَانِ“ یعنی انسان، احسان کا بندہ ہے۔  
 یہی چیز تھوڑے سے فرق کے ساتھ حضرت امیر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے، آپ فرماتے ہیں:  
 ”أَلَا نَسَانُ عَمِيدُ الْإِحْسَانِ“ انسان، احسان کا بندہ ہے۔

ایک اور روایت میں آپ ہی سے منقول ہے کہ: ”بِأَلِ الْإِحْسَانِ تُمَلِّكَ الْقُلُوبَ“ احسان کے ذریعے انسانی قلوب کو مسخر کیا جاسکتا ہے۔

نیز ایک اور حدیث میں حضرت علیؑ ہی فرماتے ہیں ”وَأَفْضَلُ عَلَى مَنْ شِئْتَ تَكُنْ أَمِيرًا“ جس پر تم نیکی کرو گے اسی کے امیر بن جاؤ گے۔

ان سب کی اصل پیغمبر خدا کی وہ حدیث ہے جس میں آپ نے ارشاد فرمایا:

”أَنَّ اللَّهَ جَعَلَ قُلُوبَ عِبَادِهِ عَلَى حُبِّ مَنْ أَحْسَنَ إِلَيْهَا وَبُغْضِ مَنْ أَسْلَمَ إِلَيْهَا“ خداوند عالم نے دلوں کو ان لوگوں کی محبت میں مسخر کر دیا ہے جو ان کے ساتھ اچھائی کرتے ہیں اور ان لوگوں کے لئے بغض قرار دیا ہے جو ان سے برائی کرتے ہیں۔

خلاصہ کلام ۱ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص کسی کی خدمت کرتا ہے، یا کوئی نعمت عطا کرتا ہے تو محبت و عطف کے تمام وسائل انسان کو اسی کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں۔ اس طرح سے اس کا اس کے ساتھ تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اسی طرح پہچانے اور اس کا شکر یہ ادا کرے اور پھر یہ نعمت جس قدر اہم اور زیادہ پائیدار ہوگی، ”منعم“ کی طرف اس کے عاطفوں کا تحریک بھی زیادہ ہوگا اور اس کی ”پہچان اور معرفت“ کیلئے بھی زیادہ خواہش مند ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے علم کلام (علم العقائد) نے قدیم الایام سے ہی ”شکر منعم“ کے مسئلے کو مذہب کی تحقیق کے بارے میں اور معرفت الہی کے سلسلے میں ایک اہم سبب قرار دیا ہے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ رہے کہ ”شکر منعم“ ایک عقلی حکم ہونے سے پہلے ایک عاطفی حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مختصر سے اشارے کو ہم عرب کے مشہور شاعر ”ابوالفتوح بستی“ کے شعر پر ختم کرتے ہیں۔ شعر عرض ہے۔

أَحْسِنَ إِلَى النَّاسِ تَسْتَعِيدَ قُلُوبَهُمْ  
 فَطَالَمَا اسْتَعَبَدَ الْإِنْسَانَ إِحْسَانٌ

لوگوں کے ساتھ احسان اور نیکی کرو تا کہ ان کے دلوں کو اپنا غلام بنا لو، کیونکہ انسان ہمیشہ سے احسان کا بندہ چلا آ رہا ہے۔  
 اسی اشارے کے ساتھ ہم قرآن کی خدمت میں حاضر ہو کر درج ذیل آیات کو گوش دل سے سماعت کرتے ہیں۔ ارشاد رب

العزت ہے:

۱۔ وَاللّٰهُ اٰخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ  
السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَكْرُوْنَ

(نحل/۷۸)

۲۔ وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً  
تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاجِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ  
تَشْكُرُوْنَ

(نحل/۱۳)

۳۔ فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمْ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاَشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاكَ  
تَعْبُدُوْنَ

(نحل/۱۱۳)

ترجمہ

- ۱۔۔ اور خداوند عالم نے تمہیں ماؤں کے شکم سے نکالا، حالانکہ تم کچھ نہیں جانتے تھے۔ لیکن اس نے تمہارے لئے کان، آنکھیں، اور عقلیں قرار دی ہیں تاکہ تم اس کا شکر بجالاؤ۔
- ۲۔۔ وہ خدا تو وہ ہے جس نے سمندر کو (تمہارے لئے) مسخر کر دیا ہے تاکہ تم (اس کا) تازہ گوشت کھاؤ اور پہننے کیلئے زینت کے وسائل اس سے باہر نکالو۔ اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ وہ پانی کے سینہ کوشا گفٹہ کرتی ہیں تاکہ تم (تجارت کر کے) خدا کے فضل سے بہرہ مندی کرو، شاید کہ اس کی نعمتوں کا شکر بجالاؤ۔
- ۳۔۔ جب یہی حالت ہے تو خدا نے جو روزی تمہیں عطا کی ہے تم حلال اور پاکیزہ کو کھاؤ اور خدا کی نعمت کا شکر بجالاؤ، اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### شکرِ منعم، معرفتِ الہی کا زینہ ہے

سب سے پہلے آیت خداوندِ عالم کی اہم ترین نعمتوں کا ذکر کر رہی ہے تاکہ انسان کی شکرگزاری کی حس کو متنبہ کر دے اور اس طرح سے وہ اسے ”منعم“ کی معرفت کی دعوت دے رہی ہے۔ نعمت کی گفتگو معرفت کا ذریعہ ہے ”آنکھ“، ”کان“ اور ”عقل“ کے متعلق فرماتا ہے: ”جب تم اپنی ماؤں کے شکم سے باہر آئے تھے تو اس وقت تم کچھ نہیں جانتے تھے۔ خداوندِ عالم نے تین ذرائع تمہارے اختیار میں دیدیئے: کان، آنکھ، اور عقل“ (وَجَعَلْ لَكُمْ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ)

کان کے راستے سے تم ”نقلی علوم“ اور دوسرے لوگوں کی دانش سے آشنا ہوتے ہو۔

آنکھ کے ذریعہ اسرارِ طبیعت اور عجائبِ آفرینش کے مشاہدہ سے ”سائنسی“ اور ”تجرباتی علوم“ سے، اور عقل کے ذریعہ ”عقلی علوم“ اور منطقی تجزیہ و تحلیل سے۔

اگرچہ آیت میں یہ تین موضوع وادعاطفہ کے ذریعہ ایک دوسرے پر عطف ہو رہے ہیں اور ضروری بھی نہیں ہے کہ اس میں ترتیب کے معنی پائے جائیں، لیکن پھر بھی بعید نہیں ہے کہ فطری ترتیب شاید اسی طرح ہو کیونکہ انسان اپنی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد تک مشاہدہ اور دیکھنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ چونکہ تاریکی کا عادی ہوتا ہے لہذا نور سے وحشت کرتا ہے اور اپنی آنکھوں کو ایک عرصہ تک بند رکھا ہے جب کہ کان پہلی آواز کو سن لیتا ہے اور ظاہر ہے کہ قدرتِ عقلی اور تمیز و شعور انسان میں شنوائی اور بینائی کے بعد ہی زندہ ہوتے ہیں، خاص کر جو ”فؤاد“ بقولِ ارباب لغات ”پختہ اور عمیق عقل“ کے معنی میں ہیں، نہ کہ عقل کا ہر طرح کا سادہ مرحلہ، اور ظاہر ہے کہ پختہ عقل تو ان سب کے بعد ہی وجود میں آتی ہے۔

ضمنی طور پر بھی ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ مندرجہ بالا آیت اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہو سکتی ہے کہ ”کلیات عقلیہ“ تک رسائی جس کے ذریعہ ”جزئیات“ کے علم کے بعد ہی ہوتی ہے اور مندرجہ بالا آیت اس بات کی صراحت کر رہی ہے کہ اس قسم کی نعمتوں کے عطا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی شکرگزاری کی حس کو متحرک کیا جائے کیونکہ وہ اسے خالق کی محبت، اللہ کی معرفت اور اس کے احکام وادامر کی اطاعت کی طرف بلائی ہے۔

البتہ یہ چیز انسان کے بعض علوم کے فطری ہونے کے منافی نہیں ہے، کیونکہ فطری معلومات بوقتِ ولادت انسان کی سرشت میں استعداد اور لیاقت کی صورت میں تو ہوتی ہیں لیکن وہ بالفعل ظاہر نہیں ہوتیں، بلکہ آہستہ آہستہ بار آور ہوتی رہتی ہیں۔

دوسری آیت میں خدا کی نعمتوں میں سے ان تین نعمتوں کا ذکر ہے جن کا تعلق سمندر کی تسخیر کے ساتھ ہے اور اسے فضلِ خدا سے فائدہ اٹھانے اور شکر ادا کرنے کا سبب بتایا گیا ہے۔

پہلی نعمت گوشت کا مواد ہے جو سمندر سے حاصل کیا جاتا ہے اور اسے ”کَمْبًا طَرِيًّا“ (زیادہ گوشت) سے تعبیر کیا گیا ہے، ایسا گوشت جس کی پرورش کی انسان کو تکلیف نہیں اٹھانی پڑی صرف دست قدرت الہی نے ہی اسے دریاؤں کے دل میں پروان چڑھایا اور اب بلا کسی قیمت کے اس کے اختیار میں دے دیا۔ اور یہ چیز خدا کی بہت بڑی نعمت شمار ہوتی ہے، خصوصاً اس زمانے میں جب پرانے گوشت کی فراوانی تھی اور لوگ مجبور تھے کہ نمک لگا کر یا بھون کر یا دھوپ میں خشک کر کے اُسے محفوظ کر لیتے ہیں۔ لیکن اس قسم کا گوشت مسافروں کے لئے کئی قسم کی بیماریوں کا سبب بن جاتا، زہریلے مواد کی صورت اختیار کر لیتا، جب کہ دریائی سفر یا ساحلی سفر میں بڑے آرام کے ساتھ تازہ گوشت سے استفادہ کرتے تھے۔

پھر اس آرائش اور زیبائش مواد کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جو سمندروں کی اتھاہ گہرائیوں سے نکالا جا رہا ہے اور انسان اس سے استفادہ کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ”تم اس سے زینتی وسائل نکالتے ہو اور پہنتے ہو“ (وَتَسْتَخْرِجُونَ مِنْهَا حَلِيَّةً تَلْبَسُونَهَا) یعنی خداوند عالم نے غذا جیسے ضروری مواد سے لے کر ایسے وسائل تک تمہارے اختیار میں دے دیئے ہیں جن کا مصرف صرف آرائش و زیبائش ہے۔

اور آخری مرحلہ میں سمندر کی برکتوں میں سے ایک اور برکت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ ایسی برکت ہے جو آج تک انسانی زندگی میں نہایت مؤثر ہے اور وہ ہے ضروریات زندگی کے مال و متاع اور انسانوں کی نقل و حمل کیلئے سمندر کے وسیع و عریض راستوں سے استفادہ کرنا۔ اگر یہ بات پیش نظر رکھی جائے کہ دنیا کے تقریباً ۵۷ فیصد حصے کو سمندر نے ڈھانپ رکھا ہے اور دنیا کے ہر حصے تک اس کے ذریعہ رسائی ہو سکتی ہے، تجارتی مال کا اہم حصہ اور ضروریات زندگی کا اہم مواد اسی راستے سے جا بجا ہوتا ہے اور بیشتر مسافرت بھی اسی راستے سے انجام پاتی ہے، لہذا اس بات کی اہمیت اور واضح ہو جاتی ہے ارشاد ہوتا ہے ”تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ وہ پانی کے سینے کو چیرتی ہوئی آگے بڑھتی ہیں۔“ (وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاجِرَ فِيهِ)

آخر میں فرماتے: ان نعمتوں کی بخشش اس لئے ہے ”کہ تم خدا کے فضل سے بہرہ برداری کرو اور اس کا شکر بجالاؤ“ (وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ)

۲۔ اس طرح ان نعمتوں کی طرف توجہ کو بھی شکرگزاری کی روح کو زندہ کرنے اور اس کے ساتھ ہی معرفت الہی کے حصول کا ذریعہ قرار دیا ہے، اگرچہ خدا کو ہمارے شکر کی کیا ضرورت ہے؟

یہ سب کچھ اس کی ذات اور صفات کی معرفت اور کمالِ مطلق کی طرف حرکت کے بہانے ہیں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ”مواخر“، ”ماخرۃ“، کی جمع ہے جو ”مخر“ (بروزن فخر) کے مادہ سے ہے، صاحبان لغت اور اباب تفسیر کی مجموعی گفتگو سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کے اصل معنی ”چیرنا یا ”پھاڑنا“ ہیں۔ کشتی کے سینے سے پانی کی موجوں، کوچیرنا یا چرے، ناک اور جسم کے اگلے حصے کے ذریعہ ”ہوا کی موجوں“ کو چیرنا، یا زمین کے سینے کو زراعت کیلئے چیر پھاڑ کرنا، چونکہ یہ امور غالباً آواز کے ساتھ ملے ہوئے ہوتے



ہیں لہذا یہ لفظ تیز و تند آندھیوں کی آواز پر بھی بولا جاتا ہے۔<sup>[۱]</sup>

اصولی طور پر انسان کی ساری زندگی کائنات کی رکاوٹوں کے درمیان سے ہو کر گزرتی ہے لہذا اس کو چاہیے کہ وہ ان رکاوٹوں کے سینے کو چیرتے ہوئے آگے نکل جائے اور یہی اہم نکتہ ہے۔

ضمنی طور پر یہ بات بھی معلوم ہوگی کہ ”مواخر“ اس کشتی کو کہتے ہیں جو چل رہی ہو۔ اسی لئے ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے اس کی ”جاریہ“ کے معنی میں تفسیر کی ہے۔<sup>[۲]</sup> اور کشتی کی اہمیت بھی تو اسی وقت ہوتی ہے جب وہ چل رہی ہو۔

تیسری اور آخری آیت میں مشرکین مکہ، یا مومنین یا قوی احتمال کے مطابق ان سب کی طرف خطاب ہے۔ حکم ہو رہا ہے کہ ”جو کچھ خدا نے تمہیں روزی عطا فرمائی ہے اس سے حلال و پاکیزہ کو کھاؤ اور اس کی نعمتوں کا شکر بجالاؤ“ (فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا وَاشْكُرُوا لِعَظَمَةِ اللَّهِ) قابل توجہ بات یہ ہے کہ آخر میں فرماتا ہے ”اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو“ (اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُونَ)

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں پر قضیہ شرطیہ اس لئے لایا گیا ہے کہ وہ خدا پرست نہیں ہیں، اس کی نعمت کا شکر بالکل ہی بجا نہیں لاتے اور منطقی اصطلاح کے مطابق ”سالہ بہ انتقائے موضوع ہے“۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ اس قضیہ شرطیہ کی جزا وہی جملہ ”فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ-----“ ہے جو اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے۔ یعنی اس اسم کی روزی تمہارے لئے اس وقت حلال اور طیب ہے جب تم خدا کے بندے اور اس کے فرمانبردار ہو گے، کیونکہ اس کی اس دنیا کی تمام نعمتیں مومن انسانوں کیلئے پیدا کی گئی ہیں، جس طرح باغ کا مالی پھولوں کی خاطر پودوں کی آبیاری کرتا ہے نہ کہ کانٹوں کے لئے، ہر چند کہ کانٹے بھی اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

ایک تیسری تفسیر بھی ذکر کی گئی اور وہ یہ کہ خطاب بت پرستوں کو ہے کہ اگر تم کسی کی عبادت کرنا چاہتے ہو تو اس کی عبادت کرو جو تمہارا اولیٰ نعمت ہے۔ تم کیوں بتوں کی پرستش کرتے ہو جن کا کوئی بھی اثر نہیں۔<sup>[۳]</sup>

ان تفاسیر کو آپس میں جمع کرنا بھی ممکن ہے کیونکہ ظاہر میں مخاطب تمام مومنین اور کفار ہیں، اگرچہ اس آیت سے پہلے اور بعد کی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ روئے سخن زیادہ تر کفار کی طرف ہے۔

صورتِ حال خواہ کچھ بھی ہو اس سے ”نعمت“، ”شکر“، ”عبادت“ اور پھر ”معبود کی معرفت“ اور ”ولی نعمت“ کے درمیان باہمی تعلق بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ اس طرح معرفت کے دوسرے سبب کا پتہ چلتا ہے کہ جو شکر منعم کا مسئلہ ہے۔

[۱] کتاب ”لعین“، ”مفردات راغب“ تفسیر قرطبی، اور لغات کی دوسری کتابوں کی طرف رجوع فرمائیں۔

[۲] تفسیر فخر رازی جلد ۲۰ ص ۷۷ یہی معنی تفسیر روح المعانی اور تفسیر قرطبی میں بھی اس آیت کے ذیل میں بیان ہوئے ہیں۔

[۳] تفسیر کشاف جلد ۲ ص ۶۳۰۔ آخری تفسیر ایک احتمال کے طور پر تفسیر المیزان اور تفسیر روح المعانی میں انہی آیات کے ذیل میں بیان ہوئی ہے۔

## شکرِ منعمِ اسلامی روایات میں:

۱۔ ایک حدیث میں حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں:  
”لو لم یتوعد اللہ علی معصیۃ لکان یجب ألا یُعْطَى شکر النعمہ“ اگر خداوند عالم نے گناہوں پر عذاب سے نہ بھی ڈرایا ہوتا پھر بھی اس کی نعمتوں کا تقاضا یہی تھا کہ اس کا شکر ضرور بجالا جائے۔ [۱]

اس حدیث میں ”واجب“ کی تعبیر درحقیقت وہی فریضہ ہے جو انسانی عاطفہ کی وجہ سے وجود میں آتا ہے۔

۲۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

ایک رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عائشہ کے پاس تھے۔ انہوں نے سرکار رسالت مآب سے پوچھا: آپ (عبادت کیلئے) اپنے آپ کو اس قدر زحمت میں کیوں ڈالتے ہیں۔ جب کہ خدا نے آپ کے گزشتہ اور آئندہ گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ [۲] آپ نے ارشاد فرمایا: **أَلَا أَرَى كَوْنُ عَبْدٍ أَشْكُرًا كَمَا فِي خَلْقِ خَلْقِهِ**۔ [۳]

۳۔ امام چہارم حضرت علی ابن الحسین زین العابدین علیہ السلام صحیفہ سجادیه کی ایک دعا میں فرماتے ہیں:

”حمد و ستائش اس خدا کیلئے ہے کہ اگر اس نے اپنے بندوں پر پے در پے اور فراواں نعمتوں کے بدلے میں اپنی حمد و کا طریقہ نہ بتایا ہوتا کہ اس کی نعمتوں سے تو بہرہ مند ہوں لیکن اس کی حمد کو بجانہ لائیں، اس کے رزق سے بہرہ ور ہوں، لیکن اس کا شکر بجانہ لائیں، تو اس وقت انسان اپنی انسانی حدود سے نکل کر پستی میں حیوانوں کی سرحد تک جا پہنچتے اور خدا کے اس فرمان کا مصداق بن جاتے کہ (أُولَئِكَ كَانُوا لِنِعْمِ اللَّهِ غَافِلِينَ) وہ چوپایوں کی مانند بلکہ اس سے بھی زیادہ گمراہ ہوتے۔ [۴]

۴۔ نوح البلاغہ میں حضرت امیر علیہ السلام کا ایک اور فرمان ذیشان ہے:

”ولو فكر و افی عظیم القدرۃ و جسيم العنمة لرجعوا الى اطريق و خافوا عذاب الحريق ولكن القلوب عليلة و البصائر مدخوالة“ یعنی اگر وہ لوگ خدا کی قدرت کی عظمت اور اس کی نعمتوں کی بزرگی میں غور فکر کرتے تو راہ (راست) کی طرف لوٹ آتے، اور جلانے والی آگ سے خوف کھاتے، لیکن (کیا کیا جائے) دل بیمار ہیں اور آنکھیں معیوب ہیں۔ [۵]

[۱] نوح البلاغہ، کلمات تفسیر، جلد ۲۹۰

[۲] سورہ فتح کی پہلی آیت کی طرف اشارہ ہے جس کی تفصیلی تفسیر نمونہ کی بائیسویں جلد میں بیان ہو چکی ہے۔

[۳] اصول کافی جلد ۲ باب الشکر حدیث ۶۔

[۴] صحیفہ سجادیه (کاملہ) دعائے اول۔

[۵] نوح البلاغہ خطبہ ۱۸۵۔

ان روایات سے ”شکرِ نعمت“ اور ”معرفتِ الہی اور اس کے فرمان کی اطاعت کا باہمی رابطہ عیاں ہو جاتا ہے۔

## ۳۔ فطری سبب

### اشارہ:

جب ہم فطرت کی بات کرتے ہیں اس سے مراد وہی اندرونی احساسات و جذبات اور ادراکات ہیں جن کیلئے کسی قسم کے عقلی استدلال کی ضرورت نہیں ہوتی۔

جب ہم کسی نہایت ہی خوبصورت اور دل فریب قدرتی منظر کو دیکھتے ہیں یا کسی بہت ہی خوبصورت اور خوشبودار پھول کو دیکھتے ہیں تو ایک نہایت ہی پر زور اور طاقت ور کشش کا اپنے اندر احساس کرتے ہیں۔ ایسی کیفیت کا نام حُسن کی طرف رجحان، میلان یا عشق ہے۔ ایسے مواقع پر کسی قسم کے استدلال کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

جی ہاں! حس زیبائی انسانی روح کے اعلیٰ رجحانات میں سے ہیں۔

مذہب خاص کر خدا کی معرفت کی طرف کشش بھی ان ذاتی اور اندرونی احساسات میں سے ایک ہے، بلکہ تمام انسانوں کی سرشت اور رجحان میں طاقت ور ترین اسباب میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں، خواہ وہ گزشتہ دور کی ہو یا موجودہ دور کی ہمیں کوئی ایسا زمانہ نظر نہیں آتا جس میں لوگوں کی روح اور فکر پر عقائدِ مذہبی کی کوئی نہ کوئی حکم فرمانہ ہو۔ اور یہی چیز اس عمیق احساس کے اصل ہونے کی دلیل ہے۔ چونکہ خدا شناسی کے دلائل کے حصے میں توحیدِ فطری ایک مستقل دلیل کے عنوان سے اپنی تمام آیات کے ساتھ زیر بحث آئے گی، لہذا اس پر زیادہ گفتگو کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اور صرف ایک نکتہ پر اکتفا کرتے ہوئے اس کی مزید تشریح کو اسی بحث پر ملتوی کرتے ہیں۔

قرآن مجید نے انبیائے عظام کے قیام کی داستان کو بیان کرتے ہوئے بہت سے مقامات پر اس بات پر زور دیا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کا اصل فریضہ شرک اور بت پرستی کے آثار کی بیخ کنی تھا (نہ کہ اثباتِ وجودِ خدا، کیونکہ یہ چیز تو ہر شخص کے سرشت میں چھپی ہوئی ہوتی ہے) بالفاظِ دیگر ان کا کام یہ نہ تھا کہ ”خدا پرستی کا پودا“ انسانی دلوں میں کاشت کریں بلکہ ان کا مقصد اس موجود پودے کی آبیاری کر کے اس کے اطراف میں موجود شرک و بت پرستی کی خاردار جھاڑیوں کے بیجا اور فضول گھاس کا مکمل طور پر خشک کر کے اس کی بیخ کنی کریں۔

”الَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اللّٰهَ“ یا ”اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ“ (خدا کے علاوہ کسی کی عبادت مت کرو) کا جملہ جو کہ بتوں کی نفی کی صورت ہے، نہ کہ خدا کے

وجود کے اثبات کی، قرآن مجید کے بہت سے مقامات پر انبیاء کی زبانی بیان ہوا ہے۔ خصوصاً حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ حضرت نوحؑ حضرت یوسفؑ اور حضرت ہودؑ علیہم السلام کی دعوت میں ذکر ہوا ہے۔

علاوہ ازیں ہم خود اپنی جانوں میں اور بھی حقیقی فطری احساسات رکھتے ہیں جن میں ایک علم و دانش اور شناخت و معرفت کے ساتھ ہمارا حد سے زیادہ لگاؤ ہے، جو ہمارے اندر پایا جاتا ہے۔

آیا یہ بات ممکن ہے کہ ہم اس عظیم کائنات میں اس عجیب نظام کا تو مشاہدہ کریں، لیکن اس بات سے قطعاً بے تعلق ہو جائیں کہ اس نظام کے منبع اور سرچشمہ کونہ پہنچائیں۔

کیا یہ بات ممکن ہے کہ کوئی دانشور چیونٹیوں کی زندگی کے بارے میں بیس سال تک تحقیقات میں لگا رہے، یا کوئی دوسرا محقق بیسیواں سال بعض پرندوں یا درختوں یا مچھلیوں کے بارے میں کاوش اور عرق ریزی سے کام لے، لیکن اس بے پایا سمندر کے اصل منبع و مرکز اور سرچشمے کونہ پہنچائیں جو ازل سے لے کر ابد تک جاری و ساری ہے؟

یہ وجوہات ہیں جو ہم ”معرفت اللہ“ کی طرف دعوت دیتی ہیں، ہماری عقول کو اس راستے پر چلاتی ہیں، ہماری عاطفوں کو اس طرف کھینچتی ہیں اور ہماری فطرت کے رُخ کو اسی جانب موڑتی ہیں۔ یہ تھا خلاصہ مذہب اور معرفت خداوندی کی حقیقی اور سچی پیدائش کے اسباب کا۔

## چند توضیحات

### ۱۔ انحرافی توجیہات

کچھ مادہ پرست مشرقی اور مغربی جامعہ شناس اور ماہرین نفسیات کا عجیب اصرار ہے کہ خدا شناسی اور مذہب کی پیدائش کا سبب ”جہالت“، ”خوف“ یا کئی اور عوامل ہیں۔

البتہ یہ بات ایک لحاظ سے عجیب نہیں، کیونکہ گویا وہ پہلے سے یہ طے کر چکے ہیں اور اس بات کا فیصلہ کر چکے ہیں کہ کائنات میں مادہ کے علاوہ کوئی اور چیز موجود نہیں ہے۔ اس لئے وہ اپنے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ ہر ایک چیز کی تخلیق کو مادہ کا مرہون منت سمجھیں اور انہی خطوط پر وہ اس کی تفسیر کریں۔

۱] سورہ ہود/ ۲

۲] سورہ ہود/ ۲۶

۳] سورہ یوسف/ ۴۰

۴] سورہ احقاف/ ۲۱۔

ادھر ہم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ مذہبی عقائد کے وجود ہی نے ہمیشہ سے مادیت کے ایوانوں کو لرزہ برانداز کیا ہوا ہے۔ اور اگر ہم قرون وسطیٰ میں کلیسا اور سائنسدانوں کے درمیان ہونے والی بدترین لڑائی کو بھی اس کے ساتھ ملا دیں تو یہ نتیجہ نکالنے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ خدا اور مذہب کے لئے اس قسم کی مادی تفسیریں مادیت کی مذہب کے ساتھ لڑائیوں کا ایک حصہ ہیں۔

اگرچہ اس قسم کے تمام نظریات کے بارے میں تفصیلی بحث کیلئے لمبی گفتگو کی ضرورت ہے کہ اگر ہم اس میں داخل ہو جائیں تو ہمیں تفسیری بحث کی کیفیت سے خارج کر دے گی، لہذا ہم آج پر تفصیلی گفتگو سے پرہیز کرتے ہوئے فہرست وار صرف اس کی طرف ایک اشارہ ضروری سمجھے ہیں۔ ہم ایک بار پھر تکرار کرتے ہیں کہ اس قسم کی تفسیریں پہلے سے طے شدہ امر کے تحت کی گئی ہیں اور وہ یہ کہ ماوراء الطبیعہ جہان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ جو کچھ ہے وہ بھی مادی دنیا ہے۔ یہ تمام نظریات، یا واضح تر الفاظ میں یہ تمام مفروضات، پانچ اہم مفروضوں میں خلاصہ کئے جاسکتے ہیں۔

## ۱۔ ”جہالت“ کا مفروضہ

ایک مشہور و معروف ماہر اجتماع کا کہنا ہے کہ ”اگرچہ علم و ہنر نے بہت سے اسرار آمیز عوامل کی حقیقت کو واضح کر دیا ہے لیکن پھر بھی بہت سے عوامل ایسے ہیں جو ابھی تک سر بستہ رازوں کی حیثیت سے حیطہ علم سے دور بھاگ رہے ہیں اور ان عوامل کے حقائق کو جاننے اور ان کے بارے میں تحقیقات ہی مذہب کی پیدائش کا سبب بنی ہے۔“<sup>[۱]</sup>

ایک مادی فلسفی اس بات پر اضافہ کرتا ہے کہ جب انسان حوادث کو تاریخی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے تو وہ علم اور مذہب کو دو صلح ناپذیر دشمن ہونے پر ایک واضح دلیل تصور کرتا ہے۔ کیونکہ جو شخص علت کے قانون کے تحت اس کائنات میں تبدیلی کا عقیدہ رکھتا ہے وہ ایک آن تک کے لئے بھی اپنے دماغ میں یہ تصور نہیں کر سکتا کہ حوادث کے اس مرحلے میں کوئی چیز اس کی سدرہ بن سکتی۔<sup>[۲]</sup>

سادہ سے لفظوں میں وہ اس بات کا دعویٰ کرنا چاہتے ہیں کہ طبعی اسباب و علل سے انسان کی ناکاگی اس بات کا موجب بن گئی ہے کہ وہ یہ تصور کرے کہ طبیعت اور نیچر سے ماوراء کوئی طاقت ہے جس نے اس کائنات کو ایجاد کیا ہے اور اب اسے چلا رہی ہے۔ اسی لئے طبعی اسباب و علل جس قدر واضح ہوتے جائیں گے خدا پرستی اور مذہب کا عقیدہ اسی قدر مست ہوتا جائے گا!!!

”جہالت کے مفروضہ“ کے حامیوں کی یہ غلط فہمی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ:

۱۔ انہوں نے یہ تصور کر لیا ہے کہ خدا کے وجود ایمان کا مقصد یہ ہے کہ ”قانون علیت“ کا انکار کیا جائے اور ہم اس مرحلے پر ایک

[۱] ”جامعہ شناسی“ ازم سوئیل کنوٹیک ص ۲۰۷

[۲] کتاب ”دنیائی کہ من حی بیدنہ“ ص ۱۵۸ اور ”گٹ کنیٹ“ کا یہ قول کس قدر خندہ آور ہے کہ سائنسی علم نے کائنات کے باپ کو اپنے کام سے ہٹا کر اسے گوشہ نشین کر دیا ہے۔ (یعنی علل طبعی کی دریافت کے بعد خدا پر ایمان کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ ملاحظہ ہو کتاب ”علل گرائش بہ مادگیری“ ص ۷۶

دورا ہے پر کھڑے ہوں۔ (الف) یا تو طبیعی اسباب اور علل کو قبول کریں۔ (ب) یا پھر خدا کے وجود کو!  
حالانکہ خدا پرست فلاسفہ کے نقطہ نظر سے ”قانون علیت“ پر ایمان اور طبیعی علتوں کی دریافت درحقیقت معرفتِ خداوندی کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔

ہم خداوندِ عالم کو بد نظمیوں اور مبہم و تاریک حوادث میں ہرگز تلاش نہیں کرتے، بلکہ روشنائیوں اور کائنات کے جانے پہچانے نظاموں میں ڈھونڈتے ہیں کیونکہ ایسے نظاموں کا وجود کائنات میں علم و قدرت کے ایک مبداء پر واضح ترین دلیل ہے۔

۲۔ وہ اس نکتہ سے کیوں غافل ہیں کہ انسان قدیم ترین زمانے سے لے کر اب تک اس کائنات پر ہمیشہ سے ایک خاص نظم کو حکم فرما دیکھتا آ رہا ہے، ایسا نظم جس کی توجیہ عقل و شعور سے خالی علتوں کے ساتھ امکان پذیر نہیں ہے، اور وہ ہمیشہ سے اسی چیز کو وجود خدا کی نشانی سمجھتا آ رہا ہے۔ البتہ گزشتہ دور میں یہ نظام بہت کم متعارف تھا لیکن انسانی علم و دانش جس قدر ترقی کرتے جائیں گے اس نظم کے مزید دقیق اور ظریف گوشے سامنے آتے جائیں گے اور کائنات کے مبداء کا علم و قدرت اسی قدر آشکارا اور واضح ہوتے جائیں گے۔

اسی وجہ سے ہمارا عقیدہ ہے کہ ”خدا کے وجود“ اور ”مذہب“ پر ایمان ”سائنسی علوم“ کی ترقی کے ساتھ ساتھ پیش گام ہے اور اس کائنات کے بارے میں نئے انکشافات اور تازہ دریافت خدا کی بہتر معرفت کے بارے میں ایک نیا قدم ہوگا۔ چنانچہ جس طرح ہم آج خدا کو پہچان سکتے ہیں اس طرح ہم سے پہلے لوگ نہیں پہچان سکتے تھے کیونکہ اس وقت علم نے اس قدر ترقی نہیں کی تھی۔

## ۲۔ ڈر کا مفروضہ

مشہور مغربی مؤرخ ”ویل ڈورانٹ“ اپنی تاریخ میں روم کے حکیم ”لوکرتیوس“ سے ”دین کے سرچشمے“ کے عنوان کے تحت ایک بحث میں یوں رقمطراز ہیں:

”ہمارا سب سے پہلا ڈر اور خوف خداؤں کے بارے میں ہے اور موت سے خوف کی قسموں میں سے اُسے سب سے اہم مقام حاصل ہے۔۔۔۔۔ اسی لئے ابتدائی زمانہ کے لوگ اس بات کو باور نہیں کرتے تھے کہ موت ایک طبیعی چیز ہے۔ اسی لئے وہ ہمیشہ اس کیلئے ایک مافوق طبیعتِ علت کے قائل تھے۔“<sup>[۱]</sup>

اسی چیز کو مشہور فلسفی ”رسل“ نے ایک اور انداز میں بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں:

”میرا گمان یہ ہے کہ مذہب کی پیدائش کا اصل سبب خوف اور ڈر ہی ہو سکتا ہے۔ طبیعی بلاؤں کا ڈر، جنگ اور اس جیسی دوسری چیزوں کا ڈر، اور ان غلط چیزوں کا ڈر جنہیں انسان غلبہ شہوت کے وقت انجام دیتا ہے۔“<sup>[۲]</sup>

[۱] ”تاریخ تمدن“ ویل ڈورانٹ جلد ۱ ص ۸۹۔

[۲] ”جہانی کہ من فی شناسم“ ص ۵۴۔

اس مفروضہ کا باطل ہونا یہاں سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس کے تمام حامیوں نے گویا اس بات پر معاہدہ کر لیا ہے کہ مذہب اور خدا پرستی کے عقیدہ کے لئے مافوق طبیعت کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ اس کا عامل بھی خود طبیعت ہی میں تلاش کیا جائے، ایسا عامل جس کی بازگشت ایک قسم کے گمان اور خیال کی طرف ہو۔ اسی لئے انہوں نے ہمیشہ اس سلسلے میں فرعی مسائل ہی کو پیش نظر رکھا ہے اور اصلی مسئلہ کو فراموش کر دیا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ خدا پر ایمان انسان کو ایک قسم کی روحانی طاقت اور سکون عطا کرتا ہے، اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ اسے موت اور دیگر سخت حوادث کے مقابلے میں شجاع بنا دیتا ہے اور یہاں تک اس میں روح پھونک دیتا ہے کہ وہ ہر قسم کی جاننازی اور یشار کو اپنالیتا ہے، لیکن ہم اس بات کو آخر کیوں فراموش کر دیں، جو ہمیشہ کیلئے انسان کی آنکھوں کے سامنے ہے، یعنی یہ نظام جو زمین و آسمان، حیوانات و نباتات اور خود انسان کے اپنے وجود میں حکم فرما ہے۔

بالفاظ دیگر انسان جس قدر بھی علم تشریح (آپریشن) اور فزیالوجی وغیرہ سے بے خبر ہو، جب وہ اپنے ہی بدن میں موجود آنکھ، کان، قلب اور ہاتھ، پاؤں کی عجیب بناوٹ کو دیکھتا ہے تو اس کے ساتھ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ یہ ”اتفاق“ اور ”بے شعور“ عوامل کی تخلیق نہیں ہیں اور نہ ہی انہیں ایسی چیزوں کی تخلیق سے تفسیر کیا جاسکتا ہے۔

اس طرح ایک پھول، ایک زنبور عسل، سورج و چاند کی تخلیق، ان کی ایک نظم و نسق کے ساتھ گردش اور دوسری مخلوقات کا بھی یہی حال ہے۔

یہ ایک ایسی چیز ہے جو ہمیشہ انسان کے پیش نظر رہی ہے اور اب تک چلی آرہی ہے جب یہ خدا کی ذات پر ایمان کا اصل عامل ہے تو پھر یہ لوگ اس روشن حقیقت کو نظر انداز کر کے ”خوف“ اور ”جہالت“ ہی کو اس کا سبب کیوں سمجھتے ہیں؟ ہم یہ بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ خود لوگ اس قسم کی روشن حقیقت کے بارے میں ”جاہل“ ہیں اور مذہبی عقائد کی ترقی اور پیش رفت سے ”خائف“ ہیں۔ اصل راستے سے ہٹ کر اور واضح راہ کو چھوڑ کر کیوں بھٹک جاتے ہیں؟ سوائے اس کے کہ انہوں نے پہلے سے جو فیصلہ کر لیا ہے وہ انہیں حق بات تسلیم کرنے سے روک رہا ہے۔

### ۳۔ ”اقتصادی عوامل“ کا مفروضہ

اس مفروضہ کے حامی وہ لوگ ہیں جو تاریخ کی متحرک رکھنے والی طاقت کو بھی پیداواری مشینری کی مانند سمجھتے ہیں اور ان کا نظریہ ہے کہ تمام اجتماعی چیزیں، خواہ وہ ثقافتی ہوں یا علمی، سیاسی ہوں یا فلسفی، حتیٰ کہ مذہبی، غرض سب چیزوں کو اقتصادی عوامل کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ انہوں نے مذہب کی پیدائش اور اقتصادی مسائل کو آپس میں ربط دینے کیلئے عجیب و غریب توجیہات گھڑی لی ہیں۔ ان کا کہنا ہے: ”انسانی معاشرے میں سامراجی طبقے نے استعمار کا شکار ہونے والے غریب لوگوں کی قوت مزاحمت کو ختم کرنے اور ان کی اذہان کو الودہ کرنے کیلئے ”مذہب“ کو ایجاد کیا ہے۔ ”لینن“ کا مشہور جملہ جو اس نے ”سوشلزم اور مذہب“ نامی کتاب میں لکھا ہے اس کی عکاسی

کرتا ہے کہ ”معاشرے میں مذہب تریاک اور افیون کی حیثیت رکھتا ہے۔“

اس سلسلہ میں ان کی طرف سے بہت سی باتیں کہی گئی ہیں جن کا تکرار بے سود ہوگا۔ لیکن خوش قسمتی کی بات ہے کہ اس مفروضہ (سوشلزم) کے حامی خود ہی اپنے متضاد بیان اور متضاد کلام سے اس کا جواب دیتے ہیں۔ وہ جب اسلام کا سامنا کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس نے کیونکر ایک پسماندہ قوم میں تحریک اور جنبش پیدا کی ہے اور ساسانی شہنشاہوں، رومی بادشاہوں، مصری فرعونوں اور یمنی تبعالہ کو آسمان قدرت سے قصر مذلت کی طرف کس طرح پھینکا، تو وہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ اسلام کو تاریخ کے اس حصے سے مستثنیٰ قرار دے دیں۔

اس سے بھی بالاتر عصر حاضر میں سامراج کے خلاف خاص کر شرق غرب کے شیطانی تسلط کے خلاف عمیق اسلامی تحریکوں کو دیکھتے ہیں، خصوصاً صہیونزم کے خلاف فلسطینی عوام کے جدوجہد پر نگاہ ڈالتے ہیں، تو ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا کہ وہ اپنے ہی تجزیوں پر شک کریں۔ ہم یہاں ان لوگوں کی بات نہیں کر رہے جو حصار اندر حصار میں جکڑے ہوئے ہیں اور آفتاب نصف النہار تک کو دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔

بہر حال موجودہ گزشتہ تاریخ، خاص کر اسلامی تاریخ کی طرف توجہ کرتے ہوئے، یہ بات بخوبی روشن ہو جاتی ہے کہ ان کے زعم کے برعکس مذہب صرف نشہ آور چیز اور افیون ہی نہیں ہے بلکہ نہایت ہی طاقت ور اور پُرکشش اجتماعی تحریکوں کا سبب بھی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اقتصادی مسائل بھی انسانی کے ایک حصے کو تشکیل دیتے ہیں، لیکن انسان کو اقتصادیات میں منحصر کر دینے میں انسان کی معرفت میں بہت بڑی غلطی ہوگی اور اس کے اعلیٰ رجحانات اور ارفع مقاصد کو سمجھنے میں زبردست کوتاہی ہوگی۔

## ۴۔ ”جنسی“ مفروضہ

اب آئیے اور ”مسٹر فرانسس“ کی چند باتیں سنیے جو ”مذہب کی پیدائش اور ”جنسی غریزہ“ کے درمیان ایک پل قائم کرنا چاہتے ہیں اور مذہب کو جنسی غریزہ کا مرہون سمجھتے ہیں۔

ان کی یہ کوشش ہے کہ وہ اس بات کو ایک موہوم قبیلہ کے بارے میں اپنے مفروضہ میں پیوند لگائیں۔ (اس موہوم اور خیالی قبیلہ میں ایک باپ ہوتا ہے جس کی بہت سی بیویاں ہوتی ہیں اور کئی جوان اولادیں، جو سب کے سب محرومیت کی زندگی بسر کرتے ہیں، انجام کار انہوں نے باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے اسے قتل کر ڈالا اور اس کا گوشت کھا گئے۔ پھر وہ اپنے اس فعل پر نادم ہوئے اور قبیلہ کی عورتوں سے لالعلقی اختیار کر کے اپنے فعل سے توبہ کی اور اسے ناپسندیدہ گردانا) یہیں سے ان کے درمیان ایک قسم کی ممانعت پیدا ہوگئی (یا فرائیڈ کے بقول ”تابو“) جسے محارم کے ساتھ ازدواج کیا جاتا ہے۔ وہ (فرائیڈ) کہتے ہیں کہ آج کے وحشی قبائل میں بھی ”توتم“ نامی چیز پائی جاتی ہے (جیسے باپ یا راکین میں سے کوئی بزرگ) جو ان کا محافظ اور ولی نعمت ہے۔

وہ اس ”توتم“ کا بڑا احترام کرتے ہیں اور ان کا تصور ہوتا ہے کہ وہ خود کو اس جیسا بنائیں (ان کا ”توتم“ پر اعتقاد بھی ویسے ہی جیسے موہوم اور خیالی قبیلہ کے بارے میں اعتقاد کی بنیاد بتائی گئی ہے) فرائیڈ کے بقول ”تابو“ اور ”توتم“ پر اعتقاد ہی مذہبی عقائد کی پیدائش کی



بنیاد ہے۔ مندرجہ بالا تصریحات کے مطابق اس کا تعلق بھی جنسی مسئلہ سے ہے۔ [۱]

اس بات سے قطع نظر کی فرائیڈ کے جنسی مفروضہ کی بنیاد ایک افسانے پر رکھی گئی ہے (موہوم اور خیالی قبیلہ کے افسانے پر)، اس کے اپنے تجربے بھی کہانیوں اور افسانوں کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ فرائیڈ نے انسان کے روح اور جسم کو جو کہ گونا گوں حیثیتوں کا حامل ہے، صرف ایک زاویے اور ایک حیثیت سے دیکھا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان کے اندر جنسی غریزہ موجود ہے، لیکن یہ بات بھی تو مسلم ہے کہ انسان کا تمام وجود غریزہ جنسی کا نام تو نہیں، اس کا جسم اور بھی مختلف غرائز کا حامل ہے اور اس کی روح میں اعلیٰ میلان بھی پایا جاتا ہے۔ ”صرف ایک پہلو سے دیکھنا“ ایک ایسی مصیبت ہے جس میں نہ صرف فرائیڈ گرفتار تھے بلکہ تمام سوشلسٹ بھی اس مصیبت کا شکار ہیں جو انسان کو صرف اقتصادی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں یہ دونوں قسم کے اصحاب انسانی معرفت کے بارے میں سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

کیا یہی بہتر تھا کہ مسٹر فرائیڈ موہومات کا سہارا لینے کی بجائے ان حقائق پر نظر ڈالتے جنہیں انسان روز اول سے اب تک دیکھتا آ رہا ہے، یعنی وہ نظام جو اس وسیع و عریض کائنات پر بھی اور خود انسان کے اپنے جسم پر بھی حکم فرما ہے اور بے عقل و شعور طبیعی علتوں کے ساتھ اس کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا ہے یہ چیز ہی خدا پر اعتقاد کی پیدائش کا سبب ہے، اس قدر واضح بات کو چھوڑ کر کیوں دوسرے گمراہ کن راستوں کو اختیار کیا جائے؟

## ۵۔ ”اخلاقی ضروریات“ کا مفروضہ

مسٹر ”آئن سٹائن“، ”مذہب اور سائنس“ کے تحت ایک بحث میں کہتے ہیں:

”تھوڑا سا غور کرنے کے ساتھ یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ وہ جذبات و احساسات اور ہیجانوں جو مذہب کی پیدائش کا سبب بنے ہیں، بہت زیادہ اور بہت مختلف ہیں۔۔۔۔۔۔“

پھر وہ ”خوف“ کے مفروضے کو ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں:

۔۔۔۔۔۔ انسان کے اجتماعی ہونے کی خصوصیت بھی مذہب کی پیدائش کے عوامل میں سے ایک ہے۔ ایک انسان دیکھتا ہے کہ ماں، باپ یا عزیز واقارب اور رہبر اور بزرگ ایک ایک کر کے مر رہے ہوتے ہیں اور باری باری اس کے اطراف سے ان کی جگہ خالی ہوتی جاتی ہے۔ اسی لئے وہ ہدایت پانے، دوست بنانے، محبوب ہونے اور کسی پر بھروسہ کرنے اور امید رکھنے کی آرزو کرتے ہیں۔ یہی چیز اس کے اندر خدا کے بارے میں عقیدہ کی راہیں ایجاد کرتی ہے۔ [۲] تو گویا اس طرح سے آئن سٹائن یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ اخلاقی اور اجتماعی اسباب ہی

[۱] ”فرائیڈ اور فرائیڈزم“ نام کتاب سے اقتباس

[۲] ”دنیا کے من می پیٹم“ ص ۵۳

ہیں جو انسان کے اندر مذہب کی پیدائش کا سبب بنتے ہیں۔

لیکن ہم یہاں پر بھی وہی چیز دیکھتے ہیں کہ انہوں نے غلطی سے ”اثر“ اور ”سبب“ کو ایک چیز تصور کر لیا ہے، جب کہ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر اثر سبب بھی ہو۔ ممکن ہے کہ ہم ایک گہرا کنواں کھودتے وقت خزانہ بھی پالیں، تو یہ ایک ”اثر“ ہوگا اس کھدائی کا۔ جب کہ مسلم ہے کہ کنواں کھودنے کا اصلی محرک اور سبب کوئی اور چیز تھی اور وہ تھا حصول آب نہ کہ خزانے کی دریافت۔

بنا بریں یہ ٹھیک ہے کہ مذہب انسان کو روحانی دردوں اور بے چینیوں سے تسکین دلاتا ہے۔ عزیزوں، دوستوں اور بزرگوں کی جدائی کے وقت خدا پر ایمان ہی ہے جو اسے تنہائی سے نجات دلاتا ہے اور ان کی جدائی سے جو خلا پیدا ہو جاتا ہے وہ اس کی تلافی کرتا ہے۔ لیکن یہ ایک اثر ہے نہ کہ سبب۔

مذہب کا اصلی سبب جو بہت ہی مستدل اور منطقی معلوم ہوتا ہے پہلے درجے پر تو وہی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے۔ انسان خود کو اس کائنات میں ایک ایسے نظام کے سامنے پاتا ہے کہ اس کے بارے میں جس قدر بھی غور و فکر کرے اسی قدر اس نظام کی عظمت، گہرائی اور گیرائی میں چلا جاتا ہے اور اس کی عظمتوں سے زیادہ سے زیادہ آشنا ہوتا جاتا ہے۔

وہ ”ایک پھول“ کو جو اس قدر لطیف و ظریف اور ایک عجیب و ذریعہ ساخت کا حامل ہے، یا ”ایک آنکھ“ کو جو نہایت ظریف اور پیچیدہ سسٹم کی حامل ہے، اندھی اور بہری بے جان و بے شعور فطرت کی اچانک پیداوار نہیں سمجھتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس نظام کے مبداء کی تلاش کرتا ہے۔ البتہ اس سلسلے میں کئی اور معاون امور بھی ہیں جن کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے۔

تعب کی بات تو یہ ہے کہ وہی ”آئن سٹائن“ جس نے اس مفروضے کی پیش کش کی ہے ایک اور جگہ اپنی گفتگو کے انداز کو تبدیل کرتے ہوئے اپنے عقیدے کو کائنات کے پیدا کرنے والے اور اپنے ایمان راسخ کو اس عظیم مبداء کے ساتھ اس طرح ظاہر کرتا ہے کہ نہایت ہی جاذب توجہ ہے۔ وہ ایسے عقائد کا انکار کرتا ہے جن کے ساتھ خرافات ملے ہوئے ہوتے ہیں، نہ کہ ایسے عقائد کا جو خالص توحید پر مشتمل اور ہر قسم کے خرافات سے خالی ہوں۔ وہ کہتا ہے:

”خدا کے وجود کے حقیقی معنی ان اوہام کی رائے سے معرض وجود میں آتے ہیں جنہیں بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے۔“

پھر وہ اپنے اور دوسرے عظیم دانشوروں کے عقیدہ کو بیان کرتا ہے جسے وہ ایک قسم کا مذہبی عقیدہ بنا کر ”آفرینش کا مذہبی اعتقاد“ یا ”وجود“ کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ایک اور مقام پر اسے ”کائنات“ کا عجیب و دقیق اور حیران کن نظام کا نام دیتا ہے۔

ان سب سے بڑھ کر جو بات لائق توجہ ہے یہ ہے کہ وہ کہتا ہے:

”یہی مذہبی ایمان ہی تو ہے جو دانشوروں کی تحقیقی زندگی کیلئے چراغِ راہ ہے“ البتہ اس مقام پر کہنے کی بہت سی باتیں ہیں اور اگر ہم

عنوانِ قلم کو چھوڑ دیں تو ہم تفسیر موضوعی کی بحث سے خارج ہو جائیں گے۔

لہذا ایک بار پھر ہم اپنی اصل بات کی طرف واپس آتے ہیں اسی پر اس بحث کو ختم کرتے ہیں اور یہ چیز ہر ایک کی خاطر میں لاتے ہیں کہ: ”مذہب کی پیدائش کے اسباب کو سب سے پہلے تو جہان آفرینش کے مطالعہ (عقلی اور منطقی اسباب) میں تلاش کرنا چاہیے

پھر طاقت و اندرونی کشش (فطری سبب) میں اور اس کے بعد اس مبداء بزرگ کی طرف توجہ میں جو بے پایاں نعمتوں کا والی ہے (عاطفی سبب) تلاش کرنا چاہیے۔<sup>[۱]</sup>

[۱] اس بارے میں مزید معلومات کیلئے ہماری کتاب ”انگیزہ پیدائش مذہب“ کی طرف رجوع فرمائیں۔

خدا شناسی کے دلائل

بُرہانِ نظم

## اشارہ

خدا شناسی کے سلسلہ میں قرآن مجید کی بہت سی آیات اور سورتوں میں جس مسئلہ پر زیادہ روز دیا گیا ہے وہ ”برہانِ نظم“ ہے، اور وہ بھی اس حد تک کہ قرآن پاک میں دیگر براہین و دلائل اس برہان کے سامنے کمتر حیثیت کی ہیں۔

اس سے یہ پتہ بھی چلتا ہے کہ اس عظیم آسمانی کتاب یعنی قرآن مجید کے نقطہ نظر سے خدا کی شناخت و معرفت اور ہر قسم کے شرک کی نفی کیلئے بہترین اور سب سے روشن راہ نظام آفرینش اسرارِ کائنات اور ”آفاق“ و ”انفس“ پر مشتمل آیات کا مطالعہ ہے۔

## برہانِ نظم کی خصوصیات

اس برہان کی کچھ ایسی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے قرآن مجید میں اس حد تک اس کے بارے میں تاکید کی گئی ہے اور اس پر اتنا زور دیا گیا ہے۔

۱۔ برہانِ نظم جہاں ایک طرف دانشوروں کو قانع کرتی ہے وہاں دوسری طرف عوام الناس بھی اپنی حیثیت کے تحت اس سے استفادہ کر سکتے ہیں، کیونکہ آفرینش کے اسرار کا ادراک کرنے کیلئے لوگوں کی مختلف قسمیں ہیں۔

۲۔ برہانِ نظم میں خشک فلسفی دلائل نہیں ہیں، بلکہ اس کے برعکس اس میں ایک خاص لفظ ہوتا ہے اور اس مبداء بزرگ کی معرفت جس قدر زیادہ ہوتی جائے گی انسان کا عقل و شعور اور نشاط و مسرت بھی اتنا زیادہ ہوتے جائیں گے اور اس عظیم مبداء کے متعلق مزید جذبہ اور شوق پیدا ہوتا جائے گا۔ وہ ایسے نضوع و خشوع پر آمادہ ہو جائے گا جس کے اندر عشق و محبت ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر وہ انسان کی عقل کو بھی سیراب کرتی ہے اور اس کے عواطف و اخلاق کو بھی۔ المختصر اس کائنات کے دوسرے تمام نظاموں کے بارے میں تحقیقات کے ضمن میں خداوند عالم کی مختلف نعمتوں کے بارے میں غور و فکر کرنے کیلئے جب برہانِ نظم کا سہارا لیتے ہیں تو وہ شکرِ منعم کی حدود تک لے جاتی ہے جو بذاتِ خود، خدا شناسی کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے۔

۳۔ برہانِ نظم ایک ایسی برہان ہے جو نشوونما ہی پاتی رہی ہے۔ یا بالفاظ دیگر ختم ہونے میں نہیں آتی، کیونکہ اس کی کبریٰ ہر چند کہ اپنی جگہ پر ثبات و برقرار اور دائم و پائیدار ہے۔ لیکن اس کی صغریٰ ہمیشہ نئی کونپلیں نکالتی رہی اور اس کی شاخیں اور پتے ہمیشہ پروان چڑھتے رہتے ہیں کیونکہ اسرار آفرینش کے بارے میں ہر ایک نئی علمی دریافت، اس کیلئے نیا مصداق یا نئی صغریٰ کو وجود عطا کرتی رہتی ہے۔ اس طرح سے وہ ہر روز نئی شکل اختیار کرتی رہتی ہے اور انسانی علوم و دانش کی پیش رفت کے دو شادوش یہ بھی ترقی اور پیش روی کی منازل طے کرتی رہتی ہے۔

۴۔ برہانِ نظم انسان کو ”انفسی“ اور ”آفاق“ سیر کی دعوت دیتی ہے۔ یہ بابرکت سیر روز بروز انسانی معرفت کی سطح کو بلند سے بلند تر کرتی رہی ہے، اس کی سوچوں کو پروان چڑھاتی رہتی ہے، خاص کر اس کی وجہ سے بھی برہانِ نظم کی بنیادیں انسانی زندگی کے ساتھ اہم آہنگ ہیں اور قدم قدم پر اس کے ساتھ ہیں، توحید کے بعض دوسرے دلائل کی مانند نہیں ہیں جو روزمرہ کی انسانی زندگی سے الگ تھلگ یا علیحدہ ہوں۔

۵۔ برہانِ نظم وہ واحد برہان ہے جو تجربی فلاسفہ کو بھی قائل کر دیتی ہے، جو خالص عقلی دلائل کے منکر ہیں اور اس سائنسی اور علمی حربے کو خود انہی کے خلاف استعمال کرتی ہے جس سے وہ مادیت کے حق میں دلائل کا کام لیتے ہیں۔ لہذا اس لحاظ سے بھی وہ بہت مؤثر ہے۔

پس بنا بریں تعجب نہیں کرنا چاہیے اگر قرآن مجید نے اپنے توحیدی مباحث کی اکثریت کو اسی برہان کی بنیادوں پر استوار کیا ہے لیکن تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ بعض محققین جو (خالص فلسفی برہانوں جیسی) دوسری دلیلوں سے متاثر ہو کر اس برہان کی زبردست اہمیت سے چشم پوشی کر لیتے ہیں، گویا وہ اس کی خصوصیات اور گہرے اثرات سے پوری واقفیت نہیں رکھتے۔

## برہانِ نظم کی بنیادیں۔

یہ برہان دو اصل بنیادوں پر استوار ہے جو منطقی اصطلاح میں صغریٰ، کبریٰ کو ملا کر شکل اول کو تشکیل دیتی ہیں۔

الف: اس کائنات پر ایک منظم اور چمکانا نظام حکم فرما ہے۔

ب: جہاں پر بھی ایسا نظم حاکم ہو وہاں پر یہ بات ممکن نہیں ہے کہ وہ اتفاقاً پیدا ہو بلکہ ضروری ہے کہ اس کا تعلق علم اور عظیم قدرت سے ہو۔

پس نتیجہ یہ نکلے گا کہ علم اور عظیم قدرت کا ایک مبداء اس تخلیقی کائنات کے نظام کے ماوراء موجود ہے خواہ آپ اسے خدا کہیں یا اللہ، یا کسی اور نام سے یاد کریں، کیونکہ اس بحث میں نام سے زیادہ غرض نہیں ہے۔

## ”نظم اور علم“ کا رابطہ

سب سے پہلے دوسرا مقدمہ جسے اصطلاح میں قیاس کا کبریٰ کہا جاتا ہے وہ ثابت ہو اور اس کیلئے ضروری ہے کہ ”نظم“ کی مختصر سی تعریف کی جائے۔

کہا جاسکتا ہے کہ ہر تنظیم یا کوئی دوسری چیز جو ایک خاص پروگرام کے مطابق عمل کرتی ہے، جس کا ایک نتیجہ ہوتا ہے، وہ منظم ہے۔ اس طرح سے ”حساب“، ”پروگرام“ اور ”مقصد“ اس نظم کے تین اصلی عناصر ہیں۔ مثلاً ”گھڑی“ ایک نمونہ ہے ”منظم چیز“ کا۔ کیونکہ اس کے اجزا ایک صحیح صحیح حساب کے تحت بنائے گئے ہیں۔ پھر اسے جوڑنے کیلئے ایک پروگرام مرتب ہوا اور اس کا مقصد صحیح وقت کا بتلانا ہے۔ اور اس رابطہ (علم اور نظم کے رابطہ) کی تحقیق کیلئے چند دلائل سے امداد لی جاسکتی ہے:

۱۔ سب سے پہلی دلیل تو خود انسان وجدان ہے کیونکہ ہم نے کئی ایسے بزرگ عالم اور دانشمندیاز بردست موجود اور ہنرمند افراد کو دیکھا ہے جن کے علم و ہنر کے آثار باقی رہ گئے ہوں اور جب ان آثار مثلاً تصنیفات و تالیفات، مصنوعات، نفیس مناظرہ پر مشتمل بوڈ، حیرت انگیز تعمیرات کو دیکھتے ہیں تو کسی قسم کی دلیل کی ضرورت محسوس کئے بغیر اس کے عقل، ذوق، علم، صنعتی اور ہنرمہارت کا اعتراف کریں گے۔

۲۔ اس رابطے کے ثابت کرنے کیلئے وجدان کے علاوہ منطقی دلیل سے بھی کمک لی جاسکتی ہے کیونکہ کسی منظم عمارت کو وجود میں لانے کیلئے کم از کم انتخاب کے سات مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ مثلاً ایک باشکوہ، پختہ اور خوبصورت عمارت کی پیش نظر رکھیں تو مندرجہ ذیل سات انتخابی مراحل کو دیکھیں گے:

(۱) مسالہ جات کی جنس (۲) ان کی مقدار اور تعداد (۳) مسالہ جات کی کیفیت (۴) مختلف اشکال اور اندازے (۵) اجزاء کے درمیان ہم آہنگی (۶) ان کے درمیان تناسب (۷) ہر ایک جزو کا اپنی مناسب جگہ پر ہونا۔

مذکورہ سات چیزوں کا انتخاب باقاعدہ حساب و کتاب کے تحت ہو اور علم و عقل کے ساتھ حساب و کتاب بھی ایسا ہو کہ جس میں ذرہ بھرفرق نہ ہو۔ چنانچہ مذکورہ انتخابات کے تحت جس عمارت پر ہماری نگاہ پڑتی ہے تو ہم یقین سے کہہ دیتے ہیں کہ بے شک اس کا بنانے والا کافی سوچ بوجھ اور علم و عقل کا مالک تھا۔

۳۔ اور (نظم اور علم کے) اس رابطے کو ایک اور طریقے (برہان ریاضی کے طریقے) سے بھی ثابت کیا جاسکتا ہے۔ ”احتمالات کا حساب“ جو دور حاضر میں، یونیورسٹیوں میں ایک مستقل علمی رشتے کی صورت میں اختیار کر چکا ہے، ”علم و نظم“ کے رابطے کیلئے نہایت ہی موثر اور کارگر ہے اور یہ وہی چیز ہے جسے ہم اپنی زندگی میں اجمالی طور پر درک کر چکے ہیں۔ لیکن ”احتمالات کا حساب“ اسے ایک روشن ریاضی صورت میں پیش کرتا ہے۔

ہم ہرگز یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ ایک اُن پڑھ انسان ”اچانک“ کی صورت حال سے فائدہ اٹھا کر کسی موضوع پر، مثلاً ”فلسفہ“، ”یا شعروادبیات“، ”یا طب“ کے موضوع پر نہایت ہی مفصل اور با مقصد کتاب لکھ ڈالے۔ وہ اس طرح کہ ہم ایک ٹائپ مشین اس کے سامنے رکھ دیں اور مکمل طور پر اس کے اختیار میں دے دیں۔ وہ کسی ایک حرف کو بھی نہ پہچانتا ہو۔ حروف کی شناخت کے بغیر ٹائپ کرتا جائے اور ایک مفصل و مدلل کتاب معرض وجود میں آجائے۔ اس طرح سے صرف یہی نہیں کہ کتاب نہیں لکھی جائے گی بلکہ ”اچانک“ کی اس طرح کی کیفیت سے ایک معمولی سا خط بھی تحریر نہیں کیا جاسکے گا۔

کیونکہ اگر ہم ٹائپ مشین کے تیس حروف ہی فرض کریں (البتہ اس تعداد سے زیادہ بھی ہیں کیونکہ بعض حروف کی کئی مختلف صورتیں ہیں، مثلاً ”ب“، ”اول“، ”ب“، ”درمیانی“، ”ب“، ”آخری اور“، ”ب“، ”مفرد“، تو اس طرح سے ب کی چار مختلف صورتیں بن جاتی ہیں) تو یہاں پر احتمالات کا حساب یہ کہتا ہے کہ ایک دو حرفی کلمہ مثلاً ”من“ کی اچانک پیدائش کیلئے نو سو میں سے صرف ایک احتمال ہے۔ (1/30 \* 1/30 = 1/900) اور ایک تین حرفی کلمہ کی اچانک پیدائش کیلئے ۲۷ ہزار میں سے صرف ایک احتمال ہے، اسی طرح کسی پانچ حرفی کلمہ کی پیدائش کیلئے اکیس ملین (دو کروڑ دس لاکھ) احتمالات کی حد سے بھی بڑھ جائیں گے۔

اب اگر ایک مختصر سے خط میں صرف ایک سو حروف ہوں تو اس کے احتمالات کا مجموعہ ۳۰ عدد سے ۱۰۰ عدد کی طاقت میں بدل جائے گا۔ پس ہمارا زیر نظر خط اس مذکورہ عدد سے زبردست عظیم ہوگا جس کی کوئی حد و انتہا نہیں ہوگی۔ یعنی ایک کسری عدد جس کی صورت ایک اور اس کا مخرج ایک ۳ عدد ہے جس کے دائیں جانب ایک سو صفر ہو، تو عظمت و بزرگی کے لحاظ سے اس کسری کا مخرج کسی حساب میں نہیں آسکتا اور کائنات میں اس عدد کی بزرگی کو کوئی چیز نہیں پہنچ سکتی۔

اس حقیقت کی مزید وضاحت کیلئے اتنا کافی ہے کہ ہم یہ کہیں کہ اگر روئے زمین کے تمام سمندروں کے پانی کو ایک ایک قطرہ کر کے شمار کریں تو ایک ایسا عدد بنے گا جس کے دائیں طرف اکیس صفر سے کم ہوں۔ اس طرح اگر ایک ہزار صفحہ کی کتاب کا اندازہ لگائیں تو اس کے احتمالات کا عدد اس قدر عظیم ہوگا کہ اس کے کسری عدد کا احتمال صفر کے برابر جانچنے کا یعنی حساب و کتاب کی حد سے نکل جائے گا، جو کہ عام طور پر مجال ہے۔ (خوب غور کیجئے گا)

اسی دلیل کی بنا پر اگر کوئی شخص اس بات کا دعویٰ کرے کہ مثلاً ”قانون“ نامی طب کی کتاب کا لکھنے والا ”بوعلی سینا“ بالکل ہی اُن پڑھ تھا، ”سعدی“ ذوق شعری سے عاری تھا۔ ”آئن سٹائن“، ”ریاضی“ سے مطلقاً بے خبر تھا، دنیا کی معروف تاریخی عمارتوں کے بنانے والے معمار ذرہ بھر معماری کا علم نہیں رکھتے تھے، لہذا ان تمام مذکورہ افراد کے باقی رہ جانے والے آثار جو انہوں نے یادگار کے طور پر چھوڑے ہیں، وہ سب اچانک ہی معرض وجود میں آگئے تھے۔ وہ صرف لاشعوری طور پر ہاتھوں کو صفحات پر رکھتے جاتے تھے یا عمارتی مسالہ جات کو ہاتھ لگاتے جاتے تھے اور کتاب یا عمارت از خود معرض وجود میں آجاتی تھی۔ ایسا کہنے والا شخص اگر مذاق نہیں کر رہا تو دیوانہ ضرور ہے۔

قصہ مختصر علم اور نظم کا باہمی رابطہ اس قدر واضح اور روشن ہے کہ اس پر بہت سے انسانی علوم اور دانش کی بنیاد استوار ہے۔ مثلاً انسانی تمدن کی تاریخ گزشتہ لوگوں سے یادگار کے طور پر باقی رہ جانے والے آثار پر تحقیق و ریسرچ کے بعد لکھی گئی ہے۔ دانشور حضرات ان آثار پر تحقیق کرتے ہیں جو کھدائیوں کے موقع پر ظاہر ہوتے ہیں یا گزشتہ اقوام کی قبور اور عبادت گاہوں پر تحقیق کر کے اس دور کے لوگوں کو ثقافت، تمدن، بود و باش، عقائد اور اس قسم کی کئی دوسری چیزوں کا پتہ چلاتے ہیں، جب کہ اگر ہم نظم و علم کے رابطے کا انکار کریں تو یہ سب استنباط اور نتائج بے کار ہو جائیں۔ اب جب کہ علم اور نظم کا رابطہ اچھی طرح واضح ہو گیا اور گویا برہان نظم کی کبریٰ پر ثبات ہو گیا ہے تو ہم کائنات میں اس کے مصداقوں کی تلاش میں نکلنے ہیں جن پر قرآن پاک نے بڑی تاکید کی ہے اور زور دیا ہے۔

یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ قرآنی آیات میں برہان نظم کی کبریٰ کے بارے میں قطعاً کہیں ذکر نہیں آیا، یعنی کسی جگہ پر بھی ”علم و نظم کا رابطہ“ دکھائی نہیں دیتا، کیونکہ یہ اس قدر واضح اور عیاں ہے کہ اس کے بیان کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اگر کوئی شخص اس کا انکار کرتا ہے تو اسے بہت سے حقائق سے ہاتھ دھونا پڑا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ اس رابطے کے منکرین ٹھیک ”سوفسطائیوں“ کی مانند ہیں جو زبانی حد تک تو بہت سے حقائق کا انکار کرتے ہیں، لیکن اپنی روزمرہ کی زندگی میں دوسرے لوگوں کی مانند ان کا اعتراف کرتے ہیں۔ مثلاً اگر وہ بیمار ہوتے ہیں، تو ڈاکٹر اور دوا کے پیچھے جاتے ہیں، ڈاکٹر کے نسخہ پر حرف بہ حرف عمل کرتے ہیں تو گویا ڈاکٹر، دوا، علم طب، دوا سازی اور اس قسم کی سینکڑوں چیزوں کے وجود کا اقرار کرتے ہیں۔ ”علم اور نظم کے رابطہ“ کے منکر افراد ہر علم، صنعتی، ادبی اور ہنری اثر سے علمی اور عملی دونوں لحاظ سے ایک آگاہ، باذوق و باشعور ہنرمند مبداء کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں اور کسی بھی صورت میں جنون آمیز احتمالات پر تکیہ نہیں کرتے۔ یہاں پر اس نکتہ کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مادہ پرست فلاسفہ کا ایک گروہ جو برہان نظم سے برسر پیکار ہیں (کائنات میں یا تو نظم کے وجود کے منکر ہیں یا پھر علم اور نظم کے رابطے کا انکار کرتے ہیں) جن کا سرخیل ”ہیوم“ ہے۔ ان کے یاس چند بے وقعت اور ناقابل اعتناء وسوسوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ وسوسے بھی ایسے جنہیں اپنی زندگی میں وہ خود بھی قبول نہیں کرتے۔



## ۱۔ انسانی تخلیق میں اس کی نشانیاں

سب سے پہلے ل کر مندرجہ ذیل آیات کا دل و جان سے مطالعہ کرتے ہیں:

۱۔۔۔ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ إِذَا أَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُونَ

(روم/۲۰)

۲۔۔۔ إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا

(دھر/۲)

۳۔۔۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي

قَرَارٍ مَّكِينٍ

(مؤمنون/۱۲-۱۳)

۴۔۔۔ ذَلِكَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ

خَلَقَهُ أَخْلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ مَاءٍ مَّهِينٍ

ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ

قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ

(الم سجدہ/۹۳-۹۶)

۵۔۔۔ وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُتُّ مِنْ دَابَّةٍ آيَاتٍ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ

(جاثیہ/۴) [۱]

[۱] اس بارے میں کئی اور آیات بھی ہیں جنہیں ہم نے مضمون کی ہم آہنگی کی وجہ سے یہاں پر تحریر نہیں کیا۔ ملاحظہ ہوں سورہ نجم کی آیات ۴۵، ۴۶، ۴۷ سورہ مؤمن کی

آیت ۶۷ سورہ فاطر آیہ ۱۱، سورہ کہف آیت ۷، ۸، ۳۸- سورہ نحل آیت ۴ سورہ انعام آیت ۲ وغیرہ۔

## ترجمہ

- ۱۔۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر تم انسان بن گئے اور روئے زمین پر پھیل گئے۔
- ۲۔۔ ہم نے انسان کو ملے ہوئے نطفہ سے پیدا کیا اور اُسے آزمائیں گے، (لہذا) اُسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔
- ۳۔۔ ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا پھر اُسے نطفہ بنا کر ایک قابل اطمینان جگہ (رحم) میں ٹھہرایا۔
- ۴۔۔ وہ ایسا خدا ہے جو پوشیدہ اور ظاہر سے باخبر ہے اور طاقتور اور مہربان ہے۔ وہ وہی تو ہے جس نے جس کو پیدا کیا، اچھا پیدا کیا۔ اور انسان کی پیدائش کا آغاز مٹی سے کیا۔ پھر اس کی نسل کو پست اور بے قدر و قیمت پانی کے نچوڑ سے خلق کیا۔ اس کے بعد اس کے اعضاء و اندام کو موزوں بنایا اور اس میں اپنی روح کو اس میں پھونکا، اور تمہارے لئے کان، آنکھ، اور دل بنائے، لیکن تم اس کی نعمتوں کا بہت کم ہی شکر یہ ادا کرتے ہو۔
- ۵۔۔ اور اسی طرح تمہاری تخلیق میں اور دوسری ساری زمین میں چلنے والی مخلوق میں جو پھیلی ہوئی ہے، ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو اہل یقین ہیں۔

## الفاظ کے معانی

”بَشْرٌ“ دراصل ”بَشْرَةٌ“ سے ہے جس کا معنی ہے انسان کی ظاہری جلد۔ لیکن کتاب ”مقائیس اللغۃ“ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اصلی معنی ہیں کسی چیز کا حسن و جمال کے ساتھ ظاہر ہونا۔ لہذا ”بَشْرٌ“ (بروزن بَسْر) کی حالت مسرت اور شادمانی کی حالت کہلاتی ہے۔ چونکہ یہ حالت انسان کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے لہذا ”بَشْرٌ“ کا لفظ نوع انسان کیلئے اسم بن گیا ہے۔ اور یہ لفظ زن و مرد، مفرد وثنیہ اور جمع سب پر بولا جاتا ہے۔

”سَلَالَةٌ“ (بروزن عصارہ) اس چیز کے معنی میں ہے جو کسی دوسری چیز سے لی جائے اور وہ اس کا خلاصہ اور نچوڑ تصور کی جائے۔ یہ لفظ دراصل ”سَلَنٌ“ (بروزن حل) سے لیا گیا ہے، جس کے معنی ہیں آہستہ آہستہ کھینچنا اور اتارنا۔ تلوار کو نیام سے نکالنے کیلئے بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ پھر اس کا اطلاق ان اشیاء پر ہونے لگا ہے جو نچوڑ اور خالص ہیں۔ اور یہ جو مذکورہ بالا آیات میں ہم پڑھتے ہیں کہ خداوند عالم نے انسان کو مٹی کے سلالہ سے پیدا کیا ہے تو اس کا معنی ہے کہ اس کے صاف شدہ نچوڑ سے پیدا کیا ہے، جب کہ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے

مراد یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام روئے زمین کی ہر قسم کی مٹی کے نچوڑ سے پیدا ہوئے ہیں (اس لئے ان تمام کے آثار کو اپنے وجود میں خلاصہ پاتا ہے) ”سلیل“ کے لفظ کا اطلاق ”اولاد“ پر اس لئے ہوتا ہے کہ وہ ماں باپ کے وجود سے حاصل ہوتا ہے۔

”نطفہ“ دراصل ”صاف پانی“ کے معنی میں ہے اور بعض اہل لغت نے اسے ”کم پانی“ کے معنی میں بھی لیا ہے وہ پانی جو انسان کی پیدائش کا مبداء اور اصل ہے چونکہ قلیل بھی ہوتا ہے اور صاف شدہ بھی، نیز تمام وجود کا نچوڑ بھی اسی لئے اس لفظ کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے۔ جاری ہونے والی مائع چیزوں کو ”بھی“ ”ناطفہ“ کہتے ہیں۔

”امشاج“ ”مشخ“ (بروزن نج ۹ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں مخلوط اور ملی جلی چیز، اور بعض اسے ”مشخ“ کی جمع سمجھتے ہیں۔ چونکہ انسان کے نطفہ کے منعقد ہونے کے وقت مرد اور عورت دونوں کا پانی ایک دوسرے کے ساتھ مخلوط اور مرکب ہو جاتا ہے، اسی لئے اسے ”امشاج“ کہتے ہیں۔

”لسان العرب“ میں ہے کہ یہ مادہ دراصل ایسے دو مختلف رنگوں کے معنی میں آتا ہے۔ جو آپس میں ملے جُلمے ہوتے ہیں۔ (پھر اس کو مختلف ملی جلی اشیا کے معنی میں بولا جانے لگ گیا ہے)۔

”نطفہ امشاج“ انسان کی آفرینش شاید ان مختلف مواد کی طرف اشارہ ہو جن سے نطفہ ترکیب پاتا ہے، یا ان مختلف صلاحیتوں اور لیاقتوں کی طرف اشارہ ہو جو وارثت وغیرہ کے ذریعہ سے نطفہ میں جمع ہو جاتی ہیں، یا ان تمام قسم کی ترکیبات کی طرف اشارہ ہو۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### سب سے پہلے ”انفسی آیات“

قرآن مجید میں انسان کی پیدائش کے آغاز کے بارے میں مختلف تعبیریں ملتی ہیں، زیر بحث آیات کے سلسلہ کی سب سے پہلی آیت میں فرماتا ہے ”اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا ہے“ (وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ) چوتھی آیت میں فرماتا ہے۔ ”ہم نے انسان کی تخلیق مٹی سے فرمادی ہے۔“ (وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ)

تیسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ”خدا نے انسان کو مٹی کے نچوڑ سے پیدا کیا“ (وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ) سورہ صافات، آیت ۱۱ میں فرماتا ہے ”ہم نے انسان کو چکنے والی مٹی، یا سخت اور محکم مٹی سے پیدا کیا“ (إِنَّا خَلَقْنَاهُمْ

مِنْ طِينٍ لَازِبٍ)

سورہ حجر کی ۲۶ ویں آیت میں فرماتا ہے ”خدا نے انسان کو بدبودار کیچڑ سے پیدا کیا“ (وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ)

سورہ الرحمن کی ۱۴ ویں آیت میں ارشاد فرماتا ہے ”خدا نے انسان کو خشک اور کھکنانے والی مٹی سے پیدا کیا“ (خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ

## صَلِّصَالٍ كَالْفَخَّارِ

”صلصال“ کے اصل معنی ”خشک جسم میں آواز کا پلٹ جانا“ میں۔ اسی لئے خشک شدہ مٹی کو ”صلصال“ کہتے ہیں کہ جب کوئی چیز اُسے لگتی ہے تو اس سے آواز اٹھتی ہے اور جب وہ پک جائے تو اُسے ”فخار“ کہتے ہیں۔

”فخار“، ”فخر“ کے مادہ سے لیا گیا ہے، جس کے معنی ہیں بہت فخر کرنے والا، جو فخر کرنے والے افراد شور تو بہت مچاتے ہیں لیکن ان کا اندر خالی ہوتا ہے، اسی لئے انہیں فخر کہا جاتا ہے۔ کوزہ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور ہر قسم کی سفال وغیرہ جس کا اندر خالی ہوتا ہے، کو بھی فخر کہا جاتا ہے، بلکہ ہر اس چیز کو فخر کہتے ہیں جو مٹی سے بنا کر آگ میں پکاتی جائے۔<sup>[۱]</sup>

مندرجہ بالا آیات کے مجموعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان آغاز میں خاک اور مٹی تھا۔ اُس خاک میں پانی ملایا گیا تو وہ گیلی مٹی میں تبدیل ہو گیا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد وہ مٹی بکچڑ بن گئی اور کچڑ ایک عرصہ گزرنے کے بعد ایک نچوڑ کی صورت میں آدم کے اصل مادہ میں تبدیل ہو گئی اور اس کے بعد وہ خشک ہو گئی اور کئی اہم مراحل گزرنے کے بعد آدم کی صورت بن گئی۔

لیکن قرآن پاک کی دوسری آیات مثلاً اسی سلسلہ بحث کی دوسری آیت میں انسانی تخلیق کو ملے فله نطفے سے بیان کیا گیا ہے۔ (وَمِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ)

اور تیسری آیت میں پہلے تو ”مٹی کے نچوڑ“ سے، پھر ”رحم میں ٹھہرے ہوئے نطفہ“ سے (وَمِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهَا نُّطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ)

ظاہر ہے کہ ان آیات سے مراد انسان کے مراحل اور بعد کی نسلیں ہیں۔ وہ اس طرح سے کہ ہمارے جداول یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو سب سے پہلے مٹی سے پیدا کیا گیا اور ان کی بعد کی نسل کو نطفہ اَمْشَاج سے۔<sup>[۲]</sup>

یہ احتمال بھی مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں ملتا ہے کہ چونکہ نطفہ کو تشکیل دینے والا مواد سارے کا سارا مٹی سے حاصل ہوتا ہے لہذا صرف پہلا انسان ہی مٹی سے پیدا نہیں ہوا بلکہ بعد کے تمام انسان بھی مٹی سے پیدا ہوتے ہیں۔

بہر حال یہ بات واقعاً کائنات کے عظیم عجائبات اور تخلیق عالم کی حیرت انگیز صورت حال ہے کہ مٹی جیسی ایک بے جان مردہ اور کم قیمت چیز سے انسان جیسی زندہ، ہوشیار اور انمول چیز پیدا ہو۔ یہ اس عظیم مبداء کی روشن نشانیوں میں سے ایک واضح ترین آیت اور نشانی ہے۔ بقول شاعر

شائستہ	ستائش	آن	آفریدگاری	است
کار دچینیں	نقش	دلاویز نقشی	زما	وطنی

[۱] مفردات راغب، مجمع البحرین اور لسان العرب

[۲] تفسیر المیزان جلد ۱۶ ص ۱۷۳ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

(حمد و ثنا کے لائق وہ خالق کائنات ہے جو اس قسم کا نقش دل آویز پانی اور مٹی سے معرض وجود میں لاتا ہے) اصولی طور پر موت کے دل سے حیات کی پیدائش ابھی تک علمی دنیا کا ایک ناقابل حل معما بنی ہوئی ہے کہ کن حالات و شرائط کے تحت انسان جیسا زندہ وجود خاک جیسے بے جان وجود سے منصفہ شہود پر آتا ہے، کیوں کہ تمام دانشوران عالم کا پختہ عقیدہ ہے کہ جب گرہ زمین آفتاب سے جدا ہوں تو اس وقت مکمل طور پر جل کر بھسم کر دینے والی آگ کا ایک گولہ تھا اور اس میں زندگی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ سرد ہونا شروع ہوا اور بڑے پیمانے پر گیسوں کی سیلاب آور بارشیں اس کے اطراف میں برسے لگیں، سمندر معرض وجود میں آگئے لیکن کوئی زندہ چیز اس دنیا میں موجود نہیں تھی۔

پھر حیات و زندگی کی کوئلیں، نباتات اور حیوانات کی صورت میں ظاہر ہونے لگیں، انجام کار انسان کی تخلیق عمل میں آگئی۔ ہم خواہ انسان کی مستقل تخلیق کے معتقد ہوں (جیسا کہ آیات قرآن سے ظاہر ہوتا ہے) یا اسے دوسرے حیوانوں کی ارتقا یافتہ اقسام میں سے کوئی تسلیم کریں (جیسا کہ ڈارون کے عقیدہ اور ارتقاء کے مفروضہ کے حامیوں کا نظریہ ہے) ہر صورت میں اس انسان کی اصلیت مٹی پر جا کر ختم ہوتی ہے اور وہ اسی خاک ہی کا پتلا تسلیم کیا جاتا ہے۔ جہاں پر زمین سے ایک باریک سے باریک ترین خلیے کی پیدائش نے دنیا کے تمام دانشوروں کو حیرت زدہ کیا ہوا ہو، وہاں پر مردہ اور بے جان زمین سے انسان کی پیدائش کی کیا حالت ہوگی؟

یہیں پر ہمیں اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہم آیات حق میں سے ایک عظیم آیت اور عظمت رب العالمین کی ایک مہیر العقول نشانی کے سامنے موجود ہیں۔ جو ”عالم اصغر“ میں ایک نشانی ہے اور یہ عالم اصغر، عالم اکبر کا ایک مکمل نمونہ ہے۔

”کرسٹی مورسین“ نامی ایک معروف مؤلف ”راز آفرینش انسان“ نامی کتاب میں کرہ زمین میں زندگی کی پیدائش کے آغاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”کرہ زمین میں حیات کے ظہور کے آغاز میں ایک عجیب اتفاق رونما ہوا جس نے زمین پر موجود چیزوں کی زندگی میں زبردست اثر کیا۔ خلیوں میں سے ایک خلیے میں یہ عجیب خاصیت موجود تھی کہ وہ سورج کے نور کے ذریعہ سے بعض کیمیائی ترکیبوں کا تجزیہ کرے اور اس عمل کے نتیجے میں اپنے لئے بھی اور اپنے جیسے دوسرے خلیوں کے لئے بھی غذا کا مواد فراہم کرے۔ ان اولین خلیوں کی اولاد میں سے کچھ خلیوں نے اسی غذا سے استفادہ کیا ہے جو ان کی ماں نے آمادہ کی تھی۔ اس طرح سے نسل حیوانی کو وجود میں لے آئے، جب کہ دوسرے خلیوں کی اولاد نے جو کہ نباتات کی شکل اختیار کر چکے تھے، دنیا بھر کی نباتات کو تشکیل دیا۔ اور آج تمام جاندار چیزیں زمین سے غذا حاصل کرتی ہیں۔“

اس کے بعد کہتے ہیں:

”کیا یہ ماننے والی بات ہے کہ ایک خلیہ اتفاقی طور پر حیوانات کی زندگی کا منشاء اور دوسرے خلیے نباتات کی اصل بنے ہوں؟“

کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ:

”دانشور حضرات مادی دنیا کی موجود چیزوں کو دو قسموں پر تقسیم کرتے ہیں۔ ایک ”آلی“ (یعنی وہ موجودات جو خراب ہو جاتی ہیں جیسے نباتات اور حیوانات کے اعضاء و اجسام) دوسرے ”معدنی“ جو خراب نہیں ہوتیں۔ اسی وجہ سے کیمسٹری کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں ایک

کا نام ہے ”آلی کیمسٹری“ اور دوسری کا نام ہے ”معدنی کیمسٹری“

”تقریباً تمام انسانی غذا کا تعلق آلی مواد سے ہے جو سارے کے سارے زمین سے حاصل کئے جاتے ہیں اور جب وہ بدن میں داخل ہوتے ہیں تو ہر عضو کی مناسب غذا کے مطابق جدید کیمیکل ترکیب حاصل کرتے ہیں۔ یہ وہی حقیقت ہے جسے قرآن پاک نے ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے: ”ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا ہے“ یا ”تمہیں مٹی کے نچوڑ سے خلق کیا ہے۔“ [۱]

یہ ٹھیک ہے کہ انسان دو چیزوں کا مجموعہ ہے، یعنی خاکی مادہ کے علاوہ روح الہی کا حامل بھی ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں ہے کہ جس کی ہم اہنگی کے ساتھ ہی روح مختلف اعمال و افعال کی مظہر ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے روح کی ہم آہنگی کے ساتھ یہ خاکی مادہ مختلف قسم کی ایسی مختلف صلاحیتوں، مختلف ذوقوں، مختلف ایجادات اور مختلف اعمال کا مظاہرہ کرتا ہے کہ عقل انسانی جن پرششدرہ جاتی ہے۔

باوجودیکہ انان عرصہ دراز سے مختلف علوم کا موضوع بنا ہوا ہے اور اس کے ہر پہلو پر ایک نہ ایک مخصوص علم تحقیق اور ریسرچ میں مشغول ہے، پھر بھی وہ ایک ناشاختہ چیز کی صورت میں باقی ہے اور ایک لمبا عرصہ درکا ہے کہ دانشوران عالم اپنی شبانہ روز سر توڑ کوششوں کو بروئے کار لائیں، کائنات کے اس عظیم معمہ کو حل کریں اور اس کے مختلف گوشوں کو نمایاں کریں۔ پھر بھی ممکن ہے کہ وہ یہ کارنامہ انجام نہ دے سکیں۔

انسانی جسم کا ہر ایک عضو بذات خود ایسے احتمالات کے حساب کا ایک مستقل موضوع بن سکتا ہے۔ آنکھ، کان، دل، رگیں، نظام تنفس، گردے، معدہ، جگر بلکہ مغز اور اعصاب کا انتہائی پیچیدہ نظام ریاضی کے ایک سادہ سے حساب کے تحت واضح کرتا ہے کہ کوئی بھی عقل اسے اچانک پیدائش کا نتیجہ قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہے۔

ان اعضاء میں سے ایک عضو کی سرگرمیوں اور فریکل ساخت کے بارے میں ہزار ہا دانشوروں اور مفکرین نے سینکڑوں یا ہزاروں کتابیں لکھ ڈالی ہیں اور یہ کس قدر عجیب بات ہے!

کیا کوئی شخص باور کر سکتا ہے کہ ان اعضاء میں سے ہر ایک کی شناخت کیلئے اس قدر علم، عقل، ہوش اور ذکاوت ضروری ہو، لیکن ان کی ساخت و تخلیق کے لئے علم و عقل کی کوئی ضرورت نہیں ہے؟ کیونکہ ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک کارخانہ کے کام کرنے کے طریقہ کار کو سمجھنے اور اس سے استفادہ کرنے کے طریقہ کو جاننے کیلئے سالہا سال کا مطالعہ درکار ہو لیکن اس کے بنانے اور ایجاد کرے میں عقل و خرد کا کوئی عمل دخل نہ ہو، بلکہ وہ شعور و احوال کے ہاتھوں منصہ شہود پر آجائے!! اسے کون سی عقل باور کر سکتی ہے؟

یہیں پر نہ صرف انسان کی اس سادہ مٹی (خاک) کے مادہ سے اور ”سَلَاةٍ ۛر ۛن طَیِّبٍ“ (یعنی مٹی کے نچوڑ) سے اور ”مَجْمَا مُسْتَوْنِ“ (یعنی بدبودار کیچڑ) سے پیدائش، خدا کے وجود کی عظیم آیات اور تخلیق کائنات کے عظیم ترین شاہکاروں میں ہوتا ہے۔ بلکہ اس کے بدن کا ایک ایک خلیہ اس کا آئینہ تمام نما بن جاتا ہے۔

[۱] عجاز قرآن از نظر علوم امروز ص ۲۳، ۲۴ سے اقتباس

## نظام تخلیق نہایت پیچیدہ اور نازک ہے

کہتے ہیں کہ فلاں مشینری کا نظام پیچیدہ ہے۔ یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب اس کی ساخت میں مختلف اجزاء اور تنصیبات کام میں لائے جائیں۔ اس کا رابطہ کثیر اور کئی طرح کی چیزوں سے ہو اور وہ کئی طرح کے اہم کام دے۔ مثال کے طور پر ایک کلکولیٹر (حساب کرنے کی مشین) کو وہی لے لیجئے جو اپنے اصلی کام یعنی حساب کرنے کے علاوہ ہندسہ یعنی جیومیٹری اور الجبرا کے مسائل کو بھی آنا فانا حل کر دیتی ہے، اور ریاضی کے مختلف مسائل کو بھی سربج انداز میں حل کر دیتی ہے یا اسے محفوظ کر لیتی ہے، تو کہتے ہیں کہ اس کا نظام پیچیدہ ہے۔

دانشوروں کا کہنا ہے کہ آنکھ کے پردے کے پیچھے نوے ہزار باریک اعصابی رگیں ہیں جو پردے کے خلیوں کو اعصابی سلسلہ سے ملاتی ہیں (یاد رہے کہ نوے ہزار کی یہ تعداد صرف ایک آنکھ میں ہے، نہ کہ دونوں میں) اور یہ ایک نہایت ہی ظریف، باریک اور پیچیدہ ساخت ہے۔ اس نکتہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم اصل بحث کی طرف لوٹتے ہیں۔

اس جہان آفرینش میں نزاکت و ظرافت کے مسئلہ کے علاوہ ایسا حد سے زیادہ پیچیدہ نظام موجود ہے کہ انسان کا دماغ کا چکر آجاتا ہے اور بعض دانشوروں کے بقول انسان کے عظیم بدن کے شہر میں ایسی عمارتیں بھی موجود ہیں جن کے سامنے اس کائنات کی سربفلک عمارتیں ایک معمولی سی جھونپڑی کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مثال کے طور پر بطور نمونہ ہم اس کائنات کے پیچیدہ نظاموں میں سے ایک خلیے کی ساخت کا نظام پیش نظر رکھ کر اس کے بارے میں قدرے تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں جس کے بارے میں دور حاضر میں عجیب و غریب انکشافات ہوئے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک انسان متوسط طور پر ”دس ملین ارب“ (یا ایک کروڑ ارب) چھوٹے چھوٹے خلیوں سے ملے کر بنا ہے۔

سب سے پہلے جس شخص نے ان خلیوں کو دریافت کیا ہے اور ان کیلئے یہ نام تجویز کیا ہے، ایک دانشور بنام ”ہوک“ ہیں جو سترھویں صدی عیسوی میں گزرے ہیں۔ البتہ انہیں اس وقت یہ معلوم نہیں تھا کہ اس اکائی کی ساخت کس حد تک پیچیدہ اور مجر العقول ہے۔ لیکن بعد کے دانشوروں نے اس کی تحقیق کے بارے میں اپنی کوششیں جاری رکھیں اور تاجال جن اسرار تک ان کی دسترسی ہو سکی ہے ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔۔۔ خوردبین سے دیکھے جانے والے ایک چھوٹے سے خلیے کو ایک ایسے شہر سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ جس میں غذائی مواد کو انسانی جسم کی ضرورت پورا کرنے کے مواد میں تبدیل کرنے کیلئے ہزاروں تنصیبات، لیبارٹریاں اور کارخانے ہوں۔ لیکن پھر بھی انسان کے ذریعہ معرض وجود میں آنے والی عظیم ترین اور جدید ترین مصنوعات کا اس کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔۔۔ یہ چھوٹا لیکن حیران کن شہر تین حصوں پر مشتمل ہے۔

(الف) جلد، جو اس کی فصیل کی حیثیت رکھتی ہے۔

(ب) خلیے کا درمیان حصہ (سفیدہ یا سیٹوپلاز)

(ج) جوہر، یا کمانڈنٹ ہیڈ کوارٹر۔ (نیوکلیئر)

جلد یا فصیل جو خلیے کے گرد بنائی گئی ہے اس قدر لطیف، طریف اور نازک ہے کہ اگر اس قسم کی پانچ لاکھ فصیلوں کو ایک دوسرے پر رکھ دیا جائے تو بڑی مشکل سے ایک عام سے کاغذ کی ضخامت کے برابر بنے۔ لیکن اس کے باوجود وہ بیرونی حملہ آور اور مشکل ایجاد کرنے والے عوامل کے مقابلے میں اس قدر حساس اور محکم ہے کہ شہرہ آفاق دیوار چین بھی اس کے سامنے ہیچ نظر آتی ہے!!!

یہ نازک حصار تین تہوں پر مشتمل ہیں، اوپر کی دو تہیں تو پروٹین کی ہیں اور نچلی تہ چربی سے بھر پور ہے، اور یہ چربی کسی چیز کو کسی بھی صورت میں اپنے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتی، جب تک کہ اس کے پاس رمز بھری چابی نہ ہو۔ وہ چابی یہ ہے۔

”جو مواد اندر داخل ہونا چاہتا ہے وہ اس حصار کی چربی کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اُسے جذب کر کے اندر چلا جائے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دوست ہے نہ کہ دشمن۔“ اس طرح سے یہ شہر کسی چوکیدار اور سنتری کے بغیر ہر طرف سے اور ہر طرح سے محفوظ ہے۔

۳۔۔ اس شہر (خلیے) کے اندر بہت سی نہریں CANALS ہیں جو جلد سے شروع ہو کر جوہر یعنی کمانڈنٹ ہیڈ کوارٹر تک جا پہنچتی ہیں اور غذائی مواد کو اپنے اندر لے کر اُسے پروٹین میں تبدیل کر دیتی ہیں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ تیزابیت ACIDITY کی ۲۳ مخصوص قسمیں ان خلیوں میں داخل ہوتی ہیں جن کی کئی قسموں کی باہمی ترکیب سے پروٹین حاصل ہوتی ہے۔

۴۔ اس کا اصل جوہر ہی بذات خود کئی ہزار منزلہ سربفلک عمارت کی مانند ہے، نیویارک کی سربفلک عمارتیں جس کے مقابلے میں ایک حقیر سا مکان معلوم ہوتی ہیں۔

خلیے کا اصلی جوہر جو کہ کمانڈنٹ ہیڈ کوارٹر بھی ہے خود اس کی لمبی چوڑی تفصیل ہے۔ اس کا بیرونی پردہ ہے، اندرونی شیرہ ہے اور اس کے اطراف میں باریک باریک نسیں ہیں جن میں سے ہر ایک کا اپنا مخصوص کام ہے۔

۵۔۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ خود جوہر ہی میں کئی باریک، چھوٹی چھوٹی اور ظریف اکائیاں موجود ہیں۔ دانشمندی کی تحقیق کے مطابق جن کی تعداد ۲۵ ہزار بنتی ہے اور ان اکائیوں کا نام جین GEN ہے۔

ان GENS نے نہ صرف خلیوں کا سارا کام سنبھالا ہوا ہے بلکہ جسم کی تمام سرگرمیوں پر بھی کڑی نظر رکھے ہوئے ہیں۔ ان کا اہم ترین مسئلہ روایتی امور کا کنٹرول اور صفات و خصائص کو آئندہ خلیوں میں منتقل کرنا ہے۔ یعنی انسانوں اور دو سرے جانوروں کی موروثی صفات ان GENS ہی کے ذریعہ منتقل ہوتی ہے۔ اور چونکہ جینز کا عمدہ ترین کام جوہر کی مخصوص تیزابیت کے ذمہ ہوتا ہے لہذا اسے الیکٹرانک مغزی جینز کا کمپیوٹر کہا جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر جوہر بات قابل توجہ ہے وہ یہ کہ خود ان جینز GENS کی تشکیل بھی کئی اور اجزاء سے ہوئی ہے جن کے تیس ہزار سے پچاس ہزار طبقے ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ یہ عظیم شہر جس کی اس قدر عجیب و غریب فصیل، ہزاروں خوبصورت دروازے، بے شمار کارخانہ، گودام اور پائپوں



کا بچھا ہوا جال، کمانڈنٹ ہیڈ کوارٹر، ہیجڈ و حساب تنصیبات اور اس دوسری کے ساتھ ربط باہم اور اس قسم کے کئی دوسرے اہم اور زندہ کام ہیں۔ وہ بھی ایک چھوٹے اور محدود سے رقبہ میں جو کہ کائنات کے بہت بڑے پیچیدہ اور حیرت ناک شہروں میں سے ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ ایسی تنصیبات ایجاد کریں جو اس قسم کے کام انجام دے سکیں، جو یقیناً ہمارے بس سے باہر ہے۔۔۔ تو اس کیلئے ہزار ہا ایکڑ زمین کی ضرورت ہوگی جس پر یہ تنصیبات، عمارات اور مشینیں نصب کرنا پڑیں گی تاکہ اس قسم کا کارنامہ انجام دے سکیں۔ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ صنایع ازل نے یہ سب کچھ ایک ملی میٹر کے دس لاکھ حصہ کے پندرہوں حصہ میں قرار دیا ہے۔<sup>[۱]</sup>

پس انسان کی تخلیق میں اس قادر مطلق کی ایک نہیں بلکہ ہزاروں اور لاکھوں آیات اور نشانیاں پوشیدہ ہیں جن کی وجہ سے مجبوراً کہنا پڑتا ہے:

العظمة لله الواحد القهار

[۱] ”فزیا لوجی حیوانی“، ”فزیا لوجی وراثت“، اور سفر بہ اعماق وجود انسان، نامی کتابوں سے اقتباس

## ۲۔ جنین کے پروان چڑھنے میں خدا کی نشانیاں

### اشارہ

ماں کے پیٹ میں جنین کی تبدیلیاں کافی عرصے تک دانشوروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہیں۔ آخر کار علم نے اس اسرار آمیز دنیا کی نقاب بھی الٹ دی اور بتا دیا کہ ایک نطفہ جب ”رحم“ میں جا ٹھہرتا ہے تو وہاں پر اس کی سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں اور اپنی ارتقائی منزلیں طے کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس دوران وہ کیسے کیسے مراحل طے کرتے ہوئے اس مرحلے تک جا پہنچتا ہے کہ ایک مکمل انسان کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

پھر عجیب بات تو یہ ہے کہ اس دور میں قرآن مجید نے مختلف آیات میں جنین کے مختلف مراحل طے کرنے کی بات کی ہے اور بار بار اس بات پر زور دیا ہے جب اس قسم کی دریافت کا نام و نشان تک نہ تھا، مگر قرآن پاک نے کبھی توحید کے اثبات کیلئے اور کبھی معاذ (قیامت) کے ثبوت کے طور پر اس چیز کو بیان کیا ہے۔

اگر ”جنین شناسی“ کا علم اب بھی اپنی بچپن کی منزلوں سے گزر رہا ہے اور اس اسرار بھری دنیا کے متعلق ہماری معلومات اب بھی ناچیز اور بہت محدود ہیں، تاہم اب تک جو کچھ ہو چکا ہے اس نے دانشوروں کے سامنے عجائب و اسرار کی ایک دنیا رکھ دی ہے۔ چنانچہ اسی اشارے کے ساتھ ہم مندرجہ ذیل آیات کو جان و دل کے کانوں سے سماعت کرتے ہیں:

...وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ ۝١٣ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَكِينٍ ۝١٤ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظْمًا فَكَسَوْنَا الْعِظْمَ لَحْمًا ۝١٥ ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۝ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۝١٦

(مومنون/ ۱۳ تا ۱۶)

...أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِنْ مَنِيٍّ مُبْمَنِيٍّ ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّى ۝ فَبَعَلَ مِنْهُ الزَّكْرَ وَالْأُنثَى

(قیامت/ ۳۷ تا ۳۹)

...أَوَلَمْ يَرَى الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُبِينٌ

(پس/۷۷)

۴۔۔۔ قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ: أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ  
تُفْفَةٍ ثُمَّ سَوَّكَ رَجُلًا

(کہف/۳۷)

۵۔۔۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُفُفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ  
يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُونُوا شُيُوخًا وَمِنْكُمْ مَن  
يُتَوَفَّى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوا أَجَلًا مُّسَمًّى وَلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ

(مومن/۶۷) □

## ترجمہ

- ۱۔۔۔ ہم نے انسان کو مٹی کے ٹپو سے پیدا کیا۔ پھر اُسے نطفہ بنا کر مطمئن جگہ ((رحم میں) رکھا۔ پھر نطفہ کو جسے ہوئے خون (علقہ) میں اور علقہ کو 'مضغہ' (خون کے لوٹھڑے) میں اور مضغہ کو ہڈیوں میں تبدیل کیا۔ اس کے بعد اسے تازہ تخلیق عطا کی۔ پس بابرکت ہے وہ خدا جو بہترین پیدا کرنے والا ہے۔
- ۲۔۔۔ آیا انسان ایک ناچیز مٹی کا نطفہ نہیں تھا جسے رحم میں ڈالا گیا؟ پھر وہ لوٹھڑے کی صورت میں ہو گیا۔ اور خدا ہی نے اُسے پیدا کیا اور موزوں بنایا اور اس سے دو جوڑے مذکر اور مؤنث خل فرمائے۔
- ۳۔۔۔ کیا انسان یہ نہیں جانتا کہ ہم نے اُسے ایک (حقیر سے) نطفہ سے پیدا کیا ہے؟ پھر وہ (اس قدر قدرت، شعور اور گفتگو کرنے والا ہو گیا کہ) آشکارا لڑائی کرنے لگا۔
- ۴۔۔۔ اُسے اس کے (ایماندار) دوست نے باتیں کرتے ہوئے کہا: آیا تو اس خدا سے کافر ہو گیا ہے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفہ سے پیدا کیا ہے اور پھر تجھے مکمل مرد قرار دیا؟

□ اس بارے میں اور بھی بہت سی آیات ہیں۔ لیکن چونکہ وہ انہی آیات سے ملتی جلتی ہیں لہذا انہیں ذکر کرنے کی بجائے ان کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو سورہ فاطر ۱۱ اور سورہ

۵۔۔ وہ تو وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، اس کے بعد جمے ہوئے خون سے پھر تمہیں بچے کی صورت میں باہر بھیجتا ہے، پھر تم کمال قوت کے مرحلے تک جا پہنچتے ہو، اس کے بعد بوڑھے ہو جاتے ہو (اور اس دوران) تم میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس مرحلہ تک پہنچنے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں اور مقصد یہ ہے کہ تم اپنی مقررہ مدت تک جا پہنچو اور شاید کہ عقل سے کام لو۔

## الفاظ کے معانی اور تشریح

”علقہ“، ”علق“ (بروزن شفق) کے مادہ سے ہے جس کے اصل معنی تو کسی چیز سے تعلق اور رابطہ ہیں، اسی لئے ”علق“ کا معنی ”جما ہوا خون“ اور ”جونک“ بھی آیا ہے۔ اور ”علقہ“ کو کہ رحم مادر میں جنین کے تدریجی مراحل کا ایک حصہ ہے۔ اسی لئے علقہ کہلاتا ہے کہ وہ جمے ہوئے خون کی صورت اختیار کئے ہوئے ہوتا ہے۔<sup>[۱]</sup>

”کتاب“ مقابیس اللغۃ میں اس لفظ کے اصل مفہوم کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ اس تعلق پر دلالت کرتا ہے جو کسی چیز کا اپنے سے بلند ترین چیز کے ساتھ ہوتا ہے۔ بعد میں اس کے مفہوم نے وسعت اختیار کر لی۔<sup>[۲]</sup>

”مضع“، ”مضع“ کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں ”غذا کا چبانا“ اور گوشت کی اس بوٹی کے معنی میں ہے جسے منہ میں لے کر انسان چباتا ہے اور وہ ابھی تک پوری طرح پکی نہیں ہوتی، یعنی ناپختہ ہوتی ہے۔ جنین پر ”علقہ“ کے مرحلہ کے بعد اس کا اطلاق اس قسم کی بوٹی کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس مرحلہ پر جنین ایسی صورت اختیار کر لیتا ہے اور لوتھڑے کی شکل بن چکا ہوتا ہے۔ اس میں سبز رنگ کی رگیں بھی نمودار ہو چکی ہوتی ہیں۔

کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے ”قَلْبُ الْإِنْسَانِ مُضْعَعَةٌ مِّنْ حَسَدِهِ“ (انسان کا دل اس کے جسم کے گوشت کا ایک ٹکڑا (لوتھڑا) ہوتا ہے) یہ اور اس قوم کی دوسری تمام تعبیرات ایک ہی اصل کی طرف لوٹ جاتی ہیں۔<sup>[۳]</sup>

”ممنی“ دراصل ”منی“ (بروزن سعی) کے مادہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں اندازہ لگانا اور چونکہ نطفہ کا پانی ایک انسان یا حیوان کے اندازے کے مطابق ہوتا ہے، اسی لئے اس لفظ کا اطلاق اس پر ہوتا ہے ”موت“ کو اس لئے ”ممنیہ“ کہتے ہیں کسی انسان یا حیوان کی زندگی کے اندازہ کی حامل ہوتی ہے۔

”تمنی“ یعنی ”تمنا“ کے لفظ کا آرزوؤں اور امیدوں پر اطلاق اسلئے ہوتا ہے کہ انسان ان آرزوؤں کا اپنے دل میں اندازہ

[۱] مفردات راغب۔

[۲] لغت کی اور کتابیں مثلاً لسان العرب اور مجمع البحرین میں بھی اسی طرح کی تعبیرات ملتی ہیں۔

[۳] ملاحظہ ہو، مقابیس اللغۃ، مجمع البحرین، لسان العرب، اور صحاح اللغۃ۔

کرتا ہے اور انہیں تصور میں لاتا ہے۔ چونکہ بہت سی آرزوئیں واقعہ کے مطابق نہیں ہوتیں لہذا ”امنیہ“ کا لفظ کبھی کبھی جھوٹی آرزوؤں پر بھی بولا جاتا ہے۔ [۱]

## آیات کی تفسیر اور ان کی جمع بندی

### جنین کی اسرار آمیز کائنات

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قرآن مجید نے رحم مادر میں جنین کے ارتقائی مراحل کی طرف کئی مرتبہ اشارہ کیا ہے، اس پر تاکید بھی کی ہے، اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ لوگ اس بارے میں خوب غور و فکر سے کام لیں اور اس بارے میں دقیق مطالعہ کریں۔ اسی بات کو قرآن نے معرفتِ الہی تک پہنچنے کا ایک راستہ بھی بتایا ہے اور معاد کے ثبوت کیلئے بھی اسے ایک دلیل قرار دیا ہے۔

چنانچہ زیر بحث سلسلہ کی آیات میں سے پہلی آیت کے آخری الفاظ ”فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ“ (پس بابرکت ہے وہ خدا جو بہترین خالق ہے) کے مطابق خدا شناسی کے مسئلہ کو بیان کیا جا رہا ہے۔ ہر چند کہ اسی سورت (مومنوں) کی اور بھی بہت سی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ معاد (قیامت) کے مسئلہ کو بھی زبردست اہمیت دی گئی ہے۔ اس طرح یہ سورت مبداء اور معاد دونوں کے مسائل کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔

پہلے تو آفرینش انسان کو ”مٹی کے ٹچوڑ“ سے پھر ”جو نطفہ رحم کی امن و امان کی قیام گاہ میں موجد ہے“ سے بتایا گیا ہے۔ ان دو مراحل کا ذکر کرنے کے بعد پانچ اور مراحل کا بھی ذکر کیا ہے جو مجموعی طور پر سات مراحل بن جاتے ہیں۔

۱۔۔ پہلا مرحلہ ”علقہ“ ہے جب نطفہ جھے ہوئے خون کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اس میں بہت سی رگیں وجود میں آجاتی ہیں۔

۲۔۔ دوسرا مرحلہ ”مضغہ“ ہے جو خون کے لوتھڑے کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

۳۔۔ تیسرا مرحلہ ”عظام“ کا ہے جب گوشت کے تمام خلیے ہڈیوں کے خلیوں میں بدل جاتے ہیں۔

۴۔۔ چوتھا مرحلہ ہڈیوں پر گوشت کو پوشش کا ہے جو تمام ہڈیوں کے عضلات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ (فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا)

اب اس مقام پر قرآن کا لہجہ تبدیل ہوتا ہے اور جنین کے بارے میں تبدیلیوں اور نئی اور اہم آفرینش کی خبر دیتے ہوئے ایک اسرار آمیز اور راز بھری صورت میں کہتا ہے ”پھر ہم نے اُسے نئی آفرینش عطا کی“ (ثُمَّ أَنْشَأْنَاكَ خَلْقًا آخَرَ)

جب یہ ساتوں مراحل اختتام کو پہنچتے ہیں تو (فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ) کے جملہ کے ساتھ اس عجیب مخلوق کی خوبصورت انداز میں تعریف کرتا ہے، ایسا جملہ کہ نہ تو قرآن کی کسی اور آیت میں استعمال ہوا ہے اور نہ ہی کسی اور مخلوق کے بارے میں بیان ہوا ہے ”کیا کہنے

[۱] مفردات راغب، مجمع البحرین اور لسان العرب۔

ایسی مخلوق کے، کیا کہنے اس قدرت نمائی کے اور آفرین ہے اس کے عظیم و بزرگ و برتر خالق پر۔“

اس مجمل اور سربستہ جملہ ”خلق جدید“ سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین نے مختلف تفسیریں بیان فرمائی ہیں، اور جو تفسیر سب سے زیادہ مناسب اور بہتر معلوم ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ جب جنین انسان حس و حرکت یعنی زندگی اور حیات کے مرحلہ پر پہنچ جاتا ہے، حرکت کرنے لگتا ہے، حیوانات اور انسانوں کی کائنات میں قدم رکھنے لگتا ہے، اسی تحرک اور جست و خیز کو ”انشاء“ سے تعبیر کیا گیا ہے، جو اس طولانی راستے کی طرف اشارہ ہے جسے انسان مختصر سی مدت میں طے کرتا ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی ایک حدیث ہے جو آپؑ نے ”ثُمَّ أَدْنَانَا كَأَنَّ خَلْقًا آخَرَ“ کے بارے میں ارشاد فرمائی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں اس کی تفسیر ہے ”هُوَ نَفْخُ الرُّوحِ فِيهِ“ یعنی اس میں روح پھونکنا مراد ہے [۱]

یہ ٹھیک ہے کہ جنین اپنے پہلے لمحہ ہی سے ایک زندہ موجود چیز ہوتا ہے لیکن جب تک شکم مادر میں کسی قسم کی حس و حرکت نہیں کرتا، اس وقت تک وہ انسان یا حیوان کی نسبت نباتات کے زیادہ مشابہ ہوتا ہے لیکن چند ماہ گزرنے کے بعد اس میں انسانی روح زندہ ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی روایات میں ہے کہ جنین جب تک اس مرحلہ تک نہیں پہنچ جائے اس کی مکمل دیت نہیں ہوتی۔ لیکن جب وہ اس مرحلہ پر پہنچ جائے تو پھر اس کی دیت ایک مکمل انسان کی سی دیت ہوگی۔ [۲]

”أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ“ (سب خالقوں سے بہترین خالق) کی تعبیر کیوں استعمال کی گئی ہے حالانکہ خدا کے علاوہ اور کوئی بھی خالق نہیں ہے؟ اس لئے کہ ”خلق“ کے معنی صرف ”عدم سے وجود میں لانے“ (کتم عدم سے منصفہ شہود میں لانے) کا نہیں ہیں، بلکہ اس کے اور بھی بہت سے معانی ہیں۔ مثلاً ”کسی چیز کا انداز لگانا“، ”صنعت“ اور ”دنیا کی موجودہ چیزوں کو کوئی شکل عطا کرنا“، اور مسلم ہے کہ انسان اپنی خدا داد صلاحیتوں سے اس دنیا کی مختلف چیزوں کے مواد میں تبدیلی پیدا کر کے کسی چیز کو ایجاد کرتا ہے، مثلاً لوہے یا فولاد سے اوزار اور ہتھیار یا کوئی کارخانہ وجود میں لاتا ہے، یا عمارتی سامان سے ایک باشکوہ اور حیران کن عمارت مختلف اندازوں میں تعمیر کرتا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ ”خلق کرنے“ کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں یہ سب معانی داخل ہو جاتے ہیں اس لئے قرآن مجید نے حضرت عیسیٰ مسیح کا ایک قول اس طرح نقل کیا ہے:

”أَنِّي آخُلِقُ لَكُمْ مِنَ الطَّيْرِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنْفُخُ فِيهِهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ“ ”یعنی میں مٹی سے پرندے کی طرح کی چیز بتاتا ہوں اور پھر اس میں اپنی روح پھونکتا ہوں تو وہ خدا کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے“ (آل عمران/۴۹)

البتہ خالق حقیقی، یعنی وہ ذات جس نے مادہ اور صورت کو عدم سے وجود بخشا ہے اور اشیاء کی ہر قسم کی قدرت اور خواص کی اسی کی طرف بازگشت ہے، وہ صرف اور صرف خدا ہے، جب کہ دوسرے ”خالقوں“ کا کام، جو کہ مجازی خالق ہیں، صرف صورت کو تبدیل

[۱] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۵۴۱ حدیث ۵۶ و ۵۷

[۲] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۵۴۱ حدیث ۵۶ و ۵۷

کرنا یا مواد کو جوڑنا ہوتا ہے۔

اسی سلسلے کی دوسری آیت میں انسان کی پیدائش کے آغاز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یعنی اس زمانے کی طرف جب وہ ”منی“ نام کا ایک ناچیز قطرہ تھا اور اس کے بعد فقط اس کے ”علقہ“ کے مرحلہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور باقی مراحل جنین کو ”مَخْلَقٌ فَسَّوٰی“ (خدا نے پیدا کیا اور نظام بخشتا) کے عنوان کے تحت ایک نہایت ہی جامع تعبیر کو ذکر فرمایا ہے۔ خصوصی طور پر ایک ایسی چیز پر زور دیا ہے جو ”جنین شناسی“ سے متعلق نہایت ہی پیچیدہ صورت حال ہے، یعنی ”مذکر“ و ”مؤنث“ کی جنس کی پیدائش پر زور دیا ہے فرماتا ہے: ”فَجَعَلَ مِنْهُ الذَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَى“

”سَوٰی“ دراصل ”تسویۃ“ کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں ”صاف کرنا“ اور ”نظم و نظام عطا کرنا“۔ چنانچہ بعض حضرات اسے روح کی تخلیق کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو اس سے پہلی آیت میں ایک اور صورت میں بیان ہو چکا ہے۔ لیکن بعض اور حضرات نے ”خلق“ کو ”روح کی تخلیق“ کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور ”سَوٰی“ کو انسانی جسم کے اعضاء کو منظم اور معتدل ہونے کی طرف جانا ہے دوسرے حضرات نے اسے معتدل بنانے اور مکمل کرنے کے ساتھ تفسیر کیا ہے۔

لیکن ظاہر یہ ہے کہ آیت کی تعبیریں اس قدر جامع اور وسیع ہیں کہ ”علقہ“ پر وضع حمل تک جس قسم کی تخلیق، نظم و نظام، تعادل و توازن اور ارتقاء و تکمیل کا تقاضا ہوتا ہے، اسپر استعمال ہوتا ہے۔ [۱]

”راغب“ اپنی کتاب ”مفردات“ میں کہتے ہیں کہ ”تسویۃ“ کا اطلاق اس مقام پر ہوتا ہے جہاں کسی چیز کو اندازہ اور کیفیت کے لحاظ سے افراط اور تفریط سے بچایا جائے۔

تیسری آیت میں ایک نئے نکتہ کو بیان کیا گیا ہے۔ انسان کی نطفہ سے پیدائش کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرماتا ہے ”اس کی نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ ”حَصِيْمٌ مِّمَّيْنِ“ (کھلم کھلا جھگڑالو) بن جاتا ہے۔“

اس تعبیر کی بھی کئی تفسیریں کی گئی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ یہ انسان کے ”قوت“ اور ”ضعف“ کے دو مراحل کی طرف اشارہ ہے کہ ایک وقت وہ تھا جب وہ ایک ناچیز اور حقیر نطفہ تھا اور ایک وقت یہ بھی ہے کہ جھگڑے، تنازع پر اترتا ہوا ہے حتیٰ کہ خدا کے ساتھ بھی !!

دوسری یہ کہ یہ انسان کی قوت گویائی (قوة ناطقة) اور فہم و شعور کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ناچیز سا نطفہ اب اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ صرف بات ہی نہیں کر سکتا بلکہ مختلف قسم کے دلائل و گفتگو اور عقل کی توانائی کا حامل بھی ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ نطق و بیان اور منطق و استدلال جو دو انسانی کے اہم ترین موجودات ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ اس عجیب و غریب تنازعہ کی طرف اشارہ ہے جو انسان کے دو خلیوں CELLS کے درمیان واقع ہوتا ہے اور دو خلیے (اسپرماٹوزیڈ) اور مادہ (اول) ہیں۔ نر خلیے مادہ خلیوں پر غلبہ پانے اور ان کے ساتھ مرکب ہونے کی کوشش کرتے ہیں، کیونکہ

[۱] تفسیر قرطبی، روح المعانی، فی ظلال القرآن، المیزان اور تفسیر فخر رازی، اسی آیت کے ذیل میں۔

جب نطفہ رحم میں داخل ہوتا ہے تو کوئی ہزار اسپرماٹوزائیڈ، بڑی تیزی سے حرکت میں آجاتے ہیں اور فوراً ہی مادہ نطفہ سے ملنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

سب سے پہلے اسپرما جب اس میں داخل ہو جاتا ہے تو دوسروں پر اس کا دروازہ بند کر دیتا ہے، کیونکہ ”اول“ کے اطراف میں ایک ایسا محکم غلاف وجود میں آ جاتا ہے جو دوسروں کو داخل نہیں ہونے دیتا۔ اس عجیب دارو گیر اور محاز آرائی میں دوسرے ”اسپر“ شکست کھا جاتے ہیں اور خون میں جذب ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے نطفہ کے مرحلہ کے ذکر کے بعد اس کے ”خصیم مین“ ہونے کے مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے۔<sup>[۱]</sup>

چوتھی آیت میں بھی انسان کی مٹی سے خلقت کی طرف اشارہ ہے، پھر نطفہ اور بعد میں تعادل اور نظام و نظم کی طرف۔ پانچویں آیت، جو اس سلسلے کی آخری آیت ہے، میں اس مرحلہ کے علاوہ ”ولادت“ اور طفل نو مولود کی صورت میں ”جنین“ کے شکم مادر سے نکلنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ ”نَمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا“

جیسا کہ ہم جانتے ہیں جنین کی اہم ترین حیرت ناک صورتوں میں ایک صورت اس کے ولادت کے ساتھ ایک دورانیہ اپنے اختتام کو پہنچ جانا ہے۔ وہ کون سے عوامل ہیں جو جنین کو ایک مقرر وقت پر شکم مادر سے نکلنے کا حکم دیتے ہیں اور اسے عادی صورت سے منقلب کر کے دوسری صورت میں بدل دیتے ہیں (عادی صورت میں جنین کا سراو پر ہوتا ہے اور اس کا چہرہ ماں کی پیٹھ کی طرف) جو اس کے سر کو نیچے کر دیتے ہیں تاکہ اس کی ولادت آسان ہو جائے۔

سب سے پہلے پانی کی وہ تھیلی پھٹ جاتی ہے جس میں جنین تیرتا رہتا تھا، پانی باہر نکل آتا ہے اور جنین اکیلا دنیا میں جانے کیلئے تیار ہو جاتا ہے۔ ماں کو زبردست درد لاحق ہو جاتا ہے۔ شکم پیٹھ اور پہلو کے تمام ٹٹھے جنین پر دباؤ ڈالتے ہیں اور اسے باہر نکلنے کی راہنمائی کرتے ہیں۔

بوقت ولادت ماں کے جسم میں کیمیکل فعل و انفعالات اور فزیکل تبدیلیاں شروع ہو جاتی ہیں یہ پروگرام اسقدر عجیب اور حیرت ناک ہوتا ہے کہ اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک بے پناہ اور بے انتہائی علم و قدرت ہی ہے جس نے کسی اہم مقصد کیلئے یہ پروگرام مرتب کیا ہے۔ اس طرح مندرجہ بالا تمام آیات سے یہ بات بخوبی سمجھی جاسکتی ہے کہ جنین کے مختلف مراحل کے طے کرنے کا پیچیدہ اور مہیرا عقول نظام اس بات کی ایک اہم ترین علامت اور نشانی ہے کہ اسے کسی بے انتہا اور لازوال علم و دولت نے کتم عدم سے منصفہ شہود پر جلوہ گر فرمایا ہے ساتھ ہی اس بات کی دلیل بھی ہے کہ وہ خالق اس بات پر بھی قادر ہے کہ مرنے کے بعد زندگی عطا کرے اور معاد کو وجود میں لائے، کیونکہ جنین بھی تو ہر زمانے میں ایک نئی معاد سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ پس ان تصریحات کی روشنی میں یہ بات بخوبی کہی جاسکتی ہے کہ جنین کے مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد اس کائنات میں قدم رکھنے سے توحید بھی ثابت ہو جاتی ہے اور معاد بھی۔

[۱] ملاحظہ ہو کتاب ”اعجاز قرآن از نظر علوم روز“ ص ۲۷۔



## چند وضاحتیں

### ۱۔ نقش بر آب

ایک مشہور ضرب المثل ہے کہ جب کسی چیز کی ناپائیداری کو ثابت کرنا چاہیں تو کہتے ہیں کہ ”وہ نقش بر آب ثابت ہوئی“ کیونکہ تھوڑی سی حرکت اور نسیم کی وجہ سے سب کچھ ملیا میٹ ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ خداوند عالم مختلف قسم کے انسانوں اور بہت سے دوسرے جانداروں کا نقش پانی پر قائم کرتا ہے اور ان تمام صورتوں کو نطفہ کے قطرہ آب پر بنایا ہے۔ خداوند عظیم و اعظم کے علاوہ اور کون ہے جو ایسی تصویر کشی کر سکتا ہے؟

### ۲۔ تین تاریکیوں کے اندر

اس سے بڑھ کر جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ کہ بقول قرآن مجید خداوند عالم ان پے در پے تخلیقات کو جو کہ نطفہ کے پانی میں وجود میں لاتا ہے، حتیٰ کہ وہ مختصر سی مدت میں ایک مکمل انسان کی صورت اختیار کر لیتا ہے، خالق کائنات یہ سب کچھ ایک ظلمت کدہ میں انجام دیتا ہے جہاں تک کسی اور کی دسترس قطعاً ناممکن ہے جیسا کہ سورہ زمر کی چھٹی آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

”يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ ذَٰلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَآئِي تُصِرُّ فُؤُونًا“ وہ تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں میں یکے بعد دیگرے کئی خلقتیں عطا کرتا ہے اور وہ بھی تین تاریکیوں میں یہ ہے تمہارا خداوند پروردگار کہ کائنات کی حکومت اسی کیلئے سزاوار ہے، اس کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں ہے ان روشن آیات کے ہوتے ہوئے تم راہِ حق سے کیوں منحرف ہوتے ہو؟

تین تاریکیوں سے کیا مراد ہے؟ جیسا کہ بہت سے مفسرین نے بتایا ہے اور بعض روایات میں بھی ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ان سے مراد (۱) شکم مادر کی ظلمت اور (۲) رحم کی ظلمت اور (۳) ”مشمیمہ“ کی ظلمت (مشمیمہ اس مخصوص تھیلی کو کہتے ہیں جس میں جنین موجود ہوتا ہے) ہیں جو تین ضخیم پردوں کی صورت میں جنین کے گرد لپٹے ہوتے ہیں۔ [۱]

نقاش اور مصور کتنا ہی ماہر اور زبردست کیوں نہ ہو وہ ہمیشہ مکمل نور اور روشنی میں ہی تصویر کشی کر سکتا ہے۔ لیکن نقاش ازل اور خالق باعظمت ایسے عجیب تاریک خانے میں، اس قدر دل کشی نقش بر آب بناتا ہے کہ بے ساختہ کہنا پڑتا ہے ”جَلَّ الخالق“

[۱] تفسیر مجمع البیان۔ المیزان۔ تفسیر فخر رازی اور کئی دوسری تفسیریں۔ (مرحوم طبری نے مجمع البیان میں بھی اسی معنی کو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل کیا ہے)

## ۳۔ امن کا مقام

قرآن مجید (سورہ مومنوں کی ۱۳ ویں آیت میں) مکمل صراحت کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ ہم نے انسان کے نطفہ کو ایک مکمل امن کے مقام پر رکھا ہے۔ (ثُمَّ جَعَلْنَاكَ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ)

درحقیقت بدن کے محفوظ ترین مقامات سے وہ جگہ ہے جہاں پر نطفہ اور جنین ٹھہرتے ہیں، جو ہر طرف سے زیر حفاظت اور زیر حراست ہوتے ہیں۔ ایک طرف سے تو ہڈیوں اور پسلیوں کے ستون ہوتے ہیں، دوسری طرف لگن حاصرہ کی طاقت ور ہڈی ہوتی ہے اور تیسری طرف بہت سے ایسے پٹھے اور پردے ہیں جنہوں نے شکم کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بعض خطرناک حوادث کے ظاہر ہونے کے وقت ماں کا ہاتھ بھی لاشعوری طور پر ڈھال کا کام دیتا ہے۔

ان سب صورتوں سے قطع نظر ایک اور بات جو باعث حیرت ہے وہ یہ کہ جنین ایک ایسی تھیلی میں ہوتا ہے جو ہمیشہ لیسڈار پانی سے بھری رہتی ہے اور مکمل طور پر بے وزن ہوتی ہے، یعنی اس پر کسی بھی طرف سے کسی قسم کا دباؤ نہیں ہوتا، کیونکہ جنین کی ساخت خاص کر اس کے اوائل میں اس قدر نرم نازک، لطیف اور باریک ہوتی ہے کہ اگر اس پر تھوڑا اور معمولی سا دباؤ بھی پڑ جائے تو اسے مکمل طور پر تباہ و برباد کر سکتا ہے۔ یہ تھیلی اپنے اس مخصوص پانی کے ساتھ ایک اور خصوصیت کی حامل بھی ہے اور وہ یہ کہ اس میں چوٹ کے برداشت کرنے کی صلاحیت بھی ہوتی ہے، بالکل ویسے ہی جیسے کسی مکمل ترین موٹر کار میں نہایت ہی نرم نرم سپرنگ SPRING لگا دیے جاتے ہیں۔ لہذا تیز چلنے کی وجہ سے ماں کو اگر کسی قسم کی چوٹ لگ جائے تو اس چوٹ کا اثر اس تھیلی تک جا کر ختم ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اُسے اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔

پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یہ تھیلی جنین کیلئے درجہ حرارت کو حد اعتدال پر رکھتی ہے اور اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتی کہ باہر کی سردی یا گرمی، جو ناگہانی طور پر ماں کے شکم کو لگ جاتی ہے، آسانی کے ساتھ جنین تک جا پہنچے۔ کیا اس سے بڑھ کر کوئی اور امن و امان کا مقام مل سکتا ہے؟ کیا خوبصورت تعبیر ہے قرآن کی کہ نطفہ کے ٹھکانے کا نام ”قرار مکین“ رکھا ہے۔

## ۴۔ ”خَصِيمٌ مُّبِينٌ“ یا کھلم کھلا جھگڑالو

یہ بھی جنین کی ایک اور حیرت ناک صورت حال ہے، خواہ ہم اس کی انسان کی قوت گویائی، قدرت تکلم اور طرز استدلال و احتجاج سے تفسیر کریں، جیسا کہ مفسرین نے ایسا کیا ہے، یا رحم مادر میں نرم مادہ کے نطفوں کی باہمی محاذ آرائی اور چپقلش و نزاع سے تفسیر کریں، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے یا دونوں صورتیں مراد لی ہیں۔ ہر صورت میں یہ جنین کے ایک عجیب و غریب اور لطیف و ظریف نکات میں سے ایک ہے کہ بظاہر پست اور ناچیز شے سے ایک ایسا قیمتی اور والا نشان گوہر پیدا ہوتا ہے۔

## ۵ جنین کی غذائیں

جنین کے عجائبات میں سے ایک اور بات اس کی غذائیں ہیں کیونکہ جنین کی پرورش اور اس کی جلد کی نشوونما کیلئے مکمل غذائی مواد کی ضرورت ہے، جو ہر لحاظ سے پاک و صاف ہو۔ اس کے ساتھ ہی اُسے آکسیجن OXYGEN کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور پھر کافی مقدار میں پانی بھی ضروری ہے، جو ہمیشہ اسے ملتا رہے۔ خداوند عالم نے یہ فریضہ ایک اور چیز پر عائد کیا ہے جسے ”جفت“ PLY CENTA کہتے ہیں، جو جنین کے اولین لمحات ہی سے اس کے ہمراہ ہوتی ہے یہ ایک طرف سے تو دوشریانیوں اور ایک وریڈ (رگ) کے ذریعہ ماں کے دل سے مربوط ہے اور دوسری طرف سے ناف کے بند کے ذریعہ جنین سے تعلق رکھتی ہے۔

یہ تمام غذائی مواد اور ضروری پانی اور آکسیجن کو ماں کے جریان خون کے ذریعہ سے جذب کر لیتا ہے اس کو صاف (ریفائن) کر کے دوبارہ جنین میں منتقل کر دیتا ہے اور غیر ضروری مواد مثلاً کاربن CARBON وغیرہ کو یکجا کر کے ماں کے خون کی طرف پلٹا دیتا ہے۔ اس طرح ”جفت“ دو طرح کے کام انجام دیتا ہے، ایک ”حاصل کرنے“ کا اور دوسرا ”عطا کرنے“ کا۔ اور نیز وہ فلٹر FILTER اور کاربوریٹر CARBORATOR کی مانند ہے، جس سے صرف اس کا مطالعہ کرنے سے ہی خالق کی بے پناہ عظمت کا پتہ چل جاتا ہے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ایک روایت میں ہے کہ امام علیہ السلام نے فرمایا ہے:

”بچہ اس نسیم سے حصہ لیتا ہے جسے ماں حاصل کرتی ہے۔“

کتنے سال ہوئے ہیں کہ دانشوروں کو اس بات کا پتہ چلا ہے کہ جس بچے کا بچھڑا کام نہیں کرتا اور وہ پانی میں بھی تیر رہا ہوتا ہے اُسے آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے؟ کتنا عرصہ ہوا ہے کہ انہوں نے اس بات کا پتہ چلایا ہے کہ جو آکسیجن ماں استعمال کرتی ہے وہ اس کے خون میں داخل ہو کر ”جفت“ تک جا پہنچتی ہے اور بچہ ناف کے بند کے ذریعہ اس سے استفادہ کرتا ہے؟ صورت حال جو بھی ہو اس بات کے معلوم ہونے کی زیادہ مدت نہیں گزری، لیکن امام کی چشم بینا نے اسے پہلے ہی سے دیکھ لیا تھا اور فرما دیا تھا: ”بچہ اُسی نسیم سے استفادہ کرتا ہے۔“ کیا جس آلودہ ہوا میں ہم سانس لے رہے ہیں، اس کے مقابلے میں ”نسیم“ سے بڑھ کر اور کوئی تعبیر ہو سکتی ہے جسے امام نے آکسیجن کو بیان کے طور پر استعمال کیا ہے؟ [۱]

## ۶۔ جنین کی جنسی سرنوشت

جنین کیونکر اور کن عوامل کے تحت مذکر یا مؤنث بنتا ہے، اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ یعنی ابھی تک سائنس نے بھی اس کا جواب دریافت نہیں کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ غذائی مواد یا دوائیں اس بارے میں مؤثر ثابت ہوں، لیکن اُنکی یہ تاثیر تقدیر بدلنے اور بگاڑنے یا مقرر کرنے کیلئے نہیں ہوتی۔ تاہم عجیب بات یہ ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں ان دو جنسوں (مردوزن) کے درمیان ہمیشہ نسبتی

[۱] کتاب ”اولین دناگاہ“ جلد ۱ ص ۲۵۳ سے اقتباس

توازن پایا جاتا ہے۔ یہ توازن تمام معاشروں میں موجود ہوتا ہے، اگر کہیں کوئی فرق ہو بھی تو وہ اس قدر اہم اور قابل توجہ نہیں ہوتا۔ ذرا تصور کیجئے کہ اگر یہ توازن کسی دن ختم ہو جائے اور مثال کے طور پر مرد، عورتوں سے دس گنا زیادہ ہو جائے یا اس کے برعکس عورتیں مردوں سے دس گنا بڑھ جائیں تو کیا کیا خرابی نہیں ہوگی جو معاشرے میں پیدا نہ ہو جائے! انسانی معاشروں میں کس حد تک بگاڑ پیدا ہو جائے گا؟ کیا وہ معاشرہ جس میں عورتوں کی نسبت مردوں دس گنا ہو یا مردوں کی نسبت عورتیں دس گنا، اس میں معاشرتی سکون اور اجتماعی امن وامان ملے گا؟ لیکن جس ذات نے انسان کو صحیح اور سالم زندگی بسر کرنے کیلئے پیدا کیا ہے اسی نے اس کے عجیب اور اسرار آمیز توازن کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ خداوند عالم اپنی حکمت اور مشیت کے پیش نظر جسے چاہے بیٹا عطا کر دے اور جسے چاہے بیٹی دیدے۔ (يَهْدِي لِمَنْ يَشَاءُ إِنَّا نَهْدِي لِمَنْ يَشَاءُ الذُّكُورَ - شوریٰ/ ۴۹) لیکن اس کی یہ مشیت حساب و کتاب کے تحت اور چچی تلی ہوتی ہے۔

## ۷۔ اسرار آمیز اور جلد انجام پانے والی تبدیلیاں

جنین کی اور حیرت انگیز باتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان کا اصل نطفہ اوائل میں ایک یکتا خلیہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا اور تقسیم کے طریقہ سے صعودی صورت میں پروان چڑھتا ہے، افزائش اور تبدیلیاں بہت جلد عمل میں آتی رہتی ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ہے ”ہر وقت ایک دوسری آفرینش کے بعد ایک نئی آفرینش عطا کرتا ہے۔“ (خَلَقْنَا مِمَّنْ بَعْدَ خَلْقِهِ) یہ ایسی نشوونما اور افزائش ہوتی ہے کہ انسان کی ولادت کے بعد بھی اگر یہی سلسلہ جاری رہے تو وہ ایک مختصر سے عرصے میں ایک بلند و بالا پہاڑ کی بلندیوں تک جا پہنچے اور زمین کی سطح اس کیلئے تنگ ہو جائے۔ لیکن جو ذات جنین کو ارتقاء کی یہ تیزی عطا کرتی ہے، وہی ذات انسان کے ایک مقررہ مرحلے پر پہنچ جانے کے بعد اسے روک کر تدریجی رفتار بخشتی ہے۔

## ۸۔ رحم کی مستقبل پر نگائیں

آخر کیا وجہ ہے کہ ایک خلیہ تقسیم کے وقت مختلف صورتوں میں تبدیل ہو جاتا ہے، گوشت کے خلیے، ہڈیوں کے خلیے، پھلوں کے خلیے، جلد کے خلیے وغیرہ؟ کیا رحم کا کام ہوتا ہے کہ وہ اس کے مستقبل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے بارے میں پیش بینی کرتا اور ہر ایک خلیے کو اس کے اپنے مقام پر متعین کرتا ہے اور اس کی تصویر کشی کرتا ہے؟ اگر واقعاً اس میں اس قسم کا ہوش و ذکاوت اور قدرت و طاقت ہے تو یہ سب کچھ اسے کس نے عطا فرمایا ہے؟

مشہور دانشور ”لکسیس کارل“ اپنی کتاب ”انسان موجودنا شناختہ“ میں کہتے ہیں:

”گو یا بدن کا ہر ایک جزو مجموعی طور پر بدن کی موجودہ اور آئندہ ضروریات کو سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو اس کے مطابق تبدیل کر لیتا ہے۔ اجزاء کی بناوٹ کے زمان اور مستقبل کو حال کی طرف سمجھتے ہیں، مثلاً حمل کے آخری ایام میں عورت کے نرم بیرونی جسم کی بناوٹ مزید نرم اور پھیلنے کی قابل ہو جاتی ہے۔ اور تبدیلی کی یہی صورت حال چند دن بعد ہونے والے وضع حمل کے دوران جنین کے عبور کو آسان کر دیتی

ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ پستان کے خلیوں کو زیادہ کر کے اُسے بڑا بنا دیتی ہے، حتیٰ کہ بچے کی پیدائش سے پہلے ہی پستان اپنا کام شروع کر دیتے ہیں یعنی ان میں دودھ آجاتا ہے اور بچے کی غذا آمادہ ہو جاتی ہے۔۔۔ جنین کے شکم مادر میں پروان چڑھنے کے دوران یہ عضلات اور پٹھوں کا طریقہ کار ہی کچھ ایسا ہوتا ہے گویا وہ مستقبل کے تمام پروگرام کو پہلے ہی سے جانتے ہیں۔ اور دو مختلف زمانی فاصلوں یا دو مختلف مکانی نقاط کو بھی اچھی طرح پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ [۱]

ہمیں اس سے غرض نہیں ہے کہ اس موضوع کا کیا نام رکھیں، کیونکہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اس سے یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ اس کے پس پردہ ایک عظیم اور صاحب علم و قدرت مبداء ضرور موجود ہے جو اس نظام کو چلا رہا ہے۔

## ۹ ہڈیوں کا لباس

سورہ مومنوں کی چودھویں آیت کی تفسیر میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ قرآن مجید عضلوں اور پٹھوں کے بارے میں ایک خاص تعبیر پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے۔ ”پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت پہنایا“ لفظ ”کسونا کا انتخاب قرآن مجید کے علمی معجزات میں سے ایک معجزہ ہے کیونکہ جدید تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ ہڈیاں گوشت سے پہلے ظاہر ہوتی ہیں۔ [۲]

## ۱۰۔ جنین باہر آتا ہے

جیسا کہ ہم سورہ حج کی پانچویں آیت کی تفسیر میں پڑھ چکے ہیں۔ ”خداوند عالم نے جنین کو شکم مادر سے باہر بھیجنے کی نسبتاً اپنی طرف دی ہے اور فرمایا ہے۔ ”ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا“ (پھر ہم تمہیں طفل بنا کر باہر بھیجتے ہیں) یہ تعبیر ولادت کے مسئلہ کی اہمیت کو اچھی طرح واضح کرتی ہے جس کو دانشور بھی تسلیم کر چکے ہیں۔

وہ کون سے عوامل ہیں جو ولادت کے زمانہ کو مقرر کرتے ہیں؟ کن حالات کے تحت جنین کو باہر جانے کا حکم ملتا ہے؟ بدن کے تمام اعضاء کیونکر اپنے آپ کو اس عظیم تبدیلی کیلئے آمادہ کرتے ہیں؟ کن عوامل کی وجہ سے بچہ شکم مادر میں الٹا ہو جاتا ہے تاکہ وہ سر کے بل متولد ہو؟ کیا وہ جانتا ہے کہ پاؤں کے بل اس کی ولادت ناممکن یا نہایت مشکل ہے؟ ماں کے جسم کے تمام پٹھوں کو کون حکم دیتا ہے کہ وہ جنین پر زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالیں کہ وہ باہر نکلے؟

جب گاہ و بے گاہ اس سسٹم میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے اور ڈاکٹر صاحبان ”آپریشن“ پر مجبور ہوں تو اس کی اہمیت اس وقت بہتر طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے ذریعہ سے پیدا ہونے والے افراد کا وجود شاید سب کیلئے اس امر کی تنبیہ ہے کہ وہ اس موضوع کی اہمیت کو سمجھیں۔ البتہ بعض مواقع پر تخمینی طور پر بچے کی ولادت کی پیش گوئی کرتے ہیں، لیکن بسا اوقات اس کی ولادت یا تو اس زمانے سے پہلے

[۱] کتاب ”انسان موجود شناختہ“ ص ۱۹۰

[۲] کتاب ”اعجاز قرآن از نظر علوم امروز“ ص ۲۹

ہو جاتی ہے یا بعد میں۔ اس طرح سے ولادت کا مسئلہ اپنے تمام منظمہ لوازمات سمیت خداوند عالم کی آیات میں سے ایک آیت ہے۔

## ۱۱۔ بوقتِ ولادتِ محیر العقول تبدیلیاں

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کوئی بھی شخص صحیح طور پر ولادت کے مقررہ لمحہ کو نہیں بتا سکتا ہے اور اگر کسی وقت ڈاکٹروں اور حکیموں کی طرف سے عمومی یا خصوصی صورت میں پیش گوئی کے طور پر کچھ بتایا بھی جاتا ہے تو وہ ظن اور تخمین پر مبنی ہوتا ہے جیسا کہ قرآن مجید نے سورہ رد کی ۸ ویں آیت میں کہا ہے:

”اللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَحْبِلُ كُلُّ أَنْثَىٰ وَمَا تَغِيضُ الْأَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَ اللَّهِ بِمِقْدَارٍ“ (خداوند عالم ہر جنین کے بارے میں علم رکھتا ہے جسے کوئی بھی مؤنث اپنے ساتھ اٹھائے پھرتی ہے اور اس کو بھی جانتا ہے جسے رحم کم کرتے ہیں (معمول کی مدت سے پہلے جنم دیتے ہیں) اور اسے بھی جسے زیادہ کرتے ہیں (معمول کی مدت کے بعد جنم دیتے ہیں) اور اس کے پاس ہر چیز کا اندازہ ہے۔<sup>[۱]</sup>)

آیت کا ظاہر یہ ہے کہ یہ چیز خدا کے خاص علوم میں سے ہے کیونکہ وہ جنین کی ہر طرح کی خصوصیات کو اس کے متولد ہونے سے پہلے جانتا ہے۔ نہ صرف جنسیت کے مسئلہ کو جانتا ہے، بلکہ اس کی تمام لیاقتوں، استعداد، ذوق اور اس کی ظاہری اور باطنی صفات سے بھی باخبر ہوتا ہے۔ اس طرح جنین کی ولادت کے لمحہ کو بھی صرف وہی جانتا ہے، کہیں یہ بات ذہن میں نہ آجائے کہ اس قسم کی کمی اور زیادہ کسی حساب اور دلیل کے بغیر ہوتی ہے بلکہ اس کا ایک لمحہ ایک ایک پل اور ایک ایک گھڑی حساب و کتاب کے تحت ہے ارشاد فرماتا ہے ”وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَ اللَّهِ بِمِقْدَارٍ“ (اس کے نزدیک ہر چیز کا اندازہ اور معینہ مقدر ہوتی ہے)

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ نومولود کے زندگانی سسٹم میں بوقتِ ولادت عجیب و غریب قسم کی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جو اس کو جدید ماحول میں ڈھالنے کیلئے نہایت ہی ضروری ہوتی ہیں، ان میں سے صرف دو کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

(الف) گردشِ خون کا سسٹم تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ جنین میں گردشِ خون کا مسئلہ ایک سادہ سی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ کیونکہ جنین میں صفائی کی غرض سے آلودہ اور غلیظ خون پھیپھڑوں کی طرف حرکت نہیں کرتا، اسلئے کہ وہاں پر نظام تنفس نہیں ہوتا۔ لہذا اس کے قلب کے دونوں حصے (دایاں اور بائیں حصہ) جن میں سے ایک تو اعضاء تک خون پہنچانے کا ذمہ دار ہوتا ہے اور دوسرا صفائی کی غرض سے خون کو پھیپھڑوں تک پہنچانے کا پابند ہوتا ہے) ایک دوسرے سے متعلق ہوتے ہیں، لیکن جو جنین باہر کی

[۱] ”تغیض“، ”غیض“، (بوزن فیض) کے مادہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی مانع چیز کو نگل جانا یا اسے تہہ میں لے جانا ہے۔ پھر اس کا اطلاق ”نقصان“ (کم ہونا) نیز ”فساد“ (بگڑ جانا) پر ہونے لگا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین نے ”تغیض“ کے معنی کم ہونا اور بعض نے وقت مقررہ سے قبل پیدا ہونا بتایا ہے۔ اور مفسرین کے درمیان بھی یہی معنی مشہور ہیں۔ یہی تفسیر حضرت امام محمد باقر یا حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام سے بھی منقول ہوئی ہے اور آیت کا ذیل بھی اسی پر گواہ ہے۔

دنیا میں قدم رکھتا ہے وہ دریچہ بند ہو جاتا ہے اور خون کے دو حصے ہو جاتے ہیں، ایک حصہ تو غذا رسانی کی غرض سے تمام خلیوں کو پہنچایا جاتا ہے اور دوسرا سانس لینے کیلئے پھیپھڑوں کی طرف۔

پس جب تک جنین شکم مادر میں ہے وہ اپنے لئے ضروری آکسیجن ماں کے خون سے حاصل کرتا ہے لیکن چونکہ ولادت کے بعد اسے خود کفیل ہونا ہے اور پھیپھڑوں اور تنفس کے ذریعہ اسے آکسیجن لینی ہے۔ لہذا جو پھیپھڑے پہلے ہی سے شکم مادر میں مکمل ہو کر کام کرنے کیلئے پوری طرح آمادہ ہو چکے تھے، وہ خدا کے ایک فرمان کے ذریعہ اچانک کام کرنا شروع کر دیتے ہیں جو یقیناً عجائبات میں سے ہے۔

(ب) بندناف بند ہو جاتا ہے اور خشک ہو کر گر جاتا ہے۔ (بندناف جو ”جفت“ کے توسط سے ماں کے خون سے غذا حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے، اسے عام طور پر کاٹ دیتے ہیں، لیکن اگر اسے نہ بھی کاٹیں تو وہ بالترتیب خشک ہو کر گر پڑے۔

یعنی بوقت ولادت جس طرح آکسیجن کے حصول کا راستہ تبدیل ہو جاتا ہے اسی طرح غذا حاصل کرنے کا راستہ بھی اچانک بدل جاتا ہے اور منہ معدہ اور انتڑیاں جو جنینی کی مدت کے دوران مکمل طور پر بن کر تیار ہو چکی تھی لیکن ابھی تک اپنا کام شروع نہیں کیا تھا، اچانک کام شروع کر دیتی ہیں اور یہ انسانی تخلیق کی ایک اہم حیرت آفرین صورت حال ہے۔

## ۱۲۔ بچے کا رونا

نومود بچے عام طور بہت گریہ کرتے ہیں، اور ممکن ہے کہ ان کا یہ گریہ ان کی پریشانی اور تکلیف کی وجہ سے ہو، کیونکہ ان کے پاس اپنی تکلیفوں کے بیان کیلئے ”گریہ کی زبان“ کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں ہوتی، یا پھر بھوک اور پیاس کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے اور ممکن ہے کہ دنیا کی نئی صورت حال کی وجہ سے، کیونکہ زندگی کی نئی کیفیت ممکن ہے ان کے رونے کا سبب بن سکتی ہے۔ مثلاً گرمی ہے، سردی، تیز روشنی ہے وغیرہ۔ لیکن ممکن ہے اس کے علاوہ بھی بچے روتے ہوں اور ان کا یہ گریہ ان کی زندگی اور حیات کی بقاء کی علامت ہے۔

کیونکہ اس موقع پر بچے کو سخت ورزش اور حرکت کی ضرورت ہوتی ہے، جب کہ وہ ورزش پر قادر نہیں ہوتے صرف ایک ہی ورزش ہوتی ہے جو اس کے ہاتھ، پاؤں، سینہ اور پیٹ کے ڈھانچے کو متحرک کرے، خون کو تیزی سے تمام رگوں میں پہنچانے کا سبب بنے اور متواتر تمام خلیوں کو غذا رسانی کا موجب بنے وہ صرف اور صرف ”رونے کی ورزش“ ہے جو ایک نومولود کیلئے ایک مکمل ورزش سمجھی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اگر نومولود گریہ نہ کرے تو اسے سخت نقصان پہنچنے کا زبردست اندیشہ ہوتا ہے اور اس کی زندگی مکمل طور پر خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

علاوہ ازیں بچوں کے مغز میں رطوبت فراوانی کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ اگر وہ وہیں پر رہ جائے تو اس کیلئے کئی خطرناک بیماریوں اور دردوں کا سبب بن جائے، یا بچے کے اندھا ہو جانے کا موجب بن جائے۔ اسی لئے رونا اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ اضافی رطوبتیں آنسوؤں کی صورت میں آنکھوں سے باہر گرتی ہیں جس سے بچے کی تندرستی اور سلامتی کی ضمانت مل جاتی ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اپنی ایک مشہور حدیث ”توحید مفضل“ میں اس چیز کی طرف اشارہ فرمانے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

”چونکہ والدین کو رونے کے فوائد کا علم نہیں ہوتا اس لئے وہ کوشش کرتے ہیں کہ اسے ہر ممکن طریقہ سے چپ کرایا جائے اور رونے سے باز رکھا جائے، کیونکہ انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ رونے کے فوائد کیا ہیں۔“<sup>[۱]</sup>

نیز اسی روایت میں حضرت امام علیہ السلام نے بچے کے منہ سے لعاب جاری رہنے کے متعلق بھی ارشاد فرمایا ہے کہ بچے کے منہ کا لعاب درحقیقت اس کے آنسوؤں کی کمی کو پورا کرتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

”خداوند دانا و بینا نے اس طرح مقرر رکھا ہے کہ بچے کی اضافی رطوبتیں اُس کے منہ سے نکلتی رہیں تاکہ وہ بڑا ہو کر ہر قسم کی صحت سے بہرہ مند رہے۔“<sup>[۲]</sup>

### ۱۳۔ بچوں میں بالترتیب عقل اور حواس کی بیداری

اگر اوائل ہی سے بچے کے پاس عقل ہوتی تو وہ یقینی طور پر بہت ہی پریشان ہوتا، کیونکہ وہ اپنی ناتوانی اور ذلت کا احساس کرتا، وہ اس لئے کہ وہ یہ احساس کرتا کہ وہ آخر کیوں چل پھر نہیں سکتا؟ کیوں غذا کھا نہیں سکتا؟ کیوں معمولی سی بھی حرکت نہیں کر سکتا؟ کیوں اسے دوسرے لوگ ایک کپڑے میں لپیٹ کر گھوڑے میں سلائیں یا اسے خشک و تر کریں وغیرہ وغیرہ۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مشہور حدیث ”توحید مفصل“ میں بیان فرماتے ہیں:

”علاوہ ازیں اگر وہ عاقل پیدا ہوتا اور مستقل زندگی کا حامل ہوتا تو طفلانہ حرکات کی شیرینی، تربیت اولاد کی مٹھاس اور اس راہ سے اولاد اور والدین کے درمیان پیدا ہونے والا عمر بھر کا رابطہ بالکل ختم ہو جاتے۔“<sup>[۳]</sup>

ان سے باتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے اس کے ایک مکمل طور پر نئی اور ان جانی دنیا میں قدم رکھنے سے اس کے دل میں استقدر وحشت اور اضطراب اور پریشانی پیدا کر دیتا کہ اس کے اعصاب اور افکار بڑی حد تک متاثر ہوتے اور کرب و تنگی سے دوچار ہوتے۔ لیکن وہ لایزال قدرت جس نے انسان کو ارتقاء کیلئے خلق فرمایا ہے، اس نے ان سب چیزوں کو پیش نظر رکھ کر اسے اس جہان میں بھیجا ہے۔

اسی طرح اگر اس کے حواس مکمل ہوتے تو وہ جب ایک مرتبہ آنکھ کھولتا تو اچانک نئے ماحول کا مشاہدہ کرتا اور اس کے کان نئی نئی آوازیں کو سنتے ممکن ہے کہ بسا اوقات ان کے سننے کی تاب ان میں نہ ہوتی۔ اس لئے یہ امور تدریجی طور پر اور یکے بعد دیگرے انجام پاتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

”وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ

[۱] بحار الانوار، جلد ۳ ص ۶۵، ۶۶

[۲] بحار الانوار، جلد ۳ ص ۶۵، ۶۶

[۳] بحار الانوار، جلد ۳ ص ۶۶۲، ۶۵



تَشْكُرُونَ“ (خداوند عالم نے تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں سے باہر نکالا جب کہ اس وقت تم کچھ نہیں جانتے تھے اور تمہارے لئے کان، آنکھیں اور عقول بنائے تاکہ تم اس کی نعمت کا شکر بجالاؤ) (نحل/ ۷۸)

اس آیت کی رُو سے ابتدا میں اسان کے پاس کچھ بھی علم نہیں ہوتا، حتیٰ کہ اس کے کان اور آنکھیں بھی نہیں ہوتی، پھر خداوند عالم اُسے سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی قوت عطا کرتا ہے۔ ”ابصار“ (آنکھوں) کے ذکر سے پہلے ”سمع“ (کانوں) کا ذکر شاید اس لئے ہے کہ نومولود میں سب سے پہلے کانوں کی سرگرمی کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر ایک مدت کے بعد آنکھیں دیکھنے کی توانائی پیدا کرتی ہیں حتیٰ کہ جس طرح پہلے بتایا جا چکا ہے، بعض افراد اس بات کے قائل ہیں کہ عالم جنین ہی میں کم و بیش سننے کی قدرت ہوتی ہے اور وہ ماں کے دل کی دھڑکنوں کو سنتا ہے اور اس کے ساتھ مانوس ہوتا ہے۔

## ۱۴۔ غذا پہلے، بچہ بعد میں

انسان اور بہت سے دوسرے حیوانات کے نومولود آغازِ ولادت میں سخت اور ثقیل غذا سے استفادہ کی قدرت نہیں رکھتے۔ اسی لئے آفرینش کے قدرت مند ہاتھ نے ”دودھ“ نامی مخصوص غذا ان کی ماؤں کے پستانوں میں فراہم کر دی ہے۔ یہ دودھ درحقیقت وہی خون ہوتا ہے جو جنین کے شکم مادر میں ہونے کے دوران جنین کی غذا کا کام دیتا ہے۔ ایک نہایت ہی وسیع اور جلدی سے انجام پانے والی تبدیلی کے ذریعہ وہ دودھ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور ایک ضروری مدت تک بچے کی غذا کا کام دیتا رہتا ہے۔

حمل کے ایام میں ماں کے پستان تدریجی صورت میں تبدیلی اختیار کرتے رہتے ہیں۔ ”جفت“ PLACENTA سے نپکنے والی رطوبتیں ماں کے خون میں پڑتی ہیں تو وہ پستانوں کو نم و دار کرتا ہے کہ جس سے پستان دن بدن بڑھنے لگتے ہیں اور اپنے آپ کو ایک اہم اور سنگین وظیفہ کی ادائیگی کیلئے تیار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ پستان میں جو نالیوں ہوتی ہیں اور وہ نپل NIPPLE تک ملی ہوتی ہیں، ایک تو بڑھ جاتی ہیں اور دوسرے پھیلی جاتی ہیں اور ان سے مختصر سا ترشح بھی ہونے لگتا ہے یہ بچے کی پیدائش کے وقت اپنے کام کی انجام دہی کیلئے مکمل طور پر آمادہ ہو چکی ہوتی ہے۔ اور پھر قابل توجہ یہ بات ہے کہ دودھ کا پستانوں سے ترشح مستقل صورت میں نہیں ہوتا، وگرنہ وہ ہمیشہ باہر بہتا رہتا، بلکہ جونہی نومولود کے لب ماں کے پستان تک پہنچے اور اُسے چوسنا شروع کیا تو اعصاب میں حرکت پیدا ہونا شروع ہوگئی اور وہاں سے حرام مغز MYLO اور حرام مغز سے ہپوٹالیموس تک جا پہنچی اور دو طرح ترشح کا موجب بن گئی۔ ایک قسم کا ترشح تو یہ ہوتا ہے کہ خون نالیوں سے پستان کی طرف جاتا ہے دودھ کے راستوں کے اطراف کی باریک باریک رگوں کی مقبض (سیکٹر) دیتا ہے، اور ان پر یہ دباؤ ڈالتا ہے کہ سارے کے سارے دودھ کا رخ NIPPLE کی طرف موڑ دیں۔ یہ سارا عمل صرف (۳۰) سیکنڈ میں مکمل ہو جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ دودھ صرف اسی پستان ہی سے جاری ہونا شروع نہیں ہوتا جسے نوزاد نے منہ لگایا ہے بلکہ دونوں پستانوں سے یہ عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اسی لئے تو اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ نومولود کو دونوں پستانوں سے دودھ پلایا جائے۔

دودھ ایک مکمل غذا ہے خصوصاً نومولود کیلئے ماں کا دودھ ایک کامل ترین غذا سمجھا جاتا ہے اور دنیا میں کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

دودھ میں کئی VITAMIN پائے جاتے ہیں خصوصاً وٹامن A، وٹامن B اور وٹامن D اور وٹامن P وغیرہ دانشوروں کی طرف سے اس میں موجود بائیس قسم کے مختلف مادے بھی دریافت ہو چکے ہیں علاوہ ازیں کئی ”آفریم“<sup>[۱]</sup> بھی اور نو مولود کیلئے ضروری دوائیں بھی ماں کے دودھ کے ساتھ اس کو منتقل ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو بچے ماں کے دودھ سے محروم ہو جاتے ہیں وہ کئی قسم کی ناتوانیوں اور کمزوریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ماں کا دودھ صرف بچے کی غذا ہی کا کام نہیں دیتا بلکہ اس کی باطنی مہر و محبت اور روحانی غذا کا موجب بھی بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ماں کے دودھ سے محروم ہوتے ہیں ان میں کئی قسم کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور مہر و محبت کے جذبہ سے بھی محروم ہوتے ہیں۔ اسی لئے قرآن مجید فرماتا ہے:

”وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُنْفِخَ الرِّضَاعَةَ“ ما نسیں اپنی اولاد کو مکمل دو سال دودھ پلاتی رہیں، یہ ان کیلئے ہے جو دودھ پلانے کی مدت کو مکمل کریں۔ (بقرہ / ۲۳۳)

دودھ کی حیران کن تفصیلات اور بھی ہیں جو اس مختصر سی کتاب میں درج نہیں کی جاسکتیں۔ اگر عنانِ قلم کو اس قسم کی مباحث کیلئے چھوڑ دیا جائے تو پھر ہم تفسیری بحث سے خارج ہو جائیں گے۔

[۱] مزید تفصیل کیلئے ”دائرة المعارف قرن بیستم“ (مادہ ”لبن“) اور ”اولین دانش گاہ“ جلد ۶۔ نیز ”عجاز قرآن از نظر علوم امروز“ کا مطالعہ فرمائیں البتہ ”توحید مفضل“

والی حدیث میں بھی اس بارے میں دلچسپ اشارے ملتے ہیں ملاحظہ ہو بحار الانوار جلد ۳ ص ۶۲

## ۳۔ عالم حیات میں اس کی نشانیاں

اشارہ:

جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے حیات یعنی زندگی کائنات کی ایک ایسی پیچیدہ ترین چیز ہے کہ تمام دانشوروں کی عقلیں اس کے بارے میں حیران ہیں۔ ہزاروں سال سے صاحب فکر و نظر افراد اس کے بارے میں غور و فکر کرتے چلے آ رہے ہیں، لیکن ابھی تک یہ معمہ حل نہیں کر سکے۔ آخر وہ کیسے اسباب اور کون سے عوامل ہیں کہ ایک ہی جنبش سے ایک بے جان چیز حیات اور زندگی کے مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے، غذا حاصل کریت ہے، نشوونما پاتی ہے اور اپنی طرح کی چیزیں پیدا کرتی ہے؟

ممکن ہے کہ انسان کئی صدیوں کے تجربے کے بعد کوئی پیچیدہ آلہ (مثلاً نہایت درجہ ترقی یافتہ الیکٹرانک دماغ وغیرہ) بنا لے۔ اگرچہ یہ بھی بجائے خود اس کے موجدین کے علم و دانش کے وسیع ہونے کی دلیل ہے، لیکن وہ آلہ خواہ کتنا ظریف، لطیف اور پیچیدہ کیوں نہ ہو قطعاً نشوونما نہیں پائے گا، اپنے عیوں اور ٹوٹ پھوٹ کا اعلان نہیں کرے گا، اپنے طرح کی چیزوں کی تولید کی تو بات ہی اور ہے۔

زندہ اور موجود چیزیں اپنی اعلیٰ درجے کی ظریف و لطیف، پیچیدہ اور مجرب العقول ساخت کے علاوہ یہ سارے کام انجام دیتی ہیں اور ان کے علاوہ اور بھی کئی کام سرانجام دیتی ہیں کہ ان کے بارے میں انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ اور ان کے امور کی انجام دہی کے بارے میں مختصر سے مطالعہ سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ ایسی چیزوں کا وجود ان کے خالق کے بے انتہا علم اور قدرت کی واضح روشن اور آشکار دلیل ہے۔

قرآن مجید نے خدا کے وجود کے ثابت کرنے اور ہر طرح کے شریک کی نفی کرنے کیلئے ”حیات اور موت“ کے موضوع پر زیادہ زور دیا ہے اور کئی مختلف آیات میں اس موضوع کی اہمیت کو اچھی طرح بیان فرمایا ہے اور یہ ہے بھی حقیقت۔ اس مختصر سے اشارے کے بعد ہم مل کر مندرجہ ذیل آیات کو گوش دل سے سماعت کرتے ہیں:

۱۔۔۔ إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَى يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ذَلِكُمْ اللَّهُ فَأَنَّى تُؤْفَكُونَ

(انعام/۹۵)

۲۔۔۔ كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أُمَّرَةً فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمَيِّتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ

(بقرہ/۲۸)

- ۳۔۔۔ هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَالْيَهُ تُرْجَعُونَ (يونس/۵۶)
- ۴۔۔۔ وَهُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ  
(مؤمنون/۸۰)
- ۵۔۔۔ إِنَّ اللَّهَ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ  
مِن وَلِيٍّ وَلَا لِيٍّ صَبِيرٍ (توبه/۱۱۶)
- ۶۔۔۔ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ (دخان/۸)
- ۷۔۔۔ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ أَذَقَ لَهُ  
رَبِّهِ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أَحْيِي وَأُمِيتُ بقرہ/۲۵۸)
- ۸۔۔۔ إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَيُمِيتُ وَاللَّيْلُ الْمَبْصُورُ (ق/۳۳)
- ۹۔۔۔ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ هَلْ مِنْ  
شَرِّ كَائِدَةٍ مَّن يَفْعَلُ مِنْ ذَلِكَ مِّنْ شَيْءٍ سُبْحٰنَهُ، وَتَعَلَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ  
(روم/۳۰)
- ۱۰۔۔۔ وَاللَّهُ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا إِنَّ فِي ذَلِكَ  
لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ (نحل/۶۵)

## ترجمہ

- ۱۔۔۔ خداوند عالم دانے اور گٹھلی کو شگافتہ کرنے والا ہے، زندہ کو مردے سے خارج کرتا ہے اور مردے کو زندہ سے، یہ ہے خداوند یکتا، پس تم راہِ حق سے کیونکر منحرف ہوتے ہو؟
- ۲۔۔۔ تم خداوند عالم کے ساتھ کیونکر کفر کرتے ہو جب کہ تم مردہ جسم تھے، اس نے تمہیں زندہ کیا، پھر تمہیں موت دے گا اور دوبارہ زندہ کرے گا۔ پھر تم اسی کی طرف پلٹا جاؤ گے۔
- ۳۔۔۔ وہ وہی ہے جو تمہیں زندہ کرے گا اور مارے گا اور تم اسی کی طرف لوٹا دیئے جاؤ گے۔

۴۔۔ خدا تو وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور دن اور رات کا آنا جانا بھی اسی کیلئے ہے، تو کیا تم غور و فکر سے کام نہیں لیتے؟

۵۔۔ آسمانوں اور زمین کی حکومت اسی کیلئے ہے (وہ) زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے، خدا کے علاوہ تمہارا کوئی اور مددگار نہیں ہے۔

۶۔۔ اس کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں، وہ زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ وہ تمہارا پروردگار ہے اور تمہارے پہلے آباؤ اجداد کا بھی۔

۷۔۔ کیا تو نے نہیں دیکھا (اور نہیں جانتے) اس شخص کو جس نے ابراہیمؑ کے ساتھ اس کے رب کے بارے میں مناظرانہ گفتگو کی کیونکہ خدا نے اُسے حکومت دی ہوئی تھی، جب ابراہیمؑ نے کہا میرا رب زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے، تو اس نے کہا میں زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔

۸۔۔ ہم ہیں کہ زندہ کرتے اور موت دیتے ہیں اور ہماری ذات کی طرف ہی بازگشت ہے۔

۹۔۔ خداوندِ عالم وہی تو ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہیں رزق و روزی دی، پھر موت دے گا اور پھر زندہ کرے گا۔ کیا جن لوگوں کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو، ان کاموں میں سے کچھ کر سکتے ہیں؟ وہ پاک ہے اور ہر اس چیز سے بالا و برتر ہے جس کو اس کا شریک بناتے ہیں۔

۱۰۔۔ خدا نے آسمان سے پانی بھیجا اور زمین کو اس کے مُرد ہونے کے بعد زندہ کیا، اس میں ان لوگوں کیلئے واضح نشانی ہے جو سننے والا کان رکھتے ہیں۔

## الفاظ کے معنی اور تشریح

”حیات“ کے بارے میں ”راغب“، ”مفردات“ میں کہتے ہیں:

”حیات کے مختلف معانی ہیں۔ حیاتِ نباتی (نباتات کی زندگی)، حیاتِ حسی (حیوانات کی زندگی) اور حیاتِ عقلی (انسانی زندگی) حیات کے ایک معنی ”نعم و اندو کا برطرف ہونا“ بھی ہیں۔ حیاتِ اخروی اور جاودانی اور وہ حیات جو خداوندِ عالم کے اوصاف میں شمار ہوتی ہے۔“ وہ اس موقع پر ہر ایک کیلئے قرآن مجید کی آیات سے شاہد لاتے ہیں لیکن کتاب ”مقائیس اللغۃ“ میں اس لفظ کے دو اصلی معنی ذکر کرتے ہیں، ایک وہ ”حیات“ جو ”موت“ کے مقابلے میں ہے اور دوسرا ”حیاء“ جس کا مخالف نقطہ ”بے حیائی“ اور ”بے شرمی“ ہے۔

لیکن بعض دوسرے دانشوروں کا عقیدہ ہے کہ دونوں معانی ایک ہی اصل کی طرف لوٹتے ہیں، کیونکہ جو شخص حیا اور شرم کا حامل ہوتا ہے وہ خود کو ضعف اور ناتوانی سے بچائے رکھتا ہے اور خیر اور پاکیزگی کی طرف گامزن رہتا ہے۔ اگر بڑے سانپ کو ”حیہ“ کہا جاتا ہے تو یہ اس کی شدت کے ساتھ حرکت ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ ”حیہ“ کہلاتا ہے۔ اور یہی حرکت اس کی زندگی کے واضح ترین آثار میں شمار ہوتی ہے۔ نیز قبیلہ کو ”حی“ اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں ایک قسم کی اجتماعی اور گروہی حیات موجود ہوتی ہے۔<sup>[۱]</sup>

”موت“، ٹھیک ”حیات“ کا نقطہ مقابل ہے۔ لہذا حیات کی طرف اس کی بھی کئی مختلف قسمیں ہیں، جن میں سے ایک ”موتِ نباتی“ ہے، جیسا کہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں فرمایا ہے ”أَحْيَيْتُنَا بِهٖ بَلَدًا مَّيِّتًا“ یعنی ہم نے اس کے ذریعہ مردہ زمین کو زندہ کر دیا ہے (سورہ ق/۱۱) اور ”حیوانی موت“ اور ”عقلانی موت“ یعنی جہالت، ”موت“ بمعنی غم و اندوہ کے بھی ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

”وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ“ اس کے پاس ہر طرف سے غم و اندوہ پہنچ جاتے ہیں جب کہ وہ مردہ نہیں ہے۔ (ابراہیم/۱۷) موت نیند کے معنی میں بھی آتی ہے، جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ”نیند خفیف سی موت ہے“ جب کہ ”موت گہری نیند ہے“۔

بعض لوگوں نے موت کے یہ معنی بھی کئے ہیں ”کسی زندہ موجود کی تدریجی تحلیل“ اور ”موتہ“ جنون یعنی دیوانگی جیسی حالت کو کہتے ہیں، گویا عقل اور علم اس حالت میں مرجاتے ہیں۔

بعض حضرات نے ”میت“ اور ”مائت“ کے درمیان فرق بتایا ہے اور کہا ہے ”میت تو ”مردہ“ کو کہتے ہیں، ”مائت“ اس چیز کو کہتے ہیں جو جل ہوتی جا رہی ہو اور مرنے کے قریب جا پہنچی ہو۔ اس لفظ کے کنا یہ والے معانی تو بہت ہی زیادہ ہیں جن سے ”کفر“، ”خواب“ اور ”خوف“ وغیرہ ہیں۔

نجر زمینوں کو ”موات“ اسی لئے کہتے ہیں کہ ان میں نباتاتی حیات کا فقدان ہوتا ہے۔ اور وہ زراعت اور کاشتکاری کیلئے آمادہ نہیں ہوتی۔ لیکن جب زراعت اور کاشتکاری کے قابل ہو جاتی ہے تو اسے ”مہیات“ کہتے ہیں۔

”مقائیس اللغۃ“ میں آیا ہے کہ اس لفظ کے اصل معنی ”طاقت کا ختم ہو جانا ہیں“ اور زندہ موجودات کی موت اس کے ظاہر تین مصداقوں میں سے ایک ہے۔

[۱] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، مفردات راب، لسان العرب، مجمع البحرین اور لغت کی دوسری کتابیں

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### حیات کی آفرینش، آفرینش کا شاہکار ہے:

مذکورہ بالا دس آیات میں اور قرآن مجید کی کئی دوسری آیات میں موت و حیات کے مسئلہ پر بعنوان ”خداوند جل شانہ کی دو عظیم ترین آیات“ کے بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ بیشتر آیات میں تو انسان کی موت و زندگی پر گفتگو کی گئی ہے۔ بعض آیات میں بطور عام موت و حیات کا ذکر کیا گیا ہے، یعنی تمام ذی حیات چیزوں کا اور بعض میں نباتات کی موت و حیات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

اسی سلسلے کی سب سے پہلی آیت میں خداوند قادر و قہار کی قدرت کے ذریعہ دانے اور گٹھلی کے شگافتہ ہونے، زندہ چیز کو مردہ سے اور مردہ چیز کو زندہ سے باہر نکالنے کا تذکرہ ہے۔ یعنی موت و حیات کے وسیع معنی کے لحاظ سے نباتات، حیوانات اور انسان کی قوت کا ذکر ہے۔ جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ نباتات کے دانے محکم اور مضبوط ہوتے ہیں اور گٹھلیاں ان سے بڑھ کر مضبوط، کہ جن کا آسانی سے چیرنا بھی ناممکن ہوتا ہے۔ لیکن ان سے جو کوئی پھوٹی ہیں وہ اس قدر نازک، باریک اور لطیف ہوتی ہیں کہ جن کا کوئی حد و حساب نہیں ہوتا۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہوتا ہے کہ یہ لطیف و نازک کوئی اس قدر مضبوط و محکم قلعہ کو پھاڑ کر اس سے اپنا سر باہر نکال لیتی ہیں؟ اور صرف سر ہی باہر نہیں نکالتیں، پروان بھی چڑھتی رہتی ہیں؟ تو کیا یہ سب کچھ خداوند قادر و قدیر کی قدرت کے بغیر ممکن ہو سکتا ہے؟ اور ان اللہ فائق الحب و النوی کا جملہ گویا اسی بات کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔

خداوند عالم مردے کو زندہ سے اور زندہ کو مردہ سے کیونکر باہر نکالتا ہے؟ اس بارے میں بہت سے متقدم مفسرین نے نمونہ کے طور پر انڈے سے چوزے کا پیدا ہونا، گٹھلی اور دانے سے درختوں اور نباتات کا پیدا ہونا اور نطفہ سے انسان کا پیدا ہونا ذکر کیا ہے، جب کہ موجودہ تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ زندہ چیزیں ہمیشہ زندہ چیزوں سے ہی وجود میں آتی ہیں۔ یعنی درختوں اور دیگر نباتات کے دانوں (بیجوں) اور گٹھلیوں میں غذائی مواد FOOD MATTER کے علاوہ ایک زندہ خلیہ بھی ہوتا ہے جو حقیقت میں ایک نہایت ہی باریک اور ناقابل رویت درخت یا نباتات ہوتا ہے۔ جب اُسے کوئی مناسب ماحول میسر آ جائے تو وہ اس غذائی مواد سے بہرہ وری کرتے ہوئے نشوونما پانا شروع کر دیتا ہے۔ اسی طرح انسان اور جانوروں کے نطفہ میں بھی بے حد زندہ خلیے ہوتے ہیں، جو درحقیقت انسان یا حیوان کی پیدائش کا مبداء واقع ہوتے ہیں۔

بعض معاصر مفسرین (تفسیر مراغی اور تفسیر المنار کے مفسرین کی مانند) اس بات کی طرف اس اشکال کی وجہ سے متوجہ ہوئے ہیں اور اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ مخصوص خلیے اگرچہ سائنسدانوں کے عرف میں وہ زندہ محسوب ہوتے ہیں لیکن عرف عام اور لغت میں وہ اس عنوان کے شائستہ اور لائق نہیں ہیں کیونکہ ان میں زندگی اور حیات کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے: مردہ سے زندہ کے نکلنے سے مراد ان دو معانی میں سے ایک لیا جائے۔

ایک تو یہ کہ اگرچہ موجودہ حالات میں زندہ اور موجود چیزیں ہمیشہ زندہ بیجوں، دانوں اور نطفوں سے باہر آتی ہیں، لیکن یہ بات بھی مسلم ہے کہ وہ آغاز میں ایسے نہیں تھے۔ کیونکہ جب کرہ زمین، چاند سے جدا ہوا تو اس وقت یہ کرہ مکمل آگ تھا، اور کوئی بھی زندہ چیز اس میں موجود نہیں تھی۔ پھر ان حالات کے تحت جن کی حقیقت آج تک ہم سے مخفی ہے، خداوند عالم کے حکم کے مطابق پیچیدہ ترین قوانین کے تحت سب سے پہلی زندہ چیز، بے جان چیزوں کے وجود سے معرض وجود میں آئی۔

لیکن بعض لوگوں کا یہ مفروضہ ہے کہ پر وہ مصر بھی ہیں کہ کرہ زمین پر حیات دوسرے گروں سے آسانی پتھروں کے ذریعہ منتقل ہوئی ہے لیکن یہ مفروضہ کسی مشکل کو حل نہیں کرتا، کیونکہ اس طرح سے بات پھر دوسرے گروں تک چلی جائے گی، کیونکہ آغاز میں بطور مسلم وہ بھی گرم اور بھسم کر دیتے تھے، اور جن چیزوں کو ہم جانتے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسی حرارت میں زندگی کی تاب نہیں رکھتی تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اولین بیج اور دانہ یا نطفہ ایک نہایت ہی مختصر اور چھوٹی سی چیز ہے۔ لیکن اسی بے جان مواد سے غذا حاصل کرنے کے طریقے نشوونما پاتے ہیں اور حقیقت میں وہ بے جان موجودات کو جذب کر کے جاندار بناتے ہیں۔ لہذا اس طرح لاکھوں کروڑوں زندہ خلیئے، مردہ موجودات سے خارج ہوتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں کہہ سکتے ہیں کہ ”خداوند علم مردہ کو زندہ سے اور زندہ کو مردہ سے باہر نکالتا ہے۔“ بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ اس تعبیر سے مراد، ”کافر“ کا ”مومن“ سے اور ”مومن“ کا ”کافر“ سے پیدا ہونا ہے، یا سقط شدہ بچے کا زندہ ماں کے پیٹ سے باہر آنا اور زندہ بچے کا ناگہانی طور پر مرنے والی ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا ہے۔

لیکن بطور مسلم یہ سب اس آیت کے کلی مصداقوں میں سے چند ایک مصداق ہیں نہ کہ آیت کا تمام مفہوم، آیت کا اصل مفہوم مذکورہ مفہوموں میں سے ایک ہے جو اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ بہر حال زندگی اور حیات کا مسئلہ اس قدر پیچیدہ ہے کہ دانشور صاحبان اب تک اس کے اسرار سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس مقام پر دعوتِ فکر یہ ہے کہ اگر کسی چیز کے اسرار کو سمجھنے کیلئے اس قدر عقل اور ہوش و ذکاوت کی ضرورت ہوتی ہے تو کیا اس چیز کی ایجاد بغیر کسی عقل و ہوش کے حاصل ہو جاتی ہے؟

اس لئے تو قرآن مجید اسی آیت کے آخر میں صراحت کے ساتھ فرماتا ہے: ”ذَالِكُمْ اللهُ فَأَلَىٰ تُو فَاكُونَ“ یہی خداوند وحدہ لا شریک ہے جو گٹھلی اور دانے کو شگافتہ کرتا ہے، زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے باہر نکالتا ہے پس تم کس طرح حق سے روگردانی کرتے ہو؟“ دوسری آیت میں متنبہ کر کے سوال کیا گیا ہے ”تم کیونکہ خداوند یگانہ کا انکار کرتے ہو؟ جب تم مردہ تھے خدا نے تمہیں زندہ کیا اور پھر مارے گا اور اس کے بعد زندہ کرے گا۔“ (كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ) اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صرف موت اور حیات کا مسئلہ ہی خدا کی شناخت کیلئے کافی ہے۔

بالفاظ دیگر تخلیق کی دنیا میں موت اور حیات سے پہلے اسی چیز کو ملاحظہ کرتا ہے۔ انسان اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی حیات اس کی اپنی حرف سے نہیں ہے کیونکہ ایک دن تھا کہ وہ بے جان چیزوں کے زمرے میں شمار ہوتا تھا، کسی اور نے اسے حیات کا یہ تحفہ دیا ہے اور وہ بھی بڑے اسرار و رموز اور نظریات، لطافتوں اور پیچیدگیوں سے بھرا ہو۔

بعض مفسرین نے یہاں پر ”کفر“ سے مراد ”کفرانِ نعمت“ لیا ہے، یعنی موت و حیات کی نعمت کا کفران، وہی موت جو دوسری حیات



کا پیش خیمہ ہوتی ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہاں پر کفر خدا کے وجود کا انکار یا توحید کے انکار کے معنی میں ہے۔  
ضمنی طور پر یہ بات بھی مد نظر رہے کہ اس آیت میں مسئلہ معاد پر بھی توجہ دی گئی ہے یعنی موت اور حیات کی تخلیق جہاں پر خدا کی توحید کی دلیل ہے وہاں پر معاد کے امکان کی دلیل بھی شمار ہوتی ہے۔

تیسری آیت اگرچہ آیات معاد کے ذیل میں قرار پائی ہے، لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، موت اور حیات کا مسئلہ خدا کے وجود کے ثبوت کیلئے بھی اور معاد کے وجود کیلئے بھی دلیل ہے ((هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ)) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ موت اور حیات صرف اسی کے ہاتھ میں ہیں اور اس قسم کی محیر العقول اور تعجب خیز تخلیق اس کے سوا کسی اور کے بس کی بات نہیں۔

چوتھی آیت، سورہ مومنوں میں آیات توحید کے بعد ذکر ہوئی ہیں اور اس میں دو مسائل پر زور دیا گیا ہے، ایک تو ہے ”موت و حیات“ کا مسئلہ اور دوسرا ”رات اور دن کے آنے جانے“ کا مسئلہ اور ان دونوں کی آپس میں بڑی حد تک مشابہت بھی ہے، موت تاریکی کی مانند ہے جب کہ حیات روشنی کی طرح، رات کو پہلے اور دن کو بعد میں ذکر کرنے کا مقصد بھی شاید یہی ہو کیونکہ موت، حیات سے پہلے تھی اور انسان پہلے مردہ اجزاء تھا، پھر خدا نے اسے زندگی کا لباس پہنایا۔

”اختلاف لیل و نہار“ خواہ رات اور دن کے آنے جانے کے معنی میں ہو (اگر ”خلفہ“ (بروزن حرفہ کے مادہ سے ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں یکے بعد دیگرے آنا اور ایک دوسرے کا جانشین ہونا) یا فرق و اختلاف اور سال کے مختلف موسموں میں بتدریج تبدیلی کے معنی میں ہو) اگر ”خلاف“ کے مادہ سے ہو جس کا معنی یہی ہوتا ہے) اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ایک ایسا نظام حکم فرما ہے جس میں بال برابر بھی فرق نہیں ہے اور اس میں چار موسم پائے جاتے ہیں۔ اور ان چار موسموں کی اپنی اپنی برکات ہیں، جیسا کہ موت و حیات کا مسئلہ اور اس پر حکم فرما دقیق نظام ہے جس کے انسان معاشرے میں بڑی حد تک آثار اور نتائج ملتے ہیں، جن کے بغیر انسانی زندگی کا نظام درہم برہم ہو سکتا ہے۔  
اگر کوئی بھی شخص نہ مرتا تو زمین رہنے کے قابل نہ ہوتی۔ اگر سب لوگ جلدی جلدی مرتے جاتے تو زمین پر رہنے والا کوئی دکھائی نہ دیتا، لیکن اس کائنات کے خالق نے ایسے سچے تلے نظام کو ان پر حکمران بنا دیا ہے کہ اس زمین پر ہمیشہ کئی قومیں رہ رہی ہوتی ہیں جو زندگی کے عطیہ سے استفادہ کرتی رہتی ہیں اور ان ہی میں سے کچھ لوگ جا رہے ہوتے ہیں تو کچھ آ رہے ہوتے ہیں۔

اسلئے تو آیت کے آخر میں فرماتا ہے ”أَفَلَا تَعْقِلُونَ“ کیا تم غور و فکر نہیں کرتے؟ خالق کی قدر، ربوبیت اور وحدانیت میں بھی اور اس بات میں بھی کہ اس اچھوتے نظام کا کسی علم و تدبیر کے بغیر وجود میں آنا محال ہوتا ہے۔

پانچویں آیت میں زمین اور آسمانوں کی مالکیت اور حاکمیت کے ذکر کے بعد موت اور حیات کے مسئلہ کو بیان فرمایا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ موت و حیات کا مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ اُسے زمینوں اور آسمانوں کی پیدائش کے ساتھ ساتھ ہی بیان کیا جائے  
آیت کے آخر میں فرماتا ہے ”وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَلَا نَصِيْرٍ“ یعنی جب ہر قسم کی قدرت و طاقت اور زمین و آسمان کی حاکمیت خداوند تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور اس کے علاوہ نہ تو کوئی ولی، سرپرست اور محافظ و ناصر و مددگار ہے، تو پھر اس کے غیر کے پاس پناہ ڈھونڈنے کا کیا مقصد؟

چھٹی آیت میں موت و حیات کا مسئلہ ربوبیت کے مسئلہ کے ساتھ ہی بیان ہوا ہے۔ وہی خدا جو تمہارا اپنا اور تمہارا آباؤ اجداد کا رب اور پرورش کرنے والا ہے، وہی موت اور حیات کا خالق ہے۔

اصولی طور پر موت اور حیات کا مسئلہ خدا کی ربوبیت کی ایک شاخ ہے کیونکہ ”ربوبیت“ کے معنی اصلاح کرنا، نظام عطا کرنا اور پرورش کرنا ہیں، اور یہ موت اور حیات کی راہوں کے علاوہ ناممکن ہے۔ ”حیات“ انسان کو ”ارتقاء“ کے امکانات عطا کرتی ہے۔ اور ”موت“ بھی ایک اور وسیع تر کائنات میں نئی زندگی اور ارتقاء کا مقدمہ ہوتی ہے۔

ساتویں آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے زمانے کے جبار بادشاہ ”نمرود“ کے ساتھ گفتگو کو بیان کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ گفتگو حضرت ابراہیمؑ کے بت شکن کے واقعہ کے بعد عمل میں آئی ہے، جب آنجناب ایک ہیرو کی حیثیت اختیار کر چکے تھے اور آپؑ کا شہر چہار دانگ عالم میں پھیل چکا تھا اور نمرود لعین نے آپ کو اپنے دربار میں طلب کر کے آپ کے ساتھ بات چیت کی۔<sup>[۱]</sup>

یہ مغرور شخص جو نشہ حکومت میں بدمست ہو چکا تھا اس نے ابراہیم علیہ السلام سے سب سے پہلا سوال یہی کیا ”تیرا خدا کون ہے؟“ ابراہیم علیہ السلام نے بھی جواب میں سب سے پہلے حیات اور موت کا مسئلہ کا سہارا لیا اور کہا ”میرا پروردگار تو وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے“ (رَبِّی الَّذِیْ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ)

جبار اور سرکش نمرود باوجودیکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرمان کی صداقت اور حقانیت کو اچھی طرح سمجھتا تھا لیکن اپنے ارد گرد والوں کے دماغ اور افکار کو منحرف کرنے اور انہیں غفلت میں ڈالنے کیلئے کہا کہ ایسا تو میں بھی کر سکتا ہوں ”میں زندہ بھی کرتا ہوں اور مارتا بھی ہوں“ (أَنَا أَمِیْتُ)

اس موقع پر اپنے دعویٰ کی صداقت کیلئے نمرود نے کیا کیا؟ قرآن میں تو اس کا تذکرہ نہیں ہے، البتہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ اس نے فوراً حکم دیا کہ دو قیدیوں کو لایا جائے ان میں سزائے موت کا حکم تھا، اسے رہا کر دیا گیا اور دوسرے کو جو بے قصور تھا، سزائے موت دے دی اور کہا، ”دیکھا آپ نے موت و حیات میرے ہاتھ میں ہے۔“

فخر الدین رازی اپنی تفسیر میں اس چیز کو بعید تصور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حاضرین مجلس ایسے بے وقوف نہیں ہو سکتے کہ وہ نمرود کے کاموں اور موت و حیات میں، جو کہ خدا کا کام ہے کوئی فرق محسوس نہ کریں!

حضرت رازی کہتے ہیں کہ دراصل نمرود کا مقصد یہ تھا کہ ”کیا آپ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ خدا کسی واسطے کے بغیر یہ کام انجام دیتا ہے؟ یہ بات تو ٹھیک نہیں ہے، لہذا عالم اسباب کے ذریعہ ہی ایسا ممکن ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں، میں بھی یہ کام انجام دے سکتا ہوں“۔<sup>[۲]</sup>

[۱] یہ بات کہ ”مندرجہ بالا گفتگو حضرت ابراہیمؑ کی بت شکنی کے بعد عمل میں آئی“ متعدد تفسیروں میں مذکور ہے، جن میں ”تفسیر مراغی“ جلد ۳ ص ۱۲۱ اور ”تفسیر فخر رازی جلد ۷ ص ۲۵ زیادہ قابل ذکر ہیں۔

[۲] تفسیر فخر رازی جلد ۷ ص ۲۳

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جناب رازی نے اس نکتہ کو فراموش کر دیا ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں نادان افراد کی تعداد کم نہیں رہی ہے، خصوصاً جب حاکم جابر ہو تو اس کے اطراف میں خوشامدیوں اور چالوسوں کی بھرمار ہوتی ہے۔

اسی سے ملتی جلتی کیفیت حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے حالات میں بھی پائی جاتی ہے کہ فرعون نے اپنے بودے اور مضحکہ خیز دلائل کے ساتھ اہل مصر کو احمق بنایا اور انہیں اپنے بندگی کی دعوت دی۔ جو تفسیر جناب فخر رازی نے بیان فرمائی ہے وہ ان فلسفیوں کی مانند ہے جو آپس میں بیٹھ کر نقطے درست کرتے رہتے ہیں کہ اگر فاعل بالواسطہ ہو تو یوں ہو جائے اور اگر بلا واسطہ ہو تو یوں ہو جائے!!

آٹھویں آیت میں تیسری آیت کی طرح بتایا جا رہا ہے کہ حیات و موت کی تخلیق خدا ہی کے ساتھ خاص ہے اور سب کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے۔

نویں آیت میں مشرکین کو دو ٹوک الفاظ میں مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

”خدا وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، زندگی بخشی اور روزی عطا فرمائی ہے۔ تمہاری موت اور بروز قیامت تمہاری دوبارہ زندگی بھی اسی کے دست قدرت میں ہے۔ تمہارے بتوں میں سے کوئی بت اس طرح کا کام کرنے پر قادر ہے؟ کیا وہ کوئی چیز پیدا کر سکتے یا کسی چیز کو موت دے سکتے ہیں؟ کسی کو روزی عطا کر سکتے ہیں؟ اب جب کہ یہ سب کچھ خدا ہی کیلئے خاص ہے تو پھر تم کسی کو اس کا شریک کیوں ٹھہراتے ہو؟ وہ ان تمام شریکوں سے منزہ اور برتر ہے جو تم اس کیلئے قرار دیتے ہو۔“ (سَبْحَانَہٗ وَتَعَالَىٰ حِکْمَیْہِمْ کُوْنِ)

آخر کار دسویں اور آخری آیت میں نباتات کی حیات کے مسئلہ کو پیش کیا گیا ہے جو حیات کا زیبا اور پراسرار چہرہ ہے، اور مردہ زمینوں کی اس کیفیت کو انسانوں کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے کہ خداوند عالم کیونکر خشک اور زندگی سے عاری بیابانوں کو ایک یا کئی بارشوں کے ذریعہ لباس زندگی پہناتا ہے کہ اس کے ہر گوشے سے نغمہ حیات اُٹھ رہا ہوتا ہے اور روز رستاخیز (قیامت) کا منظر پیش ہو رہا ہوتا ہے۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے ”نباتات کی حیات کے اس مسئلہ میں ان لوگوں کیلئے بہت بڑی نشانی ہے جن کے ہاں سننے والے کان ہوتے ہیں، نباتات کی حمد و تسبیح کے نغموں کو سنتے ہیں اور ہر پودے کے زمزمہ کو حید کو جو زمین سے لگ رہا ہوتا ہے اور سر بلند کر کے وحدہ لا شریک لہ کا ذکر جاری کئے ہوئے ہوتا ہے، گوش جان سے سنتے ہیں۔ (اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآیٰةً لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ)

## مزید تفصیل

### ۱۔ زندگی ایک عظیم معمہ ہے:

انسانی علم و دانش کی پیش رفت نے بہت سے حقائق سے پردہ اٹھا دیا ہے اور اس عظیم کائنات کے بہت سے مسائل کو واضح کر دیا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، اس تمام ترقی کے باوجود انسان کے سامنے بہت سے معمے موجود ہیں جو ابھی حل کرنے کے قابل ہیں، جن میں سے ایک اور ہم ترین معمہ ”معمہ حیات“ ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو لاکھوں کروڑوں دانشمندانوں کی تلاش بسیار اور سعی مسلسل کے باوجود ابھی تک لائینل چلا آ رہا ہے اور ابھی تک ابہام کے پردوں میں اسی طرح چھپا ہوا ہے۔

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے چودہ سال قبل مشرکین کو ان الفاظ میں مخاطب کر کے کہہ دیا ہے:

’يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضَرْبٌ مِّثْلُ مَا اسْتَمِعُوا إِلَهُ، إِنَّ الدِّينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوْ اجْتَمَعُوا إِلَهُ، وَإِنْ يَسْأَلْهُمْ الذُّبَابُ شَيْئًا لَأَسْتَنْفِذُوهُ مِنْهُ ضَعْفَ الظَّالِمِ وَالْمَظْلُومِ‘، اے لوگو! ایک مثال بیان کی گئی ہے جسے تم بھی غور سے سن لو۔ خدا کے علاوہ جن لوگوں کو تم پکارتے ہو وہ تو ایک مکھی پیدا کرنے پر بھی ہرگز قادر نہیں ہیں، اگرچہ اس کام کیلئے وہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ بھی دے دیں اور اگر ان سے ایک مکھی کوئی چیز لے اڑے تو وہ اس سے واپس نہیں لے سکتے۔ طالب اور مطلوب دونوں کمزور اور ناتواں ہیں۔ (بتوں کے عبادت گزار بھی اور ان کے معبود بھی)۔ (حج۔ ۷۳)

پھر مزے کی بات یہ ہے کہ مکھی کے پیدا کرنے کیلئے آج کے ترقی یافتہ انسان کی ناتوانی اور عجز اسی حد تک ہے جو آج سے چودہ سو سال پہلے تھے، بلکہ اس کے برعکس آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی انسان اس قدر عاجز ہے کہ جب مکھی کھیاں یا ٹڈیاں یا کوئی اور حشرات الازض اس پر حملہ آور ہوتے ہیں تو زیر پاشی کے تمام جدید اور ماڈرن وسائل کو استعمال کر کے بھی ان سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔

ہو سکتا ہے کہ اس موقع پر کوئی یہ کہہ دے کہ انسان نے ایسی ایسی چیزیں ایجاد کر ڈالی ہیں جو ایک مکھی سے کئی گنا اہم ہیں، اہم ترین بھی ہیں۔ مثلاً خلائی جہاز، پیچیدہ الیکٹرانک مغز (کمپیوٹر) وغیرہ۔

لیکن یہ بہت بڑی غلطی ہوگی اگر ہم ان دونوں کو ایک جیسا سمجھیں۔ ایک خلائی جہاز یا پیچیدہ الیکٹرانک مغز میں قطعاً نشوونما نہیں پائی جاتی۔ مجال ہے کہ وہ اپنے جیسی کسی چیز کو جنم دے سکیں۔ وہ اپنے اوپر نازل ہونے والی مصیبتیں دور نہیں کر سکتے، اپنے پرانے اور فرسودہ پرزوں کی از خود مرمت نہیں کر سکتے، انہیں بیرونی ہدایت اور راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کہ مکھی اس بارے میں خلائی جہاز اور کمپیوٹر پر واضح برتری کی حامل ہے۔ ہاں البتہ مکھیوں کی فراوانی اس بات کا موجب بن چکی ہے کہ ان کی اہمیت ہماری آنکھوں میں بڑی حد تک کم ہو گئی ہے۔ اگر تمام دنیا میں صرف ایک مکھی موجود ہوتی تو معلوم ہوتا کہ دانشوروں نے اس بارے میں کس قدر توجہ منعطف کی ہے؟

اس سے بھی قطع نظر ہمیں اس موازنہ اور مقابلہ کی ضرورت بھی نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ واضح ہو جائے کہ کسی زندہ موجود کی ساخت، حتیٰ کہ

ایک خلیے کی ساخت، جس کی طرف ہم گذشتہ مباحث میں واضح اشارہ کر چکے ہیں، اس قدر اسرار آمیز اور پیچیدہ ہے کہ جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کا بنانے والا غیر محدود علم و قدرت کا مالک ہے اور حیات و زندگی کے پیچیدہ قوانین سے اچھی طرح واقف ہے بلکہ صحیح ترین الفاظ میں یہ کہا جائے گا کہ ”ان قوانین کی بنیاد اس نے خود ہی رکھی ہے“ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی چیزوں کی شناخت کیلئے اس قدر علم اور شعور کی ضرورت ہو لیکن ان کی تخلیق کیلئے کسی قسم کے عقل و شعور کی ضرورت نہ ہو؟

یہ وہی چیز ہے جس کے اثبات کیلئے ہم نے ان مباحث کو شروع کیا ہے۔ ان آیات میں اور ان آیات سے ملتی جلتی دوسری قرآنی آیات میں اسی چیز کو پیش کیا گیا ہے۔ اس گفتگو کو ہم ایک نکتہ بیان کر کے ختم کرتے ہیں اور وہ یہ کہ حیات اور زندگی اگرچہ کائنات کی واضح ترین چیزوں میں سے ہے، لیکن اس کی حقیقت ابھی تک کسی پر واضح نہیں ہو سکی۔ البتہ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہ زندگی کے آثار اور علامات ہیں (مثلاً نشوونما، رشد و بلوغ، غذا کا حصول، اپنے جیسی مخلوق کی تولید، حس و حرکت، غور و فکر وغیرہ) لیکن وہ حقیقت جو ان آثار و علامات کا سرچشمہ ہے، وہ کیا ہے، وہ اب تک کسی پر واضح نہیں ہو سکی اور عقلاء کی عقلیں اس بارے میں حیران ہیں۔

## ۲۔ کیا انسان کوئی اور زندہ چیز بنا سکتا ہے؟

اس میں شک نہیں کہ یہ زندہ چیزیں آغاز میں بے جان چیزوں سے معرض وجود میں آئی ہیں اور یہ امر خواہ کرہ زمین پر انجام پایا ہو یا کسی اور آسمانی کرے میں، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کن وجوہات کے تحت اور کن فارمولوں کے مطابق اس قدر عظیم تحرک پیدا ہوا؟ اب تک یہ بات کسی پر واضح نہیں ہو سکی۔

البتہ کچھ دانشوروں نے اس امید کا اظہار کیا ہے کہ ہم بتدریج ان وجوہات اور فارمولوں کو دریافت کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی نہ کسی دن بے جان مواد سے کسی زندہ خلیے کی ایجاد کر لیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ ان کی یہ امید کس حد تک بجائے اور انجام کار یہ خواب شرمندہ تعبیر ہوگا بھی یا نہیں؟ بالفرض اگر انسان میں اس بات کی قدرت پیدا ہو جائے کہ وہ حیات کی وجوہات اور اس کے فارمولے دریافت کر بھی لے اور لیبارٹریوں میں کوئی زندہ خلیہ ایجاد کر بھی لے، لیکن یہ ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ:

اؤلا! ان کا یہ کام اس کائنات کی تخلیق کی تقلید اور دنیا میں موجود مختلف مواد کی باہمی ترکیب کے بغیر قطعاً ناممکن ہوگا، گویا چند مختلف چیزوں کو جوڑ لیا جائے گا جس کا نام ”ایجاد“ رکھا دیا جائے گا۔

ثانیاً! فرض کر لیا جائے کہ کوئی زندہ خلیہ ایجاد کر بھی لیا جائے تو بات یہیں پر ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ اصل مسئلہ تو کائنات کی خلیوں بھری پیچیدہ مخلوق کا ہے، مثلاً ایک مکھی کی تخلیق، ایک ٹڈی کی پیدائش، ایک پرندے کی بناوٹ ایک عظیم مچھلی کی ساخت اور ایک انسان کی ایجاد۔ کوئی شخص امیدوار بن سکتا ہے ایسے امور صنعتی راہوں سے ممکن ہو سکتے ہیں! ایک دانشور ”پروفیسر ہینز“ کہتے ہیں:

”ایک ہزار سال بعد انسان کو حیات و زندگی کے رازوں کا پتہ چلے گا۔ لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ہوا ایک مکھی یا کوئی اور حشرہ

حتیٰ کہ کوئی زندہ خلیہ ایجاد کر ڈالے۔“ [۱]

مثلاً: فرض کیا کہ خداداد عقل کے تعاون، علم کی پیش رفت اور طبعی قوانین کی تقلید کرتے ہوئے یہ مقصد حاصل ہو جائے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہمارے معاد پر اس کا کوئی اثر پڑے گا یا ہمارا دعویٰ کمزور ہو جائے گا۔ کیونکہ اگر کسی ایک زندہ خلیے کی ایجاد کیلئے پہلے سے موجود نمونوں، آمادہ طبعی مواد کے باوجود بھی اس قدر علم و دانش کی ضرورت ہوتی ہے تو اس قدر بے شمار زندہ موجودات کی تخلیق کیلئے جس سے پہلے نہ تو کوئی نمونہ موجود تھا اور نہ ہی مواد طبعی کسی قدر علم اور دانش کی ضرورت ہوگی؟ کیا ندھی گوگی اور ہر قسم کی شعور سے عاری NATURE کو اس کی تخلیق کا عامل سمجھا جاسکتا ہے؟ اس مقام پر ہم آپ کی توجہ سائنس اکیڈمی نیویارک کے چیئرمین ”کرسٹی مورسین“ کے ایک دلچسپ جملے کی طرف مبذول کراتے ہیں، جو انہوں نے اپنی کتاب ”راز آفرینش انسان“ میں لکھا ہے:

”ہیگل نے کہا ہے کہ مجھے آپ ”ہوا“، ”پانی“، ”کیمیکیل مواد“ اور ”زمانہ“ دے دیں، میں اس کے ذریعہ سے انسان تخلیق کر دوں گا۔ لیکن ہیگل یہ بات بھول گئے کہ اس کام کیلئے نطفہ اور جرثومہ حیات بھی نہایت ضروری ہے، بالفرض انہوں نے کچھ نامرتی ذرات جمع کر بھی لئے اور ایک انسان کی تخلیق کیلئے انہیں بڑے نظم اور ترتیب کے ساتھ ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو جوڑ بھی دیا اور ایک قالب وضع کر بھی لیا، اس میں جان بھی تو ڈالی ہے! چلو فرض کر لیا کہ انہوں نے ان تمام خازق العادت امور پر قابو پا بھی لیا تو لاکھوں کروڑوں احتمالات میں سے صرف ایک احتمال ہے کہ وہ ایسا کر سکیں یعنی کوئی ایسی جاندار شے پیدا کر سکیں کہ چشم روزگار نے اس سے انوکھی چیز نہ دیکھی ہو، مگر جو چیز قابل توجہ ہے وہ یہ کہ اس کامیابی کے حاصل ہو جانے کے بعد جو جناب ہیگل بھی نہیں کہیں گے کہ یہ چیز ”اتفاق“ سے وجود میں آگئی ہے بلکہ وہ کہیں گے ”میری عقل اور میرے ہوش و نبوغ نے اسے تخلیق کیا ہے۔“ [۲]

بسا اوقات بعض افراد اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کر یہ تصور کر لیتے ہیں کہ زندگی کی پیدائش کئی اتفاقی حوادث کا نتیجہ ہو سکتی ہے اور اس کی توجیہ کی جاسکتی ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ہم احتمالات کے حساب سے ”پروٹھیڈ“ کے ایک ذرہ کی تخلیق کی اس طرح توجیہ کریں تو کرہ زمین کی عمر اس کی پیدائش کیلئے ناکافی ہوگی۔ ”پروٹھیڈ“ زندہ موجودات کو تشکیل دینے والے موادوں میں سے ایک ہے۔

”ہارورڈ“ یونیورسٹی کے ماہر حیاتیات پروفیسر ”جارج والد“ نے حیات کی پیدائش کی کیفیت احتمالات اور اس کی ازخود یا ”اتفانی صورت“ میں تخلیق کی نفی کرتے ہوئے بڑی اچھی بات کی ہے کہ جس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

”ایک ”پروٹھیڈ“ کی تشکیل کیلئے سینکڑوں بلکہ ہزاروں مالیکیول MOLE CULES کو مختلف نسبتوں میں مختلف صورتوں میں زنجیر کی طرف باہم پیوستہ ہونا پڑتا ہے اور اس قسم کے پروٹھیڈ کی قسمیں حد و حساب اور شمار سے باہر ہیں، کیونکہ ہمیں کہیں بھی دو قسم کے جانور ایسے نہیں ملیں گے جن کے پروٹھیڈ ایک جیسے ہوں۔ اسی وجہ سے آلی مواد کی مالیکیول بڑے گروہ کی تشکیل دیتے ہیں کہ جن کا مالیکیول تنوع غیر محدود ہوتا ہے

[۱] کتاب ”آیہ الکرسی“ ص ۹۳

[۲] ملاحظہ ہو کتاب ”راز آفرینش“ ص ۱۳۹ تا ۱۴۱

اور پیچیدگی حیران کن۔ اور کسی چیز زندہ کی تخلیق کیلئے نہ صرف بے انتہا پروٹھئیڈ کی کافی مقدار میں ضرورت ہوگی بلکہ انہیں مخصوص نسبت کے مطابق بھی لیا جانا ضروری ہوگا، بلکہ ان کی صحیح ترتیب بھی نہایت ضروری ہوگی۔ یعنی ان کی ساخت کا ان کی کیمیکل ترکیب کے اندازے کے مطابق ہونا بھی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔“ وہ آگے چل کر لکھتے ہیں:

”پروٹھئیڈ کی ساخت واقعاً نہایت ہی پیچیدہ ہے۔ کمپیوٹر جیسی پیچیدہ ترین چیز جنہیں انسان نے بنایا ہے، ایک عام اور سادہ سی زندہ مخلوق کے سامنے بچوں کا کھیل دکھائی دیتی ہیں۔ بس اتنا کافی ہے کہ انسان اس کام کی عظمت پر غور کرے تاکہ اسکے سامنے کسی چیز کو خود بخود تخلیق یا اتفاقی پیدائش کا غیر ممکن ہونا واضح ہو جائے۔“ [۱]

ہم اپنی اس گفتگو کو دو مقدس اور معصوم ہستیوں کے فرمان ذیشان پر ختم کرتے ہیں۔ ایک تو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا گراں قدر اور بیش قیمت کلام ہے اور دوسرا حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کا اصول کلام۔  
حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اپنی مشہور حدیث ”توحید مفضل“ میں انسان اور اس کے مختلف اعضاء کی تخلیق کے بارے میں مفضل کے سامنے بڑی وضاحت کے ساتھ تشریح فرماتے ہیں۔ مفضل عرض کرتے ہیں۔

”مولا! کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ طبیعت (نیچر) کا کام ہے۔“ امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

”سلھم عن ہذا الطبیعة اھی شیء، لہ علم و قدرۃ علی مثل ہذا  
الافعال؟ ام لیست کذلک؟ فان اوجبوا لہا العلم والقدرة  
فہما یمنعہم من اثبات الخالق؟ فان ہذا صنعته، ان رعموا انہا تفعل  
ہذا الافعال بغير علم ولا عمد ہو کان فی افعالہا ما قدر ان الصواب  
والحکمة علم ان ہذا الفعل للخالق الحکیم وان الذی سموہ طبیعة  
ہو سنة فی خلقہ الجاریۃ علی ما اجراہا علیہ“

تم ان سے پوچھو کہ یہ طبیعت (نیچر) ہے؟ کیا وہ ایسی چیز ہے جس میں ان کاموں کیلئے علم اور قدرت پائی جاتی ہے، یا ایسا نہیں ہے؟ اگر وہ اس کیلئے علم اور قدرت کے قائل ہیں تو پھر وہ خدا کے وجود کو تسلیم کیوں نہیں کرتے (درحقیقت وہ نام رکھنے میں غلطی سے کام لیتے ہیں نہ کہ اصل خدا کے وجود میں) کیونکہ یہ اسی کی تخلیق ہے۔ اور اگر گمان کرتے ہیں کہ طبیعت نے ہی ان افعال کو علم اور ارادے کے بغیر انجام دیا ہے، اس کے

باوجود اس کے تمام اعمال مکمل طور پر صحیح اور حکمت پر مبنی ہیں، تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام ایسے خالق کی پیداوار ہیں جو صاحب حکمت ہے۔ جس چیز کا نام انہوں نے طبیعت رکھا ہے درحقیقت وہ خدا کے وہ قوانین اور طریقہ کار ہیں جو اس کی مخلوق پر نافذ ہیں اور اس کے ارادہ اور منشاء کے مطابق جاری و ساری ہیں۔<sup>[۱]</sup>

امیر المؤمنین حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

”ولو اجتمع جميع حيوانها من طيرها و بهائمها.... و اجناسها و متبلدة اممها و اكياسها، على احداث بعوضة ما قدرت على احداثها، و لا عرفت كيف السبيل الى ايجادها، و لتحيرت عقولها في علم ذلك“ اگر کائنات کی تمام زندہ چیزیں اکٹھی ہو جائیں، خواہ وہ پرندے ہوں یا چوپائے۔۔۔۔۔ اور ہر قسم کے حیوانات، چاہے وہ کم عقل ہیں یا زیرک اور عقلمند، پھر بھی ایک مچھر کی تخلیق پر قادر نہیں ہوں گے۔ کسی بھی صورت میں اور کسی بھی وقت اس کی ایجاد کے طریقے کو نہیں پہچان سکیں گے اور اس مخلوق (مچھر) کی تخلیق کے اسرار تک پہنچنے سے حیران رہ جائیں گے۔<sup>[۲]</sup>

[۱] بحار الانوار جلد ۳ ص ۱۶۷

[۲] منہج البلاغہ خطبہ ۱۸۶



## ۴۔ روح کی پیدائش میں اس کی نشانیاں

اشارہ:

روح بھی عالم ہستی (کائنات) کی نہایت ہی عجیب اور پراسرار مخلوق ہے۔ باوجودیکہ وہ سب سے زیادہ ہمارے نزدیک ہے۔ پھر بھی ہم اس کی شناخت اور معرفت سے کوسوں دور ہیں۔

دانشوروں اور فلاسفہ نے روح کی شناخت کیلئے سرتوڑ کوشش کی ہے، کسی بھی لمحے ان کی یہ کوشش متوقف نہیں ہوئی اور اسی کے پرتو میں انہوں نے بہت سے رازوں سے بھی پردہ اٹھایا ہے لیکن ابھی تک روح اسرار بھرا چہرہ تبدیل نہیں ہوا۔ اس بارے میں بہت سے سوال ایسے ہیں جو تشنہ جواب ہیں۔ اسی وجہ سے پروردگار عالم کے علم و حکمت اور تدبیر کی ایک اہم ترین دلیل اس انسانی روح کی تخلیق ہے۔ قرآنی آیات نے بھی کائنات کی اس عظیم تخلیق پر بہت زور دیا ہے اور اسے زبردست اہمیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل آیات کو گوش دل کے ساتھ مل کر سماعت کرتے ہیں:

۱۔۔۔ وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا {فَالهَمَّهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا

(شمس/۷-۸)

۲۔۔۔ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ مِنَ الرُّوحِ مَنْ أَمْرٍ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا

(بنی اسرائیل/۸۵)

۳۔۔۔ وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ

حَمِيمٍ مُّسْنُونٍ {فَإِذَا سَوَّيْتُهُ، وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سٰجِدِينَ

(حجر/۲۸-۲۹)

۴۔۔۔ ثُمَّ خَلَقْنَا الطُّفْلَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مَضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمَضْغَةَ عِظْمًا

فَكَسَوْنَا الْعِظْمَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ

(مؤمنون/۱۲)

۵۔۔۔ اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا فِيمِمْسِكَ

الَّتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى إِنَّ فِي ذَٰلِكَ

## لَا يَتَّفِقُونَ

(زمر/۴۲)

## ترجمہ

۱۔۔۔ قسم ہے نفسِ آدمی کی اور اس کی جس نے اُسے منظم بنایا ہے۔ پھر فُجور اور تقویٰ (خیر اور شر) اسے الہام کیا ہے۔

۲۔۔۔ آپ سے ”روح“ کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہہ دیجئے روح میرے پروردگار کے فرمان سے ہے، تھوڑے سے علم کے سوا تمہیں اور کچھ نہیں دیا گیا؟

۳۔۔۔ اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا: میں بشر کو خشک مٹی سے جو کہ بدبودار کیچڑ سے لی گئی، خلق کرنے والا ہوں، جب میں اُسے منظم کر لیا اور اس میں اپنی عظیم (ایک عظیم شائستہ) روح پھونک دوں تو ہم سے اس کیلئے سجد میں گرجاؤ۔

۴۔۔۔ پھر نطفہ کو علقہ (جسے ہوئے خون) کی صورت میں اور علقہ کو مضغہ (لوٹھڑے) کی صورت میں اور مضغہ کو ہڈیوں کی صورت میں لے آئے، پھر اُسے تازہ تخلیق عطا کی، بابرکت ہے وہ خدا جو بہترین خالق ہے۔

۵۔۔۔ خداوندِ عالم، روحوں کو ”موت“ کے بعد قبض کر لیتا ہے، اور وہ روحیں جو نہیں مری ہیں انہیں بھی نیند میں قبض کر لیتا ہے۔ پھر جن روحوں کو موت کا فرمان صادر کیا ہوتا ہے انہیں اپنے پاس روک لیتا ہے اور دوسری روحیں (جنہیں زندہ رہنا چاہیے) ایک معین مدت تک واپس بھیج دیتا ہے۔ اس بارے میں (خداوندِ عالم کی عظمت و قدرت کی) روشن نشانیاں ہیں، ان لوگوں کیلئے جو غور فکر کرتے ہیں۔

## الفاظ کے معانی اور ان کی تشریح

”روح“ کے لفظ کا اصل معنی ”سانس لینا“ یا ”پھونک مارنا“ ہے جب کہ بعض ارباب لغت کا عقیدہ ہے کہ یہ (روح) دراصل ”ریح“ سے مشتق کیا گیا ہے جس کے معنی ”ہوا“ اور ”نسیم“ ہیں۔ چونکہ انسانی روح یعنی وہی مستقل اور مجرد گوہر جو زندگی اور غور فکر کا سرچشمہ اور مرکز ہے ایک لطیف جوہر ہے اور حرکت و تحرک اور زندگی عطا کرنے کی وجہ سے سانس اور نسیم کی مانند ہے۔ لہذا اس لفظ کو اسی معنی کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہ روح کا بدن کے ساتھ نزدیکی رابطہ سانس لینے کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اسی لئے اس لفظ کو انسانی روح کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔

بعض حضرات کا عقیدہ ہے کہ اس لفظ کا اصل مادہ ”ایک لطیف امر کا ظاہر اور جاری ہونا“ ہے خواہ وہ جسم کے عالم میں ہو یا جان اور معنی کے عالم میں۔ اسی لئے مقام نبوت کے ظہور و جی کے جاری ہونے اور نور حق کی تجلی کیلئے بھی اس لفظ کا اطلاق ہوا ہے۔

”روح“ (بروزن قوم) جس کے معنی مسرت و خوشی، آسائش و آرام اور رنج و غم سے نجات ہیں، وہ بھی اسی سے لیا گیا ہے۔ اسی طرح خدا کی مہربانیوں اور رحمت کو بھی ”روح اللہ“ کہا جاتا ہے۔

”ریحان“ کا لفظ جو کہ کلام عرب میں ”پھول“ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اس لئے ہے کہ اس کی خوشبو ہوتی ہے جو مشامِ جان کو معطر کر دیتی ہے۔

”روح“ کا لفظ ”غروب کی جانب“ کے معنی میں ہے کیونکہ موقعہ پر حیوانات استراحت و آرام کیلئے اپنی اپنی جگہوں کو واپس لوٹ آتے ہیں۔

بہر حال قرآن مجید میں یہ لفظ بہت سے مختلف معانی کیلئے استعمال ہوا ہے، کبھی ”فرشتہ و جی“ کے معنی میں کبھی خدا کے خاص فرشتوں میں سے ایک بڑے فرشتے کے معنی میں (یا فرشتوں سے بڑی مخلوق کے معنی میں)، گاہے خداوند عالم کی معنوی طاقت کے معنی میں جس کے ذریعہ وہ موئن کو قوت پہنچاتا ہے اور کبھی انسانی روح کے معنی کیلئے استعمال ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں اس کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔

”نفس“ کے بارے میں راغب اپنی کتاب مفردات میں کہتے ہیں ”نفس بمعنی روح کے ہے۔ اور کبھی کسی چیز کی ذات کے بارے میں بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور ”نفس“ (بروزن نفس) اس ہوا کو کہتے ہیں جو منہ کے ذریعہ انسان کے بدن میں داخل یا اس سے خارج ہوتی ہے یعنی سانس۔ یہ لفظ ”نفس“ خون پر بھی بولا جاتا ہے کیونکہ اگر خون و فرما مقدار میں انسان کے جس سے بہہ جائے تو روح اس سے جدا ہو جاتی ہے اور بسا اوقات یہ لفظ تمام انسانی وجود پر بھی بولا جاتا ہے۔ بہر حال نفس کا ایک مشہور معروف معنی وہی ”روح“ ہے قرآن مجید میں جس کے کچھ مراتب ذکر کئے گئے ہیں۔

۱۔ ”نفسِ امارہ“ جو انسان کو برائیوں کے ارتکاب کا حکم دیتا ہے۔ ”إِنَّ النَّفْسَ الْأَمَّارَةَ بِالسُّوءِ“ (سورہ یوسف/ ۵۳)

۲۔ ”نفسِ لوامہ“ اگر کبھی انسان گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے تو اس سے وہ پشیمان ہوتا ہے اور اپنے آپ کو ملامت اور سرزنش کرتا ہے۔ ”وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ“ (قیامت/ ۲)

۳۔ ”نفسِ مطمئنہ“ وہ نفس ہوتا ہے جو سکون و اطمینان کے مراحل تک پہنچ چکا ہوتا ہے اور مکمل طور پر خدا کا مطیع اور اس کی عنایات اس کے شامل حال ہوتی ہیں۔ ”يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمَطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً“ (نجر/ ۲۷-۲۸)

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### عالم تخلیق کا عجوبہ۔۔۔۔۔ روح

اسی سلسلے کی سب سے پہلی آیت میں انسان کی روح اور اس کے خالق کی قسم اٹھائی گئی ہے وہی خدا جس نے روح کو پیدا کیا، انسان کی روح کی تمام قوتوں کو یکجا اور منظم کیا، ظاہری حواس سے لے کر جو کہ روح کے ادراکات کا مقدمہ ہیں، غور فکر، حافظہ، تخیل، ادراک، ایجاد، ارادہ اور عزم ضمیم کی قوت تک سب کو شامل ہے (وَنَفْسٍ وَّمَا سَوَّاهَا) ان تمام قوتوں کو منظم کرنے کے بعد انسان کو ہدایت کے طریقے تعلیم فرمائے اور فُورِ تَقْوَىٰ کی راہیں دکھلائیں۔ (فَالِهَمَّهَا فُجُورًا هَا وَتَقْوَاهَا)

باوجودیکہ انسان کی روحانی قوتیں بہت زیادہ اور مختلف قسم کی ہیں، لیکن ان تمام میں سے قرآن مجید نے یہاں پر ”الہام، فُور، اور تَقْوَىٰ“ (حسن و تَج کے ادراک) کی نشاندہی کی ہے کیونکہ یہ مسئلہ انسان کی تقدیر اور خوشی قسمتی اور بدبختی میں بڑی حد تک مؤثر ہے۔ ہم بار بار بتا چکے ہیں کہ ہمیشہ کسی چیز کی قسم اس کی اہمیت اور عظمت پر دلالت کرتی ہے یعنی قسم کے موضوع اور مقیم لہ (جس کیلئے قسم کھائی جا رہی ہے) کی اہمیت کو بیان کرتی ہے۔

خصوصاً قرآن مجید کی قسمیں انسان کو آیات الہی کی ”عظمت“ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ غور و فکر کرنے کیلئے آمادہ کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں اس آیت میں لفظ ”نفس“ کو نکرہ کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے جو کہ اس جیسے مقامات پر موضوع کی اہمیت یا اس کی کثرت اور تاکید پر دلالت کرتا ہے۔ [۱]

دوسری آیت میں ایک سوال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو کچھ مشرکین یا اہل کتاب کی طرف سے کیا گیا ہے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کئی ایک سوالات کئے، جن میں سے ایک روح کے بارے میں بھی تھا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے ”آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ (وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ) پھر قرآن پاک میں پیغمبر اکرم سے فرمایا: ”انہیں کہہ دیجئے کہ روح میرے پروردگار کے فرمان میں سے ہے“ (قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي)

[۱] تفسیر روح البیان جلد ۱۰ ص ۴۲۲ اور تفسیر روح المعانی جلد ۳۰ ص ۱۳۲۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں ”نفس“ کے لفظ کے ذریعہ روح اور جسم دونوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ہر چند کہ ”فَالِهَمَّهَا فُجُورًا هَا وَتَقْوَاهَا“ کا جملہ روح کے ساتھ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح قداخلع من

یہ سربستہ جواب خدا کی اس عظیم مخلوق کے اسرار آمیز ہونے کی طرف ایک معنی خیز اشارہ ہے۔ نیز تا کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ روح کے تمام اسرار کو کیوں نہیں بیان کیا گیا، آیت کے آخر میں کہا گیا کہ ”تمہیں تھوڑے سے علم و دانش کے علاوہ اور کچھ نہیں دیا گیا“ (وَمَا أُوْتِيتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا)

اور اس ”قلیل علم“ اور ”تھوڑی سی معلومات“ کی بنا پر اگر تم روح کے اسرار سے واقف نہ ہو سکو تو تعجب نہیں کرنا چاہیے (خاص طور پر اس دور اور اس ماحول میں)

بعض روایات میں حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ قریش نے اپنے بعض سرداروں کو مدینہ کے علماء یہود کی طرف روانہ کیا اور کہا کہ ”ان سے محمدؐ کے بارے میں سوال کریں، کیونکہ وہ اہل کتاب ہیں اور انہیں اس بارے میں وہ معلومات حاصل ہیں جو ہمیں حاصل نہیں“

چنانچہ وہ مدینہ پہنچے اور ان علماء سے اس بارے میں سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ ”محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے تین سوال پوچھنا! ایک ذوالقرنین کے بارے میں، دوسرے اصحاب کھف کا واقعہ اور تیسرے روح کے متعلق۔ اگر تو انہوں نے تینوں کے جوابات دے دیئے یا کسی کا بھی جواب نہ دیا تو پیغمبر نہیں ہیں، لیکن اگر کچھ کا جواب دے دیا اور کچھ کا نہ دیا تو پیغمبر ہیں۔“

جب وہ مدینہ سے واپس آئے اور مذکورہ سوالات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھے تو آنجنابؐ نے ذوالقرنین اور اصحاب کھف کے واقعات کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا لیکن روح کے متعلق صرف اسی سربستہ جواب پر اکتفاء کی کہ وہ خدا کا فرمان ہے۔<sup>[۱]</sup> اگرچہ اس آیت میں روح کے معنی کے بارے میں معصومین علیہم السلام کی روایات میں بھی اور مفسرین قرآن کی گفتگو میں بھی مختلف تفاسیر ذکر ہوئی ہیں، ان میں سے زیادہ تر تفاسیر ایسی ہیں جن میں باہمی منافات نہیں اور انہیں آپس میں جمع کیا جاسکتا ہے۔ روح انسانی کا تعلق اس مفہوم سے ہے جو آیت بالا کے مدلول میں داخل ہے۔<sup>[۲]</sup>

تیسری آیت میں خداوند عالم کی فرشتوں سے گفتگو کا تذکرہ ہے، جو آفرینش بشر کے بارے میں ہوئی ہے۔ خداوند عالم نے اس وقت ان سے خطاب کر کے فرمایا ”میں ایک انسان کو خشک کی ہوئی سیاہ رنگ کی بدبودار مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں۔ جس وقت میں اس کو ہر طرح سے درست کر لوں اور اس میں اپنی روح سے پھونک دوں تو تم سب کے سب اس کے سامنے سجدہ میں گر پڑنا۔“

اس آیت میں دو نکتے قابل توجہ ہیں، ایک تو انسان کے روح کی اضافت خداوند عالم کی طرف کی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے کہ ”اپنی روح سے“، جو کہ انسانی روح کی عظمت اور اہمیت کی انتہاء کی دلیل ہے، جسے اصطلاح میں ”اضافت تشریفیہ“ کہتے ہیں جیسے ”بیت اللہ“ یعنی

[۱] تفسیر المیزان، اس بارے میں اقوال نقل کئے گئے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی کہ اس روح سے مراد وہ روح ہے جو ”یوم یقوم الروح الملائکة صفا“ والی آیت میں مذکور ہوا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس سے مراد جبرائیل، بعض نے کہا ہے کہ قرآن مجید ہے اور آخری تفسیر یہ ہے کہ یہ روح انسانی ہے اور تبار بھی اس روح کا ہوتا ہے۔

[۲] تفسیر روح المعانی جلد ۱۵ ص ۲۴۱

خدا کا گھر، ”شہر اللہ“ یعنی خدا کا مہینہ، جو خانہ کعبہ اور ماہ رمضان المبارک کی اہمیت کی طرف اشارہ ہے، وگرنہ ساری جگہیں خدا کا گھر ہیں اور سارے مہینے اسی کے مہینے ہیں۔

دوسرا نکتہ آدمؑ میں روح پھونکنے کے بعد اس کے سامنے تمام فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم ہے جو مقام انسانی کی عظمت کی ایک اور دلیل ہے کیونکہ سجدہ یعنی خضوع اور وہ بھی تمام فرشتوں کی طرف آدمؑ کے مقام والا کی بہترین علامت شمار ہوتا ہے۔

چوتھی آیت میں نطفہ کی تخلیق اور جنین کے دقت مراحل طے کرنے اور مختلف مراحل میں اس بے مقدار ذرہ کے نازک اندام پر گونا گوں لباس پہنانے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد انداز سخن کو تبدیل کر کے فرمایا ہے ”پھر ہم نے انسان کو ایک نئی تخلیق عطا کی (ثُمَّ أَدْشَأْنَا نَافَهُ خَلْقًا آخَرَ)“

اس مرحلہ پر دوسرے مراحل کے برخلاف ”انشاء“ (ایجاد) کی تعبیر جو معنی تخلیق کے ہے اور اس کے ساتھ ہی ”ثم“ کا لفظ جو عام طور پر فاصلے کیلئے استعمال ہوتا ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ آفرینش انسانی اس مرحلہ پر سابقہ مراحل سے مکمل طور پر مختلف ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے مراد روح کی وہی تخلیق ہے جو جسم کے ارتقاء کے بعد اس سے متعلق ہوتی ہے

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ”خَلْقًا آخَرَ“ (دوسری تخلیق) کی تعبیر ایک اسرار آمیز اور سر بستہ تعبیر ہے جو سابقہ تعبیرات سے بالکل مختلف ہے۔ جن میں ”نطفہ“، ”علقہ“، ”مضغ“، ”عظام“ اور ”لحم“ کا ذکر ہے اور یہ سارے کے سارے جانے پہچانے مفہوم ہیں۔ یہ بھی اس آخری مرحلے کی دوسری مراحل سے اختلاف کی ایک اور دلیل ہے۔

قابل تعجب بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے اس ”نئی تخلیق“ کیلئے کئی تفسیریں ذکر کی ہیں۔ جو آیت کی روح سے کسی طرح سازگار نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے۔ ”أَدْشَأْنَا نَهُ خَلْقًا آخَرَ“ سے مراد انسان کے بدن میں دانتوں اور بالوں کا اُگنا ہے۔<sup>[۱]</sup> حالانکہ آیت کی تعبیروں سے اس کی کوئی مناسبت نہیں ہے۔ اور یہ بات یقینی ہے کہ دانتوں اور بالوں کا اُگنا اہمیت کے لحاظ سے کسی بھی طرح جنین کے مختلف مراحل طے کرنے کے زمرے میں نہیں آتا۔

آیت کے آخر میں ایک اور عجیب جملہ آیا ہے جو اس مرحلہ پر یا ان تمام مراحل میں انسانی تخلیق کی حد سے زیادہ اہمیت کی ایک اور علامت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ”فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ“ صد آفرین اس علم اور حکمت پر جس نے ان تمام استعدادوں اور شائستگیوں کو اس طرح کی ناچیز مخلوق میں پیدا کر دیا ہے۔ آفرین ہے اس پر اور اس کی بے نظیر تخلیق پر۔

”تبارک“، ”برک“ کے مادہ سے ہے (جو کہ برگ کے وزن پر ہے) کا معنی ہے اونٹ کا سینہ۔ چونکہ جب اونٹ اپنا سینہ زمین پر رکھتا ہے تو اس میں ایک قسم کا ثبات و قرار پیدا ہو جاتا ہے، اسی لئے یہ لفظ ”ثبات اور دوام“ کے معنی میں آیا ہے ہے چونکہ جو بھی دائمی نعمت ہوتی ہے، اس کی اہمیت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے، اسی لئے اس قسم کی نعمتوں کو بابرکت کہتے ہیں۔ خدا کے بارے میں اس لفظ کا استعمال اس کی ذات

[۱] یہ احتمال تفسیر روح المعانی جلد ۱۸ ص ۱۱۲ اور تفسیر قرطبی جلد ۷ ص ۴۵۰۲ میں بعض مفسرین سے نقل کیا گیا ہے

پاک کی عظمت، ثبات اور جاودانی کی طرف اشارہ ہے۔

پانچویں اور آخری آیت میں بقاء روح کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ”خداوند عالم موت کے وقت ارواح کو لے لیتا ہے اور قبض کرتا ہے۔ (اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا)

اس بات کی طرف توجہ کرنے سے ”توفی“ کا معنی ”قبض کرنا“ اور ”مکمل طور پر کسی چیز کو حاصل کر لینا“ ہے اور ”انفس“ کا معنی ”ارواح“ یعنی روہین ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ موت کی حالت میں روح خدا کے حکم سے مکمل طور پر بدن سے جدا ہو جاتی ہے لیکن نیند کی حالت میں یہ جدائی ناقص طور پر ہوتی ہے۔ ”وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَتَامِهَا“

پھر نیند کی حالت میں بعض روحوں کے واپس نہ لوٹنے اور بعض روحوں کے ایک مقررہ مدت تک واپس آ جانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ ”ان میں خداوند عالم کی عظمت اور قدرت کی ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔“ (إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ)۔ [۱]

اس آیت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ انسان روح اور جسم کی ترکیب کا نام ہے۔ روح ایک غیر مادی جوہر ہے اور نیند موت کا ضعیف سا مرحلہ ہے جس سے روح اور جسم کا رابطہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ موت کے معنی فنا اور نیستی اور نابودی نہیں ہیں بلکہ یہ بقاء اور زندگی کے دوام کی ایک قسم ہے۔

پس نتیجہ یہ نکلا کہ انسانی روح اپنی تمام طاقتوں اور قوتوں کے ساتھ جو کہ کائنات کی ایک عجیب ترین مخلوق ہے، خداوند عالم کی عظیم ترین نشانیوں میں سے ہے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اس قدر علم و قدرت، فہم و فراست، غور و فکر، ذوق و جدت اور مقصد و ارادے کی خالق ایک بے شعور فطرت ہو جو ہر قسم کے علم اور غور و فکر اور جدت و مقصد اور ارادے سے عاری ہو۔ بلکہ اس کے برعکس اس قسم کے قطرات اور چھوٹی ندیاں اس عظیم اوقیانوس کی نشانی ہیں جس سے ان کے سوتے پھوٹتے ہیں اور یہ کم رنگ شعاعیں اس عظیم آفتاب کا ایک پرتو ہیں۔

[۱] فخر رازی اپنی تفسیر میں اسی آیت کے ذیل میں کہتے ہیں ”خداوند عالم حکیم نے انسان کی روح کے اس کے جسم کے ساتھ بیوند کو تین طرح سے منظم کیا ہے کبھی تو ایسا ہوا ہے کہ روح کا پرتو بدن کے تمام ظاہری اور باطنی اجزاء پر پڑا ہوا ہے اور یہ بیداری کی حالت ہوتی ہے۔ کبھی ظاہر میں تو روح کو لے لیا جاتا ہے، لیکن وہ باطن میں باقی ہے، یہ نیند کی حالت ہوتی ہے اور کبھی ظاہری اور باطنی دونوں صورتوں میں اس پرتو کو لے لیا جاتا ہے، یہ موت کی حالت ہوتی ہے۔“

## چند توضیحات

### ۱۔ روح کی ظاہری اور باطنی قوتیں

قد مارنے انسان کی روح کیلئے پانچ ظاہری اور پانچ باطنی قوتیں شامی ہیں۔ ظاہر قوتیں حس باصرہ (دیکھنے کی حس)، حس سامعہ (سننے کی حس) حس شامہ (سونگھنے کی حس) حس ذائقہ (چکھنے کی حس) اور حس لامسہ (چھونے کی حس) جو کہ عالم محسوسات میں انسانی روح کے درتچے اور اس مجرد جوہر اور عالم مادہ کے درمیان ایک رابطہ ہیں۔

پھر ان میں سے ایک قوت بذات خود ایک وسیع اور اسرار آمیز کائنات ہے، ان کے آلات و ہتھیار جو آنکھ، کان، زبان، ناک، اور پورے بدن کے پوست میں پھیلے ہوئے اعصاب ان میں سے ہر ایک خداوند عالم کی آیات میں سے ایک آیت ہے اور اپنے اندر علم و حکمت کی ایک دنیا لئے ہوئے ہیں۔ باطنی قوتوں کو بھی قدیم فلاسفہ نے پانچ بتلایا ہے۔

(۱) حس مشترک (۲) خیالی، جو کہ حس مشترک کا حافظہ سمجھا جاتا ہے۔ (۳) قوت واہمہ، جو دوستی اور دشمنی جیسے مفہوموں کا ادراک کرتا ہے۔ (۴) قوت حافظہ، جو کہ واہمہ ادراکات کو اپنے اندر محفوظ رکھتی ہے۔

(۵) قوت تمثیلہ، جو کہ جمع شدہ خیال اور حافظہ کی جزئی صورتوں اور مفہوموں کو تصرف میں لاتی ہے، اور جو دل خواہ صورتیں خارج نہیں ہوتیں، ان کو وجود میں لاتی ہیں۔

ان پانچوں قوتوں میں سے ہر ایک اپنے طور پر اسرار کا ایک عالم ہے۔

لیکن دور حاضر کے دانشور اور فلاسفہ نہ تو ظاہری قوتوں کو پانچ قوتوں میں محدود سمجھتے ہیں اور نہ ہی باطنی قوتوں کو پانچ میں محدود کرتے ہیں، بلکہ وہ نفس انسانی کیلئے بہت سی قوتوں کے قائل ہیں اور انسانی روح کو ایک ایسا عجیب خزانہ سمجھتے ہیں جس میں بہت سی گونا گوں طاقتیں، بیشتر ذوق اور استعداد و ادراکات پائے جاتے ہیں کہ جن میں انسانی افراد مختلف ہوتے ہیں۔

دور حاضر کی سائیکالوجی اور نفسیات شناسی نے انسانی روح کے مرموز اور تاریک گوشوں تک بھی رسائی حاصل کر لی ہے، ایک تازہ اور اسرار آمیز دنیا تک جا پہنچے ہیں اور ”مخفی ضمیر“ یا ”ناخود آگاہ وجدان“ کو دریافت کر لیا ہے اور اس مرموز چیز کی بہت سی تعجب آور چیزیں انسانوں کو دکھائی ہیں۔

### ۲۔ کائنات کی اسرار بھری مخلوق۔۔۔ روح

باوجودیکہ قرآن مجید جب آیت الہی کا ذکر کرتا ہے،، خواہ وہ آیات آفاقی ہوں یا نفسی، ان کا تعلق آسمان سے ہو یا زمین سے، نباتات سے ہو یا حیوانات سے تو ان کی بہت سی تفصیلات اور جزئیات کو بیان کرتا اور ان کی تشریح کرتا ہے لیکن جب روح کے مسئلہ کی بات ہوتی



ہے تو صرف یہ کہہ دیتا ہے۔ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي (کہہ دیجئے روح میرے رب کے امر سے ہے۔ اور اس کے اسرار کو سمجھنے کیلئے تمہارا علم بالکل ناچیز ہے۔) (وَمَا أَوْتِينَاهُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا)

یا کہتا ہے کہ ”اس کی قسم جس نے انسان کی جان کو نظام عطا فرمایا“ (وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا) یا پھر ”ایک اور مخلوق کے انشاء“ سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے ”ہم نے نطفہ کے ارتقاء کے بعد ”انسان کو نئی تخلیق عطا کی ہے۔ (ثُمَّ أَنْشَأْنَاكَ خَلْقًا آخَرَ) یا پھر روح کو اپنی طرف نسبت دے کر کہتا ہے ”وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي“ (جب اس میں اپنی روح پھونک دوں) یہ سب کی سب تعبیرات اس بات کی حکایت کرتی ہیں کہ روح کی تخلیق دوسری چیزوں کی تخلیقات سے ہٹ کر ہے اور صرف اور صرف مسئلہ روح کی پیچیدگی اور اس کے حد سے بڑھ کر اسرارِ امیر ہونے کی بدولت ہے۔

### ۳۔ روح کی مختلف سرگرمیاں

ہمارے اندر بہت سی فکری اور روحی سرگرمیاں پائی جاتی ہیں، خواہ وہ خود آگاہی کی صورت میں ہوں یا ناخود آگاہی کی صورت میں جن میں سے ہر ایک جداگانہ موضوع کی صورت میں قابل بحث ہیں۔ (اور غالباً کتابوں میں ایسا ہے بھی) ان سرگرمیوں میں سے چند ایک کی مختصر تشریح کچھ یوں ہے:

(الف) غور و فکر! مجہولات تک رسائی کیلئے غور و فکر سے کام لینا، یا فلاسفہ کے الفاظ میں فکر کی مبادی کی طرف حرکت، پھر دور حرکت مبادی سے مقصود و مراد کی طرف۔

(ب) ابتکار، زندگی میں اچانک پیش آنے والی مشکلات کے حل کیلئے ابتکاریاں نئی ترکیبوں اور گونا گوں حوادث سے نمٹنے کیلئے حل کا سوچنا، مختلف ضروریات کو پورا کرنا، دریافتیں ایجادات اور انکشافات سب اسی زمرے میں آتے ہیں۔

(ج) حافظہ، مختلف قسم کی معلومات جو جس یا غور و فکر کے ذریعہ انسان کو حاصل ہوتی ہیں، ان کو محفوظ رکھنا، ان کو درجوں میں بانٹنا، ریکارڈ میں رکھنا اور بوقت ضرورت انہیں خاطر میں لانا۔

(د) مسائل کا تجزیہ و تحلیل، ذہنوں مفہوموں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے حوادث کی وجود و اسباب تلاش کرنے کیلئے مسائل کا تجزیہ و تحلیل، پھر ان کی آپس میں ترکیب اور حوادث کے اسباب و نتائج تک رسائی۔

(ه) تخیل، یعنی ذہنی صورتوں کی ایجاد جو کبھی خارج میں موجود نہیں ہوتیں، جن کا کام جدید مسائل کو سمجھنے کیلئے مقدمہ کی صورت میں ہوتا ہے۔

(و) عزم و ارادہ: کسی کام کے انجام دینے یا اسے توقف کرنے یا پھر اسے دگرگوں کرنے کیلئے پختہ ارادہ کرنا۔

(ز) فطری اور عقلی ادراکات: نظری اور غیر بدیہی استدلال کی بنیاد فطری اور عقلی ادراکات پر استوار ہوتی ہے۔

(ح) کسی سے محبت کرنا، دوستی بنانا اور دشمنوں سے دشمنی کرنا اور اس قسم کی بیسیوں دوسرے روح سے تعلق رکھنے والے کام ہیں جن

کے انسانی اعمال پر مثبت یا منفی اثرات مترتب ہوتے ہیں۔

البتہ یہ ایسے مسائل ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ یہ سب کے سب انسان کی روح کے اندر مرکوز کئے ہوئے ہیں، اس ناپیدا کنارہ سمندر کی موجیں ہیں اور اس نیرنباں کی شعاعیں ہیں۔ انہیں کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے کہ روح خدا کی سب سے بڑی آیت اور اس کی اہم ترین نشانی ہے۔

یہ جو قرآن مجید کی سورہ ذاریات کی ۲۱ ویں آیت میں خدا فرماتا ہے کہ ”تمہارے وجود (یا تمہاری روح کے اندر) خداوندِ عالم کی آیت اور نشانیاں ہیں، تو کیا تم انہیں نہیں دیکھتے، اسی حقیقت اور واقعیت کی طرف اشارہ ہے۔

زیادہ دور نہ جائیں۔ اسی انسانی حافظہ ہی کو لے لیں جو اس کی مختلف معلومات کا ریکارڈ روم ہے، اس قدر عجیب اور تعجب آور کہ اگر ہم سینکڑوں افراد کو اپنے معلومات کی حفاظت اور ان کا ریکارڈ رکھنے کیلئے مامور کر دیں تو بھی محال ہے کہ اس تیز اور پھرتی سے حافظے کا کام انجام دے سکیں۔

اگر ایک گھنٹے کیلئے ہم سے حافظے کی قوت چھین لی جائے تو ہمارے لئے زندہ رہنا محال ہو جائے۔ صرف ہم اپنے گھر کی راہ کو نہیں بھول جائیں گے بلکہ اپنی غذا کھانے تک کو بھی فراموش کر دیں گے کہ لقمے کو منہ سے کھایا جائے یا کسی اور جگہ سے! تمام چیزیں ہمارے لئے غیر معروف، غیر مانوس، غیر معلوم اور حیرت ناک ہو جائیں گی۔

وہ جوان جو ڈرائیونگ کے حادثے میں مغز پر چوٹ لگنے کی وجہ سے اپنے حافظے کا صرف ایک حصہ کھو چکا تھا، جب اسے اپنے گھر لے جایا گیا تو وہ اسے نہ پہچان سکا اور کہنے لگا: پہلی بار میں اس گھر میں قدم رکھ رہا ہوں۔ حتیٰ کہ اپنی والدہ کو اجنبی عورت سمجھ رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے تیار کردہ پینٹنگ بورڈوں کو نہیں پہچان رہا تھا، بلکہ کہہ رہا تھا انہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔

ہزار ہا موجودات، ہزار ہا انسان، ہزار ہا مختلف مواد، ہزار ہا یادداشتیں اور ہزار ہا مختلف معلومات ایسی ہیں جنہیں ہم نے ریکارڈ کے طور پر اپنے حافظے میں جگہ دی ہوئی ہے اور پھر تعجب کی بات تو یہ ہے کہ کسی چیز کی یاد آوری کیلئے ایک سینکڑوں کے ایک ہزاروں حصے سے زیادہ عرصہ درکار نہیں ہوتا۔ یعنی اگر کسی وقت انسان کو ایک لمحہ قبل یا ایک سال قبل یا پچاس سال قبل کی یاد کو خاطر میں لانا ہو تو حافظہ اسے درجہ بندی شدہ معلومات میں سے باہر لانے کیلئے ایک سینکڑوں کے ایک ہزاروں حصے سے بھی کم وقت میں باہر لا کر اپنی توجہ میں لے آتا ہے۔ خصوصاً دانشوروں نے حافظے کے حیرت ناک کاموں میں سے ایک ایسے کی طرف اشارہ کیا ہے جسے وہ ”حافظہ کا معجزہ“ کا نام دیتے ہیں۔ اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی شخص یا کسی موضوع کو فراموش کر دیتا ہے، پھر اسے تلاش کرنے کی کوشش میں لگ جاتا ہے اور حافظے کے ریکارڈ روم میں ”فائلوں“ کو کھنگال ڈالتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان اس نام یا موضوع کو جانتا ہے تو پھر اس کی تلاش کسی؟ اور اگر نہیں جانتا تو پھر انجانا چیزوں کی تلاش کس لئے؟ کیا ممکن ہے کہ انسان ایسی گمشدہ چیز کی تلاش میں دوڑتا پھرے جسے وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے، یا کون ہے؟

لیکن اس کے باوجود یہ بات انسانی حافظہ کے بارے میں صادق آتی ہے کہ نسیان اور بھول جانے کے موقع پر ایسی چیزوں کی تلاش میں نکلے جنہیں وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا ہیں اور وہ اچانک ایسی ”الماریوں کی طرف جاتا ہے جن کی ”فائلوں“ میں اپنی گمشدہ چیزوں کو پالیتا ہے۔<sup>[۱]</sup>

یہاں پر ایک لطیف نکتہ موجود ہے جس میں مسئلہ کا حیرت ناک حل پنہاں ہے اور وہ یہ کہ ایسے مواقع پر انسان خود اس نام یا اس موضوع کی تلاش میں نہیں جاتا کہ جسے وہ نہیں جانتا، بلکہ اسے حاصل کرنے کیلئے کچھ ایسے حوادث کی جستجو کرتا ہے جو مطلوبہ نام کے ساتھ اس کے ذہن میں جمع اور ریکارڈ میں آچکے ہیں (کیونکہ حوادث ہمیشہ مجموعی اور اجتماعی صورت میں ریکارڈ میں آتے ہیں) مثلاً وہ جانتا ہے کہ فلاں شخص سے جس کا نام وہ فراموش کر چکا ہے فلاں دن اور فلاں موقع پر سب سے پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ اس طرح وہ فوراً اس دن اور اس موقع کی فائل کو حافظہ کے ریکارڈ سے طلب کر لے گا اور بجلی کی رفتار سے اس کی ورق گردانی کرے گا۔ یہاں تک کہ اس کے اندر سے اس مطلوبہ شخص کے نام کو ڈھونڈ نکالے گا۔

اس گفتگو کو ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس کلام پر ختم کرتے ہیں۔ جو توحید مفضل میں بیان ہوا ہے۔ آپ فرماتے ہیں: اے مفضل! ان قوتوں اور طاقتوں کے بارے میں غور و فکر کرو جو انسان کے نفس اور روح میں ہیں، یعنی قوتِ تفکر، قوتِ وہم، قوتِ عقل اور قوتِ حافظہ وغیرہ میں اگر ان تمام طاقتوں کے درمیان سے صرف حافظہ ہی ختم ہو جائے تو انسان کی کیا حالت ہو جائے اور معاش اور تجارت میں کیا کیا خلل پڑ جائیں۔ اگر انسان ایسی باتوں کو یاد نہ رکھ سکے جو اس کے نفع یا نقصان میں ہیں، یا جو کچھ اس نے لیا ہے یا دیا ہے یا دیکھا ہے یا سنا ہے، یا کسی کے بارے میں کچھ کہا ہے یا جو کچھ اس کے بارے میں کہا گیا ہے، غرض ان سب کو فراموش کر دے تو کیا ہو جائے؟ فراموشی کی صورت میں اگر ہزار ہا مرتبہ کسی راستے پر چلے، پھر بھی اسے تلاش نہ کر سکے۔ اگر ساری زندگی درس پڑھتا رہے تب بھی ایک حرف کو یاد نہ کر سکے اور نہ ہی کسی دین اور مذہب پر عقیدہ رکھ سکے نہ ہی کسی قسم کے تجربہ سے فائدہ اٹھا سکے نہ ہی کسی حادثے سے عبرت حاصل کر سکے، بلکہ بہتر یہی ہے کہ ”انسانیت“ کا نام مکمل طور پر اس سے اٹھالیا جائے۔ پھر امام علیہ السلام نے فرمایا: ”حافظہ کی نعمت سے بالاتر فراموشی کی نعمت ہے (مقررہ مواقع کیلئے فراموشی اگر نسیان اور فراموشی نہ ہوتے تو انسان کی زندگی میں جو بھی مصیبت درپیش آتی اسے ہمیشہ کیلئے داغدار کر دیتی۔ اس کے حسرت اور غم و اندوہ کہیں ختم ہونے میں نہ آتے وہ ہمیشہ انہی آفات و مشکلات کی یاد میں کھویا رہتا اور دنیا کی کوئی نعمت اسے گوارا نہ ہوتی۔“<sup>[۲]</sup>

[۱] ”حافظہ“ نامی کتاب کے سیریل ’چرمی دائم‘ سے اقتباس

[۲] بحار الانوار جلد ۳ ص ۸۰ و ۸۱ (مختصر تلخیص کے ساتھ)

## ۴۔ انسانی مغز کا الیکٹرانک مغز (کمپیوٹر) سے تقابل

بعض اوقات کچھ نادان لوگ انسانی روح و فکر اور اس کے مغز کی ساخت کا الیکٹرانک مغز یعنی کمپیوٹر کی ساخت سے تقابل کرتے ہیں، حالانکہ ان دونوں کا باہمی تفاوت ایسا ہے جیسے ایک حقیقی غول بیکر ہوائی جہاز اور بچوں کے کھلونے ہوائی جہاز میں ہوتا ہے۔

الیکٹرانک مغز کی فعالیت صرف اس حافظہ کے دائرہ کار ہی میں محدود ہے اور اس کا حافظہ وہی ہوتا ہے جسے انسان غذا بہم پہنچاتا ہے۔ اسی لئے وہ اس محدود حافظے سے ہٹ کر اور کسی قسم کی فعالیت کو انجام نہیں دے سکتا۔ جب کہ انسان کے مغز و فکر کی کارکردگی غیر محدود ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ الیکٹرانک مغز کسی جدید حادثے کے موقع پر خود سوچنے اور کوئی راہ نکالنے پر قادر نہیں ہوتا خواہ وہ حادثہ کتنا معمولی اور سادہ ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً کسی وقت جھگڑ چلنے کے موقع پر کیا در عمل کیا جائے، تو اس بارے میں وہ کچھ بتانے سے عاجز ہے، چہ جائیکہ وہ کسی چیز کی ایجاد عمل میں لائے یا کوئی نئی رائیں نکالے، اور پیچیدہ و اہم مسائل کے بارے میں کوئی راہنمائی کرے

اگر فرض کر بھی لیا جائے کہ دونوں کا تقابل کیا جاسکتا ہے تو کون سی عقل یا ورکر سکتی ہے کہ ایک جدید ترین اور ترقی یافتہ الیکٹرانک مغز جو بشری مصنوعات کا ایک عجوبہ ہے۔ ایک ان پڑھ، بے عقل یا اندھے اور بہرے شخص کی خلافت کا شاہکار ہے؟

کیا بے جان طبیعت (نیچر ۹) جو عقل و فکر اور ابتکار عمل سے عاری ہے وہ روح، عقل اور ابتکار عمل کو وجود میں لاسکتی ہے؟ اسی لئے تو ہم کہتے ہیں کہ انسان کی روح میں پروردگار کی ہزار ہا آیات اور نشانیاں پائی جاتی ہیں۔

## ۵۔ روح کی اصالت اور استقلال

اگرچہ خداوند عالم کی آیات اور نشانیوں سے متعلق مباحث میں یہ بات ہمارے لئے کسی فرق کی حامل نہیں ہے کہ انسان کی روح و فکر ایک مستقل گوہر اور مادہ سے جدا جوہر ہے یا مادہ سے وابستہ ہے اور اس کے آثار میں سے ہے (جیسا کہ فلاسفہ الہی اور مادہ پرستوں کا مشہور دعویٰ ہے) لیکن یہ بات بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ اگر روح کا استقلال اور اس کا اصل ہونا ثابت ہو جائے تو خدا کی اس آیت کی چمک دمک اور درخشندگی میں اضافہ ہو جائے گا اور وہ سونے پر سہاگے کا کام دے گی۔

بہر حال مادہ پرستوں کا اس بات پر اصرار ہے کہ انسان کی روح و فکر اس کے بدن کے مغزی خلیوں کے ”فزیکل کیمیکل“ (فزیکو کیمیکل) خواص میں سے ہے اور جسم و بدن کے خاتمے کے ساتھ وہ بھی بالکل نیست و نابود ہو جاتے ہیں جب کہ انسانی روح و فکر کے وہ آثار ہوتے ہیں جو مادہ پرستوں کی تفسیروں کے ساتھ بالکل قابل توجہ نہیں ہے۔

مثلاً ہر شخص اپنے اندر ایک واقعیت اور حقیقت رکھتا ہے جسے ”من“ یعنی میں کہتے ہیں جو آغاز عمر سے آخر عمر تک ایک اکائی سے زیادہ نہیں ہوتا۔ ”من“ یعنی میں بچپن سے لے کر اب تک ایک فرد سے زیادہ نہیں تھا۔ میں وہی شخص تھا اور آخر عمر تک وہی رہوں گا، البتہ میں نے درس پڑھے ہیں، تعلیم حاصل کی ہے اور اسی نسبت سے میں نے ارتقاء کی منزلیں طے کی ہیں لیکن وہی پہلا شخص ہی ہوں، کوئی دوسرا شخص نہیں بنا۔

حالانکہ اگر بدن کے مادی اجزا کو پیش نظر رکھیں تو معلوم ہوگا کہ بدن کے تمام ذرات تبدیل اور دگرگوں ہوتے رہتے ہیں۔ اور تقریباً ہر سات سال کے بعد بدن کے تمام خلیے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یعنی ستر سال کے کسی انسان کے مادی اجزاء دس مرتبہ تبدیل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کا ”من“ (یا انسانی شخصیت) حسب دستور ثابت اور برقرار ہے جس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ”من“ کی واقعیت حقیقی ہے جو مادہ سے ہٹ کر ہے اور مادہ کی تبدیلیوں سے وہ تبدیل نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ ہم اپنے ذہن میں کچھ ایسے حقائق کا تصور کرتے ہیں جو ہمارے مغزی خلیوں سے کئی ہزار گنا بڑے ہوتے ہیں مثلاً آسمانی کہکشاؤں، سورج اور چاند ستاروں وغیرہ کا تصور، ان مادی تصویروں کا ہمارے ذہن کے مادی حصے میں آنا محال ہے اور اس کے علاوہ کوئی راہ چارہ نہیں ہے کہ وہ ہمارے غیر مادی حصے روح یعنی میں منعکس ہوں کیونکہ مادی حصہ یعنی مغز تو ایک چھوٹی اور معمولی سی چیز کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ ان سب باتوں سے ہٹ کر تمام مادی اشیا قابل تقسیم و تجزیہ ہیں۔ جب کہ ہمارے ذہنی مفہیم میں کئی ایسے مفہوم بھی ہیں جو ہرگز تجزیہ اور تقسیم کو قبول نہیں کرتے۔

”واقعہ نمائی“ کی خاصیت اور اپنے وجود سے باہر کی کائنات جو کہ ہمارے علم و دانش میں موجودہ ایسی حقیقتیں ہیں جو مغز کے ”فزیکو کیمیکل“ خواص کے طریقوں سے کسی بھی طرح قابل توجیہ نہیں ہیں۔ یہ چار اور کئی دوسرے روشن دلائل اس بات کی بخوبی نشاندہی کرتے ہیں کہ ہماری روح ایک مستقل گوہر ہے جو مادہ سے بالکل جدا ہے۔ [۱]

## ۶۔ قرآن مجید میں روح کی خصوصیات

قرآن مجید کی آیات سے انسانی روح کی مندرجہ ذیل خصوصیات اور امتیازات کا پتہ چلتا ہے۔

(الف) انسانی روح ایک مستقل چیز ہے جو بدن سے جدا ہو جانے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ ”اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ.....“ (سورہ زمر/۴۲)

(ب) انسانی روح بدن سے جدا ہونے کے بعد ممکن ہے کہ عالم برزخ میں خداوند عالم کی مختلف نعمتوں سے بہرہ ور ہو یا اس کے دردناک عذاب میں معذب ہو۔ سورہ آل عمران کی آیت ۱۶۹ جو ”حیات شہداء“ کی نشاندہی کرتی ہے اور سورہ مومن کی ۴۶ ویں آیت جو ”آل فرعون کے عذاب کے متعلق بتاتی ہے، اس دعویٰ کی بین ثبوت ہیں۔

(ج) روح کی ساخت کا جسم کی ساخت سے بہت بڑا فرق ہے۔ جیسا کہ اس سلسلے سے متعلق آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں، خداوند عالم نے روح کو ”عالم مراد“ سے خلق فرمایا ہے اور اس کی آفرینش کو ”خلق آخر کی ایجاد“ سے تعبیر فرمایا ہے (ملاحظہ ہو سورہ اسراء آیت ۸۵ اور سورہ مومنون آیت ۱۴)

[۱] مزید تفصیل کے لئے تفسیر نمونہ کی بارہویں جلد میں سورہ بنی اسرائیل ۸۵ ویں آیت کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

(د) روح اور اس کی کیفیت کے بارے میں انسانی معلومات نہایت ہی قلیل اور ناچیز ہیں اور سورۃ اسراء (بنی اسرائیل) کی ۸۵ ویں آیت ”وَمَا أُوْتِيتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا“ اس بات کی شاہد ہے۔

(ھ) نیند کی حالت میں روح کا جسم کے ساتھ رابطہ کمزور ہو جاتا ہے جب کہ موت کے وقت مکمل طور پر منقطع۔ (زمر/ ۴۲)

(و) مجموعی طور پر روح اور اس کے اثرات خدا کی عظمت کی اہم ترین آیات اور اس کی معرفت کا نہایت ہی اہم ذریعہ ہیں (ملاحظہ ہو سورۃ زمر کی ۴۲ ویں آیت ”إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُونَ“)

## ۷۔ روح کے بارے میں آخری بات

روح کی بحث اس قدر وسیع اور مفصل ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں کو اس مختصر سی گفتگو میں بالتفصیل بیان نہیں کیا جاسکتا ہے اور اگر عنان قلم کو رہا کر دیں تو تفسیری بحث سے خارج ہو جائیں گے۔ اسی لئے مزید تفصیل کیلئے آپ فلسفہ کلام اور روایات پر مبنی کتابوں کا مطالعہ فرمائیں تفسیر نمونہ میں بھی اس بارے میں کافی حد تک بحث کی گئی ہے۔ تفسیر المیزان جلد ۱ ”وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ“ (سورہ بقرہ / ۱۵۴) کی تفسیر میں بھی مبسوط اور مفصل بحث کی گئی ہے۔

حضرت علامہ مجلسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس چیز کے ثبوت کیلئے سترہ عقلی اور نقلی دلائل پیش کئے ہیں کہ انسان کی حقیقت فقط جسم کا نام نہیں ہے۔ [۱]

اسی کتاب میں حقیقتِ روح کے بارے میں محقق کا شانی سے ۱۱۴ اقوال ذکر کئے گئے ہیں [۲] ہم اس بحث کو حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

”الرُّوحُ فِي الْجَسَدِ كَالْمَعْنَى فِي اللَّفْظِ“ روح انسان کے بدن میں ایسے ہے جسے لفظ میں معنی ہوتے ہیں [۳]

صفدی نامی ایک دانشور کہتے ہیں۔

”میں نے روح کے بارے میں اس مثال سے بڑھ کر خوبصورت اور بالمعنی مثال دیکھی ہے نہ سنی۔“

پس روح ایسے ہے جیسے معنی اور جسم ایسے ہے جیسے لفظ!

[۱] بحار الانوار جلد ۵۸ ص ۶ تا ۱۰

[۲] ایضاً ص ۵۷

[۳] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۵۳ مادہ روح

## ۵۔ انسان اور حیوان کی فطری اور غریزی ہدایت میں اس کی نشانیاں

اشارہ:

نہ صرف انسان بلکہ دوسرے بہت سے حیوانات بھی کچھ فطری اور غریزی علوم و دانش لے کر شکمِ مادر سے متولد ہوتے ہیں۔ ایسے علوم و دانش جن کے حصول کیلئے مسلماً کوئی معلم موجود نہیں تھا اور نہ ہی وہ کسی تجربہ اور آزمائش کا حاصل اور نتیجہ ہیں بلکہ اولین معلم نے آغاز ہی سے اسرارِ آمیز اور تعجب آور طریقہ پر انسانی اور دوسرے جانوروں کے وجود کی گہرائیوں میں انہیں ودیعت کر دیا ہے۔ ان فطری اور غریزی ہدایات اور علوم و دانش کا مطالعہ خداوندِ عظیم کی عظمت کی عظیم ترین آیات اور اس کے علم و قدرت کی واضح نشانیاں میں شمار ہوتا ہے۔ اس مختصر سے اشارے کے ساتھ ہم مندرجہ ذیل آیات کو گوشِ جان سے سماعت کرتے ہیں:

۱۔۔۔ قَالَ رَبُّبَا الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَةً ثُمَّ هَدَى

(ط/۵۰)

۲۔۔۔ أَلَمْ نَجْعَلْ لَهُ عَيْنَيْنِ {} وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ {} وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ

(بد/۱۰۳۸)

۳۔۔۔ فَالْهَمَّهَا فَجُورَهَا وَتَقْوَاهَا

(ش/۸)

۴۔۔۔ فَلَقَمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ  
اللَّهِ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ

(روم/۳۰)

۵۔۔۔ الَّذِي عَلَّمَ بِالْعَلَمِ {} عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ

(علق/۵-۳)

۶۔۔۔ الرَّحْمَنِ {} عَلَّمَ الْقُرْآنَ {} خَلَقَ الْإِنْسَانَ {} عَلَّمَهُ الْبَيَانَ

(الرحمن/۳۱)

... فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ

(غاشیہ/۲۱)

ترجمہ

- ۱۔۔ (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا ہمارا پروردگار تو وہ ہے جس نے ہر چیز کو وہ کچھ عطا کیا جو اس کا لازمہ تھا اور پھر رہبری کی۔
- ۲۔۔ کیا ہم نے اس (انسان) کیلئے دو آنکھیں نہیں بنائیں؟۔۔۔ اور ایک زبان اور دو لب؟۔۔۔ اور اسے اسکے خیر و شر کی ہدایت نہیں کی؟
- ۳۔۔ پھر (انسان کی تخلیق کے بعد) فُجُور و تقویٰ (خیر اور خیر کی آگاہی) اُسے الہام کی۔
- ۴۔۔ اپنے چہرے کو پروردگارِ عالم کے خالص دین کی طرف متوجہ کر لے۔ یہ وہ فطرت ہے جس پر خداوندِ عالم نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، خدا کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہے، یہی وہ محکم اور استوار دین و آئین ہے لیکن اکثر لوگ یہ نہیں جانتے۔
- ۵۔۔ وہی جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم، اور انسان جو کچھ نہیں جانتا تھا اسے سکھایا۔
- ۶۔۔ خداوندِ رحمان۔۔۔۔۔ قرآن کی تعلیم دی۔۔۔۔۔ انسان کو پیدا کیا۔۔۔۔۔ اور اُسے بات کرنا سکھایا۔
- ۷۔۔ پس تو یاد دلا، تو تو صرف یاد دلانے والا ہے۔



## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

استاذِ ازل!

اس سلسلے کی سب سے پہلی آیت میں حضرت موسیٰ بن عمران کی اس گفتگو کا تذکرہ ہے کہ جب وہ اور ان کے بھائی ہارون فرعون کے سامنے آئے تو اس نے ان سے پوچھا: ”تمہارا یہ پروردگار تم جس کی طرف دعوت دے رہے، کون ہے؟“ جناب موسیٰ نے فوراً ارشاد فرمایا ”ہمارا پروردگار وہی ہے جس نے ہر چیز کی خاص تخلیق عطا فرمائی پھر اسے ہدایت بھی کی“ (قَالَ رَبُّبِا الَّذِي اَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ حَلَقَةً ثُمَّ هَدَىٰ)

معلوم ہے کہ چیز کسی نہ کسی مقصد کیلئے بنائی گئی ہے اور ہر چیز خواہ نباتات ہوں یا حیوانات، پرندے ہوں یا حشرات الارض اور صحرائی اور دریائی جانور، غرض ہر ایک کسی خاص ماحول اور مقصد کیلئے بنایا گیا ہے اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر چیز اپنے ماحول کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہے اور اسے جس چیز کی بھی ضرورت ہے وہ اُسے دے دی گئی ہے یہ ہے تخلیق کے مرحلہ آغاز میں۔

لیکن ہدایت تکوینی کے مرحلہ میں ہم اچھی طرح دیکھ رہے ہیں کہ تخلیق کے بعد کسی بھی چیز کو آوارہ نہیں چھوڑا گیا بلکہ رمزی ہدایت کے ذریعہ ہر موجد کی اس کے مقصد کی طرف راہنمائی کی جاتی ہے۔ ان میں سے بہت سی ایسی مخلوق بھی ہے جس کے پاس بہت سے علم اور دانش کے خزانے ہیں لیکن یہ خزانے اس کو نہ تو ذاتی تجربے کی بنا پر حاصل ہوئے ہیں اور نہ کسی معلم کی تعلیم و تدریس کے ذریعہ یہ تکوینی ہدایت اور علوم اور دانش اس ذات مقدس کی نشانیاں ہیں جس نے اس عظیم کائنات کو خلق فرمایا ہے اور وہی اس کی ہدایت اور رہبری فرما رہی ہے۔

البتہ اس بات کا صرف انسان ہی کے ساتھ تعلق نہیں بلکہ آیت کا انداز بتا رہا ہے کہ یہ ایک کلی جامع و عمومی بحث ہے جو تمام انسانی افراد کو بھی شامل ہے اور یہ ہدایت انبیاء و مرسلین کی اس ہدایت سے ہٹ کر ہے جسے ”ہدایت تشریحی“ کہتے ہیں اور صرف انسانوں کے ساتھ خاص ہے۔

ایک بچہ جب شکمِ مادر سے متولد ہوتا ہے وہ کسی مقدمہ کے بغیر ہی اپنی ماں کے پستان کو اپنے منہ میں لے لیتا ہے، اس کو شیرہ جان کو چوسنا شروع کر دیتا ہے۔ اور کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے اور نازک ہاتھوں سے پستان کو سہلاتا ہے اور پستان کے اندر موجود دودھ کے منبع کو حرکت میں لاتا ہے۔ اس نے کہاں سے یہ سبق سیکھا ہے کہ وہ زندہ رہنے کیلئے یہ رستہ اختیار کرے؟

اس نے کہاں سے سیکھ لیا کہ اپنی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے جن کاموں کی بجا آوری اس کے بس میں نہیں، اس کا بہترین راہ ”گریہ“ ہے، ایسا گریہ جو خواب اور بیداری میں ماں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے اور اسے اُس کی امداد پر آمادہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح کئی اور علوم بھی ہیں جن سے معلم اور استاد کے بغیر انسان بہرہ مندی کرتا ہے۔

اس سے ملتے جلتے ایک اور معنی قرآن مجید کی دیگر آیات میں بھی نظر آتے ہیں۔ چنانچہ سورہ اعلیٰ کی آیت ۳ میں ہم پڑھتے ہیں

’وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ‘ خداوند عالم وہ ہے جس نے موجودات کا اندازہ لگایا اور پھر ہدایت فرمائی۔

آیات کی دوسری قسم میں خدا انسان کو اپنی نعمتوں کی یاد دہانی کرانے کے بعد آنکھ، زبان اور لبوں کی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ”ہم نے اسے اس کی خیر و شر کی ہدایت کی ہے۔“ (وَهَدَيْنَاهَا النَّجْدَيْنِ)

”نجد“ کے لغوی معنی بلند اور سپاٹ جگہ کے ہیں جو ”تھامہ“ کے مقابلے میں ہے، جس کے معنی پست، چٹائی اور سمندر کی ہم سطح زمین وغیرہ ہیں۔ چونکہ خوش بختی کے اصولوں اور سعادت کی راہوں کی آگاہی اور اس راستے کو طے کرنا ایسے ہی ہے جیسے ترفع زمینوں کو طے کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اور نہایت ہی مشکلات اور زحمت کا حامل۔ یہاں پر ”نجد“ لفظ خیر کی راہوں کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور پھر شر کے راہوں سے آگاہی پر اس کا اطلاق اس کے ساتھ ہی ”تعلیت“ کے عنوان سے قرار پایا ہے۔ بنا بریں آیت کا تحت الفاظ ترجمہ یوں ہوگا ”ہم نے انسان کو دو مرتفع زمینوں کی ہدایت کر دی ہے“ یہ دوسری زمینیں وہی خیر و شر کی راہیں ہیں۔

اسی لئے ہم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

’يَا أَيُّهَا النَّاسُ! هُمَا نَجْدَانِ، نَجْدٌ الْخَيْرِ وَنَجْدٌ الشَّرِّ، فَمَا جَعَلَ نَجْدُ الشَّرِّ أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنْ نَجْدِ الْخَيْرِ‘ اے لوگو! دو مرتفع زمینیں موجود ہیں، ایک خیر کی سرزمین اور دوسری شر کی سرزمین اور تمہارے نزدیک شر کی سرزمین، خیر کی سرزمین سے ہرگز زیادہ محبوب قرار نہیں پائی۔ [۱]

بعض کوتاہ نظر افراد نے آیت کے وسیع مفہوم کو ایک محدود موضوع میں خلاصہ کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان دو مرتفع زمینوں سے مراد ”ماں کے پستان“ ہیں۔ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ”وَهَدَيْنَاهَا النَّجْدَيْنِ“ دو پستان کی طرف اشارہ ہے، تو آپؐ نے ارشاد فرمایا ”هُمَا الْخَيْرُ وَالشَّرُّ“ نہیں بلکہ مراد خیر اور شر ہیں۔“

البتہ اس بارے میں ہدایت الہی مختلف طریقوں سے حاصل ہوتی ہے، وجدان اخلاقی، فطرت، عقلی دلائل اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے ذریعے سے (گو یا ہدایت تکوینی اور تشریحی ہدایات کی مختلف انواع پر مشتمل) لیکن آیات کا سیاق زیادہ تر ہدایت تکوینی سے مناسبت رکھتا ہے۔

تیسری آیت میں انسان کی جان اور جان روح کے خالق کی قسم کھانے کے بعد ”فَجُورًا وَتَقْوَىٰ“ کے الہام کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے ”خداوند عالم نے نفس انسانی کو فجور اور تقویٰ الہام کیا“ (فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا)

[۱] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۵۸۱، تفسیر مجمع البیان اور تفسیر قرطبی، انہی آیات کے ذیل میں۔ نیز حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی یہی بات نقل کی گئی ہے۔

”الہام“، ”لہم“ (بروزن فہم) کے مادہ سے ہے۔ جس کے معنی کسی چیز کا ”نگنا“ یا ”پینا“ ہیں۔ [۱] پھر اس کا اطلاق ”اللہ تعالیٰ کی طرف سے قلب انسانی پر کسی چیز کے ڈالنے“ پر ہونے لگا ہے، گویا انسان کا دل اس بات کو اپنے تمام وجود کے ساتھ پی لیتا ہے اور نگل جاتا ہے۔ البتہ الہام کے ایک اور معنی بھی ہیں اور وہ ”وحی“ ہیں جو کبھی اسی معنی میں بھی استعمال ہوتی ہے۔

”فجور“ کے معنی تقویٰ کے پردے کو خاک کر دینا اور گناہوں کا ارتکاب کرنا ہیں (”فجر“ کے مادہ سے ہے جو پھاڑنے اور چاک کرنے کے وسیع معنی میں ہے، یا تاریکی شب کو صبح کی سفیدی کے ذریعہ پھاڑنے کے معنی میں ہے)۔

”تقویٰ“، ”وقایہ“ کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں۔ حفاظت، اور یہاں پر وہ امور مراد ہیں جو انسان کو گناہوں اور بدکاریوں کی آلودگی سے باز رکھتے ہیں۔

خلاصہ کلام، اس آیت سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ خداوند عالم نے حسن و قبح عقلی کے ادراک اور نیک و بد کے سمجھنے کے مسئلے کو فطری طور پر انسان کی جان میں ودیعت کر دیا ہے۔ تاکہ وہ اسے اس طریقے سے سعادت اور ارتقاء کی راہوں کے طے کرنے کی ہدایت کرے۔ اس آیت کی تفسیر کے بارے میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا ہے:

”بَيِّنَ لَهَا مَا تَأْتِي وَمَا تَنْتَهِى“ مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے انسان کیلئے واضح طور پر بیان فرمایا ہے کہ کن چیزوں کو انجام دینا چاہیے اور کن چیزوں کو انجام نہیں دینا چاہیے (بالفاظ دیگر ”چاہیے“ اور ”نہ چاہیے“ کی تعلیم دی ہے)۔ [۲]

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ”فجور“ کو ”تقویٰ“ پر کیوں مقدم رکھا گیا ہے؟ بعض مفسرین نے اس کا جواب یہ دیا ہے۔ ”کیوں کہ گناہوں سے پاک ہونا مقدم ہوتا ہے تقویٰ اس آراستہ ہونے کا۔ کیونکہ ہمیشہ ”پیراستہ ہونا“، ”آرستہ ہونے“ پر مقدم ہوتا ہے اور پاک سازی تعمیر نو پر مقدم ہوتی ہے۔ [۳]

بہر حال اگر انسان کیلئے افعال کے حسن و قبح کا ادراک فطری نہ ہوتا اور مثلاً ظلم کی برائی اور عدل و احسان کی اچھائی اور اسی طرح کے دیگر اعمال کی اچھائی و برائی کو سمجھنے کیلئے استدلال کی ضرورت ہوتی تو یقیناً انسانی معاشرہ کی عمارت دھڑام سے گر جاتی، کیونکہ نظری دلائل کے قیام میں بڑی حد تک عقائد کا اختلاف پیدا ہو جاتا اور چونکہ اس کیلئے کوئی وجدانی بنیاد موجود نہیں ہے، لہذا ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق کام انجام دیتا رہتا ہے۔

پس خداوند عالم کی یہ ہدایت انسان کی اجتماعی زندگی کیلئے حد سے زیادہ مؤثر اور نقدی ساز ہے اور یہ نعمت اور یہ عظیم ہدایت اس

[۱] ”لسان العرب“ ماد ”لہم“ بنا بریں جب یہ مادہ باب افعال کے وزن پر آتا ہے تو اس کا معنی نکلوانا اور پلانا ہو جاتا ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ الہام کا لفظ صرف امر خیر میں استعمال ہوتا ہے اور اس آیت میں بھی الہام فجور سے مراد مجبور سے پرہیز ہے۔

[۲] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۵۸۶ حدیث ۷

[۳] روح المعانی جلد ۳ ص ۱۴۳

قدراہیت کی حامل ہے کہ اس کا مقابلہ کسی اور نعمت سے نہیں کیا جاسکتا ہے۔

چوتھی آیت میں دین کے فطری ہونے کی بات کی گئی ہے اور وہ بھی دین ”حنیف“ کی یعنی جو ہر قسم کے باطل اور کجی کی طرف میلان اور رجحان سے خالی اور ہر طرح کے شر اور اس طرح کی دوسری آلودگیوں سے مکمل طور پر پاک ہے۔ (فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتِ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا)

”دین“ کے وسیع مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ وہ اصول دین کے تمام مبادیات، یا کم از کم فروع دین کے تمام کلیات کو شامل ہے۔ ”دین“ کے لفظ کا استعمال اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ صرف خدا شناسی اور توحید ہی نہیں بلکہ تمام اصول اور فروع دین اجمالی طور پر فطری ہونے کے لحاظ سے روز اول ہی سے انسانی کے اندر قرار پائے ہیں، اور یہ ”مکویٰ ہدایت“ جب انبیاء علیہم السلام کی ”تشریحی ہدایت“ سے ہم آہنگ ہوتی ہے تو انسان کے اندر نہایت ہی موثر جاذ بہیت پیدا کر سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شریعت میں جس قسم کی دعوت بھی موجود ہے اس کی جڑیں خود انسانی فطرت کی گہرائیوں میں مخفی ہیں۔ کوئی بھی آسمانی مذہب انسان کی فطری خواہشات کے ساتھ محاذ آرائی اور نبرد آزمائی نہیں کرتا بلکہ جائز اور شرعی طریقہ سے ان کو روایت بھی کرتا ہے۔ انہیں پایہ تکمیل تک بھی پہنچاتا ہے اور اس طرح ہدایت تکوینی کے عنوان سے خدا پرستی اور بنداری انسان کی جان کے اندر موجود ہے اور اگر کسی وقت انحراف اور کجروی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ عارضی ہوتی ہے۔ اسی لئے انبیاء کرام کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ ان عارضی کجرویوں اور انحرافات کو زائل کر دیں تاکہ اصلی فطرت میں شگوفہ ہونے کے امکانات بڑھ جائیں۔ اور چونکہ ہم انشاء اللہ توحید فطری کی بحث (تیسری جلد) میں اس آیت کے بارے میں تفصیلی گفتگو کریں گے اس لئے یہاں پر صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

ساتویں آیت میں پہلے تو قلم کے ذریعہ خدا کے تعلیم کرنے کی بات کی گئی ہے۔ پھر کلی طور پر انسان کو ان مسائل کی تعلیم دینے کا تذکرہ ہے جو وہ نہیں جانتا۔ ارشاد ہوتا ہے ”خداوند عالم وہی تو ہے جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی اور انسان کو ان چیزوں کی تعلیم کی جو وہ نہیں جانتا تھا“ (الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ)

قلم کے ذریعہ تعلیم دینے سے مراد شاید اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ لکھنا اور پڑھنا پہلی باری انبیاء کرام علیہم السلام کی طرف سے انجام پایا۔<sup>[1]</sup> یا پھر اس وجہ سے ہے کہ خداوند تبارک و تعالیٰ نے یہ ذوق اور استعداد انسانی روح کے اندر ایک فطری ہدایت کے عنوان سے ایجاد کر دی ہوئی ہے جو لکھنے اور پڑھنے کی وجہ سے منصف شہود پر آتی ہے۔ تاریخ بشر کا دورانہ خط کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہوتا ہے۔ (سب جانتے ہیں کہ زمانہ تاریخ اور زمانہ قبل از تاریخ کی درمیانی حداسی خط کے پیدائش کی تاریخ کا مسئلہ ہی ہے) ہر صورت میں قلم کے ذریعہ تعلیم کا طریقہ ہدایت الہی کے ذریعہ ہی معرض وجود میں آیا ہے۔

”عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ“ کا جملہ ان مختلف فطری علوم کی طرف ہو سکتا ہے جنہیں خداوند عالم نے انسانی وجود کے

[1] بہت سے مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ جس شخص نے سب سے پہلے قلم کے ساتھ لکھا ہے وہ حضرت آدمؑ تھے۔ تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۲۱۰ اور تفسیر روح المعانی جلد ۱۰ ص ۷۳

اندر یادگار کے طور پر رکھ دیا ہے، خواہ وہ عقلی حسن و فتح یا فخر و تقویٰ کا ادراک ہو یا ”بدیہی قضیے“ ہوں جو استدلالی علوم ”میں نظری قضیوں“ کی بنیاد قرار پاتے ہیں، یا پھر دین کے بنیادی قواعد اور احکام الہی کے اصول ہوں۔

چھٹی آیت میں پہلے تو قرآن کی تعلیم کو خداوند ”رحمان“ کی طرف نسبت دی گئی ہے جو رحمان تمام قسم کی رحمتوں اور کرامتوں کا منبع ہے۔ پھر انسانی تخلیق کی بات کی ہے اور فرمایا ہے ”انسان کو پیدا کیا اور اسے بیان (بولنے) کی تعلیم دی (خَلَقَ الْإِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ)۔ ”بیان“ کا عمومی مفہوم ہے جس کا اطلاق ہر آشکار کرنے والی چیز پر ہوتا ہے، خواہ وہ مختلف عقلی و منطقی دلائل ہوں جو پیچیدہ مسائل کو واضح اور آشکار کر دیتے ہیں یا خط و کتابت ہو یا پھر بات کرنا ہر چند کہ ان تمام معانی سے واضح ترین معنی بات کرنا ہی ہے۔

مفسرین نے ”بیان“ کی تفسیر کے بارے میں کئی احتمالات ذکر کئے ہیں۔ کسی نے کہا ہے اس کا مطلب ہے خیر و شر کی وضاحت، کسی نے کہا حلال و حرام کا بیان، کسی نے کہا اسمِ اعظم اور کسی نے کہا لغت کی تعلیم۔<sup>[۱]</sup> لیکن واضح سی بات ہے کہ ”بیان“ ہیں ظاہری معنی بات کرنا ہی ہیں اور دوسرے تمام احتمالات ضعیف معلوم ہوتے ہیں۔<sup>[۲]</sup>

خداوند عالم نے انسان کو بات کرنا کیونکر سکھایا، اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے، چونکہ ”لغات کا وضع کرنے والا“ (زبانوں کا بنانے والا) خود خداوند عالم ہے اور اسی نے وحی کے ذریعہ انبیاء علیہم السلام کو تعلیم دی ہے۔ لیکن ظاہری طور پر اس بات پر کوئی واضح دلیل نہیں مل سکی۔ بلکہ اس سے مراد بنی نوع انسان کو خدا کی جانب سے باطنی الہام ہے جو کہ حجرہ (حلق) کے ذریعہ صوت (آواز) کی ایجاد کے ساتھ شروع ہوا ہے اور پھر مخارج حروف کا سہار لے کر زبان کی گردش کے ذریعہ حروف ایجاد ہوئے۔ پھر ان حروف کو آپس میں ملایا گیا جن سے کلمات ایجاد ہوئے۔ پھر مختلف چیزوں اور مفہوموں کے نام رکھے گئے۔ اس طرح انسان نے بولنے پر قدرت حاصل کر لی کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو اس طریقے سے ادا کرے جو ایک طرف تو ہر ایک کے بس میں ہے اور دوسرے آسان اور سہل بھی۔ اس طرح وہ ہر قسم کے مادی اور معنوی، جزئی اور کلی، نیز مستقل اور غیر مستقل مفہیم کو بخوبی ادا کرنے پر قادر ہو گیا۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ اگر یہ خدا داد خلاق لیاقت انسان کے اندر نہ ہوتی اور وہ بات تک کرنا نہ جانتا تو نہ تو یہ تمدن ہوتا اور نہ ہی علم و دانش کا وجود، چہ جائیکہ وہ اس حد تک ترقی کر پاتا۔ اور نہ ہی انسان اپنی زندگی کی بنیادیں تعاون اور اجتماعی ہمکاری پر استوار کر سکتا کیونکہ اجتماعی ہمکاری۔ ایک دوسرے کے ساتھ نزدیکی رابط کی ایک شاخ ہے۔

تفسیر المیزان میں مذکور ہے کہ اس بات کی ایک اہم ترین دلیل کہ الہام خداوندی کی ذریعہ انسان کو ”بیان“ کی صلاحیت بخشی گئی جس میں اقوام و ملل کی زبانوں کا اختلاف ہے کیونکہ ہر قوم اور ملت کی ایک مخصوص زبان ہے جس میں روحانی، اخلاقی و نفسانی اور علاقائی

[۱] تفسیر قرطبی جلد ۹ ص ۶۳۲ اور تفسیر روح المعانی جلد ۷ ص ۸۶

[۲] اگر بعض روایات میں بیان بمعنی اسمِ اعظم تفسیر ہوا ہے تو درحقیقت اس کے ایک واضح مصداق کا ذکر ہے۔

خصوصیات پائی جاتی ہیں۔<sup>[۱]</sup>

بعض محققین نے دنیا میں موجود زبانوں کی تعداد تین ہزار سے زائد بتائی ہے۔ جب کہ بعض دوسرے صاحبان تحقیق نے یہ تعداد اس سے بھی زیادہ بتائی ہے۔<sup>[۲]</sup>

واقعیہ چیز عجیب اور خداوند تبارک و تعالیٰ کی قدرت و عظمت کی نشانیوں میں سے ایک ہے خود بات کرنا بھی حق تعالیٰ کی ایک عظیم نشانی ہے جب کہ زبانوں کا اختلاف اس کی ایک اور عظیم آیت ہے اور ہر دو کا شمار تخلیق انسانی کی خصوصیات میں ہوتا ہے۔ ممکن ہے بعض پرندے بار بار کے سدھانے اور پڑھانے سے دلکش باتیں کرنے لگ جائیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کا یہ کام انسان کی طرف سے دیئے گئے چند محدود الفاظ کے دائرہ میں تقلید کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس جملہ کے مفہوم سے آشنا ہوتے ہیں یہ صرف انسان ہی ہے جو غیر محدود طریقے پر جملے بنائے اور مختلف مفاہیم کو الفاظ کے قالب میں ڈھال کر بیان کرے اور اس کام کو مکمل آگاہی کے ساتھ انجام دے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے بھی توحیدِ مفضل کی حدیث کے ضمن میں خدا کی اس عظیم آیت کی طرف توجہ دلائی ہے اور مفضل سے ارشاد فرمایا:

”آواز، بات کرنے اور اس کے ذرائع اور آلات کے بارے میں خوب غور و فکر کرو کہ جو انسان میں فراہم کر دیئے گئے ہیں۔“

پھر امام نے اس کی تمام تفصیلات مفضل سے بیان فرمائیں اور انہیں اس کے بارے میں مطالعہ کرنے کی دعوت دی۔<sup>[۳]</sup>

اس سلسلے کی ساتویں اور آخری آیت میں پیغمبر کو مخاطب کرتے ہوئے حکم دیا جا رہا ہے۔ ”تم یاد دہانی کراؤ کیونکہ تم تو صرف یاد دہانی کرانے والے ہو۔“ (فَذَلِّكَ رُؤْمًا أَنْتَ مُذَكِّرٌ)

”تذکر“ (یاد دہانی کرنا) سے شاید یہ معنی مراد ہو کہ ان علوم و دانش کے حقائق اور ان تعلیمات کا نچوڑ، ہدایت الہی کے بموجب انسان کے دل و جان میں موجود ہوتے ہیں۔ انبیاء و مرسلین کی تعلیمات کے سایہ میں پروان چڑھتے ہیں اور ”خفا“ سے ”ظہور“، ”اجمال“ سے ”تفصیل“ اور ”اندرون“ سے ”بیرون“ کے مراحل میں منتقل ہوتے ہیں۔

مندرجہ ذیل آیت قرآن مجید کی سورہ قمر میں چار مرتبہ دہرائی گئی ہے، ایک تو اس وقت جب قوم فرعون کا ذکر ہوا، دوسرے جب قوم عاد کا ذکر ہوا، تیسرے قوم ثمود کے اور چوتھے قوم لوط کے ذکر کے موقع پر، اور وہ آیت ہے ”وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ

[۱] تفسیر المیزان جلد ۱۹ ص ۱۰۷

[۲] دائرة المعارف فرید وجدی جلد ۸ ص ۳۶۳

[۳] بحار الانوار جلد ۳ ص ۱۷

مُذَكَّرٌ“ (ہم نے قرآن کو یاد دہائی کیلئے آسان کر دیا ہے۔ پس کیا ہے کوئی جو یاد حاصل کرے؟) [۱] بعض یونانی فلاسفہ کا یہ قول مشہور ہے کہ ”علم و دانش، یاد دہانی کے سوا اور کچھ نہیں تمام علمی اصول بغیر کسی استثنا کے انسان کی روح میں ودیعت کئے گئے ہیں جنہیں وہ فراموش کر چکا ہے، لیکن معلمین کی مدد سے انہیں یاد کر لیتا ہے۔“

حضرت فخر رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ بات اس امر کی دلیل ہے کہ کوئی چیز پہلے سے انسان کے اندر موجود تھی، لیکن پھر وہ اسے فراموش کر چکا ہے“ تو ہم جواب میں کہیں گے ”جی ہاں! ایسا ہی حق کے سامنے سر جھکا دینا ہر انسانی فطرت میں موجود ہے، لیکن وہ کبھی اُسے فراموش کر دیتا ہے اور ایسے مواقع پر جب اسے یاد دہانی کرادی جائے تو وہ اپنی فطرت کی طرف لوٹ آتا ہے۔“ [۲]

بہر حال یہ آیت مجموعی طور پر بنی نوع انسان کیلئے خداوند عالم کی طرف سے فطری ہدایت پر زندہ دلیل ہے۔

## چند ضروری وضاحتیں

### علوم جدید میں ”فطری“ اور ”غریزی“ ہدایت

سائنس اور نفسیات شناسی کی پیش رفت اور حیوانات کے اسرار آمیز حواس کے بارے میں دانشوروں کے مطالعہ اور تحقیق نے زندہ موجودات کی کائنات میں فطری اور غریزی ہدایت کے بہت سے میراثی عقول اور حیرت ناک اسرار دریافت کئے ہیں ہمیں ایسے حیرت ناک امور نظر آتے ہیں جن کی توجیہ و تفسیر سے موجودہ علوم بھی عاجز ہیں۔ وہ یہ نہیں بتا سکتے ہیں کہ اس طرح کی ہدایتوں کا اصل سرچشمہ کہاں ہے، مگر یہ کہ یہ تسلیم کر لیں کہ کائنات کے عظیم مبداء نے، جس نے تمام موجودات عالم کی ہدایت کا فریضہ اپنے ذمہ لیا ہوا ہے، یہ علوم ایک اندرونی رمزی الہام کے ذریعہ انسان یا دوسرے حیوانات کو عطا فرمائے ہیں۔

اس سلسلے میں ہمارے پاس اس قدر شواہد اور نمونے موجود ہیں کہ اگر ان سب کو یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ لیکن اختصار کے طور پر ذیل کے چند نمونوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۱) انسان بوقت ولادت کسی استاد اور معلم کے سکھائے پڑھائے، پستان کو جو سنا، دودھ پینا اور اس کام کیلئے ہاتھ اور پنجے سے مدد لینا اچھی طرح جانتا ہے اور یہ بات بھی بخوبی جانتا ہے کہ رو کر اپنی ضرورتوں سے کس طرح آگاہ کیا جاتا ہے؟

انسان زبان کا وضع کرنا، الفاظ کا ایجاد کرنا، منہ سے بات کرنا اور اس قسم کے دوسرے مسائل ایک مرہوز اور مخفی استعداد کی صورت

[۱] سورہ قمر آیات ۱۷، ۲۲، ۳۲، ۴۰۔

[۲] تفسیر فخر رازی جلد ۲۹ ص ۲۲

میں شکم مادر سے اپنے ساتھ لاتا ہے، اسی طرح حسن و قبح کا ادراک، اچھائی اور برائی کی تمیز اور ”چاہیے“ اور نہ چاہیے“ کی قسم کی بہت سی دوسری چیزوں سے آشنائی، عالم تخلیق کے عظیم مبداء سے واقفیت اور معرفت الہی بھی اپنی ذات کے اندر رکھتا ہے۔

ایک دانشور کا کہنا ہے کہ جب مائیں اپنے بچوں کو خاموش کرنے کیلئے انہیں اپنی آنکھوں میں لیتی ہیں تو عام طور پر اپنے بائیں سینے کی طرف ہی لے جاتی ہیں اور وہ یہ کام لاشعوری طور پر کرتی ہیں۔ یعنی خود بھی نہیں جانتیں کہ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟ درحقیقت وہ اس طرح بچے کا سر اپنے دل کے قریب لے جاتی ہیں، جس سے وہ ماں کے دل کی دھڑکنیں سن کر خاموش ہو جاتا ہے، کیونکہ دھڑکنوں کی آواز اس کیلئے جانی پہچانی ہوتی ہے، جس سے وہ جینی دورانہ میں آشنا ہو چکا ہوتا ہے اور اسے سننے کا عادی بن چکا ہے۔ بہت کم مائیں ایسی ہیں جو اس نکتہ سے باخبر ہوتی ہیں۔ اسی لئے ماں کا یہ کام اور انداز صرف اور صرف ایک فطری الہام کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔

(۲) فطری اور غریزی ہدایت کا مسئلہ عالم حیوانات میں تو اس سے بھی زیادہ وسیع اور عمومی نوعیت کا حامل ہے۔ آج کے دور کے دانشوروں نے اس کے کئی محیر العقول نمونے ذکر کئے ہیں۔ چنانچہ ”فرڈینانڈ لین“ کی لکھی ہوئی کتاب ”دیارد یا عجائب“ میں یوں لکھا ہے:

”بعض مچھلیوں کا طریقہ کار، فطرت کا شاہکار ہے اور اس کی توجیہ کسی کے بس میں نہیں۔ ”تزل آلا“ نامی مچھلی، سمندروں کو چھوڑ کر بیٹھے پانی کی ان نہروں یا دریاؤں کا رخ کرتی ہے جہاں سے اس نے زندگی کا آغاز کیا تھا، پانی کی مخالف سمت میں پوری توانائی صرف کر کے تیر کر اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے، راستے میں درپیش چٹانوں سے چھلانگ لگا کر اس پار ہوتی ہے، حتیٰ کہ آبشاروں کے اوپر سے اڑ کر آگے بڑھتی ہے۔ بسا اوقات اس قسم کی مچھلیوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ بڑی بڑی نہروں کو بڑھ کر دیتی ہے جب یہ مچھلیاں اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاتی ہیں تو وہیں پر تنم گزاری کر کے مرجاتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مچھلیاں کس طرح مناسب نہریں یا دریا تلاش کر لیتی ہیں؟ یہ کام تو ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ایجاد سے بھی زیادہ عجیب ہے، کیونکہ نہ تو اس کے پاس نقشہ ہوتا ہے جس سے وہ راہنمائی حاصل کریں۔ نہ ہی پانی کے نیچے زیادہ دور تک ان کی نگاہیں کام کر سکتی ہیں اور نہ ہی کوئی ایسا راہنما ہوتا ہے جو انہیں راستہ بتائے۔ [۱]

(۳) اسی کتاب میں ہے: ”مارماہی“ (سانپ مچھلی) کا طریقہ کار اس سے بھی زیادہ عجیب ہے، انگلستان کی یہ مچھلیاں جب آٹھ سال کی ہوتی ہیں تو اس جھیل یا نہر کو ترک کر دیتی ہیں جن میں وہ اب تک رہ رہی تھیں۔ یہ شب کو مرطوب گھاس پر آکر سانپ کی مانند اس پر رنگینا شروع کر دیتی ہیں، حتیٰ کہ سمندر کے کنارے پہنچ جاتی ہیں۔ پھر وہ بحر اوقیانوس اطلس کو تیر کر طے کرتی ہوئی ”برمودا“ کے نزدیکی پانیوں تک پہنچ جاتی ہیں، وہاں پر زیر آب جا کر انڈے دیتی اور پھر مرجاتی ہیں۔۔۔۔!

اس سے بھی عجیب تر یہ کہ ان کے بچے سطح آب پر آجاتے ہیں اور پھر اپنے مادری وطن کی طرف دور دراز کے سفر کا آغاز کر دیتے ہیں اور ان کا یہ سفر دو تین سال تک جاری رہتا ہے۔



یہ مچھلیاں اپنی منزل مقصود کو کیونکر پہچانتی ہیں جب کہ انہوں نے اس رستے کو نہیں دیکھا ہوتا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کیلئے آپ بھی دوسرے عقل مند ترین دانشوروں کی مانند جواب دیں، کیونکہ کوئی بھی دانشور اس سوال کا جواب نہیں جانتا۔<sup>[۱]</sup>

(۴) کتاب ”حواص اسرار امیر حیوانات“ کے لکھنے والے ”ویٹس دروشر“ کہتے ہیں:

”چمگاڈ کے بارے میں دانشوروں نے بہت سے محیر العقول موضوعات دریافت کئے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس دنیا میں چار قسم کی ایسی چمگاڈ پائی جاتی ہیں جو مچھلی کا شکار کرتی ہیں، وہ تاریک راتوں میں پانی کی سطح پر پرواز کرتی ہیں، اچانک اپنے پاؤں کو نیچے لے جاتیں ہیں اور ایک مچھلی کو وہاں سے نکال کر اپنے منہ میں لے لیتی ہیں! حیرت ناک راز تو یہ ہے کہ انہیں کہاں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں مخصوص نقطہ پر ایک مچھلی پانی کے اندر تیر رہی ہے؟ اپنے تمام وسائل اور فنی ترقیوں کے باوجود انسان اب تک اس بارے میں کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔ ایک بمبار طیار پانی کے اندر موجود کشتی (تار پیڈو) کی صحیح صحیح نشاندہی نہیں کر سکتا ہے بلکہ اسے یہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ مخصوص لہروں کی نشانیاں دریا پر ڈالے تاکہ وہ ان علامتوں کی وجہ سے جو ان نشانوں کے ذریعہ معرض وجود میں آتی ہیں، ریڈیو ٹیلیگرافی کی صورت میں ہوائی جہاز تک پہنچیں اور وہ پانی میں موجود کشتی کی موجودگی کا پتہ چلائے۔

(جی ہاں!) چمگاڈ کے برخلاف، ہوائی جہاز پانی کے اندر موجود اپنے ٹھکانے کا براہ راست پتہ نہیں لگا سکتا۔ پروفیسر ”گری فن“ کہتے ہیں کہ ”اس موضوع کیلئے کوئی قابل قبول وضاحت نہیں ملتی۔

موصوف آگے چل کر کہتے ہیں ”انسان نے اب تک جو کچھ بھی فنی دریافتیں کی ہیں اس نے دیکھ لیا ہے کہ فطرت اس سے پہلے وہ کام انجام دے چکی ہے۔ البتہ یہ دریافت اس کی انا کی اور خود پسندی کی حس کی تسکین کا موجب ضرور بنتی ہے، لیکن وہ ہمیشہ متوجہ ہو جاتا ہے کہ اس حصے میں بھی فطرت سے بہت پیچھے ہے!

اسی وجہ سے امریکی دانشور نے ایک نئے علم کی بنیاد رکھی ہے جس کا نام ”بائیوئی“ ہے۔ اس علم کا مقصد یہ ہے کہ فطرت ہمیں نمونے عطا کرتی ہے جن کے رازوں پر غور کر کے اس سے نئے فنی اور تکنیکی نتائج اخذ کئے جاسکیں۔

وہ کہتے ہیں ہیں: اگر ان دودھ دینے والے اور پروں سے اڑنے والے جانوروں (چمگاڈوں) میں سے کسی ایک کو کسی مکمل طور پر بند بے میں رکھ کر اس کے آشیانے سے تین سو کلومیٹر دور لے جائیں اور اسے وہیں پر چھوڑ دیں، پھر بھی وہ دن میں اندھی ہونے اور اس جگہ سے بے خبر ہونے کے باوجود تھوڑی سی مدت میں براہ راست اپنے گھونسلے کو واپس آجائے گی۔<sup>[۲]</sup>

(۵) مشہور صاحب قلم ”کری مورسین“ اپنی کتاب ”راز آفرینش انسان“ کی ایک فصل بنام ”شعور حیوانی“ کے تحت اس قسم کے بہت سے نمونے بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

[۱] یار دیار عجائب ص ۱۱۶

[۲] کتاب ”حواص اسرار امیر حیوانات“ ص ۱۷

”پرندے فطری اور غریزی طوپر اپنا آشیانہ بناتے اور اس تک پہنچ جاتے ہیں (ہر چند کہ اس سے پہلے کا نمونہ انہوں نے نہیں دیکھا ہوتا) ابائیل SWALLOW جو آپ کے گھر کے ورانڈے میں گھونسلہ بناتا ہے، وہ سردی کے موسم میں گرم علاقوں میں چلا جاتا ہے۔ لیکن جونہی موسم بہار کی آمد کا سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ واپس آ جاتا ہے۔

بہت سے پرندے جنوبی اور گرم علاقوں کی طرف سفر کرتے ہیں اور اکثر اوقات تو وہ زمین اور سمندر کے اوپر سے سینکڑوں فرسخ کا فاصلہ طے جاتے ہیں، لیکن وہ کبھی اپنا راستہ نہیں بھولتے۔

آزاد مچھلی کئی سال تک سمندر میں رہتی ہے پھر وہ اسی دریا کی طرف لوٹ جاتی ہے جہاں سے وہ سمندر میں آئی تھی۔ اس سے بھی بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ وہ دریا کے کنارے کنارے چل کر اس نہر تک جا پہنچتی ہے جہاں وہ پیدا ہوئی تھی۔۔۔ آزاد مچھلی اپنے باطنی شعور کی پیروی میں اس ساحل تک جا پہنچتی ہے جو اس کے نشوونما کی جگہ تھا۔ آخر کون سی حس اس بات کا سبب بنتی ہے کہ یہ مچھلی اس قدر دقیق اور قطعی طور پر اپنے اصلی وطن کی طرف لوٹ جاتی ہے؟ (اسے کوئی نہیں جانتا)

اگر کسی چوزے کو اسی کے آشیانے سے باہر نکال کر دو دروازے کے ماحول میں اس کی پرورش کی جائے، تو وہ جب بھی اپنے شعور اور ارتقاء کی منزل پر پہنچے گا اپنے باپ دادا کی مانند آشیانہ بنانا شروع کر دے گا۔۔۔۔۔ آیا روئے زمین پر بسنے والی مختلف مخلوق کے جداگانہ اور مخصوص اعمال جو ان سے سرزد ہوتے ہیں وہ سب اتفاق اور بغیر سوچے سمجھے معرض وجود میں آ جاتے ہیں یا نہیں، بلکہ کلی عقل و شعور ان کے سرزد ہونے کا سبب بنتا ہے۔ [۱]

(۶) ایک فرانسیسی دانشور جن کا نام ”وارڈ“ ہے، ”اکسیکلپ“ نامی پرندے کے بارے میں کہتے ہیں:

”میں نے اس پرندے کے بارے میں بہت مطالعہ کیا ہے۔ اس کی خصوصیات میں یہ بات ہے کہ جب اس کی مادہ کے انڈے دینے کی مدت ختم ہو جاتی ہے تو وہ مر جاتی ہے، یعنی وہ اپنے نومولود بچوں کا رخ ہرگز نہیں دیکھ پاتی، اس طرح اس کے بچے اس کی صورت نہیں دیکھ پاتے۔

جب وہ انڈے کے خول سے باہر آتے ہیں تو وہ کیڑوں کی شکل کے ہوتے ہیں جن کے پروبال نہیں ہوتے اور نہ ہی ان میں غذا اور دوسری ضروریات زندگی کے حصول کی قدرت ہوتی ہے، حتیٰ کہ وہ اپنے دفاع پر بھی قادر نہیں ہوتے یعنی جو حادثات ان کی زندگی سے نبرد آزما ہوتے ہیں، اُن کا وہ دفاع نہیں کر سکتے اس لئے ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک سال کی مدت تک اسی حالت میں کسی محفوظ جگہ پر رہیں اور ان کی غذا ہمیشہ ان کے پاس رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کی ماں کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے انڈے دینے کا وقت قریب آ گیا ہے تو وہ لکڑی کا ایک ٹکڑا تلاش کرتی ہے اور اس میں ایک گہرا سوراخ بناتی ہے، پھر وہ خوراک اکٹھا کرنا شروع کر دیتی ہے جو اس کے نومولود بچوں کی غذا کے قابل پتے اور کوئیلیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک کیلئے ایک سال کی غذا کے طور پر وہیں جمع کر کے سوراخ کے نیچے رکھ

[۱] کتاب ”راز آفرینش انسان“، فصل ۸ ”شعور حیوانی“۔

دیتی ہے اس کے اوپر اس سوراخ میں ایک انڈا دیتی ہے، پھر لکڑی کے برادے سے اس سوراخ کے اوپر پختہ چھت بنا دیتی ہے۔ پھر مذکورہ غذا جمع کر کے اس پر انڈا دیتی ہے اور سابق طریقہ کو اپنائے ہوئے اس پر مضبوط چھت بنا دیتی ہے۔ اس طرح وہ کئی منزلیں تیار کرتی ہے جب وہ اپنے اس عمل سے فارغ ہو جاتی ہے تو پھر مر جاتی ہے!

(آپ غور تو فرمائیں کہ یہ کمزور سا پرندہ کہاں سے جان لیتا ہے کہ اس کے نومولود بچوں کو ان چیزوں کی ضرورت ہوگی اور پھر اس نے یہ تعلیمات کہاں سے حاصل کی ہیں، کس سے سیکھا ہے؟ کیا اپنی ماں سے یہ سب کچھ سیکھا ہے حالانکہ اپنی ماں کی تو صورت ہی نہیں دیکھی، یا تجربے سے سیکھا، حالانکہ ایسا کام اس کی زندگی میں صرف ایک مرتبہ ہی انجام پاتا ہے۔۔۔۔۔۔ کیا اس مقام پر اس بات کا اعتراف نہیں کرنا پڑتا کہ یہ سارے کے سارے کام ایسے ہیں جن کا غیب کے الہام اور غریزے کے ساتھ تعلق ہوتا ہے، جسے خداوند عالم و عالم کے طاقت ور ہاتھوں نے اس کے اندر ودیعت کر دیئے ہیں!)

(۷) روس کے مشہور ماہر نفسیات اور دانشور ”پلائونوف“ اپنی ایک کتاب میں لکھتے ہیں:

”جنگِ عظیم میں اچانک میری ملاقات ایک ایسے ڈاکٹر سے ہوئی جو کئی راتوں کی بیداری کے بعد تھوڑا سا سو گیا۔ ابھی وہ سو یا ہی تھا کہ بہت سے زخمیوں کو اسی وقت لایا گیا۔ ان کا معاملہ یہ تھا کہ ان کا فوراً آپریشن کیا جانا چاہیے تھا۔ لیکن ڈاکٹر کو بیدار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ہم نے اسے بلایا، اس کے چہرے پر پانی ڈالا، اس کے سر کو جھنجھوڑا، لیکن بے سود، سر اٹھاتا اور پھر سو جاتا۔

میں نے سب لوگوں کو اشارہ کیا کہ چپ ہو جائیں (تاکہ میں انہیں بیدار کروں) چنانچہ میں نے آہستہ لیکن واضح طور پر اُسے کہا:

”ڈاکٹر صاحب! زخمیوں کو لے آئے ہیں اور تمہاری سخت ضرورت ہے“ یہ سن کر وہ فوراً اُٹھ بیٹھا۔ وہ آگے چل کر لکھتے ہیں:

”اس موضوع کی یوں توجیہ کی جاسکتی ہے کہ وہ لوگ جو پہلے اس کو بیدار کرنے کی کوشش کر رہے تھے وہ اس کے مغز کے ممنوع حصے پر اثر ڈال رہے تھے جب کہ میں نے اس کے مغز کی حفاظتی، چوکی، پر اثر ڈالا یہ حصہ گہری سے گہری نیند میں بھی بیدار رہتا ہے یہی وہ ”حفاظتی چوکی“ ہوتی ہے جس کے ذریعہ انسان باہر کی دنیا سے رابطہ قائم کرتا ہے (اور غیر شعوری طور پر اپنی دلچسپی کے امور کو اسی ”حفاظتی چوکی“ کے حوالے کر دیتا ہے)

جو ماں اپنے بیماری بچے کے پہلو میں سوئی ہوئی ہے، وہ اپنے اطراف والوں کے شور و غل سے اتنا جلدی بیدار نہیں ہوگی جتنا اپنے بچے کے معمولی سے رونے سے بیدار ہو جائے گی۔ آٹا پینے کی چکیوں پر ماہر اور فطوفانی ہواؤں اور بجلی کی گرج اور کڑک کی حالت میں تو سو جائیں گے اور نیند کے مزے لیں گے لیکن جو نہی چکی کا پتھر رکا ان کی نیند بھی اچاٹ ہوگئی۔ (یہ سب کچھ صرف اس لئے ہے کہ ان لوگوں نے غیر شعوری طور پر اپنی دلچسپی کے امور کو اپنے مغز کی ”حفاظت چوکی“ کے سپرد کیا ہوا ہوتا ہے) [۱]

(۸) ”چھٹی رمان کبوتروں“ اور ان کی اپنے اپنے آشیانوں کو اسرار آمیز دلچسپی کے بارے میں ”در دشر“ اپنی کتاب میں یوں لکھتے ہیں:

[۱] کتاب ”روانشناسی در شعوری“ جلد ۱۹ (قدرے تلخیص کے ساتھ)

”اگر انہیں بند اور تاریک ترین ڈبوں میں بند کر کے ان کے گھونسلوں سے سینکڑوں میل دور چھوڑ دیا جائے اور یہ سفر طے کرنے کیلئے بیچ و خم بھر مختلف راستے اختیار کئے جائیں، لیکن جونہی وہ ان ڈبوں سے باہر آئیں گے صرف دس یا بیس سینکڑ سورج کی طرف نگاہ کریں گے، پھر سیدھے اپنے گھونسلوں کی طرف محور پرواز ہو جائیں گے۔ یہ بات مشہور دانشور ڈاکٹر ”کریم“ کے متعدد بار کے تجربوں سے ثابت ہو چکی ہے ڈاکٹر موصوف کے طریقے کار کی ان الفاظ میں تشریح کی جاسکتی ہے کہ مثلاً ”ہمیرگ“ شہر کا ایک کبوتر جانتا ہے کہ دن کے فلاں گھنٹے میں سورج کس موقع پر ہوتا ہے۔ اگر اُسے مثلاً ”برم“ لے جایا جائے تو اس جانور کو معلوم ہوتا ہے کہ سورج وہاں پر نیم درجے شمالی اور ۲۵/۱ درجے شرقی حصہ پر واقع ہے، تو اسے ہمیرگ شہر کیلئے پرواز کرنے کیلئے وہاں پر سورج کے درجہ کو پیش نظر رکھ کر اڑنا پڑے گا۔ چنانچہ وہ ایک ہی لمحہ میں شمال مشرق کی طرف محور پرواز ہو جائے گا۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ جب آسمان پر بادل ہوں اور سورج ظاہر نہ ہو تو وہ کیسے اپنے راستوں کو پہچان لیتے ہیں۔ تجربہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے بہت سے کبوتر ایسے ہیں جو اس قسم کے ”خورشیدی قطب نما“ کے بغیر ہی اپنی راہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

بالفرض اگر یہ پرندے ”خورشیدی قطب نما“ ہی سے استفادہ کرتے ہیں تاہم یہ بات تو یقینی ہے کہ زاویوں کی تعیین اور وہ بھی بہت ہی چھوٹے اور دقیق زاویئے جو آلات و اوزار کے غیر حاصل نہیں ہو سکتے، یہ ایسے مسائل ہیں جو خدا کی ہدایت تکوینی کے بغیر قابل تفسیر نہیں ہیں۔ یہ اور اس قسم کے سینکڑوں دوسرے زندہ گواہ موجود ہیں کہ فطرت کے ماوراء ایک ایسا علم بے پایاں اور ایسی بے انتہا قدرت کا رفرما ہے جو ہر چیز کو اپنی زندگی کی ہدایت اور راہنما کرتی ہے۔ یہ سب اس بے نشان ذات کی نشانیاں اور اس کے علم و قدرت کے شاہکار ہیں۔

(۹) اس گفتگو کو ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس فرمان پر ختم کرتے ہیں جو ”حدیث مفصل“ میں بیان ہوا ہے۔ امام عالی مقام علیہ السلام فرماتے ہیں۔

”اے مفصل! ان چوپاؤں کی عجیب و غریب خلقت کے بارے میں غور و فکر کرو۔ وہ بھی انسانوں کی طرح اپنے مردوں کو زمین میں چھپا دیتے ہیں۔ وگرنہ بیاباں کے ان وحشی جانوروں اور درندوں وغیرہ کے مردے کہاں ہیں جو دیکھے نہیں جاتے؟ ان کی تعداد کوئی کم تو نہیں ہے جو کسی سے چھپی رہے بلکہ اگر کوئی یہ کہے کہ ان کی تعداد انسانوں سے کئی گنا زیادہ ہے، تو وہ غلط نہیں کہے گا۔۔۔۔۔<sup>[۲]</sup>

یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ جب وہ اپنے موت کے قریب آجانے کا احساس کرتے ہیں تو وہ کہیں دور جا کر چھپ جاتے ہیں اور وہیں پر جاتے ہیں! اگر ایسا نہ ہوتا تو جنگل اور بیابان ان کے مردوں سے بھر جاتے اور ہوا متعفن ہو کر رہ جاتی جس سے مختلف بیماریاں پھوٹ پڑتیں اور وبا پھیل جاتی۔ پس اچھی طرح اور غور سے دیکھو کہ جو کام انسان سوچ سمجھ کر اور غور و فکر کے بعد انجام دیتا ہے، وہی کام حیوانات ایک غریزہ کے طور پر انجام دیتے ہیں، تاکہ انسان اُن کے بُرے آثار سے محفوظ رہیں۔

[۱] کتاب ”حواس اسرار آئینہ حیوانات“ ص ۱۸۳

[۲] بحار الانوار جلد ۳ ص ۹۹ (قدرے تلخیص کے ساتھ)

## ۶۔ نیند اور بیداری میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں

اشارہ:

قرآن مجید نے آسمان، زمین، سورج، چاند اور انسانی روح جیسے اہم ترین موضوعات پر ہی روز نہیں دیا اور انہیں خدا کی آیات اور نشانیوں کے عنوان سے متعارف نہیں کرایا، بلکہ کبھی ان مسائل کو بھی بڑی تاکید کے ساتھ بیان فرمایا ہے جو عام طور پر ہمیں سادہ اور معمولی دکھائی دیتے ہیں تاکہ وہ یہ بات واضح کرے کہ اس کائنات میں کوئی بھی چیز سادہ اور معمولی نہیں ہے بلکہ سب چھوٹی بڑی چیزیں حق تعالیٰ کی آیات اور اس کے علم و قدرت کی نشانیاں ہیں۔

ان بظاہر سادہ اور معمولی مسائل میں سے نیند اور بیداری کا مسئلہ بھی ہے جس پر قرآن مجید نے کافی روز دیا ہے۔ اس مختصر سے اشارے کے ساتھ اب ہم ذیل کی آیات کو گوش جان سے سماعت کرتے ہیں:

۱۔۔۔ وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَامُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهِ إِنَّ ذَلِكَ  
لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ

(روم/۲۳)

۲۔۔۔ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ لَيْلٍ لِّبَاسًا وَالنَّوْمَ سُبَاتًا وَجَعَلَ النَّهَارَ  
نُشُورًا

(فرقان/۴۷)

۳۔۔۔ وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا

(نبا/۹-۱۰)

۴۔۔۔ اذْغِشِيكُمْ السُّعَاسَ اٰمَنَةً مِّنْهُ وَيُنزِلْ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً  
لِّيُطَهِّرَ كُمْ بِهِ

(انفال/۱۱)

## ترجمہ

۱۔۔ اور اس کی نشانیوں میں سے تمہاری شب روز کی نیند اور معاش (کے حصول) اور فضل پروردگار سے بہرہ مندی کیلئے تمہاری تلاش اور کوشش ہے۔ اور ان امور میں ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں، جن کے پاس سننے والے کان ہیں۔

۲۔۔ وہ وہی تو ہے جس نے رات کو تمہارے لئے لباس قرار دیا ہے اور دن کو تحرک اور زندگی کا سبب۔

۳۔۔ اور ہم نے تمہاری نیند کو تمہارے سکون کا ذریعہ قرار دیا۔ اور رات کو (تمہارے لئے) پردہ۔

۴۔۔ اور (اس وقت کو یاد کرو) جب خفیف سی نیند جو تمہارے لئے خدا کی طرف سے سکون کا ذریعہ تھی، تم پر چھا گئی۔ اور تمہارے لئے پانی نازل کیا تاکہ اس کے ذریعہ تمہیں پاک قرار دے۔

## الفاظ کے معانی اور تشریح

بعض ارباب لغت جب ”نوم“ (نیند) کے لفظ پر پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اس کے وہی مشہور معنی اور مفہوم ہیں۔<sup>[۱]</sup>

لیکن ”راغب“ اپنی کتاب ”مفردات“ میں کہتے ہیں:

”نوم کی مختلف تفسیریں ہیں جو ساری کی ساری صحیح ہیں، البتہ مختلف نکتے نظر کے تحت، بعض نے کہا ہے کہ نوم سے مراد وہی رطوبتوں اور بخارات کی وجہ سے مغز کے اعصاب کا سست ہونا ہے جب کہ بعض نے کہا ہے کہ ”نوم“ یہ ہے کہ خداوند عالم انسان کی روح کو موت دینے بغیر قبض کر لیتا ہے۔ بعض کہتے ہیں ”نوم“ خفیف سی موت ہے جب کہ موت گہری نیند ہوتی ہے<sup>[۲]</sup>

”نعاس“ (بروزن غبار) کے معنی مختصر اور ہلکی سی نیند ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ نیند کے آغاز کو نعاس کہتے ہیں۔ اور چونکہ نیند ابتداء میں خفیف اور ہلکی ہوتی ہے لہذا دونوں معانی ایک حقیقت کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

”سباب“؛ ”سبب“ (بروزن مثبت) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ”قطع کرنا اور کاٹنا“ ہوتے ہیں اور سینچر کے دن کو عربی زبان میں اسی وجہ سے ”یوم السبت“ کہتے ہیں کہ وہ آرام و سکون کے لئے کام کاج سے چھٹی کا دن ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سینچر کو یہ نام یہودیوں کے پروگراموں سے متاثر ہو کر دیا گیا ہے کیونکہ وہ سینچر کو چھٹی کا دن سمجھتے ہیں۔

[۱] لسان العرب مادہ نوم

[۲] مفردات راغب مادہ ”نوم“

یہ احتمال بھی ملتا ہے کہ یہودیوں کے عقیدے کے مطابق خداوند عالم نے کائنات کی تخلیق کا آغاز اتوار کے دن سے کیا۔ شش روزہ تخلیق کے بعد شنبہ کا دن تخلیقی کاموں کے خاتمے اور آرام کا دن تھا، اسی لئے اسے ”یوم السبت“ کہا جاتا ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ عقیدہ یہودیوں کی عظیم ترین غلطیوں میں سے ایک ہے۔ کیونکہ جب آسمان وزمین اور ماہ خورشیدی نہیں تھے تو دن اور ہفتے کہاں سے آگئے؟ اور اگر قرآن مجید نے یہ کہا ہے کہ ”خداوند عالم نے اس کائنات کو چھ دنوں میں پیدا کیا ہے“ تو اس سے مراد ”چھ ایام“ نہیں بلکہ ”چھ دورائے“ ہیں۔ ”سبت“ کا لفظ اسی مناسبت کی وجہ سے آرام و استراحت کے معنی میں آیا ہے۔ [۱]

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### تمہاری نیند خدا کی آیت ہے

اسی سلسلے کی سب سے پہلی آیت میں قرآن مجید نے رات اور دن میں انسان کے خواب کو خدا کی قدرت اور اس کے علم کی نشانیوں میں شمار کیا ہے۔ (وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَامُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ)

حتیٰ کہ آیت کے آخر میں ایک بار پھر تاکید کرتے ہوئے کہتا ہے ”ان امور (نیند، بیداری اور فضل خداوندی سے استفادہ کرنے کیلئے تلاش و کوشش) میں ان لوگوں کیلئے آیات اور نشانیاں ہیں جن کے پاس سننے والے کان ہیں۔“ (إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّبِعُونَ) اس میں شک نہیں ہے کہ زندگی کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کیلئے دنیا کے تمام جانداروں کو طاقت کی تجدید اور لازمی اور ضروری قوت کے حصول کیلئے ایسے آرام و سکون کی ضرورت ہوتی ہے جو زبردستی اُسے آ لے، حتیٰ کہ حریص اور لالچی لوگوں تک کو بھی نہ چھوڑے۔

اس مقصد کے حصول کیلئے نیند سے بڑھ کر اور کون سے عوامل متصور ہو سکتے ہیں جو لازمی طور پر انسان کو تلاش کر کے اسے اس بات پر مجبور کر دیں کہ اس کی تمام جسمانی حتیٰ کہ اہم فکری حصے کی سرگرمیوں کو متوقف کر دے جس کے نتیجے میں وہ ایک گہری استراحت میں گم ہو جائے اور تمام مدت میں اس کے بدن کے تمام حصے اور اعضا و جوارح ایک مرتبہ پھر چاق و چوبند ہو کر نئی تلاش اور نئی سرگرمیوں کیلئے آمادہ ہو جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ اگر نیند نہ ہوتی تو انسان بہت جلدی پڑ مرده، فرسودہ، بوڑھا اور شکستہ حال ہو جاتا۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ مناسب نیند اور آرام میں صحت و سلامتی، طولِ عمر اور جوانی کے عیش و نشاط کا راز مضمر ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ اسی آیت میں ”نوم“ اور ”إِبْتِغَاءَ فَضْلِ اللَّهِ“ ایک دوسرے کے مقابل میں قرار پائے ہیں جو بعض مفسرین کے بقول پہلا کلمہ موت کی علامت ہے اور دوسرا قیامت کی نشانی۔

”إِبْتِغَاءَ فَضْلِ اللَّهِ“ (فضل خداوندی کی طلب) ایک ایسے لطیف نکتہ کی طرف اشارہ ہے جو انسان کی زندگی میں اس کی سعی

[۱] مفردات راغب، مجمع البحرین اور لسان العرب

و کوششوں پر بھی توجہ رکھے ہوئے ہے اور خداوند کریم کے فضل پر بھی۔ یعنی ان دونوں کے باہمی ملاپ سے انسان کائنات کی نعمتوں سے بہر مند ہوتا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں رات کی نیند کے ذکر کے ساتھ دن کی نیند کا بھی تذکرہ ہے (هَاتَا مُكْمًا بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ) جب کہ یہ بات مسلم ہے کہ نیند کا تعلق اصول طور پر رات ہی کے ساتھ ہوتا ہے اور قرآنی آیات بھی اسی چیز کی گواہ ہیں، لیکن انسان کی زندگی میں کچھ حالات ایسے بھی پیدا ہو جاتے ہیں کہ وہ رات کو بیدار رہے اور دن کو آرام کے ساتھ سوئے۔ رات کے سفر میں یا گرم علاقوں میں موسم گرمی کی وجہ سے دن کی تمام سرگرمیاں موقوف ہو جاتی ہیں اور رات کو کام کیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ مکمل طور پر سامنے آ جاتے ہیں۔

ہمارے اس موجودہ دور میں جب کہ بہت سے صنعتی اور معالجاتی ادارے مجبور ہیں کہ دن رات کام کریں اور یہ بات بھی ممکن نہیں کہ کام کو بند کر دیا جائے، لہذا کام کرنے والوں کو تین باریوں (شفتوں) میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں دن کو نیند کی ضرورت دوسرے اوروں سے بڑھ کر واضح ہو جاتی ہے۔ اب اگر نیند کے پروگرام کی ترتیب انسان کے اختیار میں نہ ہوتی اور رات کی نیند کو دن میں پورا نہ کیا جاتا تو یقینی بات ہے کہ اس کی زندگی میں بہت بڑی مشکلات پیدا ہو جاتیں۔

دوسری آیت میں پہلے تو اس بات کی تصریح کرتا ہے، ”خدا تو وہ ہے جس نے رات کو تمہارے لئے پردہ مقرر کیا ہے۔ (وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ اللَّيْلَ لِبَاسًا) پھر نیند کے مسئلہ پر زور دے کر کہتا ہے کہ، ”اس نے نیند کو تمہارے لئے آرام اور سکون کا سبب قرار دیا ہے۔ (وَالنَّوْمَ سُبَاتًا)

”هُوَ الَّذِي“ (وہ وہی ہے۔۔۔۔۔) کی تعبیر سے ممکن ہے کہ ان امور کے توحیدی پہلو کی طرف اشارہ ہو جن میں سے ایک امر اس کی پاک ذات کی ایک نشانی ہے، یا نعمت کی بخشش کے شناخت بھی اس کی معرفت کا مقدمہ ہوگا۔

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس کے فوراً بعد فرماتا ہے ”اور دن کو چلنے پھرنے اور زندگی کیلئے حرکت و تحرک کا سبب قرار دیا ہے“۔ (وَجَعَلَ النَّهَارَ نَشُورًا) [۱]

پس دن کی روشنی میں روح وسعت پذیر ہو جاتی ہے اور انسان مکمل طور پر بیدار ہو جاتا ہے جو روز قیامت کے حشر و نشر اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے مشابہ ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ بات میدان حیات میں انسانوں کی وسعت اور زندگی کے مختلف مقاصد کی طرف ان کی حرکت کی طرف اشارہ ہو۔ اس طرح رات کے آتے ہی نیند اور آرام کا صور پھوٹا جاتا ہے اور طلوع آفتاب سے بیداری کا۔

تیسری آیت میں بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ اسی بات کو دہرایا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے کہ ”ہم نے تمہاری نیند کو آرام کا سبب قرار دیا ہے اور رات کو لباس!“ (وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا) جس طرح لباس انسان کو مختلف خطرات سے محفوظ

[۱] توجہ رہے کہ ”نشور“ بھی مصدری معنی میں ہے اور ”سبات“ کا بھی مصدری معنی ہے یا اسم مصدر کا معنی ہے اور ان کا لیل و نہار پر اطلاق مبالغہ اور تاکید کے عنوان سے ہے۔



رکتا ہے اور اس کی سلامتی کا سبب ہوتا ہے اس طرح تاریکی شب بھی اسی اثر کی حامل ہے۔  
 اسی سلسلے کی چوتھی اور آخری آیت، جس میں جنگ بدر کی گفتگو کی گئی ہے، اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اس تاریخی رات میں  
 مومنوں پر خداوند عالم کی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ بھی تھی کہ ”تم پر مختصری نیند چھا گئی اور یہ نیند خداوند عالم کی طرف سے تمہارے جسم و جان  
 کے سکون کا سبب بن گئی“ (اَذِيغِيْشِيْكُمْ النُّعَاسَ اَمْنَةً مِّنْهُ)  
 سکون عطا کرنے والی یہ نیند، خصوصاً اس قدر طولانی راستہ طے کرنے کے بعد ان کی طاقتوں کی تجدید اور میدان بدر میں کل کی فیصلہ کن  
 جنگ کی آمادگی کا سبب بن گئی، وہ جنگ جو مسلمانوں کی واضح فتح پر ختم ہوئی۔  
 ”نُعَاس“ (خفیف سی نیند) کی تعبیر شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عین آرام و استراحت کے وقت گہری نیند ان پر ایسی مسلط نہ  
 ہو سکی جس سے دشمن کو اپنے مقاصد کے حصول کو موقع مل جاتا ہے وہ ان پر شب خون مارتا۔ اس طرح وہ نیند بھی بذات خود ایک نعمت تھی اور اس کی  
 وہ کیفیت ایک اور نعمت۔ بہر حال مندرجہ بالا آیت انسان کے اعصاب اور جسم و جان اور مزید سعی و کوشش اور جہاد کی خاطر طاقتوں کی تجدید کیلئے  
 تمام مراحل میں نیند کی تاثیر و افادیت پر تاکید بھی ہے۔

## مزید تشریح

### نیند ایک مخفی مخلوق

باوجودیکہ نیند اور خواب دونوں ہمارے لئے معمول کی چیزیں ہیں، لیکن ان کے بارے میں دانشوروں نے جس قدر بھی تحقیق  
 اور جستجو سے کام لیا ہے اور اس بارے میں سر توڑ کوششیں کی ہیں پھر بھی وہ ان کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکے۔  
 آخر وہ کون سے فعل و افعال اور اثرات و تاثیرات ہوتے ہیں جو انسان کے جسم میں پیدا ہوتے ہیں جن کی وجہ سے روحانی  
 اور جسمانی سرگرمیوں کا بہت بڑا حصہ رک جاتا ہے اور تمام جسم و روح میں تبدیل رونما ہو جاتی ہے؟ نہ تو وہ کچھ سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی اس سے کوئی  
 حرکت ظاہر ہوتی ہے اور وہ مردہ و اراک کو نے میں پڑا ہوتا ہے۔ اگر ساری دنیا سیلاب کی لپیٹ میں آ جائے، وہ بے خبر سو رہا ہے!  
 اس بارے میں جس قدر بھی تشریح کی گئی ہے، نظریات پیش کئے گئے ہیں اور مفروضے بیان کئے گئے ہیں پھر بھی نیند کے اسرار سے  
 پردہ نہیں اٹھایا جاسکا۔ اور اس سے بھی بڑھ کر عجیب مسئلہ ”خواب“ کا ہے جو خود روح کی مانند ایک عظیم معجزہ شمار ہوتی ہے۔  
 البتہ ان دونوں چیزوں کی حقیقت اور اسرار کے بارے میں تفصیل سے بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے کیونکہ مندرجہ  
 بالا آیات نیند کے بے شمار فوائد اور بے حد مفادات کو بیان کر رہی ہیں اور اس کے نعمت ہونے کے پہلو کو اجاگر کر رہی ہیں۔ معتدل نیند ہمیشہ  
 انسان کے روح و اعصاب کی سلامتی کی دلیل ہوتی ہے۔ اسی لئے نفسیاتی مریضوں سے اطباء جو سب سے پہلا اور اہم سوال کرتے ہیں وہ ان کی  
 نیند کی کیفیت کے بارے میں ہوتا ہے۔



## ۷۔ زمین و آسمان کی وسعتوں میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں

اشارہ:

’انسبی آیات‘ کے ذکر کے بعد اب ’آفاقی آیات‘ کی باری ہے۔ آئیے دیکھتے ہیں کہ اس بارے میں قرآن کیا کہتا ہے اور آفاق میں اس ذات کی کیا نشانیاں ہیں؟

آسمانوں اور زمین کا مشاہد ہمیشہ سے انسان کیلئے فکر انگیز چلا آ رہا ہے لیکن انسان کے علم و دانش نے جوں جوں ترقی کی منزلیں طے کی ہیں اسرار آمیز بالائی کائنات کی عظمت بھی اس کی آنکھوں میں زیادہ ہو گئی ہے اور وہ اس طرح کہ اگر دورِ حاضر کے دانشوروں کی نظریں آسمانوں کی عظمت کا تقابل گزشتہ دانشوروں سے کریں تو صحیح معنوں میں ’دریا‘ اور ’قطرہ‘ والی بات ہو گئی۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ ’آنے والی کل‘ کا ’آج‘ کے ساتھ جب تقابل کیا جائے گا تو شاید اس وقت بھی یہی نہ کہا جائے۔

ان عظیم منظوموں، کہکشاؤں اور ثوابت و سیارستاروں میں کیا ہو رہا ہے، وہاں پر کتنے عالم موجود ہیں، ان کی پیدائش کا کب سے آغاز ہوا ہے؟ کیا ان میں کوئی مخلوق رہتی ہے یا نہیں؟ اگر رہتی ہے تو کیا اس کی زندگی بھی ہماری طرح ہے یا اس سے مختلف؟ یہ اور اس قسم کے بیسیوں سوال ایسے ہیں جنہوں نے آسمانوں کے بارے میں متجسس اور محقق انسان کی فکر کو اپنی طرف مصروف رکھا ہوا ہے۔ دورِ حاضر کے دانشور کہتے ہیں:

’اس وقت آسمان میں ہمیں کچھ ایسے ستارے بھی نظر آ رہے ہیں جن کا وجود آج سے ہزاروں بلکہ لاکھوں سال پہلے ختم ہو چکا ہے اور وہ اس لئے ہے کہ نہایت ہی دور دراز کے فاصلے کی وجہ سے ان کی روشنی ابھی تک راہ میں ہے اور ہم تک پہنچ رہی ہے جو ہزاروں یا لاکھوں سال پہلے ان ستاروں کے مبداء و مرکز سے چلی تھی۔ اگر واقعاً ایسا ہے۔۔۔۔۔۔ اور یقیناً ہے پھر آسمان کی حقیقت وسعت اور بظاہر جو ہمیں نظر آ رہی ہے، میں کس قدر فرق ہے؟ اس سوال کا جواب کسی کے بھی پاس نہیں ہے۔ (غور کیجئے گا)

اس طرح کے کئی اور سوال بھی ہیں جن کا کسی دانشور کے پاس جواب نہیں ہے۔ ہمارے سامنے اس قسم کے رازوں سے بھر ہوئی کائنات ہے۔ ایک طرف اس کی عظمت ہے اور دوسری طرف اس حکم فرمانظم اور حساب ہیں، جو اس بے انتہا علم اور قدرت کی غمازی کر رہے ہیں جو اس کی تخلیق و آفرینش میں موثر عامل ہیں۔ اس مختصر سے اشارے کے ساتھ اب ہم مل کر مندرجہ ذیل آیات کی تلاوت کا شرف حاصل کرتے ہیں:

ا۔۔۔ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الْيَلِّ وَالنَّهَارِ الْاٰیٰتٍ لِّاُولٰٓئِ

الْاَلْبَابِ

(آل عمران/۱۹۰)

۲۔ اِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الْيَوْمِ وَاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ... اٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ

(بقرہ/۱۶۴)

۳۔ وَمِنْ اٰيٰتِهِ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ السِّنِّتِكُمْ وَالْوَاوِنِكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لٰيٰتٍ لِّلْعٰلَمِيْنَ

(روم/۲۲)

۴۔ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ

(جاثیہ/۳)

۵۔ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لٰيٰةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ

(عنکبوت/۴۲)

۶۔ اِنَّ بِكُمْ اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلٰى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مَا مِنْ شَفِيعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ذٰلِكُمْ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاَعْبُدُوْهُ اَفَلَا تَدَّكَّرُوْنَ

(یونس/۳)

۷۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مِّنْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَسَخَّرِ الشَّمْسِ وَالْقَمَرَ لِيَقُوْلَنَّ اللّٰهُ فَاَنْتِ يُوْفِكُوْنَ

(عنکبوت/۶۱)

۸۔ لَخَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ

(مؤمن/۵۷)

۹۔۔۔ قَالَتْرُسُلُهُمْ إِيَّي اللَّهِ شَكُّ فَأَطْرِ السَّهْوَاتِ وَالْأَرْضِ

(ابراہیم/۱۰)

۱۰۔۔۔ وَالسَّمَاءِ بَنِيهَا بَابِئِدٍ وَإِنَّا لَنُوسِعُونَ {} وَالْأَرْضِ فَرَشْنَاهَا فَنِعْمَ  
الْبَاهِدُونَ

(ذاریات/۴۷، ۴۸)

۱۱۔۔۔ وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَحْفُوظًا وَهُمْ عَنْ آيَاتِهَا مُعْرِضُونَ

(انبیاء/۳۲)

۱۲۔۔۔ أَلَلْهِبِ الَّذِي رَفَعَ السَّهْوَاتِ بِغَيْرِ عَمْدٍ تَرَوْنَهَا تَمَّ اسْتَوَى عَلَى  
الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ

(رعد/۲)

ترجمہ

۱۔۔۔ یقیناً آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات دن کے آنے جانے میں صاحبانِ عقل کیلئے (روشن) نشانیاں ہیں۔

۲۔۔۔ یقیناً آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات دن کے آنے جانے میں۔۔۔۔ (خداوندِ عالم کی ذات پاک اور اس کی وحدانیت کی) ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے اور سوچتے ہیں۔

۳۔۔۔ اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف۔ اور اس میں ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو عالم ہیں۔

۴۔۔۔ اس میں تو شک ہی نہیں کہ آسمانوں اور زمین میں اہل ایمان کیلئے بہت سی نشانیاں ہیں۔

۵۔۔۔ خداوندِ عالم نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا، اس میں مومنین کیلئے نشانیاں ہیں۔

۶۔۔۔ تمہارا پروردگار تودہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر وہ تخت (قدرت) پر متمکن ہوا اور (کائنات کے) کاموں کی تدبیر کی۔ اس کی اجازت کے بغیر شفاعت کرنے والا نہیں ہے۔ یہ ہے خداوند

- عالم جو تمہارے پروردگار ہے۔ لہذا تم اسی کی پرستش کرو۔ کیا تم غور نہیں کرتے؟
- ۷۔۔۔ اگر تم اُن سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے اور سورج و چاند کو کس نے مسخر کیا ہے۔ تو وہ کہیں گے ”اللہ“! تو پھر وہ (عبادتِ خدا سے) کیوں روگردانی کرتے ہیں؟
- ۸۔۔۔ آسمانوں اور زمین کی پیدائش انسانوں کی پیدائش سے زیادہ اہم ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔
- ۹۔۔۔ ان کے رسولوں نے ان سے کہا، کیا خدا کے بارے میں شک ہے جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟
- ۱۰۔۔۔ ہم نے آسمان کو اپنی قدرت سے بنایا ہے اور ہمیشہ اسے وسعت دیتے رہتے ہیں۔ اور زمین کو بھی ہم نے ہی بچھایا اور ہم کیسے اچھے بچھانے والے ہیں۔
- ۱۱۔۔۔ اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا لیکن وہ لوگ خدا کی آیات سے روگردانی کرتے ہیں۔
- ۱۲۔۔۔ خداوند عالم تو وہ ہے جس نے آسمان کو۔۔۔ قابل رویت ستون کے بغیر۔۔۔۔۔۔ پیدا کیا، پھر عرش پر متمکن ہوا (اور کائنات کے کاموں کی تدبیر کی باگ ڈور سنبھالی) اور سورج و چاند کو مسخر کیا۔

## الفاظ کے معانی اور تشریح

”خلق“ کے بارے ”مقائیس اللغۃ“ کا کہنا ہے کہ اصل میں اس کے معنی درمیانی ہیں۔ ایک تو چیزوں کا اندازہ لگانا، اور دوسرے صاف اور مسطح ہونا۔

”راغب“ بھی ”مفردات“ میں کہتے ہیں کہ اس لفظ کے اصل معنی منظم اور صحیح طریقہ پر اندازہ لگانا ہیں۔ پھر کہتے ہیں: یہ لفظ ”بغیر کسی پہلے نمونے اور مادے کی اشیاء کی ایجاد“ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ ایجاد کرنے میں اندازہ لگانا اور منظم کرنا بھی ساتھ ہوتا ہے۔

پھر کہتے ہیں: ”خلقت کے ایک معنی عدم سے معرض وجود میں لانا ہوتے ہیں۔ جو خدا کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسرا اشیاء کی صورتوں کی تبدیلی اور ایک چیز کو دوسری چیز میں تبدیل کرنا ہوتا ہے جو انسانوں کے بارے میں بھی تصور کیا جاسکتا ہے۔ اس لفظ کو جھوٹ کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے (شاید اس لئے ہے کہ جو چیز حقیقت نہیں رکھتی وہ اپنے ذہن یا سننے والے کی فکر میں ایجاد کرتی ہے)

”ابن منظور“ لسان العرب“ میں کہتے ہیں کہ کلام عرب میں خلق کے معنی کسی سابقہ نمونہ کے بغیر کسی چیز کو معرض وجود میں لانا ہوتے ہیں۔

اس طرح ”خلق“ کے معنی اگرچہ اشیاء کا اندازہ لگانا، یا ان کا منظم اور صاف کرنا ہوتے ہیں۔ لیکن بعد میں اسی مناسبت کے تحت

اشیاء کی ایجاد اور صورت کے تبدیل کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے اور اب اس سے یہی معنی ہی فوراً ذہن میں آتے ہیں۔  
 ”سما“ اور باب لغت کے بقول اس چیز کے معنی میں ہے جو اوپر ہو۔ اسی لئے بعض ارباب لغت اس بات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ لفظ نسبت کے پہلو کا حامل ہے۔ یعنی ممکن ہے کہ ایک چیز کس دوسری چیز کی نسبت تو ”آسمان“ ہو لیکن تیسری چیز کی نسبت ”زمین“ ہو۔ ”اسم“ بھی اسی مادہ سے مشتق ہے کیونکہ کسی چیز کا نام رکھنا مسلمی کی بلندی اور اہمیت کا سبب ہوتا ہے۔

”التحقیق“ کے مصنف کا کہنا ہے کہ ”سما“ کبھی مادی اور محسوس ہوتا ہے جیسے ”أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً“ (خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا) اور کبھی معنوی ہوتا ہے جیسے (قَدْ زُلِيَ ثَقَلُوبُ وَجُحُكُ نَفْسِ السَّمَاءِ - بقرہ / ۱۳۴) یعنی ہم آسمان میں تیری انتظار آمیز نگاہوں کو دیکھتے ہیں۔ ”ابن منظور“ بھی ”لسان العرب“ میں کہتے ہیں ”سمو“ کا معنی علو اور بلندی ہے۔ [۱]

اسی لئے ”سما“ کے معنی صرف آسمان ہی نہیں بلکہ ہر طرح کی بلندی ارتفاع اور علو کے معنی میں بھی آتا ہے۔ لیکن جو آیات اس بحث کیلئے منتخب کی گئی ہیں ان میں عام طور پر آسمان کے معنی میں آیا ہے۔

”ارض“ دراصل ہر چیز کے نچلے حصے کو کہا جاتا ہے اور ”سما“ کے مقابل میں ہے جو ہر چیز کا بالائی حصہ ہے۔ یہ بات ”مقائیس اللغۃ“ نے کہی ہے۔ لیکن ”راغب“ اس سے ملتی جلتی تفسیر میں کہتے ہیں: ”ارض وہ جرم ہے جو ”سما“ کے مقابل میں ہے اور ہر چیز کے نچلے حصے کو ”ارض“ کہتے ہیں۔“

کتاب ”التحقیق“ میں آیا ہے کہ ”ارض“ کے مختلف اطلاقات میں جو ایک دوسرے سے وسیع تر ہیں، رہائش گاہ، محلہ، گاؤں، شہر، ملک، کرہ زمین اور جو کچھ کہ اس آسمان کے نیچے ہے، ان سے پر ارض کا اطلاق ہوتا ہے۔ ان تمام مفہم میں دو شرائط ملحوظ ہیں۔ ایک تو نیچے ہونا اور دوسرا ”اوپر“ کے مقابل میں قرار پاتا ہے۔

”ارضہ“ (بروزن حلقہ) کا معنی دیمک ہے جو زمین سے نکلتی ہے اور لکڑی کو دکھا جاتی ہے لطف کی بات ہے کہ ”ارض“ کے معانی میں سے ایک معنی ”زکام کی بیماری“ ہے اور دوسرا ”لرزہ“ یعنی کپکپی۔ (شاید یہ اس لئے ہے کہ اس قسم کی بیماری انسان کو بستر پر ڈال دیتی ہے اور اسے زمین گیر بنا دیتی ہے) [۲]

[۱] کتاب ”العین“ میں خلیل ابن احمد نے بھی ”سما“ کو ارتفاع اور بلندی کے معنی میں ذکر کیا ہے۔

[۲] کتاب ”مقائیس اللغۃ“ مفردات راغب، لسان العرب، مجمع البحرین، اور التحقیق فی کلمات القرآن الکریم۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### بلند آسمان آیت حق ہے

زیر بحث آیات کی سب سے پہلی آیت میں پہلے تو آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور رات دن کے اختلاف کا تذکرہ ہے جو زمین کے سورج کے گرد حرکت کرنے کے نتیجے میں عمل میں آتا ہے۔ پھر فرماتا ہے ”ان کی پیدائش میں اس کی عظمت اور علم و حکمت کی ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو صاحبان عقل اور درو اندیش ہیں۔ (الْأَيَاتِ لِلْأُولَى الْأَلْبَابِ) جیسا کہ ہم اسی کتاب کی پہلی جلد کے ”شناخت و معرفت“ کی بحث میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ ”الباب“، ”لب“ کی جمع ہے جس کا معنی خالص اور گہری عقل ہے۔ جو لوگ اس قسم کی عقل اور اندیشی کے حامل ہوتے ہیں وہ زمین آسمان کی تخلیق اور شب و روز کی آمد و رفت میں خدا کی ایک دو نہیں بلکہ بہت سی آیات اور نشانیاں دیکھ سکتے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اسی آیت کے ذیل کے بہت سی تفسیروں میں یہ مشہور و معروف روایت نقل کی گئی ہے کہ حضرت رسول اکرمؐ ایک رات حضرت عائشہؓ کے گھر میں آرام فرما رہے تھے ابھی آپؐ کے مبارک بدن نے مکمل استراحت نہیں فرمائی تھی کہ اپنی جگہ سے اٹھے، لباس پہنا، وضو کیا اور نماز پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ نماز میں معنوں جذبہ کے تحت آپؐ نے اس قدر آنسو بہائے کہ لباس کے سامنے والا حصہ بھیگ گیا۔ پھر سجدہ میں چلے گئے اور اس قدر روئے کہ زمین تر ہو گئی۔ آپؐ کی یہی حالت طلوع صبح تک رہی۔ جب آپؐ کے مخصوص مؤذن بلال آپؐ کو نماز صبح کیلئے لینے آئے تو حضورؐ گرامی گور دیا پایا۔ پوچھا یا رسول اللہ! آپؐ کیوں روتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اپنی رحمت و مغفرت اور عنفو و لطف سے نوازا ہوا ہے؟ یہ سن کر سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ”میں کیوں نہ روؤں؟ کیا میں خدا کا شاکر بندہ نہ بنوں؟ جب کہ اس رات مجھ پر وہ آیات نازل ہوئی ہیں، جنہوں نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے؟ پھر آپؐ نے سورہ آل عمران کی یہی آیت اور اس کے بعد کی چار آیات کو تلاوت فرمایا اور آخر میں ارشاد فرمایا: ”وَيَلِّ لِمَنْ قَرَأَهَا وَآوَلَّ هُمْ يَتَّقُكُمْ فِيهَا“ (انسوس ہے اس پر جو انہیں پڑھتے، لیکن ان میں غور و فکر نہ کرے۔) [۱]

یہ ٹھیک ہے کہ جو شخص بھی آسمانوں اور دیگر اجرام سماوی کا مشاہدہ کرتا ہے وہی خدا کی آیات کے بارے میں سوچتا ہے لیکن صاحبان عقل و خرد اس سے اور بھی زیادہ بہرہ برداری کرتے ہیں۔ وہ آسمان کے ایک ایک چپہ میں قدرت الہی کے آثار ملاحظہ کرتے ہیں اور ہر منظر اور ہر کہکشاں اور ان کی منظم اور عجیب حرکات میں ایسے ایسے اسرار کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جو غیر اولی الالباب نہیں کر پاتے۔

اور پھر مزے کی بات یہ ہے کہ دوسری آیت میں ”أُولَى الْأَلْبَابِ“ کی بجائے ”قَوْمٍ يَعْقِلُونَ“ (وہ لوگ جو عقل سے کام لیتے

[۱] تفسیر ابوالفتوح جلد ۳ ص ۲۸۴، تفسیر فخر رازی جلد ۹ ص ۱۲۲، روح المعانی جلد ۴ ص ۱۳۰، تفسیر قرطبی جلد ۳ ص ۱۱۵۵۲ اور دوسری تفسیریں۔



ہیں) تیسری آیت میں ”عالمین“ (صاحبان علم و دانش) اور چوتھی اور پانچویں آیت میں ”مؤمنین“ کا ذکر ہے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ مندرجہ بالا صفات میں سے ہر ایک صفت (قوی افکار، قوت عقل علم اور ایمان) پیشتر معرفت اور آیات الہی سے آگاہی کے لئے پیش خیمہ کی حیثیت رکھتی ہے، جیسا کہ ہم اسی تفسیر کی پہلی جلد میں معرفت کی بحث میں تفصیل سے بتا چکے ہیں۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ”أُولُو الْأَلْبَاب“، جن کیلئے آسمان وزمین کی آفرینش کے مشاہدہ کے ساتھ ہی خدا کی معرفت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، قرآن مجید نے ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

”الَّذِينَ يَدْعُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقَعُودًا عَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا“ وہ ایسے لوگ ہیں جو خدا کو قیام و قعود کی حالت میں بھی یاد کرتے ہیں اور اس وقت بھی جب وہ پہلو کے بل لیٹے ہوئے ہوں۔ اور آسمان وزمین کی تخلیق کے بارے میں بھی غور و فکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ سب کچھ بے کار پیدا نہیں کیا۔ (آل عمران/ ۱۹۱)

یعنی ایک تو ذکر خدا، دوسرے غور و فکر اور تیسرے مقصد تخلیق کی طرف توجہ، انہیں عظمت پروردگار کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے سائنس دان اگر ان تمام جزئیات کو دیکھ کر بھی خدا تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ صرف مخلوق اور معلول تک ہی محدود رہتے ہیں اور علت العلل، خالق اور مقصد تخلیق کے بارے میں کوئی ذکر و فکر نہیں کرتے۔

دوسری آیت میں بھی پہلے آیت کی طرح آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے مسئلے کو رات اور دن کے اختلاف یعنی شب و روز کی آمد و رفت (یا سال کے چار موسموں میں ان کا تدریجی فرق) کے ساتھ ساتھ بیان فرمایا ہے جو خود اسی آسمان اور زمین کی اہم پیداوار ہیں۔ اور ان پر ایسا دقیق اور منظم نظام حکم فرمایا ہے کہ ان کے واقع ہونے سے کئی سال قبل آفتاب کے طلوع و غروب اور سال کے ہر موقع اور ہر موسم میں روئے زمین کے کسی بھی خطے اور نقطے کیلئے ٹھیک ٹھیک اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جہاں پر بھی دقیق اور صحیح صحیح نظام موجود ہے، وہیں پر عقل اور علم و دانش اس کے پس پردہ حکم فرما ہے۔

تیسری آیت میں آسمانوں اور زمین کی آفرینش جو کہ ”آفاقی آیات“ میں سے ہے، کے ساتھ ہی زبانوں اور رنگوں کے اختلاف کا تذکرہ کیا ہے جس کا تعلق ”انفسی آیات“ سے ہے ارشاد ہوتا ہے، ”اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمان اور زمین کی تخلیق اور زبانوں اور رنگوں کا اختلاف“ (وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافَ اللِّسٰنِ كُمْ وَالْوٰاِنِكُمْ)

زبانوں اور رنگوں کا اختلاف، خواہ زبانوں کے فرق کے معنی میں ہو کہ بنی نوع انسان جس کے ذریعہ کلام کرتے ہیں اور ان کے چہروں کے رنگ کا اختلاف ہو، یا صداؤں کی آہنگ اور انسان کی زندگی، طرز فکر، ذوق، سلیقہ اور استعداد کارنگ ہو یا ہر دو، یہ عجیب و غریب قسم کا تنوع جو لوگوں کی ایک دوسرے سے شناسائی اور واقعیت کا سبب ہوتا ہے اور جو دقیق اور چچا تان نظام اس پر حکم فرما ہے، اس عجیب نظام سے مختلف نہیں ہے جو آسمانوں اور زمین پر حکومت کر رہا ہے۔ ہر ایک کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور سب کے سب خداوند قادر و قدیر کی ذات پر واضح دلیل ہیں۔



تمہارے فائدہ میں اور ایک روز تمہارے نقصان میں۔ [۱]

حتیٰ کہ تعبیرات میں تو ساری کی ساری دنیا ایک دن اور ساری کی ساری آخرت ایک دن کے عنوان سے شمار کی گئی ہے۔ امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام ہی فرماتے ہیں:

”وَأَنَّ الْيَوْمَ عَمَلٌ بِأَلْحَسَابٍ وَعَدَا حِسَابٍ وَلَا عَمَلٌ“ آج عمل کا دن ہے نہ کہ حساب کا اور کل حساب کا دن ہے نہ کہ عمل کا۔“

اس بار میں کلیم کا شانی کا مشہور شعر بھی ایک لطیف تعبیر ہے، کلیم کہتے ہیں۔

بدنامی حیات دو روزی نبودیش  
آں ہم کلیم باتو گویم چسان گزشت؟  
یک روز صرف بستن دل شدہ این و آں  
روز گرہ کند دل این و آں گذشت

(زندگی کی بدنامی دو دن سے زیادہ نہیں تھی، وہ بھی کلیم میں تجھے بتاؤں کہ کیسے گزرے؟)

ایک دن تو اس سے اور اس سے دل لگانے میں گذر گیا اور دوسرا دن اس سے اور اس سے دل توڑنے میں  
یا جیسا کہ اردو کا ایک شعر ہے:

عمر دار ز مانگ کے لائے تھے چار د  
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

(از مترجم)

تو گو یا زمین و آسمان کی چھ دن میں تخلیق سے مراد چھ دورانیے ہیں اور ممکن ہے کہ ان میں سے ہر ایک دورانیہ کروڑوں بلکہ اربوں سال پر مشتمل ہو۔ واضح سی بات ہے کہ اس عدد کے خلاف کوئی علمی دلیل بھی موجود نہیں ہے۔ [۲]

بلکہ ممکن ہے کہ یہ چھ دورانیہ کچھ اس طرح سے ہوں۔

(۱) جس دن ساری کائنات، گیس کی صورت میں تھی اور یک نہایت ہی عظیم گولے کی مانند اپنے محور کے گرد گھوم رہی تھی۔

[۱] نوح البلاغہ خط نمبر ۷۲

[۲] تورات اور انجیل کے الفاظ کی شرح پر مشتمل کتاب ”قاموس مقدس“ میں بھی زمین و آسمان کی چھ دن کی پیدائش کے مسئلہ کے بارے میں ایک شرح لکھی گئی ہے، جو بعض جہات سے ہماری مذکورہ بالا گفتگو سے تقریباً مختلف نہیں ہے، ہر چند کہ بعض باتیں خرافات کی مظہر ہیں، مثلاً خداوند عالم کا ساتویں دن آرام کرنا وغیرہ، (قاموس مقدس ص ۸۴ لفظ آقریش)

(۲) جس دوران کئی عظیم تو دے اس سے جدا ہوئے اور مرکزی تو دے کے گرد گھومنے لگے۔

(۳) جس دوران بعض تو دوں نے اپنی دورانی حرکت کی بناء پر ہمارے منظومہ شمسی جیسے منظومے تشکیل دیئے۔

(۴) جس دوران زمین ٹھنڈی ہو کر زندگی کے قابل ہو گئی، پانی ظاہر ہوا اور سمندر تشکیل پائے۔

(۵) جس دوران درخت اور دیگر نباتات معرض وجود میں آئے اور زمینی غذائیں تیار ہوئیں۔

(۶) جس دوران حیوانات اور پھر انسان روئے زمین پر ظاہر ہوئے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ آٹھ آیات میں تو آسمانوں اور زمین کی تخلیق کو چھ دن میں بیان کیا گیا ہے اور چار مقامات پر صرف

آسمان اور زمین کی آفرینش کا ذکر ہے۔ [۱] اور تین مقامات پر زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کا بیان ہے۔ [۲]

صرف ایک مقام ایسا ہے جہاں جمالی طور پر ان چھ ادوار کا ذکر ہے، دو دور اپنے آسمانوں کی تخلیق کیلئے، دو دور اپنے زمین

کی آفرینش کیلئے اور دو دور اپنے نباتات و حیوانات کی پیدائش کیلئے۔ (الَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ... وَقَدَّرَ فِيهَا أَمَاقًا فِي  
أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ) [۳]

پس بنا بریں مذکورہ بالا چھ دور اپنے، آسمانوں، زمین اور ان کی مختلف موجودات کی آفرینش سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس بارے میں مزید تفصیل کیلئے تفسیر نمونہ کی ان جلدوں کا مطالعہ فرمائیں جو مذکورہ بالا آیا۔ کی تفسیر میں لکھی ہیں (جلد ششم سورہ اعراف کی  
آیت ۵۴ کی تفسیر اور جلد ہفتم سورہ حم السجدة کی ۱۰۱ ویں آیت کی تفسیر)

زیر بحث آیات میں سے ساتویں آیت کہتی ہے ”یہ بات تو بت پرستوں کے نزدیک بھی تسلیم شدہ ہے کہ آسمانوں اور زمین  
کا پیدا کرنے والا اور سورج اور چاند کا مسخر کرے والا صرف خدا ہی ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ یہ عظیم کائنات اور عجیب نظام بتوں کی مخلوق  
نہیں ہو سکتے، بلکہ ان کا وجدان و ضمیر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ سب اس خدا کی مخلوق ہیں جو عالم بھی ہے اور قادر بھی ہے۔ (وَلَا يُن  
سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْقَمَرَ لِيَقُولَنَّ اللَّهُ)

بنا بریں صرف دانشمند اور صاحبان فکر و نظر ہی اسرار آفرینش کا مطالعہ کر کے اس کی ذات پاک کا اعتراف نہیں کرتے بلکہ ان  
پڑھ اور جاہل بت پرست بھی اس نظام کا مشاہدہ کر کے اس کی ذات اقدس سے آشنا ہو جاتے ہیں، ہر چند کہ عملی طور پر خرافات کی وجہ سے  
وادی شرک میں سرگرداں ہیں۔

آٹھویں آیت اگرچہ اپنی بعد کی آیات کے قرینہ سے روز قیامت اور یوم نشور کا پتہ دیتی ہے اور کہتی ہے ”جو ذات آسمانوں

[۱] حدید/۳، اعراف/۵۴، یونس/۳، ہود/۷

[۲] فرقان/۵۹، سجدہ/۴، ق/۳۸

[۳] سورہ حم السجدة/۹-۱۰

اور زمین کو اس عظمت کے ساتھ پیدا کرنے پر قادر ہے، وہ مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قدرت رکھتی ہے، کیونکہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق، انسانوں کی تخلیق سے زیادہ اہم ہے۔

لیکن پھر بھی خدا شناسی کے مسئلہ کی روشن دلیل ہے کیونکہ انسان کا صرف وجود ہی نہیں بلکہ آنکھ اور کان جیسے اس کے اعضاء بلکہ ان اعضاء میں سے ہر ایک خلیہ بھی اس قدر پیچیدگی اسرار و رموز اور نظامات کا حامل ہے جو بذات خود حق کی ایک روشن آیت بن سکتا ہے۔ بنا برین ”آسمان وزمین کی آفرینش“ جو انسان کی آفرینش سے کئی گنا برتر اور بالاتر ہے وہ تو اس کی عظمت کی بدرجہا روشن آیت اور دلیل ہوگی۔ (تَخْلُقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ)

یہ صحیح ہے کہ اگر انسان کی تخلیق کا جداگانہ طور پر اس کائنات کے اجزاء سے تقابل کیا جائے تو اس کی خلقت یقیناً ہر جزو سے بالاتر ہے، لیکن یقیناً اگر اس کا کل آسمان اور زمین سے تقابل کیا جائے تو ان کی تخلیق ہی برتر اور بالاتر ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے یہ باتیں اس وقت بیان کی ہیں جب انسان خصوصاً حجاز کے اس پس ماندہ ماحول میں۔۔۔ آسمانوں کی عظمت سے بے بہرہ تھے، ان کی اس بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات شاید یہ تھیں کہ وہ آسمان کو اپنے قریب ایسی نیلگوں چھت سمجھتے تھے جس میں نقرئی ستاروں کی میخیں گڑی ہوئی ہیں۔

لیکن آج ہم اس آیت کے عمیق مفہوم کو بخوبی درک کر رہے ہیں، کیونکہ دانشوروں نے عظیم ٹیلی سکوپوں کے ذریعہ اس چوڑے چکے آسمان کو دیکھ لیا ہے اور وہاں سے اس پر حکم فرمانظام اور خالق کی عظمت کے حیرت انگیز عجائبات ہمارے لئے ارمغان لائے ہیں۔ اور کیا معلوم کہ جو کچھ وہ آج دیکھ رہے ہیں وہ اس عالم کی عظمت کا عشرِ عشر بھی نہ ہو! شاید کل یہ حقیقت بھی بر ملا ہو جائے۔ بظاہر اسی وجہ سے آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ) [۱]

نویں آیت میں توحید اور خدا شناسی کے درس کے سلسلے میں ایک استغہامی انکار کے طور پر ارشاد ہوتا ہے ”کیا وہ خدا جو آسمان اور زمین کا خالق اور شگافتہ کرنے والا ہے، اس کے وجود میں کسی قسم کا شک و شبہ ہے؟“ (أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ) مزے کی بات یہ ہے کہ ”فاطر“ دراصل ”شگافتہ کرنے والا“ کے معنی میں ہے اور اس کلمہ کو یہاں پر یا تو اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ آسمان وزمین کی تخلیق کے موقع پر گویا عدم کا تار یک پردہ شگافتہ کیا گیا اور نورِ ہستی آسمان وزمین کا وجود آشکار ہو گیا، یا پھر اس چیز کی طرف اشارہ ہے جو آج ماہرین فلکیات کے درمیان مشہور ہے کہ یہ تمام گروے اور سارے منظومے پہلے دن تو ایک تو دے کی صورت میں ایک دوسرے

[۱] ”لا یعلمون“ (وہ نہیں جانتے) کا مفعول کیا ہے، اس بارے میں کئی احتمالات بیان کئے گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ لوگ انسانوں کی نسبت ان کی عظمت کو نہیں جانتے۔ دوسرا یہ کہ وہ حق کی بے انتہا قدرت سے بے خبر ہیں۔ تیسرا یہ کہ لوگ معاد کے مسئلہ پر اس کی قدرت کو نہیں جانتے یا یہ کہ وہ جانتے تو ہیں لیکن چونکہ اپنے علم کے مطابق قدم نہیں اٹھاتے، درحقیقت وہ جاہلوں، نادانوں کے حکم میں ہیں (لیکن بعید نہیں ہے کہ پہلے تینوں معانی آیت میں جمع ہوں جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ متعلق کا حذف کرنا عموم کی دلیل ہے۔

ے کے ساتھ مربوط تھے اپنے محور کے گرد گھومنے اور مرکز سے گریز طاقت کی وجہ سے شگافہ ہو گئے اور ان سے کچھ ٹکڑے باہر نکل گئے، جن سے منظومہ کہکشاکیں اور ثوابت و سیار وجود میں آ گئے۔ [۱]

بہر حال اس آیت کے مخاطبین خواہ مشرکین ہوں یا وجود خدا کے منکرین یا دونوں، آیت سے اس حقیقت کا پتہ ضرور چلتا ہے کہ آسمان وزمین کی آفرینش کے بارے میں خوب غور و فکر کافی ہے جس سے خدا کے وجود کے بارے میں اور اس کی وحدانیت اور قدرت کے متعلق انسان کے دل میں پیدا ہونے والے ہر قسم کے شک و شبہ کو دور کر دیتا ہے۔

دسویں آیت میں آسمان وزمین کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ”ہم نے آسمان کو قدرت کے ساتھ بنایا“ (وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَا يَاقِينِ)

اس طرح کے عظیم عالموں کو بنانے کیلئے یقیناً قدرت کی ضرورت ہوتی ہے جو خداوند قدیر کے علاوہ کسی اور کی قدرت نہیں ہو سکتی۔

بعد میں فرماتا ہے ”ہم ہمیشہ اسے وسعت دیتے رہتے ہیں“ (وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ)

اگرچہ کچھ مفسرین نے اس کے معنی ”بارش کے نازل کرنے یا اس طرح کے دوسرے طریقوں سے رزق و روزی میں وسعت“ کئے ہیں۔ [۲] لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آیت کے معنی نہایت ہی اہم اور نہایت ہی دقیق ہیں جو دورِ حاضر کے دانشوروں کیلئے ثابت ہو چکا ہے، جس نے قرآن مجید کے ایک اور علمی معجزہ سے پردہ اٹھا دیا ہے اور وہ یہ کہ یہ دنیا ہمیشہ وسیع ہوتی جا رہی ہے اور ستارے، منظومے اور کہکشاکیں بڑی تیزی سے ایک دوسرے سے جدا ہوتی جا رہی ہیں۔

”جارج گاموف“ نامی ایک مشہور دانشور اپنی کتاب ”آغاز و انجام جہان“ میں لکھتے ہیں:

”اس کائنات کی فضا جو ابوں کہکشاؤں سے تشکیل پانچکی ہے، بڑی سرعت کے ساتھ پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری کائنات جمود و سکون کا شکار نہیں بلکہ اس کا پھیلاؤ اور وسعت پذیری مسلم ہے۔ اس بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ ہماری یہ دنیادان بدن پھیلتی جا رہی ہے، جہان شناسی کے معمہ کے خزانے کی اصل چابی ہے۔ کیونکہ اگر آج یہ کائنات پھیلاؤ کی حالت میں ہو تو لازم آئے گا کہ ایک ایسا تھا جب یہ کائنات نہایت ہی سمٹی ہوئی تھی۔ [۳]

اور عجیب بات تو یہ ہے کہ یہ وسعت پذیر اس قدر تیزی کے ساتھ انجام پارہی ہے کہ جو بقول ”فورڈ ہوئل“:

[۱] راغب مفردات میں کہتے ہیں: ”فَطْر“ (بروزن ستر) طول یعنی لمبائی میں چیز نے اور شگافہ کرنے کے معنی میں ہے۔ لیکن پھر اس کا استعمال ایجاد کے معنی میں ہونے لگا ہے اور ”فَطْر“ (بروزن متر) افطار اور ترک روزہ کے معنی میں ہے گویا روزہ کو شگافہ کر دیا جاتا ہے۔ (اور فطرت بمعنی خلقت بھی اسی مادہ سے لیا گیا ہے)

[۲] بعض مفسرین نے ”موسعون“ کی معنی ”قادرین“ کے تفسیر کی ہے کیونکہ ”وسعت“ بمعنی ”قدرت“ کے بھی آتا ہے لیکن ”وسیع“ کرنا اور وسعت دنیا کا معنی زیادہ واضح اور آشکار ہے

[۳] کتاب ”آغاز و انجام جہان“ ص ۷۷ (قدرے تلخیص کے ساتھ)

”گروں کی بڑی تیزی کے ساتھ عقب نشینی کی تیز ترین رفتار جس کا اب تک اندازہ لگایا جا چکا ہے، تقریباً ۶۶ ہزار کلومیٹر فی سیکنڈ ہے۔۔۔۔۔۔ جو تصویریں آسمان سے لی جا چکی ہیں یہ اہم انکشاف کرتی ہیں کہ دور ترین کہکشاؤں کا نزدیک ترین کہکشاؤں سے فاصلہ بہت بڑی تیزی کے ساتھ بڑھتا جا رہا ہے“ [۱]

ان گرات اور نہایت ہی عظیم منظوموں کے پس پشت کونسی ایسی عظیم طاقت ہے جو انہیں نہایت ہی کم نظیر رفتار کے ساتھ مرکز کائنات سے دور کر رہی ہے اور وہ بھی اس انداز کے ساتھ کہ وہ اس حرکت کے نتیجے میں تباہی کا شکار نہیں ہوتے؟

پھر زمین کی طرح اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”ہم نے اسے بچھایا اور کیا خوب بچھانے والے ہیں۔“  
 ”فرش“ کی تعبیر ایک طرف اور ”ماہدون“ جو کہ ”مہد“ کے مادہ سے ہے، دوسری طرف، بہت سی تبدیلیوں کی طرف اشارہ ہے جو زمین کی پیدائش کے آغاز ہی سے عمل میں آرہی ہیں اور اُسے انسانی زندگی کیلئے آمادہ کر دیا ہے اور اسے آرام بستریا گوارے کی مانند بنا دیا ہے (توجہ رہے کہ ”مہد“ کے معنی گہوارہ یا ہروہ جگہ ہے جو بچے کے آرام کیلئے تیار کی جاتی ہے۔  
 یہ سب اس ذات لایزال ولا شریک کی قدرت اور علم کی نشانیاں ہیں۔

گیارہویں آیت میں آسمان کی آفرینش کے بارے میں ایک نئی تعبیر کے سلسلے میں ارشاد ہو رہا ہے ”ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا ہے۔“ (وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَحْفُوظًا)

کیا اس کائنات میں محفوظ چھت کی صورت میں کوئی آسمان موجود ہے جو ہر قسم کے خارجی اثر و نفوذ سے محفوظ ہو؟ جی ہاں! ممکن ہے یہاں پر آسمان سے کچھ ہوا کی طرف اشارہ ہو جو زمین کے اطراف کو گھیرے ہوئے اور جس کی ضخامت سینکڑوں کلومیٹر ہے۔ یہ ضخامت جو لطیف ہوا کے جوہر اور دوسری گیسوں پر مشتمل ہے اور گول چھت کی صورت میں کرہ زمین کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے اور وہ اس قدر مستحکم اور طاقت ور ہے کہ بعض دانشوروں کے بقول وہ ایک ایسی فولادی چھت کی مانند ہے جس کی موٹائی دس میٹر کے برابر قوت مزاحمت رکھی ہے۔ وہ صرف مہلک آسمانی شعاعوں کی نفوذ ہی سے مانع نہیں ہوتی بلکہ ان پتھروں کو بھی روک لیتی ہے جو ہمیشہ کرہ زمین کی طرف جذب ہوتے رہتے ہیں کیونکہ وہ جس رفتار سے اس ہوائی ضخامت سے ٹکراتے رہتے ہیں، ایک طرف تو ان کی حرکت کو ایک طاقت ور رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور دوسری طرف ان میں آگ لگ جاتی ہے اور وہ جل کر بھسم ہو جاتے ہیں۔

اب آپ سوچیں کہ اگر ہوا کی یہ ضخیم چھت نہ ہوتی اور زمین پر رہنے والی مخلوق رات دن لاکھوں کروڑوں چھوٹے بڑے پتھروں کی بمباری کا نشانہ بنتی رہتی تو اس دنیا کا کیا بنتا؟ کیا ”زمین کے گہوارے“ میں آرام و سکون کا وجود ہوتا؟ کیا اسے آرام و استراحت کا گہوارہ اور آغوش کہا جاسکتا تھا؟

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس مقام پر ایک مشہور دانشور بنام ”فرانک آلن“ کی گفتگو کو بھی سنتے چلیں جو انہوں نے اپنی کتاب ”نجوم

برائے ہمہ“ میں درج کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

”جو فضا سطح زمین پر زندگی کی حفاظت کیلئے تشکیل پانچکی ہے وہ (تقریباً ۸ سو کلومیٹر موٹی ہے) اور یہ وہ ضخامت اور موٹائی ہے جو زمین کیلئے زرہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اسے ہر روز بیس ملین (۲ کروڑ) ایسے آسمانی پتھروں کی تباہی سے بچاتی ہے جن کی رفتار (۵۰) پچاس کلومیٹر فی سیکنڈ ہوتی ہے!“<sup>[۱]</sup>

یہ ٹھیک ہے کہ جو شہابے زمین پر گرتے ہیں ان میں سے بعض کا وزن 1/1000 گرام (ایک ملی گرام) ہوتا ہے، لیکن حد سے زیادہ تیز رفتاری کی وجہ سے اس کی طاقت ایٹم بم کے ذروں کے برابر ہوتی ہے۔

البتہ بعض اوقات ان شہابیوں کا حجم اور نقل اس قدر زیادہ ہوتے ہیں کہ وہ فضا کی موٹائی اور ضخامت کو عبور کر کے سطح زمین تک پہنچ جاتے ہیں۔ ایسے شہابیوں میں سے ایک سائبریا کا مشہور اور عظیم شہابیہ ہے جو ۱۹۰۸ء میں زمین پر گرا تھا، اور اس کا قطر اس قدر زیادہ تھا کہ اس سے چالیس کلومیٹر قبضہ متاثر ہوا جس سے زبردست تباہی پھیل گئی تھی (گویا خداوند عالم نے اس ذریعہ سے لوگوں کو خبردار کیا تھا کہ ذرا سوچو! اگر تم پر ایسے پتھروں کی بارش ہوتی رہے تو تمہارا کیا حشر ہو؟)

حتیٰ کہ اگر زمین کے اطراف میں فضا تو ہوتی لیکن اس قدر ضخیم نہیں بلکہ قدرے باریک ہوتی تو ”راز آفرینش“ کے مصنف ”کرسی مورسین“ کے بقول:

”روزانہ چند ملین آسمانی جرم اور ثابت شہابے زمین پر گرتے رہتے (اور کرہ زمین رہنے کے قابل نہ ہوتا)<sup>[۲]</sup>

البتہ فراموش نہ کریں کہ اگر یہ محفوظ چھت نہ ہوتی تو مہلک آسمانی شعاعیں زمین پر وہ تباہی پھیلاتیں جو مذکورہ پتھروں کی تباہی سے کئی گنا زیادہ ہوتی۔ اور شاید یہی وجوہات ہیں کہ آیت کے آخر میں فرماتا ہے ”وہ (کفار) لوگ زمین میں آیات خداوندی سے روگردان ہیں“ (وَهُمْ عَنْ آيَاتِنَا مُعْرِضُونَ)

بارہویں اور آخر آیت میں آسمانوں کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید کے ایک اور علمی معجزہ کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ”خداوند عالم وہی تو ہے جس نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے بغیر بلند کیا ہے جنہیں تم دیکھ سکو“ (اللَّهُ الَّذِي رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا)

یہ تعبیر اس بات کی غماز ہے کہ آسمان، ستونوں پر استوار ہیں لیکن وہ ستون قابل مشاہدہ نہیں ہیں۔ یہ ستون ”جاذبہ“ اور ”واقعہ“ (مرکز گریز طاقتوں کے) قانون کے اعتدال و توازن پر قائم ہونے کے علاوہ اور کیا ہو سکتے ہیں؟ ”جاذبہ“ اور ”دافعہ“ کا اعتدال اور توازن ایک نہایت ہی عظیم طاقت و رستون ہے جو دیکھنے میں نہیں آتا۔ اس نے منظومہ شمسی اور دیگر منظوموں کو اپنے اپنے مدار پر قائم

[۱] کتاب ”نجوم برائے ہمہ“ ص ۷۵

[۲] راز آفرینش نانسانص ۴۳



اور برقرار رکھا ہوا ہے۔ انہیں ایک دوسرے پر گرنے سے روکا ہوا ہے اور ساتھ ہی ان کو ایک دوسرے سے دوڑ ہونے سے بھی بچایا ہوا ہے تاکہ وہ آپس میں دور ہو کر مکمل طور پر جدا نہ ہو جائیں۔

اس بات پر توجہ رہے کہ لفظ 'عمد' (بروزن صمد) اسم جمع ہے جو 'عمود' کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی 'ستون' ہے اگر قرآن یہ بتانا چاہتا ہے کہ 'آسمانوں میں ستون نہیں ہیں' تو کافی تھا کہ اتنا کہہ دیتا 'رَفَعَ السُّلُوبَ بِغَيْرِ عَمَدٍ'، لیکن 'تروٹھا' کے جملہ کا اضافہ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ یہاں پر ایسے ستونوں کی نفی ہے جو قابل رویت ہیں، جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ستون تو ہیں لیکن دکھائی نہیں دیتے۔ اسی لئے حضرت امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام بعض نادان لوگوں کے جواب میں فرماتے ہیں جو یہ کہا کرتے تھے کہ 'آسمانوں کے ستون نہیں ہیں':

"سبحان الله اليس الله يقول بغير عمد ترونها" یعنی سبحان الله! کیا خداوند عالم نہیں فرماتا کہ ان ستونوں کے بغیر جو تم دیکھ سکو؟" تو دوسرا شخص کہتا "جی ہاں!" پھر آپ فرماتے:

"ثم عمدوا لكن لا ترونها" تو ستون تو ہیں لیکن نہیں دیکھ پاتے۔<sup>[۱]</sup>

یہی چیز حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے ایک دلچسپ فرمان میں بھی ذکر ہو چکی ہے، جو آپ نے "عمود من نور" (نور کا ستون) کے تحت ارشاد فرمایا۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

"هذه النجوم التي في السماء مدائن مثل المدائن التي في الارض مربوطة كل مدينة الى عمود من نور" یہ سارے جو کہ آسمان میں ہیں، تمہارے شہروں کی مانند ہیں جو روئے زمین پر ہیں، جن میں سے ہر ایک شہر دوسرے شہر کے ساتھ نور کے ایک ستون کے ذریعہ ملا ہوا ہے۔<sup>[۲]</sup>

اور یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ علماء متقدمین کے زمانے میں جب کہ "جاذبہ" اور "رافعہ" کا قانون واضح نہیں ہوا تھا، بعض مفسرین نے وہی تفسیر کی ہے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ آیت کا مضمون بتاتا ہے کہ آسمانوں میں ستون تو ہیں لیکن دکھائی نہیں دیتے، ہر چند کہ بعض حضرات نے ان غیر مرئی ستونوں کو قدرت خدا سے تعبیر کیا ہے۔<sup>[۳]</sup>

بہر حال یہ خداوند عالم کی عظیم آیات میں سے ایک ہے کہ ان طاقت و رنا قابل رویت ستونوں اور نظاموں کے ذریعہ آسمانی کروں کو قائم اور برقرار رکھا ہوا ہے جو جاذبہ اور رافعہ کے قانون پر حکم فرما ہیں اور اس توازن میں تھوڑی سی کم بیشی پیدا ہو جائے تو یا تو وہ بڑی شدت کے ساتھ ایک دوسرے سے جا ٹکرائیں یا پھر ایک دوسرے سے اس حد تک دور ہو جائیں کہ ان کا آپس میں کسی قسم کا رابطہ ہی نہ رہے۔

[۱] تفسیر برہان جلد ۲، ص ۲۸

[۲] بحار الانوار جلد ۵۵، ص ۹۱

[۳] مجمع البیان جلد ۵، ص ۲۷۴-۲۷۵ روح المعانی جلد ۱۳، ص ۸۷-۸۸ تفسیر فخر رازی جلد ۲، ص ۲۳۲ اور قرطبی جلد ۵، ص ۵۰۸

## نتیجہ

اگرچہ قرآن مجید میں زمین و آسمان کی آفرینش سے متعلق آیات صرف وہی نہیں ہیں جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، اور اگر ہم ”قرآن مجید میں آسمان اور زمین“ کے موضوع کے تحت ہی گفتگو کرنا شروع کر دیں تو یہ ایک مستقل کتاب بن جائے۔<sup>[۱]</sup> لیکن یہی بارہ آیات جو ہم نے نمونہ اور خلاصہ کے طور پر اوپر ذکر کی ہیں، خداشناسی کی بحث اور عالم اکبر میں اس کی نشانیوں کے سلسلے میں بڑی حد تک ہماری رہنمائی کر سکتی ہیں اور بتا سکتی ہیں کہ اس عظیم تخلیق میں یقیناً راہ حق کے راہیوں کے لئے بہت نشانیاں موجود ہیں۔ اس عظیم اور اسرار بھری کتاب کا مطالعہ روز بروز اس سے نزدیک تر کر دیتا ہے، اسکے عشق کا پیمانہ لبریز تر کر دیتا ہے اور ہمیشہ زبان پر یہ ورد جاری رہتا ہے کہ ”رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا“ (خداوند! تو نے اس وسیع و عریض جہان کو باطل اور بے فائدہ خلق نہیں فرمایا)

## چند ضروری وضاحتیں

## ۱۔ آسمان کی عظمت اور وسعت

کوئی شخص اچھی طرح نہیں جانتا کہ آسمانوں کی کیا وسعت اور چوڑائی ہے۔ ہم تو صرف یہی جانتے ہیں کہ انسان کے علم و دانش نے جس قدر ترقی کی ہے انسان کی نگاہ میں آسمانوں کی عظمت بھی اسی قدر بڑھ گئی ہے۔ یعنی ان کے کئی پہلو دریافت ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں دانشور اور ماہرین فلکیات کی آخری معلومات ہمیں بتاتی ہیں کہ:

”ہمارا منظومہ شمسی جو اسی کہکشاں سے تعلق رکھتا ہے، یہ کہکشاں جو درحقیقت ستاروں کا ایک شہر ہے اور جہاں تک دانشوروں کی تحقیق کا تعلق ہے اس میں سولین (سوارب) ستارے موجود ہیں، جن میں ہمارا سورج اسکے متوسط اور اگر اس عدد کو سوارب سے ضرب دیں تو نتیجہ سولین ارب گنا زیادہ ہے۔

اگر اس حساب کے ساتھ ایک اور حساب کا اضافہ کر دیں جو دانشوروں کی آخری تحقیق کا نتیجہ ہے، یعنی اس کائنات میں ہماری کہکشاں جیسی کم از کم ایک ارب کہکشاںیں دریافت ہو چکی ہیں، تو اس موقع پر انسانی عقل بے ساختہ طور پر اس بات کا اعتراف کرے گی کہ عظمت اور بزرگی صرف اسی ذات کبریٰ کیلئے خاص ہے جس نے اس بے انتہا کائنات کو خلق فرمایا ہے۔ (ایک بار پھر مذکورہ اعداد کا مطالعہ فرمائیں اور اس ذات ذوالجلال کی عظمت کے بارے میں غور فرمائیں)

پھر یہ کہ اعداد و شمار انسان کی زمانہ حال کی تحقیق اور علم و آگاہی سے متعلق ہیں، اور معلوم نہیں کہ مستقبل میں کتنے جدید عوامل اور کائناتیں

[۱] قرآن مجید میں تین سو مرتبہ لفظ ”سما“ مفرد اور لفظ ”سماوات“ جمع کی صورت میں ذکر ہوا ہے۔

دریافت ہوں؟ اس موقع پر آسمانوں کی عظمت کے بارے میں ”پالومار“ رصد خانہ کی شہادت قابل توجہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

”جب تک پالومار رصد خانہ کی (عظیم) دوربین ایجاد نہیں ہوئی تھی اس وقت تک اس دنیا کی وسعت پانچ سو نوری سال سے زیادہ نہیں تھی (نوری سال سے مراد اس فاصلے کی مقدار ہے جسے روشنی تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے ایک سال تک طے کرتی ہے۔ اور تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کا مقصد ہے گویا آنکھ جھپکنے کے دوران اس پورے کرہ ارضی کا سات بار چکر) لیکن اس دور میں نے ہماری دنیا کو ایک ہزار ملین (ایک ارب) نوری سال تک پہنچا دیا ہے جس کے نتیجے میں کئی لاکھ جدید کہکشاؤں دریافت ہوئی ہیں جن میں سے کچھ تو ایک ہزار ملین (ایک ارب) نوری سال ہم سے دور ہیں اور اس ایک ہزار ملین نوری سال کے فاصلے کے بعد عظیم، مہیب اور تاریک فضا دکھائی دیتی ہے جس میں کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

لیکن کسی قسم کے شک و شبہ کے بغیر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس مہیب اور تاریک فضا میں بھی لاکھوں کروڑوں کہکشاؤں موجود ہیں اور جو دنیا ہماری جانب ہے وہ انہی کہکشاؤں کی کشش کی وجہ سے محفوظ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس دنیا کو ہم دیکھ رہے ہیں وہ ایک عظیم ترین دنیا کے مقابلے میں ایک حقیر اور چھوٹے سے بے مقدار ذرہ سے زیادہ نہیں ہے۔ اسکے باوجود پھر بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس دوسری دنیا کے اس پار کوئی اور دنیا موجود نہ ہو۔<sup>[۱]</sup>

## ۲۔ زمین و آسمان پر حکم فرما چنے تلے قوانین

عام طور پر ہوتا یہی ہے کہ چیزیں جیسی عظیم ہوں گی ان پر حکم فرما تو انہیں اتنے ظریف نہیں ہوں گے، جب کہ یہ بات اس وسیع و عریض کائنات پر صادق نہیں آتی۔ یعنی یہ کائنات عجیب و غریب انداز میں وسیع و عریض ہونے کے باوجود نہایت دقیق، پیچیدہ اور ظریف قوانین کی حامل ہے۔ اس مدعا کی صداقت کیلئے کافی ہے کہ مندرجہ ذیل امور پر غور کیا جائے۔

(الف) ہم سب جانتے ہیں کہ آخر کار انسان اس مہم میں کامیاب ہو ہی گیا کہ فضائی گاڑی ایجاد کر کے دو افراد کو کرہ ماہ کے اس حصے پر اتارے جو دانشوروں نے متعین کر دیا تھا۔ اور پھر اسی طرح انہیں واپس بھی لے آیا گیا۔ اب اس بارے میں آپ اچھی طرح غور فرمائیں کہ تین دن کی اس مدت میں جب کہ یہ گاڑی زمین اور چاند کا درمیانی فاصلہ طے کر رہی تھی، اس دوران زمین اپنے محور کے گرد بھی گھوم رہی تھی اور آسمان میں سورج کے گرد اپنی جگہ کو بھی تبدیل کر رہی تھی۔ اس طرح چاند ہے کہ اپنے محور کے گرد گھوم رہا تھا اور کرہ ارض کے اطراف میں بھی حرکت کر رہا تھا۔ یہ حرکتیں کس قدر چچی تلی، منظم اور حساب شدہ ہونی چاہئیں کہ سائنس دان کمپیوٹر کے ذریعہ سے کرہ زمین اور کرہ مادہ میں تبدیلیوں اور حرکتوں کا صحیح صحیح اندازہ لگا کر فضائی گاڑی کو چاند کی طرف روانہ کریں اور وہ اپنے صحیح ٹھکانے پر جا کر اتر جائے اور پھر وہاں سے واپس زمین کو آجائے۔ اگر ان مختلف حرکات میں سے کسی ایک میں تھوڑی سی بھی کمی بیشی ہوتی اور ان میں ایک لمحہ کا بھی فرق ہوتا تو یقیناً دانشوروں کے تمام

[۱] رسالہ ”فضا“ شماره ۵۶ مجریہ فروردین ماہ ۱۳۵۱ ہجری شمسی

اندازے اور حسابات غلط ہو جاتے اور ان کا کام بگڑ جاتا۔ کائنات کا یہ بچاؤ نظام ہی تھا جس نے انسان کو اس قدر عظیم کارنامہ سرانجام دینے کی اجازت دی کہ وہ کرہ ماہ کی معین اور دل خواہ جگہ پر اس گاڑی کو اتارے۔

(ب) ماہرین فلکیات بیسیوں سال قبل چاند اور سورج گرہنوں کے بارے میں درپیش حوادث کا حساب اور اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اسی طرح رات اور دن کے گھنٹوں کی مقدار اور سورج اور چاند کے طلوع و غروب کا حساب اور اندازہ بھی لگا سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ اسی سچے تلے اور منظم حساب و کتاب اور منظم حرکت کی بدولت ہے۔

(ج) جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ جاذبہ (کشش) کی طاقت آسمانی کروں کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتی ہے جب کہ دافعہ کی قوت گردش دورانی حرکت سے وجود میں آتی ہے، جسے مرکز گریز طاقت کا نام دیا جاتا ہے جو انہیں ایک دوسرے سے دور بھگانے کی کوشش کرتی ہے۔

اب اگر کسی کچھ کے کو اپنے مقرر مدار کے گرد لاکھوں سال حرکت کرنا مقصود ہو اور وہ حرکت بھی بالکل ٹھیک ٹھیک اور دقیق، تو ان دونوں طاقتوں کو مکمل اعتدال اور توازن پر رہنا چاہیے یہ بات بھی ہم میں سے ہر ایک جانتا ہے کہ جاذبہ یا کشش موجودات کے اجرام کی مقدار کے ساتھ ’’مستقیم‘‘ نسبت اور مجذور کے ساتھ ’’معکوس‘‘ نسبت کا فاصلہ ہے (اگر اجرام زیادہ ہوں گے تو جاذبہ کشش) زیادہ ہوگی اور اگر فاصلے زیادہ ہوں گے تو مذکورہ بالا حساب کے مطابق جاذبہ یعنی کشش کم ہو جائے گی)

بنا بریں اگر مثلاً کرہ زمین کو مقرر مقدار میں سورج کے گرد ایک کافی لمبے عرصے کیلئے ایک ثابت مدار میں گردش کرنا مقصود ہو تو چاہیے کہ سورج کے جرم کی مقدار نیز ان کا باہمی فاصلہ اور سورج کے گرد زمین کی حرکت کی رفتار غرض ہر ایک چیز کو صحیح صحیح، دقیق اور سچے تلے حساب کے تحت ہونا چاہیے تاکہ ان کے درمیان اعتدال اور توازن برقرار رہے۔ یہ سب مسائل ایسے ہیں جو کسی بے انتہاء علم اور ایک عقلمند کی مداخلت کے بغیر قطعاً ناممکن ہیں۔

### ۳۔ سات آسمان

قابل توجہ بات ہے کہ قرآن مجید کی سات آیات میں ’’سماوات سبع‘‘ (سات آسمانوں) کا تذکرہ آیا ہے۔ [۱] ان آیات میں سے ایک میں تو زمین کے سات طبقات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

’’اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ‘‘

اسی طرح ایجاد کیا۔ (طلاق/ ۱۲)

[۱] بقرہ - ۲۹، اسراء - ۴۴، مومنون - ۸۶، فصلت - ۱۲، طلاق - ۱۲، ملک - ۳، نوح - ۱۵، (نیز دو آیات میں سبع طرائق یعنی سات راستے اور سبعا شتادا یعنی سات

مضبوط موجودات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جو ممکن ہے سات آسمانوں کی طرف اشارہ ہو۔ (مومنون - ۱۷، نباء - ۱۱)

سات آسمانوں کے متعلق جو مختلف تفسیریں بیان ہوئی ہیں ان میں سے جو تفسیر سب سے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ”سبع سموات“ کے معنی واقعی وہی سات آسمان ہی ہیں۔ یعنی آسمان کے معنی کچھ نہیں بلکہ عالم بالا کے ستارگان اور کواکب کا مجموعہ ہے اور سات سے مراد ہی مشہور تعداد ہے نہ کہ تکثیری عدد یعنی جو کثرت پر دلالت کرتا ہو۔

ہاں البتہ قرآن مجید کی کئی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم جو ثوابت، سیارات، کہکشائیں اور شہابے وغیرہ دیکھتے ہیں، ان سب کا تعلق ”آسمان اول کے مجموعہ“ سے ہے۔ بنا بریں اس عظیم مجموعہ کے ماوراء ایک اور عظیم مجموعہ (جو چھ آسمانوں پر مشتمل ہے) موجود ہے، جن میں سے بعض کو دوسرے بعض پر برتری حاصل ہے، اور وہ (کم از کم آج تک) انسانی علم کی دسترس سے باہر ہے۔

سورہ صافات کی چھٹی آیت میں ہم پڑھتے ہیں ”إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةِ الْكُوَاكِبِ“ (ہم نے نچلے آسمان کو ستاروں کے ساتھ زینت بخشی ہے)

سورہ نجم السجدہ کی بارہویں آیت میں آیا ہے: ”وَوَزَّيْنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحٍ“ (ہم نے نچلے آسمان کو چراغوں سے مزین کیا ہے)

اور یہی چیز تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورہ ملک کی پانچویں آیت میں بھی بیان ہوئی ہے یہ بات قابل توجہ ہے کہ علامہ مجلسی مرحوم نے بحار الانور میں اسی احتمال کو آیت مذکورہ کی تفسیر میں سے ایک تفسیر کے طور پر ذکر فرمایا ہے وہ فرماتے ہیں:

”تیسرا احتمال جو میرے ذہن میں پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ جن تمام افلاک کو ستاروں کیلئے ثابت کیا گیا ہے وہ سارے کے سارے نچلے آسمان کے نام سے موسوم ہیں۔“

ٹھیک ہے کہ ابھی تک ہمارے علمی اوزار و آلات نے دوسرے چھ عالموں سے پردہ نہیں اٹھایا۔ لیکن علمی لحاظ سے ان کے وجود کی نفی پر بھی کوئی دلیل نہیں پائی جاتی۔ اور کیا معلوم کہ بہت جلد یہ معمہ بھی حل ہو جائے بلکہ بعض ماہرین فلکیات کی دریافتوں سے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ دوسرے عالموں کی بہت سی علامات دور سے دکھائی دیتی ہیں، جیسا کہ ابھی ہم ”پالومار“ کے معروف رصدخانے کی رپورٹ درج کر چکے ہیں اور جو جملہ ہمارے اس مدعا کا شاہد ہے۔ اسے ہم دوبارہ یہیں پر نقل کئے دیتے ہیں۔

”پالومار رصدخانے کی دوربین کی ایجاد کی بدولت کئی لاکھ جدید کہکشائیں دریافت ہوئی ہیں جن میں سے کچھ تو ایک ہزار ملین (ایک ارب) نوری سال ہم سے دور ہیں اور اس ایک ارب نوری سال کے فاصلے کے بعد عظیم، مہیب اور تاریک فضا دکھائی دیتی ہے جس میں کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ لیکن کسی قسم کے شک و شبہ کے بغیر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس مہیب اور تاریک فضا میں بھی لاکھوں کروڑوں کہکشائیں موجود ہیں اور جو دنیا ہماری جانب ہے وہ اپنی کہکشاؤں کی کشش کی وجہ سے محفوظ ہے معلوم ہوتا ہے کہ جس دنیا کو ہم دیکھ رہے ہیں وہ ایک عظیم ترین دنیا کے مقابلے میں ایک حقیر اور چھوٹے سے بے مقدار ذرے سے زیادہ نہیں ہے۔ اسکے باوجود پھر بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس دوسری دنیا کے اس

پارکونی اور دنیا موجود نہ ہو!۔“ [۱]

ایک اور دانشور نے اس کائنات کی عظمت کے بارے میں ایک مفصل مقالہ تحریر کیا ہے جس میں اس نے کہکشاؤں کے درمیانی فاصلوں کے حیرت ناک اور محیر العقول اعداد و شمار پیش کئے ہیں جو سارے کے سارے نوری سالوں کی بنیاد پر مشتمل ہیں، وہ لکھتا ہے:

”علم نجوم (ستارہ شناسی) کے ماہرین کا اس مقام پر یہ نظریہ ہے کہ ابھی تک انہوں نے اس باعظمت کائنات کے قابل رویت راستوں کے آدھے کنارے کو طے کیا ہے، جب کہ ان فضاؤں کے راستے ابھی طے کرنے میں جواب تک دریافت نہیں ہو پائیں۔“ [۲]

اس طرح ابھی تک بنی نوع انسان نے جو عالم دریافت کئے ہیں وہ اپنی وسعت اور عظمت کے باوجود اس عظیم کائنات کے ایک مختصر سے حصے پر مشتمل ہیں اور سات آسمانوں کے تصور سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں۔ [۳]

## ۴۔ آسمان کی طرف نگاہ کیوں نہیں کرتے؟

آسمانوں کی وسعتوں میں آیات خداوندی کی کثرت اور رات کو آسمان کی بے مثال خوبصورتی اس بات کا موجب بنی ہے کہ قرآن مجید اور اسلامی روایات تمام لوگوں کو عموماً اور مومنین کو خصوصاً زیادہ سے زیادہ ایمان پیدا کرنے کیلئے ہمیشہ آسمانوں کے مطالعہ کی دعوت دیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید کی سورہ ق کی چھٹی آیت میں فرماتا ہے:

”أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهُا مِنْ فُجُوجٍ“ کیا انہوں نے اس آسمان کی طرف نہیں دیکھا جو ان کے سر پر ہے کہ ہم نے اسے کیسے بنایا ہے اور اسے ستاروں کے ذریعہ زینت بخشی ہے اور اس میں کوئی غیر موزونیت اور شکاف نہیں ہے؟“

خصوصاً اسلامی روایات میں حکم دیا گیا ہے کہ جب ”سحر خیز مومنین“ نماز تہجد کیلئے اٹھیں تو سب سے پہلے آسمان پر نگاہ ڈالیں اور سورہ آل عمران کی آخری آیات کی تلاوت کریں جو ”إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالاختلاف اللیل والنهار۔۔۔۔۔“ سے شروع ہوتی ہیں کیونکہ ان میں تمام حقائق عارفانہ صورت میں بیان کئے گئے ہیں پھر اپنے رب کی عبادت کو شروع کریں (ایسی عبادت جو توحید اور معرفت رب کے عطر سے معطر ہو) [۴]

[۱] رسالہ ”فضا“ شمارہ ۵۶، مجریہ ۱۳۵۱ ہجری شمسی

[۲] رسالہ ”نیوز ویک“ فریہ ۱۹۶۵ء (یاد رہے کہ یہ گواہی آج سے ستائیس سال پہلی کی ہے)

[۳] مزید تفصیل کیلئے تفسیر نمونہ جلد اول سورہ بقرہ کی آیت کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیں جس میں سات آسمانوں کے بارے میں مختلف تفسیریں درج کی گئی ہیں۔

[۴] تفسیر مجمع البیان جلد ۲ ص ۵۵۴ سورہ آل عمران کی آخری آیات کے ذیل میں

ایک اور روایت میں منقول ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بھی نماز تہجد کیلئے کھڑے ہوتے سب سے پہلے مسواک فرماتے پھر آسمان پر نگاہ ڈال کر انہی آیات کی تلاوت فرماتے۔<sup>[۱]</sup>

حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے حالات میں ہے کہ آپ کے ایک دوست بنام ”حبہ عرنی“ کہتے ہیں کہ: ”ایک رات کا واقعہ ہے کہ میں (حضرت علی علیہ السلام کے صحابی) ”نوف“ کے ساتھ دارالامارہ میں سویا ہوا تھا کہ رات کے آخری حصے میں، میں نے دیکھا کہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنا ہاتھ دیوار پر رکھا ہوا تھا اور والہانہ انداز میں (آسمان کی طرف نگاہ کرے) ان آیات کی تلاوت فرما رہے تھے ”إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ----“ اور ان کا بار بار تکرار کر رہے تھے گویا آپ کی عقل پرواز فرما رہی تھی۔

پھر آنجناب نے میری طرف منہ کر کے ارشاد فرمایا ”حبہ! جاگتے ہو یا سو رہے ہو؟“ میں نے عرض کی، جناب میں بیدار ہوں، جب آپ کی یہ حالت ہو تو ہم کیسے (سو) سکتے ہیں؟“

پھر آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور ارشاد فرمایا ”حبہ! خداوند عالم کی طرف سے کئی موقف مقرر ہیں جہاں جا کر ہمیں رُکنا پڑے گا۔ ہمارے اعمال میں سے کچھ بھی اس پر مخفی نہیں اور وہ میری اور تمہاری شہرگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔۔۔۔۔۔“<sup>[۲]</sup>

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیاء خدا کے خاص بندے کسی بھی وقت اس فکر انگیز اور ایمان آفرین مطالعہ سے غافل نہیں ہوتے تھے اور آسمانوں کی تخلیق اور ان پر حکم فرمانظام سے ہمیشہ الہام لیا کرتے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

[۱] تفسیر مجمع البیان جلد ۲ ص ۵۵۴ سورہ آل عمران کی آخری آیات کے ذیل میں

[۲] بحار انوار جلد ۴۱ ص ۲۲

## ۸۔ سورج، چاند اور ستاروں کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں

### اشارہ:

اگرچہ سورج اور چاند کو ستاروں اور آسمانی کروں میں شمار کیا گیا ہے اور آسمانوں کی عظمت کے بارے میں علیحدہ گفتگو کی گئی ہے لیکن چونکہ یہ دونوں ہمارے کرہ ارضی سے زیادہ قریب ہیں لہذا ان دنوں کا ہماری زندگی میں بڑا دخل ہے، قرآن مجید نے بھی ان پر خصوصی توجہ دی ہے اور ہر ایک کو خداوند عالم کی عظیم آیات میں سے ایک آیت کے عنوان سے متعارف کرایا ہے۔ نیز بعض ستاروں کے فوائد کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور انہیں بھی آیات خداوندی میں شمار کیا ہے اور سچ مچ ان میں سے ہر ایک..... خصوصاً دورِ حاضر کی دریا فتوں کی روشنی میں..... ایک طرف تو وہ ہمارے لئے خداوند عالم کی عظمت و قدرت کی اور دوسری طرف قرآنی تعلیمات کی عظمت کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ اس مختصر سے اشارے کے ساتھ ہم مندرجہ ذیل آیات کو گوشِ جان سے سماعت کرتے ہیں:

۱... هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَدَقَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابِ مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ

(یونس/۵)

۲... أَلَمْ تَرَ وَكَيْفَ خَلَقَ اللَّهُ سَبْعَ سَمَوَاتٍ طَبَاقًا ۙ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الشَّمْسُ سِرَاجًا

(نوح/۱۵-۱۶)

۳... وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ

(ابراہیم/۳۳)

۴... وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلًّا يَجْرِئُ لِآجَلٍ مُّسَمًّى

(فاطر/۱۳)

۵... وَمِنْ آيَاتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ



وَاللَّقَمَرِ وَاسْجُدْ وَابْتَدِعْ وَاللَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ

(حم السجدة/ ۱۳۷)

۶۔۔۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ {} وَالْقَمَرَ  
قَدَرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ {} لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ  
تُدرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ

(یس/ ۲۰ تا ۲۳)

۷۔۔۔ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ

(انبیاء/ ۳۳)

۸۔۔۔ فَلَا فِئْتَمَّةٌ رَبِّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ إِنَّا لَقَدِيرُونَ

(معارف/ ۲۰)

۹۔۔۔ كَلَّا وَالْقَمَرَ ۚ وَاللَّيْلِ إِذَا أَدْبَرَ ۚ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ ۚ إِنَّهَا لَلْأَحَدَى  
الْكُبْرَى ۚ

(مثر/ ۳۵ تا ۳۸)

۱۰۔۔۔ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ اللَّيْلِ وَالْبَحْرِ  
قَدْ فَضَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ

(انعام/ ۹۷)

ترجمہ

- ۱۔۔۔ وہ وہی تو ہے جس نے خورشید کو روشنی دی اور چاند کو نور قرار دیا اور اس کیلئے منزل مقرر کیں تاکہ تم سالوں کے عدد اور (کاموں کے) حساب کو جانو۔ خداوند عالم نے یہ سب کچھ حق کے سوا پیدا نہیں کیا۔ وہ (اپنی) آیات کو ایسے لوگوں کیلئے تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے جو عقل رکھتے ہیں۔
- ۲۔۔۔ کیا تم نہیں جانتے کہ خداوند عالم نے سات آسمانوں کو یکے بعد دیگرے کیونکر پیدا کیا ہے؟

- اور چاند کو آسمانوں کے درمیان میں روشنی کا سبب اور سورج کو روشن چراغ قرار دیا ہے۔
- ۳۔۔ اس نے سورج اور چاند کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے جو ہمیشہ منظم طریقہ سے چل رہے ہیں۔
- ۴۔۔ اس نے سورج اور چاند کو (تمہارے لئے) مسخر کر دیا ہے اور ان میں سے ہر ایک مقررہ وقت تک چلتے رہیں گے۔
- ۵۔۔ اس کی نشانیوں میں سے رات، دن، سورج اور چاند ہیں۔ سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو، اس خدا کا سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا ہے اگر تم اس کی ہی عبادت کرتے ہو۔
- ۶۔۔ اور سورج (بھی ان لوگ کیلئے ایک آیت ہے) جو کہ ہمیشہ اپنے ٹھکانے کی طرف حرکت میں رہتا ہے، یہ خداوند قادر اور عالم کی تقدیر ہے۔ نہ تو سورج کیلئے سزاوار ہے کہ وہ چاند تک پہنچ جائے اور نہ ہی رات دن سے آگے بڑھ سکتی ہے اور ہر ایک فلک میں تیر رہا ہے۔
- ۷۔۔ وہ وہی تو ہے جس نے رات، دن، سورج اور چاند کو پیدا کیا ہے، ان میں سے ہر ایک فلک میں تیر رہا ہے۔
- ۸۔۔ مشرقوں اور مغربوں کے رب کی قسم کہ ہم قدرت رکھتے ہیں۔
- ۹۔۔ ایسا نہیں ہے جیسے وہ تصور کرتے ہیں، چاند کی قسم۔۔۔۔۔ اور رات کی قسم جب وہ (اپنے دامن سمیٹ کر) پیٹھ پھیرے۔۔۔ اور صبح کی قسم جب وہ اپنا منہ کھولے۔۔۔۔۔ کہ وہ (قیامت کا ہولناک حادثہ) اہم مسائل میں سے ایک ہے۔
- ۱۰۔۔ وہ وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے ستاروں کو پیدا کیا ہے تاکہ تم بری اور بھری تاریکیوں میں ہدایت حاصل کرو۔ ہم نے ان لوگوں کیلئے اپنی نشانیوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جو عقل رکھتے ہیں (اور غور و فکر سے کام لیتے ہیں)

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### سورج، چاند اور ستاروں کی قسم

باوجودیکہ ان آیات کے نازل ہونے کے زمانے میں سورج، چاند اور ستاروں کے بارے میں انسانی معلومات بہت ہی محدود تھیں اور بھی خرافات سے بھری ہوئی، (خاص کر جس علاقہ میں قرآن کی یہ آیت نازل ہوئیں) پھر بھی قرآن مجید سورج، چاند اور ستاروں کی عجیب قسم کی عظمت سے یاد کرتا ہے اور ان کی بہت سی خصوصیات کو بیان کرتا ہے اور مجموعی طور پر ان سب کو آیات حق اور اس کی پاک ذات کی نشانیاں قرار دیتا ہے۔

اسی سلسلے کی سب سے پہلی آیت میں فرماتا ہے ”وہ وہی ہے کہ جس نے سورج کو ضیا اور روشنی اور چاند کو نور قرار دیا ہے“ (هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا)

بعض ارباب لغت نے (جیسے طرحی نے مجمع البحرین میں) اور بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ ”ضیا“ اور ”نور“ میں یہ فرق ہے کہ ”ضیا“ اس روشنی کو کہتے ہیں جو کسی چیز کی ذات سے اُٹھے اور ”نور“ اس روشنی کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے سے لی جائے۔ بنا بریں مندرجہ بالا آیت اس نکتے کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ سورج کی روشنی ذاتی ہے جب کہ چاند کی روشنی سورج کی روشنی کی مرہون منت ہے۔ قرآن نے یہ بات اس وقت کہی جب دنیا کے لوگ اس چیز سے قطعاً آگاہ نہیں تھے۔

البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان دونوں لفظوں میں سے ہر ایک ممکن ہے کہ ایک ہی معنی کے لئے استعمال کیا جائے اور وہ ہے ”روشنی“ یعنی ”ذاتی“ اور ”اکتسابی“ روشنی، چنانچہ قرآن مجید اور کلمات عرب میں اس کا اس طرح کا استعمال ہمارے مدعا کی دلیل ہے۔ البتہ جب دونوں باہم استعمال ہوں گے تو ان کے مختلف معانی ہوں گے، جیسا کہ اسی آیت میں استعمال ہوا ہے۔

یہی چیز دوسری آیت میں دوسرے لفظوں میں بیان ہوئی ہے، یعنی پہلی تو مسات آسمانوں کی تخلیق کا تذکرہ ہے پھر فرمایا ہے ”خدا نے آسمانوں میں چاند کو نور قرار دیا ہے اور سورج کو روشنی عطا کرنے والا چراغ۔“ (قرآن کی دوسری دو آیات میں بھی سورج کو ”سراج“ (چراغ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورہ فرقان کی ۶۱ ویں اور سورہ نباء کی ۱۳ ویں آیت میں، اور ہم جانتے ہیں، کہ سورج کی روشنی خود اس کے اندر سے ہی پیدا ہوتی ہے باہر سے نہیں لی جاتی اور بعض لغات میں یہ بھی ذکر ہے کہ ”ضیا“، ”نور“ سے زیادہ شدید ہے۔ ممکن ہے کہ معنی کا یہ فرق پہلے فرق سے لیا گیا ہو اور اسی کی طرف اس کی بازگشت ہو۔ بہر حال یہاں ہر چیز سے پہلے ”سورج“ اور ”چاند“ کے نور کی بات کی گئی ہے اور انہیں خدا کی نشانیاں قرار دیا گیا ہے۔

سورج کی روشنی صرف موجودات عالم ہی کو گرم اور روشن نہیں کرتی بلکہ نباتات کی پرورش اور حیوانات کی زندگی میں بھی اس

کا بہت بڑا حصہ ہے۔

آج یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے کہ کرہ زمین پر جو جنبش اور حرکت پایا جاتا ہے وہ سب سورج کی روشنی کی بدولت ہے۔ ہواؤں کا چلنا، بادلوں کی حرکت، سمندروں کی امواج، دریاؤں کا چلنا، آبشاروں کی گونج اور حیوانوں اور انسانوں کی سرگرمیاں سب سورج کے نور کی برکت سے ہیں۔ اگر اچھی طرح سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ روئے زمین کی ہر چیز میں زندگی کی علامات نور آفتاب کی مرہون منت ہیں (غور کیجئے گا)

اگر ایک دن ایسا آجائے جس میں سورج ماند پڑ جائے اور کرہ ارضی سے سورج کی شعاعیں منقطع ہو جائیں، تو نہایت ہی قلیل عرصے میں موت، خاموشی، سکون اور ظلمت ہر جگہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیں۔

چاند کی پیاری پیاری اور میٹھی روشنی نہ صرف ہماری راتوں کیلئے چراغ کا کام دیتی اور رات کے مسافروں، شہروں اور جنگلوں میں راہنمائی کرتی ہے بلکہ اس کی لطیف اور ملامت روشنی تمام انسانوں کو آرام و سکون اور مسرت و نشاط بھی عطا کرتی ہے۔ بعض زرعی ماہرین کا کہنا ہے کہ چاند کا نور پھلوں کے پکنے اور نباتات کے پروان چڑھنے کیلئے کافی مؤثر ہوتا ہے۔ البتہ یہ سب کچھ سورج اور چاند کی صرف روشنی کے بارے میں بتایا گیا ہے، ان کی دوسری برکتوں کے بارے میں علیحدہ گفتگو ہوگی۔

پھر قرآن مجید اسی آیت کے آخر میں ان دونوں آسمانی نچڑوں کی ایک اور اہم برکت اور فائدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے

”خداوند عالم نے چاند کیلئے کچھ منزلیں مقرر فرمائی ہیں تاکہ تم سالوں کی تعداد اور (اپنی زندگی اور کاموں) کے حساب کو جان لو“ (وَقَدْ رَآهُ نَزْلًا لِّتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِّیْنَ وَالْحِسَابِ)

چاند اپنی منظم رفتار اور دقیق حرکت کی وجہ سے ایک نہایت روشن اور طبعی زندہ تقویم (کیلنڈر) ہے، اس قدر روشن کہ ہر عالم اور جاہل، جو ”پڑھ“ سکتا ہے۔ اسی کی بنیاد پر اپنی زندگی کے پروگراموں کو مرتب کر سکتا ہے۔ اور ہم اچھی طرح غور کریں تو معلوم ہوگا کہ انسانی زندگی کا سال، مہینے اور منظم و عمومی تقویم کے ساتھ نہایت ہی گہرا تعلق ہے اور چاند، سورج اور زمین کی اپنے اور سورج کے گرد منظم حرکت اس مہم کو سرانجام دیتے ہیں۔

موجودہ دور کے کیلنڈر اور تقویمیں جو منجمین کے حساب سے مرتب کی جاتی ہیں، ان لوگوں کے کام آسکتی ہیں جو ان تحریروں تک دسترس رکھتے ہیں۔ یہ صرف طبعی تقویم ہی ہے جو سب کیلئے محسوس، قابل مشاہدہ اور مفید واقع ہو سکتی ہے اور وہ چاند کی حرکت ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اس زمانے سے لے کر جب کہ وہ ”ہلال“ ہے، اس وقت تک جب وہ ”بدر کمال“ کی صورت اختیار کر لیتا ہے، پھر وہ ”حاق“ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اگر انسان تھوڑی سی بھی توجہ کرے اور اس بارے میں قدرے غور و فکر سے کام لے تو وہ مہینے کی راتوں کو اچھی طرح دیکھنے سے مہینے کی مقدار اور اندازہ متعین کر سکتا ہے، کیونکہ چاند ہرگز دو راتوں میں آسمان پر ایک جیسا نہیں ہوتا۔

اسلامی عبادات کے پروگرام قمری مہینے کی بنیاد پر مقرر کرنے کی شاید یہی وجہ ہے۔ سب اطراف پیش نظر رکھنے کی وجہ سے قرآن مجید اسی آیت کے آخر میں فرماتا ہے۔ ”خداوند عالم اپنی ان آیات اور نشانیوں کو ان لوگوں کیلئے تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے جو عالم ہیں“ (يَفْصِلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ)

تیسری اور چوتھی آیت میں انسانوں کیلئے سورج اور چاند کی تسخیر کا ذکر ہے۔ (وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ)

ہاں البتہ ایک آیت میں ان دونوں کی حرکت کو ”دائین“ (ایسی حرکت جو معمول کے مطابق اور ثابت صورت میں ہے) اور دوسری آیت میں ”كُلُّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى“ (ان دونوں میں سے ہر ایک مقررہ مدت تک کیلئے اپنی حرکت میں لگا ہوا ہے) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے جو آج ثابت ہو چکی ہے۔ وہ یہ کہ سورج اور چاند کی حرکت ایک لمبے عرصے کے بعد اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی اور منظومہ شمسی کا نظام لاکھوں کروڑوں سال بعد گرگول ہو جائے۔ یہ چیز بذات خود قرآن مجید کے علمی معجزات میں سے ایک ہے۔ البتہ سورج کی حرکت سے مراد حقیقت زمین کی سورج کے گرد حرکت ہے، کیونکہ بظاہر تو یہی نظر آتا ہے کہ سورج حرکت کر رہا ہے۔ لیکن دراصل یہ زمین کی حرکت ہوتی ہے جو انسان کے اندر یہ احساس پیدا کر رہی ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ خورشید بھی ہمیشہ کہکشاں کے اندر منظومہ شمسی کے ہمراہ حرکت میں ہے جس کی طرف بعد میں اشارہ ہوگا۔

سورج، چاند اور دیگر موجودات کی تسخیر جس کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے کہ خدا نے انہیں انسان کیلئے مسخر کر دیا ہے، یہ ہے کہ خدا نے انہیں انسانی مفادات اور اس کی خدمت کی راہوں پر چلا دیا ہے، جیسا کہ ابھی بتا چکے ہیں کہ سورج اور چاند کا نور انسانی زندگی اور تمام دیگر زندہ موجودات کیلئے نہایت ہی اہم اور مؤثر کردار ادا کرتا ہے، خصوصاً سورج کی روشنی کے بغیر روئے زمین پر زندگی کا ایک لمحہ بھی ناممکن ہے۔ حتیٰ کہ رات کی تاریکی میں بھی ہم آفتاب عالمتات کی نور کی بچی کچی حرارت اور گرمی سے استفادہ کرتے ہیں جو زمین اور ہوا میں باقی رہ جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتو رات کی تاریکی میں تمام زندہ چیزیں منجمد ہو جائیں۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی فائدے ہیں، سمندروں میں مدوجر کا وجود میں لانا جو بہت سی خدمات کا موجب بن جاتا ہے۔ انشاء اللہ ہم آگے چل کر ”سمندروں میں خدا کی نشانیاں“ کی بحث میں اس طرف اشارہ کریں گے، اسی طرح طبعی تقویم کی تشکیل اور اسی طرح کی اور بھی بہت سی خدمات۔

اس میں شک نہیں کہ آج جو کچھ ہم سورج اور چاند کی برکتیں سمجھتے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ ہیں جو ان آیات کے نزول کے زمانہ میں موجود لوگ اور ان کے مخاطب افراد سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان آیات کی جبین پر لکھا ہوا توحید اکا جو درس ہم پڑھ سکتے ہیں اس سے کہیں زیادہ ہے جو گذشتہ زمانے کے لوگ پڑھ سکتے تھے۔ اسی لئے تو زیر بحث آیت کے آخر میں فرماتا ہے، ”خداوند عالم تمہارا پروردگار وہی تو ہے جس نے ان موجودات کو تمہاری خدمت پر مقرر کر دیا ہے اور تمہارے تابع فرمان بنا دیا ہے، لیکن تم لوگ جنہیں خدا کا ہمسرہ سمجھتے ہو اور اس کا شریک بناتے ہو وہ تو اس جہاں میں کھجور کی گٹھلی کی جھلی کے برابر کی ملکیت اور حاکمیت نہیں رکھتے۔ (وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مَا يَمْلِكُونَ مِنْ قِطْمِيرٍ) [۱]

پانچویں آیت میں بڑی صراحت کے ساتھ رات، دن، سورج اور چاند کی آفرینش کو خداوند عالم کی آیات اور نشانوں میں سے

[۱] قلمبر کے متعلق بہت سے مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد وہ سفید رنگ کی جھلی ہے جو کھجور کی گٹھلی کے اوپر ہوتی ہے اور بعض کہتے ہیں اس سے مراد وہ معمولی سا گڑھا ہے جو گٹھلی کی پشت میں ہوتا ہے۔ بہر صورت یہ ایک نہایت ہی معمولی، بے قیمت اور بہت ہی چھوٹی سی مخلوق سے کنایہ ہے۔

شمار کیا گیا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ مبادا تم یہ تصور کر لو کہ یہ ہی تمہارے پروردگار اور رب ہیں، جیسا کہ سورج پرست یا چاند پرست سمجھتے ہیں۔ نہیں ایسا بالکل نہیں ہے۔ تم ان کو سجدہ مت کرو بلکہ اس خدا کیلئے سجدہ کیا کرو جو ان سے کا خالق اور آفریدگار ہے، اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو! (لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِن كُنتُمْ آيَاةً تَعْبُدُونَ)

قرآن مجید کس قدر چچی تلی اور حساب شدہ بات کہہ رہا ہے کیونکہ شب و روز آفتاب و ماہتاب اور کائنات کی دیگر اشیاء کی مختلف برکات کا شمار کرنا ممکن ہے کسی کوتاہ فکر شخص کے ذہن میں یہ فتور پیدا کر دے کہ ”چونکہ ہم ان موجودات کی نعمتوں کے مرہون منت ہیں لہذا انہیں کا سجدہ بجالائیں اور ان کی عبادت کریں“ جیسا کہ تاریخ میں بہت سے بت پرست ایسے ہی طریقے سے بت پرستی کا شکار ہو گئے تھے۔ قرآن کہتا ہے آنکھیں کھولو اور اپنی بصیرت سے اسباب پر نگاہ ڈالو، اسباب کے پس پردہ ذات مسبب الاسباب کا دیدار کرو اور اسی کی درگاہ پر اپنی پیشانیاں جھکا دو، اسباب کے فریب میں آکر عالم اسباب میں گم نہ ہو جائے۔

اسی سلسلے کی چھٹی اور ساتویں آیت میں بڑی وضاحت کے ساتھ سورج اور چاند کی حرکت اور ان منزلوں کی بات کی گئی ہے۔ آیات کے آخر میں صراحت کی گئی ہے کہ یہ اجرام سماوی اپنے اپنے لحاظ سے فلک، مدار اور راستوں میں تیرتے پھرتے ہیں (وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ) [1]

قرآن مجید کی یہ تعبیریں ایک طرف تو قرآن پاک کے عجائبات میں شمار ہوتی ہیں اور دوسری طرف عالم آفرینش اور خداوند عالم کے علم و قدرت کی شاہکار ہیں۔

”وَالشَّمْسُ تَجْرِي“ (سورج چل رہا ہے) کے جملے اور ”لِيَسْتَقَرَّ لَهَا“ (اپنے ٹھکانے کی طرف) کے جملے سے کیا مراد؟ اس بارے میں متعدد تفسیریں ملتی ہیں۔

پہلی تو یہ ہے کہ اس سے مراد خورشید کی یہ ظاہری حرکت ہے جو طلوع آفتاب سے شروع ہوتی ہے اور ٹھکانہ غروب ہے، جب سورج آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ (البتہ معلوم ہے یہ زمین کی اپنے محور کے گرد گھومنے کے نتیجے میں یہ صورت حال ہمارے سامنے آتی ہے) دوسرا یہ کہ اس سے مراد سورج کے محور کی حرکتیں ہیں جو فصل بہار کے آغاز سے کرہ زمین کے شمال کی طرف ہونا شروع ہوتی ہیں اور موسم گرما کے آغاز تک برابر جاری رہتی ہیں۔ پھر موسم گرما کے آغاز میں (شمال نیم کرے میں) راس السرطان کے مقابل (۲۳ درجہ شمال کے مدار) میں جا پہنچتی ہیں، اور اسے ”شمالی میل اعظم“ کہتے ہیں۔ اس کے بعد اس حرکت کا جنوب کی طرف آغاز ہوتا ہے اور موسم خزاں کے اوائل میں خط استوا کے مقابل پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد کرہ زمین کی طرف مائل ہو جاتی ہے، موسم سرما کے آغاز تک برابر جاری رہتی ہے اور راس الجدی کے مدار (۲۳ درجہ جنوبی کے مدار) تک جا پہنچتی ہے۔ اُسے ”جنوبی میل اعظم“ کہتے ہیں۔ پھر اس کا آغاز شمال کی طرف ہو جاتا ہے اور فصل بہار میں خط استوا کے مقابل میں ہوتی ہے۔

[1] ”یسبحون“ ”سباح“ کے مادہ سے ہے جس نے معنی ہیں، پانی یا ہوا میں تیز حرکت کرنا۔ (مفردات راغب)

اسی لئے سورج کے چلنے سے مراد یہی شمال اور جنوبی میل اعظم ہیں اور مستقر سے مراد شمالی اور جنوبی میل اعظم کا آخری نقطہ ہے، یعنی راس السرطان اور راس الجدی کا مدار۔

البتہ معلوم ہے کہ یہ حرکت سورج کے گرد زمین کی حرکت انتقالی ہے اور وہ بھی محور زمین کے ۲۳ درجہ کے جھکاؤ کے ساتھ، لیکن ہمیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سورج ہی ایسی حرکت کا حامل ہے۔

تیسرا یہ کہ اس سے مراد خورشید کی اپنے محور کے گرد وضعی حرکت ہے۔ کیونکہ یہ بات آج ثابت ہو چکی ہے کہ سورج بھی اپنے محور کے گرد گھومتا ہے (اس حرکت کے ایک مکمل دورانے کا عرصہ ساڑھے پچیس دن بتایا گیا ہے۔) اس صورت میں ’مستقر لھا‘ میں ’لام‘ بمعنی ’فی‘ (میں) کے ہوگا۔ یعنی سورج اپنے ٹھکانے میں حرکت کرتا ہے۔ (البتہ بعض مفسرین نے اس تفسیر میں اشکال کیا ہے کیونکہ یہ معنی ’تجری‘ کلمہ کے مفہوم سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

چوتھا یہ کہ سورج کی آسمانی برجوں میں حرکت مراد ہے جو سال کے بارہ مہینوں میں انجام پاتی ہے اور سورج ہر زمانے میں ان بارہ برجوں میں سے کسی ایک برج کے مقابل قرار پاتا ہے اور ستاروں کی ان فلکی صورتوں میں سے کسی ایک صورت کے سامنے ہوتا ہے۔ یہیں سے سال کے بارہ برج ظاہر ہوتے ہیں۔ [۱] بنا بریں ’مستقر‘ یا ٹھکانہ سے مراد اس دورانیہ کی انتہا ہے۔

پانچواں اور چھٹا یہ کہ اس سے مراد وہ حرکتیں ہیں جو دورِ حاضر کی دانشوروں نے دریافت کی ہیں، وہ یہ کہ ہماری کہکشاں کے گرد مجموعہ شمسی سمیت سورج کی حرکت ہے جو ایک مشہور فلکی صوت بنام ’صورت الجائی‘ کی طرف ہوتی ہے۔ ’صورت الجائی‘ سورج کے شمال میں واقع ہے۔ ہم اس حرکت میں ہر سال چھ سو ملین (ساٹھ کروڑ) کلومیٹر سے زیادہ آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہ حرکت بالکل ویسے ہی ہے جیسے کچھ لوگ کسی ایسے ہوائی جہاز کے کمرے میں بیٹھے ایک مرکز کے گرد گھوم رہے ہوں جو انہیں ایک سمت کی طرف لئے بڑی تیزی سے محو پرواز ہو، اور یہ پرواز اس قدر نرم اور ملائم ہو کہ اس کی تیز رفتاری مسافروں کو بھی معلوم نہ ہو۔

ایک اور حرکت بھی ہے، وہ یہ کہ منظومہ شمسی جس میں ہم رہ رہے ہیں بقیہ کہکشاں کے ہمراہ اسی کہکشاں کے اصلی مرکز کے گرد گھوم رہا ہے۔ اگر آپ تعجب نہ کریں تو اس کی رفتار کا اندازہ نولاکھ کلومیٹر (سے قدر کم) فی گھنٹہ لگا یا گیا ہے۔ [۲]

اس تفسیر کے مطابق مستقر سے مراد ہی قرار گاہ ہے جو اس کائنات کے خاتمے کے ساتھ مقرر کی گئی ہے۔ قیامت کے قریب سورج وہاں جا پہنچے گا جہاں پہنچ کر وہ بے نور ہو جائے گا اور اس کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ البتہ جو بھی تفسیریں بیان کی گئی ہیں ان میں آپس میں کوئی منافات نہیں ہے بلکہ یہ تمام تفسیریں آیت کے مفہوم میں جمع ہو سکتی ہیں کیونکہ نہ تو زمین کی ایک

[۱] یہاں ’برج‘ سے مراد ستاروں کا وہ مجموعہ ہے جو ایک خاص صورت اختیار کئے ہوئے ہے اور بارہ برج اس ترتیب کے ساتھ ہیں: حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو اور حوت

[۲] کتاب ’از جہانہائے دور‘ ص ۲۹۳ اور ’تفسیر ستارگان‘ ص ۳۹۲ کا مطالعہ فرمائیں۔

حرکت ہے اور نہ ہی سورج کی۔

”یسجون“ (تیر ہے ہیں) کی تعبیر ایک نہایت ہی لطیف تعبیر ہے جو سورج اور چاند کی سرچ، لیکن نرم اور موزون و معتدل حرکت کو بیان کر رہی ہے۔ چاند کے بارے میں بھی قرآن مجید نے آیات بالا میں اس کے متعلق منزلیں طے کرنے کا ذکر کیا ہے اور کہہ رہا ہے کہ ہم نے چاند کیلئے بھی منزلیں مقرر کی ہیں۔ (وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَا مَنَازِلَ)

ان منزلوں سے مراد ہی اٹھائیس منزلیں ہیں جنہیں چاند ”ہلال“ کے آغاز سے لے کر ”محاق“ (مطلق تاریکی) تک طے کرتا رہتا ہے، پھر وہ ہلال کی صورت میں نہات باریک شکل اختیار کر لیتا ہے اور زرد رنگت، کم فروغ و کم نور ہو جاتا ہے۔ نیز آخری دورا تیں جنہیں محاق کہا جاتا ہے، میں قابل رؤیت نہیں ہوتا۔

قرآن پاک نے آخر ماہ کے باریک ہلال کو ”عرجون قدیم“ (کھجور کی قوسی شکل کی زور رنگ کے پرانے خوشے) سے تشبیہ دی ہے۔ [۱] یہ تعبیر مختلف لحاظ سے نہات ہی لطیف اور دلکش ہے۔

ہم اس بحث کو جو شاید تھوڑی سی لمبی بھی ہوگی ہے دو نکتے بیان کرنے کے بعد ختم کرتے ہیں۔ پہلا نکتہ یہ کہ آیات بالا میں ”فلک“ سے مراد اس کے وہی لغوی معنی ہیں نہ کہ وہ معنی جس کے قدیم زمانے میں علمائے ہیئت قائل تھے۔ کیونکہ لغت میں ”فلک“ ستاروں کے مدار کو کہتے ہیں اور کبھی ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو دائرے کی مانند ہو اور اس کے دونوں اطراف بڑھے ہوئے ہوں۔ راغب کے اعتقاد کے مطابق دراصل یہ ”فلک“ کے مادہ سے لیا گیا ہے (جس کا وزن قفل بنتا ہے) جس کے معنی کشتی ہیں۔ کیونکہ کشتیاں، دریاؤں اور سمندروں میں اپنے اپنے راستوں پر حرکت دورانی کے تحت رواں دواں رہتی ہیں۔ [۲]

لیکن قدیم منجمین (ستارہ شناس) بطلمیوس کی پیروی میں اس بات کے معتقد تھے کہ آسمان بیاز کی مانند نوطیوں پر مشتمل ہے۔ چونکہ یہ طبقے سلور کے مانند صاف و شفاف ہیں، ستارے ان کے درمیان میخ کی مانند گاڑ دیئے گئے ہیں اور افلاک کی گردش کے ساتھ گردش کر رہے ہیں، لہذا صرف ستارے ہی نظر آتے ہیں، افلاک کی گردش کا پتہ نہیں چلتا۔

یہ نظریہ آج مکمل طور پر باطل ہو چکا ہے اور یہ بات تسلیم کی جا چکی ہے کہ ستارے اس فضائے بیکراں میں لٹکے ہوئے ہیں و ”دافعہ اور جاذبہ کے قانون“ کے تحت اپنے مقررہ راستوں پر گامزن ہیں۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید اس زمانے میں نازل ہوا جب بطلمیوس کی قدیم ہیئت تمام علمی معاشروں پر حکم فرماتی تھی۔ لیکن قرآن مجید کی تعبیریں کسی بھی صورت میں قدیم ہیئت کے ساتھ سازگار نہیں ہیں۔ (جیسے ”جریان“ اور ”ساحت“ (تیرنا) وغیرہ کی تعبیریں جو مذکورہ بالا آیات میں مذکورہ ہیں) اور دورِ حاضر کی مسلم

[۱] ”عرجون“ ”انراج“ کے مادہ سے ہے جس کے معنی کچی ہیں۔ بعض نے اس کا معنی کھجور کا وہ خوشہ لیا ہے جس سے پھل چن لیا جائے اور وہ خالی رہ جائے۔ اور ”قدیم“ بمعنی کہنہ یعنی پرانا۔

[۲] لسان العرب اور مفردات راغب مادہ ”فلک“



علمی دریافتوں سے بھی ہم آہنگ ہیں (خوب غور کیجئے)

آٹھویں اور نویں آیت میں ایسی قسمیں بیان کی گئی ہیں جن سے غور و فکر کی دعوت کا اشارہ ملتا ہے۔ ایک جگہ فرماتا ہے ”مشرقوں اور مغربوں کے رب کی قسم“ (فَلَا أَقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ) ممکن ہے کہ ”مشرقوں اور مغربوں“ کی تعبیر سے مختلف ”مکانی“ مشرقوں اور مغربوں کی طرف اشارہ ہو کیونکہ زمین کا گول ہونا اور اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ اس کچھ کے جتنے بھی منطقتے ہیں، انکی اتنی ہی مشرقین اور مغربین ہوں۔ یا پھر اس کرہ کی ”زمانی“ مشرقوں اور مغربوں کی طرف اشارہ ہو۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ سورج کے گرد زمین کی حرکت اس بات کا سبب بن جاتی ہے کہ کبھی بھی دو دنوں میں سورج ایک جگہ اور ایک نقطہ سے طلوع اور غروب نہ کرے۔

مشرقوں اور مغربوں کا یہ فرق جو کائنات کے نہات ہی سچے تلے نظام کے ساتھ عمل میں آتا ہے، ایک طرف تو سال کے ”چار موسموں“ اور ان کی مخصوص برکتوں کی پیدائش کا سبب بنتا ہے، دوسری طرف سطح زمین پر سردی، گرمی اور رطوبت کے اعتدال کا موجب بھی ہوتا ہے اور انسانوں، حیوانوں اور نباتات کی زندگی کو رونق بھی عطا کرتا ہے۔ ان چیزوں میں سے ہر ایک خدا کی آیات میں سے ایک آیت اور نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

ایک اور جگہ چاند کی قسم کھاتا ہے اور رات کی جب وہ پشت پھیرے اور صبح کی جب وہ اپنا چہرہ ظاہر کرے۔ پھر فرماتا ہے کہ یہ سب خبریں معاد کے بارے میں خبردار کرنے کیلئے ہیں اور فرماتا ہے ”قیامت اور دوزخ کے ہولناک حوادث اہم مسائل میں سے ہیں“ (إِنَّهَا إِلَّا حُدَى الْكُفْرِ) [۱]

سورہ شمس کے آغاز میں بھی سورج اس کی جان پر ورشعاعوں اور چاند جب کہ سورج کے غروب ہونے پر ظاہر ہو، کی قسم کھائی گئی ہے [۲]

سب کو معلوم ہے کہ ہمیشہ قسم اس چیز کی کھائی جاتی ہے جس کی کوئی خاص اہمیت ہو۔ اگر یہ قسم کسی عظیم ہستی سے صادر ہو تو اس کی اہمیت کو چار چاند لگ جاتے ہیں اور اگر اہم موضوع کیلئے ہو تو اس کی عظمت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اب آپ ہی سوچئے کہ جب خداوند عالم معاد کے اہم ترین مسئلہ کیلئے سورج اور چاند کی قسم کھا رہا ہے تو ان تابناک ستاروں کی کتنی عظمت اور شان ہوگی، اور اس حقیقت کو واضح کیا جا رہا ہے کہ یہ دونوں قرآن کی نگاہ میں کس قدر اہم ہیں؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے مسئلہ قیامت کے اثبات اور آسمانی کواکب اور شب و روز کے حساب کیلئے کیوں قسم کھائی

[۱] حضرت فخر رازی کہتے ہیں کہ دوزخ کے سات طبقے ہیں جن کی ترتیب یہ ہے: جنیم، لظی، حطمہ، سعیر، سقر، حجیم اور ہادیہ (تفسیر فخر رازی جلد ۳۰ ص ۲۰۹)

[۲] بہت سے مفسرین اسے بدرکامل (چودھویں کے چاند) کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو سورج کے غروب ہوتے ہیں فوراً طلوع ہوتا ہے اور یہ چاند کا خوبصورت اور کامل ترین چہرہ ہوتا ہے۔

ہے، اس لئے کہ ان امور پر حکم فرما نظام اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ کائنات کا ایک ایک ذرہ حساب و کتاب کے تحت اپنے اپنے کام میں لگا ہوا ہے، لہذا یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ انسان جو کہ عالم ہستی کا گل سرسبد ہے، کے اعمال کا نہ تو کوئی حساب ہو اور نہ ہی کتاب؟ اس کے اعمال کیلئے نہ تو معاد ہو اور نہ ہی کوئی محکمہ عدالت؟

اسی سلسلے کی دسویں اور آخری آیت میں ستاروں کے وجود کی نعمت اور ان پر حکم فرما منظم اور دقیق نظام کا تذکرہ کیا ہے اور فرماتا ہے ”خداوند عالم تو وہی ہے جس نے تمہارے لئے ستاروں کو بنایا ہے تاکہ تم صحرا اور دریا کی تاریکیوں میں ان کے ذریعہ ہدایت پاسکو“ (وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ اللَّيْلِ وَالْيَوْمِ) پھر فرماتا ہے ”ہم نے اپنی نشانیاں ان لوگوں کیلئے تفصیل کے ساتھ بیان کر دی ہیں۔ جو عالم ہیں“ (قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ)

تاریخ بتاتی ہے کہ ہر دور میں انسان کے سفر کیلئے رات کی تاریکیوں میں آسمانی ستاروں نے اس کی بہت راہنمائی کی ہے اور ستاروں ہی کے ذریعہ سے انسان نے خشکی اور تری کے سفر کا میابی سے طے کئے ہیں۔ حتیٰ کہ بہت سے دانشور اس بات کے قائل ہیں کہ مہاجر پرندے یعنی جو پرندے بسا اوقات سال میں ہزار ہا کلومیٹر طے کرتے ہیں، جن میں سے کچھ پرندے تو ایسے بھی ہیں جو چوبیس گھنٹے کسی وقفہ کے بغیر محور پرواز ہوتے ہیں، وہ بھی اپنی راہوں کا پتہ دن میں سورج کے ذریعہ اور رات کو ستاروں کے ذریعہ لگاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہوں تو وہ عارضی طور پر اپنی پرواز کو موقوف کر دیتے ہیں۔ جب مطلع صاف ہو جاتا ہے اور بادل چھٹ جاتے ہیں تو وہ اڑائیں بھرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اور یہ بات بھی ہے کہ سال کے موسموں کو ستاروں کے ذریعہ بھی پہچانا جاسکتا ہے۔ بہر حال یہ آیت تمام صاحبان فکر و نظر کو اس نکتہ کی طرف متوجہ کر رہی ہے کہ ستاروں کی آسمان میں حرکت اور ان کی اس عظیم و وسیع و عریض میدان میں قرار گاہیں ایک مخصوص نظم اور نچے تلے حساب و کتاب کے پیش نظر ہیں، وگرنہ کوئی بھی شخص رات کی تاریکی میں ان کے ذریعہ راہ نہ پاسکتا۔

یہ نظام ظاہر کرتا ہے کہ اس کائنات کا سارا نظام ایک ایسے خالق کے ہاتھ میں ہے جو مدبر اور علیم ہے۔ اس طرح ہمارے آسمان پر موجود ستاروں کا نظام ہمیں شرک اور کفر کی تاریکیوں سے بھی نجات عطا کرتا ہے۔

علم ہیئت کی ترقی کے ساتھ ہی دانشوروں کو بہت سے آسمانی ستاروں کی رفتار، ان کے حجم، باہمی فاصلے اور دوسری بہت سی خصوصیات کا پتہ چلانے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے اس طرح وہ اس عظیم نظام کے تازہ حقائق تک پہنچنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آج نہایت ہی پیچیدہ، دقیق اور ظریف آلات و اوزار ایجاد ہو چکے ہیں، جن کے ذریعہ انسان بروجہ میں اپنی راہیں تلاش کر لیتا ہے، لیکن یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ تمام بری اور بحری مسافر ایسے آلات سے بہرہ ور نہیں ہیں۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ اگر کسی وقت ان آلات میں خرابی پیدا ہو جائے تو وہ گمراہی کا موجب بھی بن سکتے ہیں اور اگر انسان نجوم و کواکب کے نظام سے آگاہ ہو تو ان آلات کی وجہ سے حاصل ہو جانے والی گمراہی کی اصلاح بھی کر سکتا ہے۔

آیت بالا کی تفسیر میں روایات اہلبیت اطہار علیہم السلام سے ایک اور تفسیر بھی منقول ہے جو آیت کا باطنی اور ثانوی معنی شمار ہوتی ہے، وہ یہ کہ ”نجوم“ سے مراد ”خدا کی طرف سے مقرر کردہ رہبر“ اور معصوم پیشوا ہیں، لوگ جن کے ذریعہ زندگی کے تاریک بیابانوں میں گمراہی سے نجات حاصل کرتے ہیں، جیسا کہ تفسیر علی بن ابراہیم میں - ”وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ اللَّيْلِ وَالْبَحْرِ“ کے معنی کی وضاحت میں فرماتے ہیں - ”النُّجُومُ، آلُ مُحَمَّدٍ“ (ستارے، آل محمد ہیں)۔<sup>[۱]</sup> ان دونوں معانی کو آپس میں جمع کرنا بھی ممکن ہے، یعنی ستارے مادی بھی ہیں جو آسمانی ہیں اور معنوی بھی ہیں جو آل محمد ہیں۔ نجات ظاہری ہے جو خشکی اور تری میں ہوتی ہے اور باطنی بھی ہے جو قیامت میں نصیب ہوگی۔

## چند ضروری وضاحتیں

### ۱۔ سورج کیا ہے؟

اس وقت کڑھ خورشید ہمارے لئے تقریباً جانا بچانا کرہ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ سورج زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے۔ یعنی اگر سورج کا درمیان خالی ہوتا تو اس میں ہماری زمین کے کرہ جیسے تیر لاکھ کڑے سما جاتے۔ دماغ کو درط حیرت میں ڈال دینے والی اس کی یہ عظمت اس کے قطر کو دیکھ کر اور بھی واضح ہو جاتی ہے، جب کہا جاتا ہے کہ اس کا قطر تقریباً چودہ لاکھ کلومیٹر ہے۔ (ایک بلین چار سو ہزار کلومیٹر) اس کا ہماری زمین سے فاصلہ تقریباً ڈیڑھ سو بلین (پندرہ کروڑ) کلومیٹر ہے۔ اس کی روشنی تین سو ہزار (تین لاکھ) کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے ہم تک آٹھ منٹ میں پہنچتی ہے۔

سورج کا عظیم جرم اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ اشیا کا مخصوص وزن اس میں بہت ہی بھاری ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر کرہ زمین پر کسی شخص کا وزن ساٹھ کلوگرام ہے تو سطح خورشید پر اس کا وہی وزن پندرہ سو کلوگرام سے زیادہ ہو جائے گا۔ دانشوروں کا کہنا ہے کہ خورشید کا وزن دو بلین ضرب، بلین ضرب بلین ٹن ہے۔ (یعنی ۲) کے عدد سے پہلے ستائیس صفریں لگا دی جائیں اور جب سے اس نے موجودہ صورت اختیار کی ہے اس زمانے سے اب تک اس کی عمر کے بارے میں تخمینہ لگایا گیا ہے کہ پانچ بلین (پانچ ارب سال کا ہو چکا ہے۔

سورج کی کم از کم تین طرح کی حرکتیں ہیں:

(الف) اپنے محور کرگرد حرکت (جو تقریباً پچیس دن میں ایک مرتبہ مکمل ہوتی ہے)۔

(ب) کہکشاں کے مرکز اور دل میں رہ کر منظومہ شمسی کے ہمراہ ”الجائی“ فلک کی طرف حرکت جس کے تحت وہ ہر گھنٹے میں چھ سو کلومیٹر

سے زیادہ اپنی جگہ چھوڑ کر وہاں سے دوری اختیار کر رہا ہے۔

(ج) کہکشاں کے مرکز کے گرد حرکت، جس کے تحت وہ ہڑھائی سولین (ہیکس کروڑ) سال میں ایک مرتبہ اسے مکمل کرتا ہے۔ لیکن سورج کے مرکز اور سطح کی حرارت بہت عجیب ہے۔ سائنسدانوں نے جو حساب کیا ہے اس کے مطابق سطح خورشید کم از کم چھ ہزار (۶۰۰۰) سینٹی گریڈ ہے۔ یہ وہ درجہ حرارت ہے جسے روئے زمین کی کسی تجربہ گاہ میں اور نہ ہی کسی بھٹی میں وجود میں لایا گیا ہے۔ اس کی دلیل بھی واضح ہے، کیونکہ اس دنیا میں جس قدر بھی دیرپا مواد ہے یا اسے کسی بھٹی میں جلایا جاسکتا ہے وہ اس قسم کی حرارت میں صرف پگھل ہی نہیں جائے گا بلکہ بخارات میں تبدیل ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سطح خورشید پر جو بھی مواد موجود ہے وہ سارے کا سارا بخارات کی صورت میں ہے۔ اس سے بھی عجیب تر اس کے عمق کا درجہ حرارت ہے جو دو بلین (۲۰ لاکھ) سینٹی گریڈ سے بھی بڑھ کر ہے۔

سورج کی سطح سے ایسے شعلے بھی اٹھتے ہیں جن کی بلندی ایک سو ساٹھ ہزار (ایک لاکھ ساٹھ ہزار) کلومیٹر ہوتی ہے اور کہ زمین بڑی آسانی کے ساتھ ان میں گم ہو سکتا ہے (کیونکہ کہہ زمین کا قطر بارہ ہزار کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہے)۔

یہ حرارت ”جلنے“ سے عمل میں نہیں آتی۔ وگرنہ پیدائش و مرگ خورشید نامی کتاب میں ”جارج گاموف“ کے بقول اگر سورج کا بزم پتھر کے کونکہ سے بنا ہوتا تو چند ہزار سال کی مدت میں مکمل طور پر ختم ہو چکا ہوتا، اور راکھ کے سوا کچھ باقی نہ ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ سورج کے بارے میں ”جلنے“ کا مفہوم صادق نہیں آتا۔ اگر اس مفہوم کو بیان کرنا ہو تو ”ایٹمی تجزیوں سے حاصل شدہ توانائی“ سے ہی ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود سائنسدانوں کے حساب اور تجزیوں کے مطابق ہر ایک سیکنڈ میں سورج سے چار بلین (چالیس لاکھ) ٹن وزن کم ہو رہا ہے۔ یعنی اس کے ان ایٹموں کی مقدار توانائی میں تبدیل ہو رہی ہے۔ اگرچہ یہ چیز سورج کیلئے مختصر عرصے کیلئے تو زیادہ موثر نہیں ہے لیکن صاف سی بات ہے کہ طویل عرصے کے بعد اس کی نابودی کا سبب بن سکتی ہے۔ قرآن مجید نے اپنی آیات میں بڑی صراحت کے ساتھ کہا ہے:

”ایک دن یہ مہر درخشاں اور (نیرتاباں) بے نور ہو جائے گا۔“ [۱]

## ۲۔ سورج کی عظیم برکتیں

ہم اس آسانی بخڑے کے وجود کے فوائد اور انسان و دیگر زمینی مخلوق پر اس کے گہرے اثرات پر جس قدر تفصیل سے بحث کریں، پھر بھی ہم اس کو بہت کم کہیں گے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس بارے میں ایک بہت بڑی کتاب لکھی جاسکتی ہے جس کی فہرست کا کچھ حصہ یوں ہوگا۔

۱۔ سورج سے پیدا ہونے والی حرارت جو دن کو براہ راست ہم تک پہنچتی ہے اور رات کو زمین پر موجود اجسام میں ذخیرے کی صورت میں ہماری طرف لوٹتی ہے، وہ نباتات کی نشوونما اور حیوانات کی زندگی اور تحریک کیلئے موثر کردار ادا کرتی ہے۔

[۱] ”ساختمان خورشید“، ”نجوم بے تلسکوپ“، ”پیدائش و مرگ خورشید“، ”تاریخ علوم“، ”از جہانہائے دور“ اور ”اسلام و ہیبت“ نامی کتابوں سے اقتباس۔

۲۔ سورج ہمیشہ نہات ہی صحیح و سالم اور کسی معاوضہ کے بغیر ہمیں ایسی روشنی عطا کرتا رہتا ہے جو اس قدر گرم بھی نہیں ہوتی جو جلا کر بھسٹ کر دے اور اس قدر سرد بھی نہیں ہوتی جس میں روح نہ ہو۔ اگر سورج کی عطا کردہ روشنی اور حرارت کی قیمت ادا کرنا مقصود ہو کہ روزانہ جو روشنی اور حرارت زمین تک پہنچتی ہے ان کی معمولی ”بجلی“ کی قیمت کے مطابق قیمت لگائی جائے، تو ضروری بن جائے گا کہ روئے زمین پر رہنے والے تمام انسان اس کے ایک گھنٹے کا بل BILL ایک بلین سات سو ملین (ایک ارب ستر کروڑ) ڈالر فی گھنٹہ ادا کریں۔ آپ خود ہی اندازہ لگائیں کہ اس حساب سے ایک سال کا کیا بل بنے گا؟

بالفاظ دیگر اگر روئے زمین پر رہنے والے لوگ سورج کی حرارت کے برابر پتھر کا کونلہ جلا کر وہ حرارت خود ہی ایجاد کریں تو اس کیلئے سالانہ اکٹھ ہزار بلین (۶۱ ہزار ارب) ٹن کوئلے کی ضرورت ہوگی۔ گویا ہر شخص کیلئے سالانہ بیس ہزار ٹن کوئلے کی [۱] کس قدر سنگین خرچہ! ۳۔ ہم جانتے ہیں کہ سورج کی روشنی سات نوروں سے مرکب ہے جو ایک دوسرے میں ملے ہوئے ہیں جن کے مجموعہ سے سفید رنگ نمایاں اور تباہاں ہے۔ یہ نور نباتات میں بڑی حد تک مؤثر ہے اور ان کی کمک کرتا ہے جس سے کاربن ڈائی آکسائیڈ ہوا کو جذب کرتی ہے اور اس کے مقابلے میں ہمیں آکسیجن واپس دیتی ہے جو ہماری زندگی کا سرمایہ ہے اور کاربن نباتات کی پرورش اور نشوونما کیلئے ہے۔

ہم عام طور پر چیزوں کو ان کے رنگ سے پہچانتے ہیں اور یہ رنگ بطور کامل نور آفتاب کے پر تو ہی میں وجود میں آتے ہیں۔ کیونکہ ہر موجود اپنی بناوٹ کے لحاظ سے سورج کے رنگوں کا ایک حصہ اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ جو حصہ اپنے اندر جذب نہیں کرتا ہم اسے اسی رنگ کا نام دیتے ہیں۔ مثلاً ایک سبز پتہ، سورج کے تمام رنگ کو چوس کر اپنے اندر جذب کر لیتا ہے سوائے سبز رنگ کے۔ گویا نور خورشید تمام رنگوں کو وجود میں لاتا ہے۔

۴۔ ماورائے ہنقش شعاعیں جو خورشید کے پرتوں میں سے ایک ہیں۔ ۹۰ فیصد جراثیم تلف کرنے کے لئے مفید ہیں اور انٹی بیوٹک کا پورا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتیں تو کڑھ زمین ایک ہسپتال بن چکا ہوتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اسلام میں مطہرات میں سے ایک سورج کی براہ راست روشنی بھی ہے۔ (البتہ خاص شرائط کے ساتھ)۔

۵۔ سائنسدانوں نے بہت بڑے عدسوں کے ذریعہ سورج کی حرارت اور روشنی کو ایک جگہ اکٹھا کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے اور اس طرح بہت سی حرارت پیدا کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے ہیں وہ دن دو نہیں جب بہت بڑے صنعتی ادارے اور تنصیبات شمسی توانائی سے چلنے لگیں اور یہی توانائی گھریلو استعمال میں بجلی کی جگہ لے لے۔

۶۔ بادلوں کی پیدائش کا سبب یہ ہوتا ہے کہ دھوپ سمندروں کی سطح پر پڑتی ہے جس سے بخارات اٹھتے ہیں اور وہ بادلوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، پھر روئے زمین پر دھوپ ہی کی وجہ سے زمین کے منطقوں کے درجہ حرارت کے مختلف ہونے کی بناء پر ہوائیں بنتی ہیں جو بادلوں کو پیاسی زمینوں کی طرف لے جاتی ہیں، جن سے نزول باراں ہوتا ہے، یہ بھی سورج کے نور اور حرارت کی بدولت ہے۔

۷۔ آسمانی برجوں (فلکی صورتوں) میں سورج کی منظم حرکت اور اس کا حساب شدہ طلوع وغروب کا پروگرام جو سال کے دنوں میں دقیق اور منظم تفاوت کے ساتھ عمل میں آتا ہے، جس سے ایک تو چار موسم وجود میں آتے ہیں، دوسرے طرف تقویم اور منظم حساب کی پیدائش کا موجب ہوتی ہے انسان کی اجتماعی زندگی کیلئے نہایت ہی موثر ہے۔<sup>[۱]</sup>

### ۳۔ چاند اور اس کی برکتیں

سورج کی نسبت چاند ایک چھوٹا سا کرہ ہے جو سائنسدانوں کے بقول کرہ زمین سے ۴۹ گنا چھوٹا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی کشش کی توانائی زمین کی توانائی کشش کا چھٹا حصہ ہے۔ اس کا کرہ زمین سے فاصلہ تقریباً ۳۸ ہزار (۳ لاکھ ۴۸ ہزار) کلومیٹر ہے۔ اسی لئے اس کی روشنی ہم تک ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں پہنچ جاتی ہے۔

کرہ زمین کے گرد اس کی رفتار تقریباً ایک سیکنڈ فی کلومیٹر ہے اور اسی مدت کے دوران وہ اپنے گرد بھی ایک چکر لگاتا ہے، چونکہ یہ دونوں حرکتیں ہم آہنگ ہوتی ہیں، لہذا زمین کی طرف چاند کا رخ ہمیشہ ثابت ہوتا ہے۔ اگر آپ تعجب نہ کریں تو ہم آپ کو بتاتے چلیں کہ شب بدر (چودھویں رات کے چاند) کی روشنی اپنے کمال کی حدوں کو چھو رہی ہوتی ہے۔ اس وقت بھی سورج کی روشنی سے چار سو ساٹھ ہزار (چار لاکھ ساٹھ ہزار) گنا کم ہوتی ہے۔ لیکن یہی مختصر نور چاندنی راتوں کو روشن کرتا ہے اور ایسے پُرفروغ، زیبا اور دل انگیز چراغ کو وجود میں لاتا ہے جو نہایت ہی شاعرانہ اور دلپذیر ہوتا ہے۔

نہ صرف مندرجہ بالا آیت میں ہی چاند اور اس کی برکتوں اور فوائد کا تذکرہ ہے بلکہ قرآن مجید کی بہت سی آیات میں یہ ذکر ہے، نیز جن آیات میں اس کی قسم کھائی گئی ہے ان کی مجموعی تعداد ستائیس ہے۔ سات آیات میں چاند کی تسخیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور یہ کہ انسانی زندگی کیلئے اس تسخیر کے کیا فوائد ہیں۔ چاند کے فائدے اور اس کی برکتیں بھی بہت زیادہ ہیں جن میں سے چند ایک کی فہرست یہ ہے:

۱۔ زمین کے گرد چاند کی منظم گردش نہایت ہی دلکش طبعی تقویم کو وجود میں لاتی ہے جس کی تفصیل ہم گذشتہ تفسیری مباحث میں بیان کر چکے ہیں۔

۲۔ چاند کی ملائم روشنی اگرچہ رات کی تاریکی کو مکمل طور پر ختم تو نہیں کر سکتی (اور نہ ہی ختم کرنا چاہیے کیونکہ اس تاریکی کا بھی ایک نہایت اہم فلسفہ ہے) لیکن ایک قابل توجہ حد تک بہت سی راتوں میں انسان کی مدد کرتی ہے تاکہ وہ شہروں، جنگلوں اور سمندروں میں اپنی راہیں تلاش کرے۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ چاند کی روشنی اتنی آرام دہ اور ملائم ہے کہ انسان اور دوسری چیزوں کی نیند و آرام میں بھی خلل نہیں ڈالتی، بلکہ اس روشنی میں انسان ایک خاص قسم کا سکون محسوس کرتا ہے۔

[۱] جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ ان امور کا اصل حامل سورج کے گرد زمین کی انتقالی حرکت ہے، لیکن چونکہ ظاہر میں سورج کی حرکت کی وجہ سے عمل میں آتی ہے، قرآن مجید

نے سورج اور چاند دونوں کو ”حسان“ (نظم و حساب کا ذریعہ) بتایا ہے۔ سورہ انعام/ ۹۶



مہینے کی چابی قرار دیا ہے۔۔۔۔۔ [۱]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام مفضل کی روایت میں فرماتے ہیں:

”اے مفضل! تم ذرا سورج کے طلوع و غروب کے بارے میں غور کرو کہ خداوند عالم روز و شب کی حاکمیت کو اسی کے ذریعہ قرار کرتا ہے۔ اگر سورج کا طلوع کرنا نہ ہوتا تو دنیا کے تمام کام ٹھپ ہو کر رہ جاتے، لوگ نہ تو اپنے معاشی امور کو سنبھال سکتے اور نہ ہی اپنے دوسرے کام انجام دے سکتے۔ دنیا ان کیلئے تاریک اور زندگی نور خورشید اور اس کے آثار نہ ہونے کی وجہ سے تلخ اور ناگوار ہو جاتی۔ غرض طلوع آفتاب کے فوائد آشکار بھی ہیں اور توضیح و تشریح سے بے نیاز بھی! اب ذرا اس کے غروب کے فوائد پر غور کرو۔ اگر غروب آفتاب نہ ہوتا تو لوگوں کا آرام و سکون غارت ہو جاتا، حالانکہ انسان کو جسم کی آسائش اور روح کے آرام کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔۔۔“

پھر سورج کی بلندی اور پستی کے بارے میں سوچو جو چار موسموں کی پیدائش کا سبب ہوتی ہے۔۔۔۔۔ اسی طرح سالانہ دورانہ مکمل کرنے کیلئے خورشید کے بارہ برجوں میں منتقل ہونے کے بارے میں سوچو۔۔۔۔۔ آفتاب کی یہ تبدیلی میووں اور غلات کے پکنے کا موجب ہے اور نباتات کی نشوونما کے آغاز کا سبب بنتی ہے۔۔۔۔۔ اس دنیا میں سورج کے طلوع کی کیفیت کو دیکھو کہ خدا نے اس کیلئے کیا کیا پروگرام ترتیب دیئے ہیں کیونکہ اگر یہ سیارہ کسی ایک جگہ پر رکا رہتا تو اس کی شعاعیں زیادہ جگہوں تک ہرگز نہ پہنچ سکتیں جن سے تمام مخلوق بہرہ مند ہوتی۔

کیا لوگ نہیں دیکھتے کہ یہ اہم امور کیونکر انجام پاتے ہیں اور جن امور میں دنیا کے لوگوں کا فائدہ و بقاء ہے ان میں کسی قسم کے ناموزونیت و نافرمانی نہیں پائی جاتی۔

چاند کے ذریعہ بھی خدا کو پہچانو! کیونکہ لوگ ایک مخصوص نظم کے تحت مہینوں کو پہچانتے اور سالوں کا حساب کرتے ہیں۔۔۔۔۔ ذرا دیکھو تو سہی کہ وہ تاریک راتوں کو کیسے منور کرتا ہے اور اس میں کیا کیا فوائد مضمحل ہیں؟ کیونکہ باوجودیکہ لوگوں کو سکون اور آرام کیلئے رات کی خنکی اور تاریکی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن مصلحت کا بھی تقاضا نہیں ہے کہ تمام راتیں مکمل طور پر تاریک رہیں کہ جن میں دوسرے کوئی بھی کام انجام نہ دیا جاسکے۔ بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وقت کی تنگی یا دن میں ہوا کی گرمی کی وجہ سے جو کام دن میں انجام نہیں دے پاتے وہ رات کو انجام دیتے ہیں یہ کام بعض اوقات چاند کی روشنی میں بھی انجام پاتا ہے۔ اور تمام راتوں میں روشنی ایک جیسی نہیں ہوتی یا سورج کی روشنی سے کم ہوتی ہے اس لئے کہ لوگ مکمل طور پر اپنے کاموں کا پروگرام راتوں کو مقرر نہ کر لیں اور جو سکون مقصود ہے وہ ضائع نہ ہو جائے۔ [۲]

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

[۱] بحار الانوار جلد ۵ ص ۸۷۱ حدیث ۳۶

[۲] بحار الانوار جلد ۵ ص ۸۷۱ حدیث ۳۵ (قدرے تلخیص کے ساتھ)



## ۹۔ رات اور دن کی پیدائش میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں

اشارہ:

اگرچہ رات اور دن ایسی چیزیں ہیں جو اپنے وجود کیلئے آفتاب کے نور اور زمین کی حرکت کی مرہون منت ہیں اور انہی کی برکتوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ قرآن مجید نے اپنی توحید آیات میں ان دونوں پر اپنی خصوصی توجہ مبذول فرمائی ہے اور بہت سی آیات میں ان پر تاکید کی ہے، لہذا ضروری بن جاتا ہے کہ ان پر جداگانہ بحث کی جائے تاکہ اس بے نشان کی نشانیاں ان میں تلاش کر سکیں، کائنات کے خالق اور پروردگار سے زیادہ سے زیادہ آشنائی حاصل کر سکیں اور اسی سے محبت کر کے اس کے درآستان پر جہ سائی کریں۔ تو آئیے سب سے پہلے مندرجہ ذیل بارہ آیات کو گوش جان سے سنتے ہیں:

۱۔۔۔ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ

(انبیاء/ ۳۳)

۲۔۔۔ يُقَلِّبُ اللَّهُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ

(نور/ ۴۴)

۳۔۔۔ هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ

(یونس/ ۶۷)

۴۔۔۔ وَمِنْ آيَاتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ

(حم السجدة/ ۳۷)

۵۔۔۔ وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَاتَيْنِ فَمَحْوَنًا آيَةَ اللَّيْلِ وَجَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابِ

(بنی اسرائیل/ ۱۲)

۶۔۔۔ وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا { } وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا

(نہاء/ ۱۰-۱۱)

۷۔۔۔ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنۢ أَرَادَ أَنۢ يَّدَّكَرَ أَوْ أَرَادَ شُكُورًا  
(فرقان/۶۲)

۸۔۔۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ

(نحل/۱۲)

۹۔۔۔ إِنَّ فِيۓ اٰخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ  
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ

(يونس/۶)

۱۰۔۔۔ قُلۡ اَرَاۤءَيْتُمْ اِنۡ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيۡكُمُ اللَّيْلَ سَرۡمَدًا اِلَىۤ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنۢ  
اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يٰۤاَتِيۡكُمۡ بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۙ قُلۡ اَرَاۤءَيْتُمْ اِنۡ جَعَلَ اللّٰهُ  
عَلَيۡكُمُ النَّهَارَ سَرۡمَدًا اِلَىۤ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنۢ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يٰۤاَتِيۡكُمۡ بِلَيۡلٍ  
تَسْكُنُوْنَ فِيۡهٖ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوْنَ ۙ وَمَنۢ رَّحِمۡتَهٗ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ  
لِتَسْكُنُوْا فِيۡهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنۢ فَضۡلِهٖ وَلَعَلَّكُمۡ تَشْكُرُوْنَ ۙ

(نقص/۷۱-۷۳)

۱۱۔۔۔ وَاللَّيْلِ اِذَا يَغۡشٰى { وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلَّى

(الليل/۲-۱)

۱۲۔۔۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوۡجِبُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُۡوۡجِبُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ  
سَمِيعٌ بَصِيۡرٌ

(حج/۶۱)

ترجمہ

۱۔۔۔ وہ وہی ہے جس نے رات، دن، سورج اور چاند کو پیدا کیا ہے۔

- ۲۔۔۔ خدایہی رات اور دن کو الٹ پھیر کرتا رہتا ہے، بے شک اس میں صاحبان بصیرت کیلئے عبرت ہے۔
- ۳۔۔۔ وہ وہی ہے جس نے رات کو تمہارے لئے پیدا کیا ہے تاکہ تم اس میں آرام کر سکو اور ان کو روشنی عطا کرنے والا بنایا ہے، اس میں ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو سنتے ہیں۔
- ۴۔۔۔ اس کی نشانیوں میں سے رات، دن، سورج اور چاند ہیں۔
- ۵۔۔۔ ہم نے رات اور دن کو (اپنی توحید اور عظمت کی) دونشانیاں قرار دیا ہے، پھر رات کی نشانی کو مٹا کر روشنی کی نشانی کو روشنی عطا کرنے والا بنایا، تاکہ تم (اس کے اٹھ کھڑے ہو) اور برسوں کی گنتی اور حساب کو جانو۔
- ۶۔۔۔ اور ہم نے (تمہارے لئے) رات کو پردہ اور دن کو تمہاری زندگی اور معاش کا ذریعہ بنایا ہے۔
- ۷۔۔۔ وہ وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین قرار دیا ہے، ان لوگوں کیلئے نصیحت حاصل کرنا چاہتے ہیں، یا شکرگزاری کرنا چاہتے ہیں۔
- ۸۔۔۔ اس نے تمہارے لئے رات اور دن مسخر کر دیا ہے۔
- ۹۔۔۔ یقیناً رات اور دن کے آنے جانے میں اور ان چیزوں میں جنہیں خدا نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے ان لوگوں کیلئے آیات (اور نشانیاں) ہیں جو پرہیزگار ہیں۔
- ۱۰۔۔۔ کہہ دیجئے کہ مجھے بتاؤ اگر خداوند عالم رات کو تمہارے لئے قیامت کے دن تک جادوانی قرار دے دیتا تو خدا کے علاوہ کوئی اور معبود تمہارے لئے روشنی لاسکتا؟ کیا تم سنتے نہیں ہو۔۔۔۔۔ کہہ دیجئے کہ مجھے بتاؤ اگر خدا قیامت تک برابر تمہارے سروں پر دن کئے رہتا تو خدا کے علاوہ کون معبود ہے جو تمہارے لئے رات لے آتا کہ جس میں تم آرام کرو؟ آیا دیکھتے نہیں ہو؟ اس کی مہربانی ہے کہ اس نے تمہارے لئے رات اور دن کو بنایا ہے تاکہ تم اس میں آرام کرو اور فضل خدا سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو، شاید اس کی نعمت کا شکر بجالاؤ۔
- ۱۱۔۔۔ رات کی قسم جب وہ دنیا پر چھا جائے۔۔۔۔۔ اور دن کی قسم جب وہ خوب روشن ہو۔
- ۱۲۔۔۔ یہ اس لئے ہے کہ خداوند عالم رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور خدا سننے اور دیکھنے والا ہے۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### شب و روز کا عجیب نظام

قرآن مجید میں ستر سے زائد مرتبہ ”لیل“ (رات) کا لفظ اور پچاس سے زائد مرتبہ ”نہار“ (دن) کا لفظ دہرایا گیا ہے جن میں سے مذکورہ بالا بارہ آیات ایک نمونہ ہیں۔ اور ان میں لیل و نہار کی تخلیق کو تو حید نقطہ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔

اسی سلسلے کی سب سے پہلی آیت میں شب و روز اور شمس و قمر کی اصل تخلیق کو بیان کیا گیا ہے جو تو حید اور خدا شناسی کی راہوں کے راہی ہیں ان کیلئے ایک دلیل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ”وہ وہی ہے جس نے رات اور دن کو پیدا کیا ہے۔“ (وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ) یہ چیز دوسری صورت میں اسی سلسلے کی چوتھی آیت میں بھی ذکر ہوئی ہے، فرماتا ہے ”اس کی نشانیوں میں سے رات، دن اور سورج اور چاند ہیں۔“ (وَمِنْ آيَاتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ)

جب کہ دوسری آیت میں خدا کے حکم سے رات اور دن کے الٹ پھیر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور اسے صاحبان بصیرت کیلئے عبرت قرار دیا گیا ہے۔ (يُقَلِّبُ اللَّهُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ)

تبدیلی کا یہ اشارہ ممکن ہے کہ رات اور دن کے آنے جانے کی طرف ہو یا پھر ان کے وقت کے کم اور زیادہ ہونے کی طرف ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سردی اور گرمی کے دنوں میں ان میں جو تفاوت رونما ہوتا ہے، اس کی طرف اشارہ ہو۔<sup>[۱]</sup> لیکن اس بات میں بھی کوئی حرج نہیں کہ رات اور دن کا یہ ہیر پھیر ان سب معانی کو شامل ہو۔

تیسری آیت میں ”شب“ و ”روز“ کے ایک نہات ہی اہم فائدے پر زور دے کر کہتا ہے کہ ”خداوند عالم تو وہ ہے جس نے رات کو تمہارے سکون کیلئے بنایا ہے اور دن کو روشنی دینے کیلئے۔“ (هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا) واضح سی بات ہے کہ رات کی تاریکی میں آرام و سکون خداوند متعال کی ایک اہم ترین نعمت ہے جس طرح کہ دن کی روشنی مختلف سرگرمیوں کیلئے ایک اور اہم نعمت ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس آیت میں لفظ ”مبصر“ استعمال کیا گیا ہے جس کا اصل معنی ہے۔ ”بینا“ (دیکھنے والا) اور سب کو معلوم ہے کہ دن خود تو نہیں دیکھتا، بلکہ وہ دوسروں کی بینائی کا سبب بنتا ہے لہذا اسے ”مبصر“ کہا گیا ہے۔ یہ تعبیر شاید تاکید اور مبالغے کے عنوان کے تحت اس پر اطلاق ہوئی ہے۔

[۱] یہ تینوں احتمالات تفسیر روح المعانی جلد ۱۸ ص ۱۷۳ اور تفسیر فخر رازی جلد ۲۴ ص ۲۵ میں ذکر ہو چکے ہیں جب کہ تفسیر مجمع البیان نے صرف پہلی اور دوسری

تفسیر کو ذکر کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو جلد ۷ ص ۱۳۸)

یہ ہے بھی حقیقت کہ اگر نور اور روشنائی کی چمک نہ ہو تو ہزاروں بیجا آنکھیں بھی بیکار ہیں، اسی لئے آیت کے آخر میں فرماتا ہے ”اس بارے میں ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جن کے کان ہیں اور وہ سنتے ہیں“ اور سن کر ان کے بارے میں غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ (اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّبِعُوْنَ)

پانچویں آیت میں شب و روز میں سے ہر ایک کو آیات الہی میں سے ایک آیت کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ”ہم نے رات کی آیت کو مٹا کر دن کی آیت کو روشنی عطا کرنے والا بنایا“۔ پھر اس کے دو اہم فوائد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ”مقصود یہ ہے کہ اس کے پرتو میں تم زندگی کی تلاش میں کھڑے ہو جاؤ اور خداوند عالم کے فضل سے بہرہ مند ہوتے رہو اور سالوں کی تعداد اور حساب کو جانو“۔ (لَتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِّيْنَ وَالْحِسَابِ)

کیا خداوند عالم کے فضل و کرم سے بہرہ برداری کا تعلق صرف دن سے ہوتا ہے اور سال اور ماہ کے حساب کا جاننا رات اور دن دونوں کے آثار میں سے ہے یا نہیں بلکہ دونوں کا رات اور دن سے قریبی تعلق ہے؟ کیونکہ رات کا سکون اور آرام دن میں کام کرنے اور خداوند عالم کے فضل و کرم سے بہرہ حاصل کرنے کیلئے یقیناً مؤثر ہوتا ہے۔ دوسرے معنی آیت کی ہم آہنگی کے پیش نظر زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں، ہر چند کہ کچھ مفسرین نے پہلے معنی کو ہی ذکر کیا ہے۔

چھٹی آیت میں یہی چیز ایک اور صورت میں توجہ کو مبذول کر رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ”ہم نے رات کو لباس اور پردہ بنایا ہے اور دن کو معاش“ (وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا ۗ وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا)

”معاش“ ممکن ہے کہ اسم زمان ہو یا اسم مکان ہو اور پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصدر میسی ہو۔ اور یہی معنی مناسب ہیں۔ [۱] ”رات“ کے بارے میں ”لباس“ کی تعبیر نہایت ہی عمدہ اور پرکشش ہے کیونکہ رات اس نیم کرہ ارضی کیلئے ایک پردہ کی حیثیت رکھتی ہے یا انسانوں کیلئے پردہ پوشی کا کام دیتی ہے، جس طرح کہ لباس، انسانی جسم کو مختلف قسم کی تکلیفوں سے بچاتا ہے اور اسے خوبصورتی عطا کرتا ہے اسی طرح رات کی تاریکی اور گہری نیند جو رات کی برکت سے حاصل ہوتی ہے انسانی جسم کو خوشحال اور سرور عطا کرتی ہے اور اسے مختلف بیماریوں سے بچاتی ہے۔ ساتویں آیت میں رات اور دن کے ایک دوسرے کا جانشین ہونے کا تذکرہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ ”خدا وہ ہے جو ان دونوں کو ایک دوسرے کا جانشین بناتا ہے۔“ (وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً)

”خلفہ“ (بروزن فتنہ) ”مفردات“ میں ”راغب“ کے بقول وہاں پر استعمال ہوتا ہے جہاں پر دو چیزیں ہمیشہ ایک دوسرے کا جانشین ہوتی رہتی ہوں۔ لیکن ”فیروز آبادی“ اپنی کتاب ”قاموس اللغۃ“ میں کہتے ہیں کہ ”خلفہ، مختلف کے معنی میں ہے۔ پہلی صورت میں شب و روز کا باری باری آنا مد نظر رکھا گیا ہے کیونکہ اگر ان کا باری باری ایک دوسرے کے بعد آنا نہ ہوتا تو زمین پر موجود تمام چیزیں سورج کی

[۱] بعض مفسرین کہتے ہیں کہ دن کے ساتھ ”معاش“ (زندگی) کا ذکر اس لئے ہے۔ کہ رات کی نیند موت کی مانند ہوتی ہے جیسا کہ مشہور مثال ہے کہ ”نیند موت کی بہن ہے“ اس لئے اس کا مقابل نقطہ جو کہ دن ہے وہ بیداری اور حیات کا موجب ہوتا ہے (حیات و زندگی اپنے تمام آثار کے ساتھ)

تمازت کی شدت کی وجہ سے جل کر بھسم ہو جائیں یا پھر رات کی شدت سرما کی وجہ سے منجمد ہو کر رہ جاتیں۔ جب کہ دوسری صورت میں شب و روز کا باہمی فرق اور سال کے چار مختلف موسموں کی طرف اشارہ ہے جن کے واضح اور مخصوص آثار انسانی زندگی میں ملتے ہیں۔ بعض مفسرین نے پہلے معنی کو لیا ہے جب کہ بعض حضرات نے دوسرے معنی کو اختیار کیا ہے۔ لیکن اگر دونوں معانی کو آپس میں جمع کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

اسلامی روایات میں آیا ہے کہ انسان کی وہ عبادتیں جو وہ رات میں نہیں بجالا سکا، دن کو ان کی قضا بجالا سکتا ہے (یا اس کے برعکس) اور شاہد کے طور پر یہی آیت لائی گئی ہے۔<sup>[۱]</sup>

یہ تفسیر بھی مذکورہ بالا تفاسیر سے نہیں ٹکراتی کیونکہ اس میں بھی ایک خاص نظام اور شب و روز کے باری باری آنے کی طرف اشارہ ہے جس میں خداوند قادر و قدیر کے بے پناہ علم اور قدرت کی حکایت کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کرہ زمین کی حرکت اپنے محور کے گرد کرہ زمین کی حرکت موجودہ صورت سے زیادہ تیز یا زیادہ سست ہوتی تو ممکن تھا کہ دن یا راتیں اس قدر طولانی ہوتیں کہ روئے زمین کی تمام مخلوق، حتیٰ کہ انسانوں تک کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔

آٹھویں آیت میں شب و روز کی تسخیر کا ذکر ہے اور ان کے انسانی خدمت گار ہونے کا بیان ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ”خداوند عالم نے رات اور دن کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔“ (وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ)

چونکہ تسخیر کی تشریح اس سے ملتی جلتی آیات میں بیان ہو چکی ہے، دوبارہ لکھنے ضرورت نہیں ہے۔

نویں آیت میں پہلے تو رات اور دن کے اختلاف کو خدا کی نشانی بتایا گیا ہے۔ پھر تمام ان مخلوقات کو اس کی قدرت علم اور عظمت کی نشانیاں قرار دیا گیا ہے جو خدا نے زمین و آسمان میں پیدا کی ہیں۔ (إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْتَقُونَ)

اس تعبیر سے پتہ چلتا ہے کہ ان دو کی تخلیق کس حد اہم ہے۔

ان آیات کے دسویں حصے میں تین آیات میں رات اور دن کے اہم فوائد کو نہایت خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ”اے پیغمبر! آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر خداوند عالم رات کو قیامت تک طولانی کر دیتا تو اس کے بغیر کوئی اور ہے جو تمہارے لئے نور اور روشنی لے آتا کہ تم اس کے فوائد اور برکات سے بہرہ مند ہوتے؟ یا اگر خدا دن کو اسی قدر طولانی بنا دیتا تو خدا کے علاوہ کوئی اور ہے جو تمہارے لئے رات کی تاریکی خلق کرتا، جو تمہارے لئے آرام و سکون کا باعث ہوتی؟ یہ خدا ہی تو ہے جس نے اپنی رحمت کی بدولت شب و روز اور نور و ظلمت کو مقرر فرمایا ہے جس سے تم ایک تو ضروری آرام و سکون حاصل کرتے ہو اور دوسرے زندگی کی سرگرمیاں خداوند عالم کے فضل و کرم

[۱] یہ تفسیر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں بیان ہوئی ہے (جیسا کہ تفسیر رازی میں ہے) اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں آئی ہے۔ (جیسا کہ تفسیر نور الثقلین

کے حصول کیلئے جاری رکھتے ہوتا کہ یہ عظیم نعمتیں تمہاری شکرگزاری کی حس کو بیدار کریں اور تم خالق کی تلاش کو نکلو!  
قابل توجہ یہ بات ہے کہ ایک آیت کے ذیل میں تو فرماتا ہے۔ ”أَفَلَا تَسْمَعُونَ“ (کیا تم سنتے نہیں؟) اور دوسری کے ذیل میں فرماتا ہے ”أَفَلَا تُبْصِرُونَ“ (کیا تم دیکھتے نہیں؟)

شاید ان عبارتوں کے ذریعہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ شب و روز کے اس دقیق نظام میں حسی دلائل بھی موجود ہیں، جو آنکھ سے دیکھے جاسکتے ہیں نقلی دلائل بھی موجود ہیں جو کان سے سنے جاسکتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ رات کے سردی ہونے کے بارے میں ”کیا تم نہیں سنتے؟“ کہا گیا ہے اور دن کے جاودانی ہونے کے بارے میں ”کیا دیکھتے نہیں؟“ کی تعبیر کو استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ عام طور پر تاریکی میں کان کام کرتے ہیں اور روشنی میں آنکھیں بیشتر کام کرتی ہے۔

شب و روز کے موضوع کی اہمیت تو اس حد تک ہے کہ قرآن مجید نے متعدد آیات میں ان دونوں کی قسم کھائی ہے۔ محمدان آیات کے اسی سلسلے کی گیارہویں آیت میں فرماتا ہے: ”رات کی قسم جب وہ تمام چیزوں کو ڈھانپ لے اور دن کی قسم جب وہ جلوہ گر ہو جائے۔“ (اس کا زندگی بخشنے والا نور، اس دنیائے حیات میں مختلف برکتوں سمیت، بیداری کی گھنٹی بجاتا ہے) ”وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ“ یہی چیز ایک اور آیت میں دوسری تعبیر کے ساتھ آئی ہے ارشاد ہوتا ہے:

”وَاللَّيْلِ إِذَا تَجَلَّىٰ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ“ رات کی قسم جب وہ پیٹھ پھیر لے (اور روشنی کی طرف رخ کرے) اور دن کی قسم جب اپنا چہرہ ظاہر کرے (اور اپنی روشنی کے ساتھ مسکرائے) (مدثر/۳۳-۳۴)

ایک اور جگہ پر فرماتا ہے:

”وَاللَّيْلِ إِذَا عَسَسَ وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ“ رات کی قسم جب وہ پیٹھ پھیر کر اپنی آخری حد تک جا پہنچے اور دن کی قسم جب وہ سانس لے (اور اپنی گہری سانسوں کے ساتھ تمام موجودات کے ڈھانچے میں روح پھونک دے) (سورہ تکوین/۱۷)

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

”وَالصُّبْحِ وَاللَّيْلِ إِذَا سَبَّحَ“ دن کی قسم جب آفتاب اوپر جائے اور رات کی قسم جب وہ آرام میں ہو۔ (اور سکون عطا کرے) (ضحیٰ/۱-۲)

اس کے علاوہ اور بھی کئی قسم کی قسمیں ہیں جو ایک بہت بڑی اہمیت کی نشاندہی کر رہی ہیں اور بتا رہی ہیں کہ قرآن رات اور دن کی اہمیت کا کس حد تک قائل ہے، تاکہ لوگ اس بارے میں زیادہ سے زیادہ غور و فکر کریں اور خداوند عالم کی نشانیوں کا ان دونوں کے چپے چپے میں نظارہ کریں، کیونکہ قسم ہمیشہ کسی چیز کی اہمیت کی دلیل اور غور و فکر کرنے کا سبب ہوتی ہے۔

اسی سلسلے کی بارہویں اور آخری آیت میں ہم اس بارے میں ایک نئی تعبیر کا سامنا کر رہے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ”یہ سب اس لئے ہے کہ خداوند عالم رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں۔“ (ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ يُرِجُّ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُورِجُّ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ)

”یورج“، ”ایلاج“ کے مادہ سے ہے جس نے معنی میں داخل کرنا۔ اور چونکہ یہ فعل مضارع کا صیغہ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ فعل

مضارع استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ جو ممکن ہے کہ سال کے مختلف موسموں میں دن رات کے تدریجی اور منظم طریقے سے کم اور زیادہ ہونے کی طرف اشارہ ہو کہ ان میں سے ایک سے کم اور دوسرے میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ تدریجی نظام نباتات کی پرورش اور زندہ موجودات کے ارتقاء کیلئے ایک موثر عامل ہے اگر یہ چیز ناگہانی صورت میں عمل پذیر ہوتی تو تمام موجودات کا توازن بگڑ جاتا اور اس سے زبردست نقصان ہوتا۔ اسی لئے خداوند عالم یہ کام تدریجی طور پر عمل میں لاتا ہے۔

نیز یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سورج کے طلوع و غروب کی طرف اشارہ ہو کیونکہ جب سورج طلوع کرنے کے قریب ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس کی کرنیں فضا کے بالائی حصہ کو روشن کرتی ہیں جس سے یہ فضا قدرے روشن ہوتی ہے۔ سورج جس قدر افق کی پشت سے اوپر آتا جائے گا اسی قدر یہ روشنی بھی بڑھتی جائے، اور پھر وقت غروب، رات یک دم ہی نہیں آجاتی بلکہ سورج کی کرنیں آہستہ آہستہ فضا کے نچلے حصے سے سمٹنا شروع ہو جاتی ہیں۔ تاریکی ان کی جگہ لینا شروع کر دیتی ہے اور یہ تدریجی تبدیلی جو نور سے ظلمت میں اور ظلمت سے نور میں عمل میں آتی ہے، اس بات کا باعث بنتی ہے کہ انسان جسمانی اور روحانی لحاظ سے اس سے ہم آہنگ ہو جائے۔ اگر رات یا دن یک دم رونما ہو جاتے تو یقیناً اس کے نتائج بہت بُرے نکلتے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت کا ظاہر یہ بتا رہا ہے کہ رات کا دن میں داخل ہونا اور دن کا رات میں داخل ہونا ایک ہی وقت میں عمل میں آتا ہے۔ درحقیقت ہے بھی ایسا ہی کیونکہ خط استواء کے شمالی علاقوں میں گرمیوں کے موسم میں رات بتدریج کم ہو کر دن کا حصہ بنتی جاتی ہے، یعنی ”يُوجِبُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ“ کا مصداق ہوتی ہے۔ انہی اوقات میں خط استواء کے نیچے کے حصے میں دن کم ہو کر رات کا حصہ بنتے جاتے ہیں جو ”يُوجِبُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ“ کا مصداق ہوتے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

”توحید مفضل“ والی معروف حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

”اے مفضل! رات اور دن کے ایک دوسرے میں تدریجی طور پر داخل ہونے میں اچھی طرح غور کرو۔۔۔۔۔ اگر ایک کا دوسرے میں یکبارگی داخل ہونا ہوتا تو اس سے جسم کو نقصان پہنچتا، جس سے لوگ بیمار ہو جاتے، بالکل ویسے ہی جیسے تم میں سے کوئی شخص یکدم گرم حمام سے باہر نکل کر بالکل ٹھنڈی جگہ پہنچ جائے، یقیناً اس سے اسے نقصان پہنچے گا اور وہ بیمار ہو جائے گا۔۔۔۔۔ اگر اس بارے میں خدائی تدبیر نہ ہوتی، تو یہ تبدیلی ایسی صورت میں کیونکر رونما ہوتی کہ جس سے انسان کی صحت و سلامتی برقرار رہ جائے۔“<sup>[۲]</sup>

[۱] طریقی نے مجمع البیان میں ”وج“ کے مادہ میں اسی نکتہ کی طرف توجہ مبذول کی ہے۔

[۲] بحار جلد ۳ ص ۸۱۱



## چند ضروری وضاحتیں

### ۱۔ نور اور ظلمت کی اہمیت۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ شب و روز کے فوائد

ہم مندرجہ بالا آیت میں دیکھ چکے ہیں کہ خداوند عالم انسانوں کو کیونکر ان دو موجودات جو بظاہر سادہ ہیں، مطالعہ کی دعوت دیتا ہے اور انہیں اپنی آیات میں شمار کرتا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ اس بارے میں ہم جس قدر بھی غور کریں نئے نکات تک جا پہنچیں گے۔

۱۔ ہم جانتے ہیں کہ کائنات کے مختلف حصوں کے شب و روز میں یقیناً بہت فرق ہے۔ خط استواء کے علاقوں میں رات بھی بارہ گھنٹے کی ہوتی ہے اور دن بھی بارہ گھنٹے کا۔ لیکن قطبی منطقے میں ۹۰ درجے کے مدار میں تمام سال ایک دن رات سے زیادہ نہیں ہے۔ جن میں سے ہر ایک تقریباً چھ ماہ کا ہوتا ہے (البتہ ایسے منطقوں میں عموماً آبادی اور سکونت نہیں ہوتی) اور کائنات کے دیگر حصوں میں ان دونوں کے درمیان مراحل تشکیل پاتے ہیں۔

لیکن تعجب تو اس بات پر ہوتا ہے کہ اس قدر فرق کے باوجود روئے زمین کے تمام نقاط سال بھر میں سورج کی روشنی سے ایک جیسا استفادہ کرتے ہیں اور یہ ایک نہایت ہی منصفانہ اور عادلانہ نظام ہے۔

۲۔ ہمیشہ گرمیوں کے موسم میں دن لمبے ہوتے ہیں اور سردیوں میں راتیں طولانی ہوتی ہیں، یعنی دو باتیں بیک وقت ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلتی ہیں۔ دنوں کی لمبائی اور دھوپ کا عمودی (یا قائل بہ عمودی) پڑنا اور یہ دونوں اثر ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں جن سے میوے اور غلہ و نباتات پک جاتے ہیں اور ہوا گرم ہو جاتی ہے۔ موسم سرما میں زیادہ سردی درختوں اور دانوں کے نیند میں چلے جانے کا موجب ہوتی ہے اور مزید ارباب یہ ہے کہ استوائی علاقوں میں جہاں پر دھوپ پوری طرح عمودی پڑتی ہے دن زیادہ طولانی نہیں ہوتے وگرنہ گرمی لگنے اور نباتات کے جلنے کا اندیشہ تھا۔

۳۔ ہمیشہ سورج کی روشنی بیداری، ہوشیاری، تحرک اور جوش و خروش کا سبب ہوتی ہے جب کہ اس کے برعکس تاریکی آرام و سکون اور نیند کا موجب۔ خاص کر حیوانات کی دنیا میں یہ چیز واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ کیونکہ پرندے صبح صادق کے طلوع کے ساتھ ہی بیدار ہو کر صحرا کا رخ کرتے ہیں، اور غروب آفتاب کے ساتھ ہی اپنے اپنے آشیانوں کو واپس لوٹ آتے ہیں اور رات کو آرام کرتے ہیں۔ دیہاتوں کے جہاں کے اکثر لوگ صبح و سالم اور طبعی زندگی کے حامل ہوتے ہیں ان کا بھی ایسا ہی پروگرام ہوتا ہے، جب کہ مشینی تمدن کی ترقی کی وجہ سے اور مصنوعی روشنیوں کی ایجاد کے سبب بہت سے لوگ رات کا کافی حصہ جاگتے اور دن کے بہت سے حصے میں سوتے رہتے ہیں۔ یہ چیز بہت سی بیماری کا عامل ہوتی ہے۔ قرآن مجید سورہ یونس کی ۶۷ ویں آیت میں ”هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ اللَّيْلَ لَتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا“ (وہ ذات تو وہ ہے جس نے رات اس لئے بنائی ہے کہ تم اس میں آرام کر سکو اور دن کو روشنی عطا کرنے والا بنایا ہے) کہہ کر درحقیقت ایسے لوگوں کو خبردار کیا ہے کہ رات کی نیند کو چھوڑ دینے سے روحانی امن سکون غارت ہو جاتا ہے۔

## ۲۔ قرآن مجید میں رات اور دن

قرآن مجید میں تیس سے زیادہ مقامات پر رات اور دن کو خدا کے وجود کی نشانی اور اس کے علم و قدرت پر دلیل کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن:

کبھی کہتا ہے: یہ صاحبان عقل کے لئے عبرت ہے۔ (نور/۴۴)

کبھی کہتا ہے: یہ ”پرہیزگاروں“ کیلئے آیات ہیں۔ (یونس/۶)

کبھی کہتا ہے: یہ ”صاحبان ایمان“ کیلئے آیات ہیں۔ (نمل/۸۶)

اور حقیقت میں ان تینوں امور کا رابطہ یہیں سے واضح ہو جاتا ہے کہ غور و فکر اور وہ بھی پختہ اور گہرا غور (جیسا کہ ”أُولُو الْأَلْبَابِ“ کے مفہوم میں پایا جاتا ہے) ایمان کے ظہور کا سبب اور اس کی تقویت کا موجب ہوتا ہے، جب کہ ایمان بھی اپنے لحاظ سے دل و جان کے اندر تقویٰ کے ظہور کا سبب ہوتا ہے۔ اس طرح خداوند عالم کی کائنات میں علم و قدرت اور عظمت کی آیات میں غور و فکر کرنے سے ایک تو عقیدے کو تقویت ملتی ہے اور دوسرے عمل کے لحاظ سے انسان کی تربیت ہوتی ہے۔

## ۱۰۔ پہاڑوں کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں

### اشارہ

ہر شخص اجمالی طور پر جانتا ہے کہ بڑی بڑی آبادیاں اور بہت سے اہم شہر بڑے بڑے پہاڑوں کے دامن یا ان کے اندر آباد ہیں۔ عظیم نہریں، جوشہروں کی آبادی کا سبب ہوتی ہیں وہ بھی انہی پہاڑوں کی بدولت ہیں، لیکن انسانی زندگی میں پہاڑوں کا عمل دخل صرف اسی حد تک نہیں ہے، ہر چند کہ یہ چیزیں بھی اپنی جگہ پر بڑی اہم ہیں۔

پہاڑوں کا صرف انسانی زندگی کے ساتھ ہی گہرا تعلق نہیں ہے بلکہ روئے زمین پر موجود تمام چیزوں کی حیات پہاڑوں کی مرہون منت ہے۔ ان کے فوائد اور برکتیں بے شمار ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ کرہ زمین پہاڑوں کے بغیر زندگی کے قابل نہیں ہے تو یہ مبالغہ نہیں ہوگا۔ اس لئے قرآن مجید نے بہت سی آیات میں پہاڑوں کی تخلیق پر بڑا زور دیا ہے اور انہیں توحید کی آیات اور پروردگار عالم کے علم و قدرت کی نشانیاں قرار دیا ہے۔ اس مختصر سے اشارے کے ساتھ مندرجہ ذیل آیات کو گوش دل و جان سے سماعت کرتے ہیں:

۱۔۔۔ اَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿۱﴾ وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿۲﴾ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ

(غاشیہ/ ۱۷-۱۹)

۲۔۔۔ أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهْدًا ﴿۱﴾ وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا

(نبا/ ۶-۷)

۳۔۔۔ وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْهَارًا

(رعد/ ۳)

۴۔۔۔ وَالْقَى فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهَارًا وَسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ

(نحل/ ۱۵)

۵۔۔۔ وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ ۖ وَجَعَلْنَا فِيهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ﴿۳۱﴾ (انبیاء/ ۳۱)

۶۔۔۔ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ قَوِّهَا وَبَرَكَ فِيهَا وَقَدِّفِيهَا أَقْوَامًا فِيهَا ثَلَاثَةُ أَرْبَعَةٍ  
أَيَّامٍ سَوَاءٍ لِلسَّائِلِينَ

(حم سجدہ/۱۰)

۷۔۔۔ وَجَعَلْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ شَامِخَاتٍ وَأَسْقَيْنُكُمْ مَاءً فُرَاتًا

(مرسلات/۲۷)

۸۔۔۔ أَمَّنْ جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا وَجَعَلَ خِلَالَهَا أَنْهَارًا وَجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ  
بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ كَثُرُوا لَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ

(نمل/۶۱)

۹۔۔۔ وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ مِمَّا خَلَقَ ظِلَالًا وَجَعَلَ لَكُمْ مِنَ الْجِبَالِ أَكْنَانًا

(نمل/۸۱)

۱۰۔۔۔ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَيضٌ وَحُمْرٌ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ

(فاطر/۲۷)

## ترجمہ

- ۱۔۔۔ آیا وہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے وہ کیسے بنایا گیا ہے؟ اور آسمان کی جانب نہیں دیکھتے کہ کیونکر بلند کیا گیا ہے؟ اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے گاڑے گئے ہیں؟
- ۲۔۔۔ آیا ہم نے زمین کو تمہارے لئے سکون کی جگہ نہیں بنایا؟ اور پہاڑوں کو میخیں؟
- ۳۔۔۔ اور وہ وہی ہے جس نے زمین کو بچھایا اور اس میں پہاڑ اور نہریں بنائیں۔۔۔۔۔
- ۴۔۔۔ اور اس نے زمین میں محکم اور پختہ پہاڑ گاڑے ہیں تاکہ زمین تمہیں لے کر جھک نہ جائے، اور اس نے نہریں ایجاد کیں اور راستے بنائے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔
- ۵۔۔۔ اور ہم نے زمین میں بھاری بھر کم پہاڑ بنائے تاکہ وہ (انسان) سکون میں رہیں اور ان میں درے اور راستے بنائے تاکہ لوگ ہدایت پا جائیں۔

- ۶۔۔ اور اس نے زمین میں اوپر سے پہاڑ بنائے اور اس میں برکتیں پیدا کیں اور خوراک کا مختلف مواد اس میں مقرر فرمایا، یہ سب کچھ چار دنوں میں تھا اور تمام طلب گاروں کی ضرورت کے مطابق۔
- ۷۔۔ اور ہم نے اس میں مضبوط اور بلند پہاڑ قرار دیئے اور تمہیں خوشگوار پانی پلایا۔
- ۸۔۔ بھلا وہ کون ہے جس نے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا اور اس کے درمیان نہریں چلائیں اور زمین کیلئے ٹھوس اور محکم پہاڑ بنائے اور دو دریاؤں کے درمیان حد فاصل بنایا (تاکہ وہ آپس میں مخلوط نہ ہوں، تو پھر ایسی صورت میں) خدا کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ بالکل نہیں! بلکہ ان میں سے اکثر تو کچھ جانتے ہی نہیں (اور جاہل ہیں)
- ۹۔۔ اور خدا ہی نے تمہارے (آرام کے) لئے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کے سائے بنائے، اُسی نے تمہارے لئے پہاڑوں سے پناہ گاہیں بنائیں۔
- ۱۰۔۔ اور پہاڑوں سے بھی (خدا کی مہربانی سے) راستے بنائے گئے ہیں جن کے رنگ مختلف ہیں کچھ تو سفید اور سرخ اور کچھ بالکل کالے سیاہ

## الفاظ کی تشریح

”جَبَل“ (بروزن عَسَل) کے معنی ہیں پہاڑ اگرچہ بعض ارباب لغت نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں سطح زمینوں کے مقابل کا لفظ۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں زمین کی وہ سطح مرتفع جو بلند اور لمبی ہو۔ بظاہر یہ تمام تعبیریں ایک ہی معنی کی طرف اشارہ ہیں۔ کبھی کبھی کنایہ کے طور پر دلیر اور عظیم لوگوں کو بھی ”پہاڑ“ کہا جاتا ہے۔ ”جبلّی“ ان صفات کو کہا جاتا ہے جو انسان کی طبیعت میں پائیدار ہوتی ہیں اور کسی قسم کی تبدیلی کو قبول نہیں کرتیں۔ (جیسے پہاڑ ہوتے ہیں) اور کسی گروہ یا جماعت کو ”جبلّی“ (جیم اور باکے کسرے اور تشدید لام کے ساتھ) کہا جاتا ہے بوجہ عظمت میں کوہ کے مشابہ ہونے کے۔<sup>[۱]</sup>

”رَوَّاسِي“، ”رَاسِيَة“ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ٹھوس اور محکم پہاڑ، اس کی اصل ”رَسُو“ (بروزن رَسَم، یا بروزن عَلُو) ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا اپنی جگہ پر ڈٹے رہنا اور ثابت رہنا۔ جن برتنوں کو زمین میں گاڑ کر ان سے کام لیتے ہیں، انہیں بھی ”رَاسِيَة“ کہا جاتا ہے۔ (جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعات کے سلسلے میں قرآن مجید میں ہے ”قد رراسيات“، یعنی زمین میں گڑی ہوئی بڑی بڑی دیگیں) جو ستون خیمہ کے درمیان میں گڑے ہوتے ہیں انہیں ”رَاسِي“ کہا جاتا ہے اور ”مرسات“، کشتی کے اس لنگر کو کہتے ہیں جو ایک جگہ پر کشتی کے ثبات و قرار کا باعث ہوتا ہے۔ یہ لفظ کبھی کبھی لوگوں کے درمیان صلح برقرار رکھنے کے معنی میں بھی آتا ہے کیونکہ صلح ہی ملک کے ثبات اور پائیدار ہونے کا سبب ہوتی ہے

[۱] مفردات راغب، مجمع البیان اور لسان العرب

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### پہاڑوں کی برکتیں اور عجیب اسرار

ان آیات کے پہلے حصے میں خداوند عالم نے اپنی زمین و آسمان میں موجود نشانیوں کے مطالعہ کیلئے لوگوں کو دعوت دی ہے، اس کے بعد اونٹ کی تخلیقی کیفیت اور اسی طرح آسمان کی بلندی کے مطالعہ کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ ستونوں کے بغیر کیونکر برپا ہے۔ پہاڑوں کی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ ”کیا وہ پہاڑوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کیونکر اپنی جگہ پر گڑے ہوئے ہیں؟“ (وَالْوَالِي الْجَبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ)

ممکن ہے کہ تعبیر پہاڑوں کے اپنی جگہ پر ثابت و برقرار رہنے اور زمین کو لرزہ برانداز ہونے جس کی طرف بعد میں اشارہ ہوگا، سے روکنے کی طرف اشارہ ہوا، یا پھر ان کے طوفانوں اور جھگڑوں کے مقابلے میں استواری، انسان کیلئے قابل اطمینان پناہ گاہیں ایجاد کرنے اور چشموں ندیوں، نالوں اور نہروں کی صورت میں پانی کیلئے ذخیرہ ایجاد کرنے کی طرف اشارہ ہو۔ ممکن ہے یہ تعبیر پہاڑوں کی طرز ساخت اور ان کی پیدائش کی طرف ظریف اشارہ ہو، موجودہ دور میں سائنس نے جس سے پردہ اٹھایا ہے، کیونکہ اس کا کہنا ہے کہ یہ پہاڑ مختلف عوامل کی بنا پر معرض وجود میں آئے ہیں، کہیں پر تو زمین کی پیچیدگی کی وجہ سے اور کہیں پر آتش فشاںوں کے سبب، نیز کہیں بارش کے پانی کے مسلسل بہاؤ کی وجہ سے کہ پانی کے مسلسل بہاؤ نے اس کی اطراف کو مکمل طور پر صاف کر دیا لیکن ٹھوس اور پختہ حصہ اپنی جگہ پر قائم رہا۔

سمندروں کے اندر بھی مرجان جیسے حیوانی پہاڑ وجود میں آتے رہتے ہیں جنہیں مرجانی پہاڑ یا مرجانی جزائر کہتے ہیں۔ یہ تمام معانی ممکن ہے کہ ”كَيْفَ نُصِبَتْ“ (کیونکر نصب کئے گئے ہیں) کے جملہ میں جمع ہوں آیات کی دوسری قسم میں خداوند متعال کی نعمتوں کے عنوان کے تحت فرماتا ہے ”کیا ہم نے زمین کو (تمہارے) سکون کی جگہ نہیں بنایا۔۔۔ اور پہاڑوں کو میٹھیں؟“ (أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا)

”اوتاد“؛ ”وتد“ (بروزن حسد) کی جمع ہے جو محکم اور مضبوط میٹھوں پر بولا جاتا ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس کے معنی وہ میٹھیں ہیں جنہیں زمین میں گاڑ کر خیمے کی رسیوں کو ان سے باندھتے ہیں۔ [۱]

پہاڑوں کی میٹھوں کی حیثیت کیونکر حاصل ہے؟ اس بارے میں متعدد تفسیریں بیان ہوئی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ آج یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ زمین کے سینے میں پہاڑوں کی عظیم جڑیں ہیں اور یہ جڑیں آپس میں جڑی ہوئی ہیں اور زرہ کی مانند زمین کے اندرونی حصے کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں۔ یہ زمین کو اس کی اندرونی حرارت کے باعث پیدا ہونے والے دباؤ سے محفوظ رکھتی ہیں وگرنہ زمین کی

سطح بے قرار اور بے سکون رہتی۔

علاوہ ازیں جس طرح چاند اور سورج کی کشش سمندروں پر اثر انداز ہوتی ہے جس سے سمندروں میں مدوجزر پیدا ہوا ہے، اسی طرح وہ خشکیوں پر بھی اثر ڈالتی ہے، لیکن پہاڑوں کے زیرِ جال زمین کو اس عظیم دباؤ کے سامنے متحکم بنائے ہوئے ہیں۔

پھر یہ بھی کہ یہ پہاڑ بلند و بالا دیواروں کی مانند زمین کے مختلف حصوں کو ہوا کے تند و تیز جھکڑوں اور طوفانوں سے بچاتے ہیں، کیونکہ اگر زمین کی ساری سطح بیابان کی صورت میں ہوتی تو ان تباہ کن اور مہلک طوفانوں کی وجہ سے انسانی زندگی کے لئے قطعاً نامناسب ہوتی۔ ان سب باتوں سے قطع نظر پہاڑوں کی حیثیت روئے زمین پر پانی کے ذخیرے کی ہے جو انسانی زندگی کے نظم و ضبط اور انتظام کیلئے پختہ میخ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تفسیر المیزان میں آیا ہے کہ ”اوتاد“ (میخوں) کی تعبیر شاید اس لئے ہے کہ زمین کے اکثر پہاڑ آتش فشانی کا نتیجہ ہوتے ہیں جو زمین کے اندرونی مواد کے پگھل کر آتش فشانیوں کے دہانہ پر پہنچنے کی صورت میں زمین پر باقی رہ گئے ہیں اور آتش فشانیوں کو اپنے قابو میں رکھے ہوئے ہیں۔ [۱]

تیسری، چوتھی اور پانچویں آیات میں پہاڑوں کی ”رواسی“ (پختہ اور محکم اشیاء) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ”خداوند عالم نے زمین میں پہاڑ اور نہریں بنائی ہیں“ (وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيًّا وَأَنْهَارًا)

ایک اور جگہ فرماتا ہے ”زمین میں پہاڑوں کو ڈال دیا ہے تاکہ وہ اس کی حرکت اور لرزش کو روکے رکھیں، اور نہریں اور راستے ایجاد کر دیئے ہیں تاکہ تم ہدایت پا جاؤ“ (وَالْقَى فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيًّا أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهَارًا وَسُبُلًا لَّتَعْلَمُوا لَكُمْ تَهْتَدُوا) اور یہی بات پانچویں آیت میں نظر آتی ہے۔

غرض ان تینوں آیات سے یہ بات بخوبی معلوم ہوئی ہے کہ پہاڑوں کے اہم فوائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ زمین کی غیر موزوں حرکتوں اور لرزشوں کو روکے ہوئے ہیں۔

”تمید“، ”مئید“ (بروزن صید) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں بڑی بڑی چیزوں کے اضطراب اور زلزلے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس کے معنی دائیں بائیں ہچکولے کھانا ہیں جیسے خالی کشتی لہروں کی دوش میں ہچکولے کھاتی ہے۔ ”میدان“ کو اس لئے میدان کہتے ہیں کہ مقابلے یا جنگ کے موقع پر اس بھاگ دوڑ اور حرکت و تحرک ہوتا ہے۔

زمین کے اندرونی دباؤ اور سورج اور چاند کے مدوجزر کی کشش اور دائمی طوفانوں کے اثرات سے محفوظ رکھنے کیلئے پہاڑوں کے کردار کے بارے میں پہلے گفتگو ہو چکی ہے، دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

نیز ان آیات سے اجمالی طور پر یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ نہروں کی پیدائش کا پہاڑوں کی تخلیق سے گہرا تعلق ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ

بڑی بڑی نہریں جو سارا سال بہتی رہتی ہیں اور بیاسی زمینوں کو سیراب کرتی رہتی ہیں، اس پانی کے وجود سے ہیں جو پہاڑوں کے اندر ہوتا ہے، یا ان کی چوٹیوں پر برف کی صورت میں ذخیرہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے عظیم پہاڑ، دنیا کی عظیم نہروں کا سرچشمہ ہیں۔

ممکن ہے کہ پہاڑوں کے وجود سے یہ غلط فہمی پیدا ہو کہ انہوں نے زمین کو مختلف حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور آمدورفت کے راستوں کو روکے ہوئے ہیں۔ اس قسم کے نظریہ کی اصلاح کے لئے مندرجہ بالا آیات کو بیان فرمایا ہے کہ خداوند عالم نے ان میں درزے اور راستے بنائے ہیں تاکہ لوگ ہدایت پا جائیں اور اپنی منزل مقصود تک جا پہنچیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ہمیشہ بڑے بڑے، عظیم اور سر بفلک پہاڑوں کے اندر مضبوط پناہ گاہیں اور راستے ہیں جو انسان کو آمدورفت کی اجازت دیتے ہیں۔ یعنی وہ طوفانوں کے مقابل میں عظیم دیوار ہونے کے باوجود انسانوں کو آنے جانے سے نہیں روکتے اور یہ اتفاق بہت ہی کم پیش آتا ہے کہ یہ پہاڑ زمین کے حصوں کو مکمل طور پر ایک دوسرے سے جدا کرتے ہوں۔

یہ نکتہ بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اگر زمین کی سطح صاف ہوتی تو اس کی اپنے محور کے گرد حرکت اور اس کی سطح پر قشر ہوا کی تند و تیز لہروں کی وجہ سے وہ آگ کی صورت میں اس قدر گرم ہوتی کہ کسی ذی روح کا اس پر زندہ رہنا مشکل ہو جاتا۔

لیکن وہ عظیم خدا جس نے زمین کو انسانوں کے سکون اور آرام کا گہوارہ قرار دیا ہے، اسی نے پہاڑوں کو حکم دے رکھا ہے کہ وہ اپنے ٹھوس اور آہنی بچے قشر ہوا پر اچھی طرح گاڑ دیں اور اسے اپنے ہمراہ زمین پر گھماتے رہیں تاکہ ہوائی لرزے اور گرمی و حرارت پیدا نہ ہونے پائیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہم اچھی طرح دیکھ رہے ہیں کہ بے جان پتھروں کے یہ ٹکڑے روئے زمین پر موجود چیزوں کی زندگی کیلئے کس قدر مؤثر ہیں۔

ضمنی طور پر ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ پہاڑ بوجہ نشیب و فراز اور بلندی اور پستی کے وسیع پیمانے پر سطحیں ایجاد کرتے ہیں اور زمین کے قابل استفادہ حصے کو کئی گنا وسیع کر دیتے ہیں، جب کہ ایسے بہت سے حصوں میں درخت پیدا ہوتے ہیں، وسیع پیمانے پر جنگل وجود میں آتے ہیں، دواؤں میں استعمال ہونے والی جڑی بوٹیاں اور غذا میں کام آنے والی نباتات اور چراگاہیں وجود میں آتی ہیں جو اہل فن پر مخفی نہیں۔

شاید انہی وجوہات کی بناء پر چھٹی آیات میں پہلے تو زمین میں پہاڑوں کے نصب کرنے کی بات کی ہے، پھر زمین کی برکتوں اور اس کی غذاؤں کے بارے میں گفتگو فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ”زمین کے اوپر پہاڑ بنائے اور اس میں برکتیں پیدا کیں اور اس میں خوراک کی مواد پیدا فرمایا“ (وَجَعَلْ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبَارَكْ فِيهَا وَقَدَّرْ فِيهَا أَقْوَامَهَا)

کیوں کہ ایک تو خود پہاڑوں کا اور دوسرے اس پانی کا جو پہاڑوں کے دامن سے بہہ نکلتا ہے خوراک کی اشیا کی پیدائش میں بڑی حد تک عمل دخل ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ آیت کے آخر میں فرماتا ہے۔ ”سَوَاءٌ لِّلرَّسَائِلِیْنَ“ جو شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ خوراک کی اشیا ضرورت مندوں کی ضرورت کے عین مطابق ہیں، اور ”سَائِلِیْنَ“ کی تعبیر ممکن ہے تمام انسانوں، حیوانوں اور نباتات کی طرف ہو (اگر جمع



مذکر عاقل کی صورت میں ذکر ہوا ہے تو نحوی اصطلاح میں ”غلبہ“ کی صورت میں ہے (یقیناً یہ تمام چیزیں زبان حال سے ”اقوات“ کا تقاضا کر رہی ہیں۔

”اقوات“، ”قوت“ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں خوراک کی مواد۔ بعض مفسرین نے اس کی تفسیر صرف ”بارش“ سے کی ہے اور بعض نے اس خوراک کی مواد سے کی ہے جو دل خاک میں چھپا ہوا ہے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ تمام خوراک کی مواد کی طرف اشارہ ہے، خواہ وہ زمین سے باہر نکلے یا زمین کے اندر پروان چڑھے اور ”قدر“ کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ یہ ”قدر“ کے مادہ سے ہے اور شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان اور تمام دوسری مخلوق کی پیدائش سے پہلے ہی اس کی تمام ضروریات کا اندازہ لگا کر اس کا پہلے ہی سے بندوبست کر لیا جاتا ہے۔

ساتویں آیت کا مضمون اس سے پہلی آیات کے ضمن میں بیان ہو چکا ہے۔

اٹھویں آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی چار اہم نعمتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ زمین کی تخلیق اس انداز میں کہ اسے اس حد تک قرار گاہ اور آرام دہ بنایا گیا ہے کہ اس پر انسان اور دوسری زندہ موجودات آرام و سکون کے ساتھ رہ سکتی ہیں، زمین کے حصوں کے درمیان نہروں اور دریاؤں کی ایجاد، محکم اور ٹھوس پہاڑوں کی تخلیق اور (میٹھے اور کھاری پانی کے) دو سمندروں کے درمیان رکاوٹ کی ایجاد، تاکہ ایک دوسرے میں مل نہ جائیں۔

یہ چاروں نعمتیں بڑے دلکش انداز میں ایک دوسرے سے تعلق رکھتی ہیں۔ پہاڑ زمین کے سکون کا موجب اور نہروں کی پیدائش کا سرچشمہ ہیں۔ یہ نہریں اور دریا جب کھاری پانی کے سمندر میں گرتے ہیں تو ان پانی کی طویل مدت تک ایک نا دیدہ اور غیر مرئی حجاب کی وجہ سے جدار ہوتا ہے اور آپس میں نہیں ملنے پاتا۔ یہ حجاب ”میٹھے“ اور ”کھاری“ پانی کے ہلکے اور بھاری ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ بالفاظ دیگر ان کے مخصوص وزن کا فرق اس بات کا موجب بن جاتا ہے کہ نہروں اور دریاؤں کا پانی کافی عرصے تک کھاری پانی میں حل نہیں ہو پاتا۔ اس کا بہت بڑا فائدہ ساحلی علاقوں کی زراعت اور کاشتکاری کیلئے ہوتا ہے کیونکہ یہ میٹھا پانی مدوجزر کے ذریعہ پیچھے کودھکیلا جاتا ہے جس سے بڑی مقدار میں زمین کی آبپاشی ہوتی ہے اور نہایت ہی سرسبز باغات اور آبادکھیت معرض وجود میں آتے ہیں۔

اسی لئے تو آیت کے آخر میں فرماتا ہے، ”کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟“ (ءِ اِلٰهَۃٌ مَّعَ الدِّیۡ) بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (بَلْ اَكْفَرُوْهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ)

جی ہاں! وہ ان تمام نعمتوں اور برکتوں کی اسرار سے بے خبر ہیں جو نعمتیں کائنات کے گوشے گوشے میں موجود ہیں اور ان میں سے ہر ایک اس بے نشان ذات کی نشانی ہے، لیکن یہ بے خبر لوگ اس سے مجرب ہیں۔

نویں اور دسویں آیت میں پہاڑوں کی بعض دوسری خصوصیات اور فوائد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے تو ”سایوں“ کی تخلیق کا تذکرہ ہے جو لوگوں کو سخت گرمی اور جلادینے والی دھوپ سے بچاتے ہیں۔ پھر ان پناہ گاہوں کی طرف اشارہ فرماتا ہے جو پہاڑوں میں موجود ہیں فرماتا ہے۔ ”اور پہاڑوں سے تمہارے لئے پناہ گاہیں بنائیں۔“ (وَجَعَلْ لَّكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَسْبَابًا)

”اکنان“، ”کن“ (بروزن جن) کی جمع ہے جو مجمع البیان کے بقول اس جگہ کے معنی ہیں جو انسان کو اپنے اندر چھپا لیتی ہے، لیکن

بعض نے اسے ہر قسم کے ڈھانپنے والی چیز کے معنی میں ذکر کیا ہے، حتیٰ کہ وہ قمیص کو بھی انسان کیلئے ”کن“ سمجھتے ہیں اور ”پہاڑوں کی اکنان“ سے مراد وہی غاریں اور شگاف ہیں جن سے انسان پناہ گاہ کے عنوان سے اپنے لئے استفادہ کرتا ہے ممکن ہے کہ کوہستانی پناہ گاہیں اور غاروں کی اہمیت شہر کے آسودہ خاطر مکینوں کیلئے ہرگز واضح نہ ہو، لیکن بے دفاع مسافروں، بیانون میں سفر کرنے والوں، گڈریوں، چرواہوں اور ان تمام دوسرے لوگوں کیلئے تو ان کی اہمیت زندگی کی حیثیت رکھتی ہے جو موسم گرما کی سخت اور جلادینے والی دھوپ یا موسم سرما کی زبردست کڑا کے کی سردی یا بادباران سے دوچار ہوتے ہیں۔ بسا اوقات تو انہیں حتیٰ موت سے نجات دلاتی ہیں، خاص کر یہ کہ اس قسم کی پناہ گاہیں سردیوں میں عام طور پر گرم اور گرمیوں میں بالعموم سرد ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ پرانے زمانے میں، بلکہ اب بھی کچھ لوگ پہاڑوں کو تراش کر ان کے درمیان اپنا گھر بناتے ہیں جو نہایت ہی محکم اور مختلف طبعی حوادث کے مقابلے میں مکمل طور پر محفوظ ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید نے ”اصحاب الحجر“ یعنی قوم ثمود کے بارے میں فرمایا ہے کہ ”وَكَانُوا يُحْتَوُونَ مِنَ الْجِبَالِ الَّتِي أُبْنُوا بِهَا وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الآئِتِ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا“ (وہ اپنے لئے امن وامان کے گھر، پہاڑوں کے درمیان میں تراشتے تھے۔ سورہ حجر/ ۸۲) یہ پہاڑوں کا ایک اور فائدہ ہے۔

ان آیات کے ایک اور حصے میں ایسے راستوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جنہیں خداوند عالم نے مختلف رنگوں یعنی سفید، سرخ اور کہیں پر مکمل طور پر سیاہ پیدا کیا ہے۔ (وَمِنَ الْجِبَالِ الَّتِي أُبْنُوا بِهَا وَمِنْهَا وَعَوْرَ اَيْبُ سُوْدًا) ”جُد“، ”جَدّہ“ (بروزن عُد اور عُدّہ) کی جمع ہے جس کے معنی جادہ اور راستہ ہیں ”بیض“، ”بیض“ کی جمع ہے جس کا معنی سفید ہے۔ ”حمر“، ”احمر“ کی جمع ہے جس کے معنی سُرخ ہے۔ ”غرابیت“، ”غریبیت“ (بروزن کبریت) کی جمع ہے جس کے معنی ”گہرا سیاہ“ ہیں کلوے کو اسی لئے تو ”غراب“ کہتے ہیں کہ وہ گہرا سیاہ ہوتا ہے۔ ”سود“، ”اسود“ کی جمع ہے جس کے معنی بھی سیاہ ہیں اور یہاں پر ”غرابیت“ کے کلمہ کے بعد تاکید کے طور پر بیان ہوا ہے۔

مختلف کوہستانی راستے، جو ایک دوسرے رنگوں کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں، مسافروں کو اپنے اپنے راستے اختیار کرنے کیلئے معاون ہوتے ہیں اور انہیں بھٹکنے سے بچاتے ہیں۔ علاوہ ازیں رنگوں کا یہ اختلاف پتھروں کے مواد ترکیبی کی علامت ہوتا ہے جو ان مختلف معدنیات کے جوہر کی دلیل ہوتا ہے جو ان پہاڑوں کے اندر چھپی ہوتی ہے۔

ان آیات کی مجموعی بندی سے یہ بات اچھی طرح سمجھی جاسکتی ہے کہ پہاڑوں کی تخلیقان کے نہایت ہی اہم فوائد، خداوند عالم کے علم و قدرت کی اہم نشانیاں اور اس ذات کردگار کی انسانوں پر رحمت اور حکمت کی دلیل ہیں۔ ان سے یہ بات بھی اچھی طرح سمجھی جاتی ہے کہ اس کائنات کی تخلیق اور اس کی ایک ایک چیز کس حد تک مفید و با مقصد ہے کہ ان کے بارے میں جتنا غور و خوض کیا جائے اتنا ہی نت نئے اسرار کا انکشاف ہوتا ہے جس کے نتیجے میں انسان کا اپنے رب سے عشق اور تعلق بڑھ جاتا ہے۔

## چند ضروری وضاحتیں

### ۱۔ پہاڑ اور قرآن پاک کا علمی معجزہ

شاید ایک صدی پہلے تک سائنسدانوں کا پہاڑوں کے متعلق ایک سطحی نظریہ تھا اور عام طور پر یہی سمجھا جاتا تھا کہ تمام پہاڑ پتھروں کے عظیم ٹکڑوں کا مجموعہ ہیں جو روئے زمین پر پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن زمانے کے گزرنے کے ساتھ ہی اس اہم راز سے بھی پردہ اٹھ گیا اور سائنسدانوں نے اس حقیقت کا پتہ چلا لیا کہ ہر پہاڑ کا بہت بڑا حصہ زمین کے اندر موجود ہے۔

چنانچہ ”جارج گاموف“ اپنی کتاب ”سرگزشت زمین“ میں لکھتے ہیں:

”جدید نظریہ کے مطابق، زمینی پہاڑوں کی نوعیت بالکل ویسی ہے جیسے برفانی پہاڑوں کی ہوتی ہے، جو برف کے دباؤ کی وجہ سے قطبی علاقوں میں وجود میں آتے ہیں جس نے بھی قطبی علاقوں کو دیکھا ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ جب دباؤ کی وجہ سے برف کے عظیم ٹوڈے ٹوٹتے ہیں تو وہ ایک دوسرے پر گرتے رہتے ہیں (اور سمندر میں گرتے ہیں تو اس صورت میں) برف کا بیشتر حجم عام طور پر پانی پر چلا جاتا ہے۔ (شاید صرف اس کا 1/10 دسواں حصہ پانی سے باہر ہوتا ہے۔ جب کہ 9/10 حصے پانی کے اندر) اس طرح جو پہاڑ بھی سطح زمین سے بلند ہوتا ہے، ایک ”کوہ منفی“ سنگ خارا GRANITE کی جنس سے زمین کو نرم اندرونی سیاہ دلدلی حصے BAGALITE میں پیدا ہوتا جاتا ہے۔“ [۱]

یہاں سے ہمیں قرآن مجید کے اس نکتے کی سمجھ آتی ہے کہ اس نے پہاڑوں کو ”ادنا“ یعنی زمین کی میخوں کا نام کیوں دیا ہے؟ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ میخ کا بہت بڑا حصہ دیوار یا لکڑی یا کسی اور چیز کے اندر ہوا ہے اور شاید کم حصہ اس سے باہر۔

نیز چونکہ میخوں کو کسی چیز کے استحکام یا کسی چیز کے مختلف ٹکڑوں کو آپس میں جوڑنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے، لہذا اس مقام پر بھی یہ تعبیر ایک لطیف اشارہ ہے پہاڑوں کی اس اہم تاثیر کی طرف وہ کرہ زمین پر اندرونی دباؤ یا مدوجز کی وجہ سے زمین کے مختلف ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے سے بچاتے اور اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

۲۔ پہاڑ صرف زمین کے سکون کیلئے ہی موثر نہیں ہوتے بلکہ زمین کی اطراف میں ہوا کیلئے بھی بہت بڑی حد تک موثر ہوتے ہیں۔ ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ ایک وسیع و عریض بیابان میں رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے کیونکہ وہاں کی ہوا عام طور پر طوفانی اور گرد آلود ہوتی ہے۔ وہاں آرام و سکون تو کجا سانس لینا بھی مشکل ہوتا ہے۔

یہ پہاڑوں کی بلند و بالا قامت ہی ہے جو ان دیوانہ وراچنے والی ہواؤں کو روک کر یا تو پیچھے کو دھکیل دیتی ہیں یا پھر فضا کے بالائی حصے میں بھیج دیتی ہیں۔

[۱] ”سرگزشت زمین“، تحریر جارج گاموف ص ۱۲۶ (قدرے تلخیص کے ساتھ)

۳۔ اس کے علاوہ برف اور بارش کے برسنے میں بھی پہاڑوں کا بڑی حد تک عمل دخل ہے کیونکہ وہ سمندروں سے اٹھنے والے بادلوں اور طوفانوں کے آگے دیوار بنے ہوئے ہیں جو انہیں روک کر برسنے پر آمادہ کرتے ہیں، بادلوں کے کچھ حصے کو اپنے دامنوں میں اور کچھ حصے کو یا تو اپنے درمیانی حصہ میں برسنے پر مجبور کرتے ہیں یا پھر اپنی چوٹیوں پر برف کی صورت میں انہیں روک رکھتے ہیں۔

۴۔ اسی طرح ہوا کی گرمی کو حدِ اعتدال پر رکھنے میں پہاڑوں کا گہرا ہاتھ ہے۔ خصوصاً استوائی علاقے میں تو ان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے، کیونکہ پہاڑوں کی بلندی سطح زمین سے ان کی دوری کا سبب بن جاتی ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ ہم جس قدر بھی سطح زمین سے دور ہوتے جائیں گے ہوا اسی قدر خنک ہوتی جائے گی۔

۵۔ پہاڑ مختلف معدنیات کا اہم منبع بھی ہیں اور اپنے دل میں بہت بڑے سرمائے کو جگہ دئے ہوئے ہیں اور انسان کی ہمیشہ سے ان سرمایوں کے حصول کیلئے کاوش چلی آ رہی ہے۔

۶۔ پہاڑوں کی ایک بہت بڑی تاثیر یہ بھی ہے کہ وہ چلنے پھرنے والی ریت کے آگے بند ثابت ہوتے ہیں، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جب ہوائیں چلتی ہیں تو صحراؤں کی ریت ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتی رہتی ہے، بلکہ بڑے بڑے صحراؤں میں تو درختوں، انسانوں، جانوروں، قافلوں حتیٰ کہ آبادیوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور جاندار چیزوں کی تباہی کا موجب بن جاتی ہے اگر اس کو مہار نہ کیا جائے تو روئے زمین کے تمام علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ پہاڑوں سے بڑھ کر اور کوئی مؤثر بند نہیں ہیں جو اس ”شتر بے مہار کو روکیں۔“

یہ اور اس قسم کے کئی اور عظیم فوائد جو ہم آیاتِ بالا کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں ہمیں ایک تو پہاڑوں کے اہم طور پر دخل انداز ہونے اور دوسرے اس بارے میں قرآن پاک کی عظمت سے آگاہ کرتے ہیں۔

## ۲۔ پہاڑوں کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمانِ ذیشان

خداوندِ عالم کی معرفت کے بارے میں ”توحید مفصل“ کا بہت بڑا اور نمایاں حصہ ہے جس میں توحید کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور کئی اسرار و رموز کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ اس میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام پہاڑوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

”اے مفصل! پتھروں اور مٹی سے مل کر بنے ہوئے ان پہاڑوں کی طرف دیکھو جنہیں بے خبر لوگ اضافی اور بے فائدہ سمجھتے ہیں، جب کہ ان کے اندر بڑی تعداد میں فوائد اور منافع پائے جاتے ہیں، جن میں سے کچھ یہ ہیں: ان کے اوپر برف پڑتی ہے اور ان کے چوٹیوں پر ضرورت مندوں کیلئے ذخیرہ ہوتی رہتی ہے، پھر بتدریج پگھل پگھل کر بہتی رہتی ہے، اس سے چشمے جاری ہوتے رہتے ہیں۔ اور چشموں کے آپس میں ملنے سے بڑے بڑے دریا اور نہریں وجود میں آ جاتی ہیں۔ نباتات اور جڑی بوٹیاں جن سے دوائیاں تیار کی جاتی ہیں انہی پہاڑوں پر اُگتی ہیں صحراؤں میں نہیں اُگتیں۔“

پہاڑوں کے اندر وحشی جانوں کے لئے غاریں اور پناہ گاہیں موجود ہیں، نیز دشمن سے مقابلے کرنے کیلئے پہاڑوں میں محکم اور مضبوط قلعے بنائے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ پہاڑوں سے ایسے ایسے پتھر تراش کئے جاتے ہیں جو عمارتوں اور چکی کے پاٹوں کے

طور پر کام میں آتے ہیں۔

نیز پہاڑوں میں مختلف قسم کی قیمتی دھاتوں کی کانیں پائی جاتی ہیں۔ جن کے اور بھی بے بہا فوائد ہیں جنہیں خدا کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا اور خدا نے انہیں اپنے علم میں رکھا ہوا ہے۔<sup>[۱]</sup>

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس کلام کے آخر میں جو ایک سربستہ جملہ ارشاد فرمایا ہے ممکن ہے کہ وہ کئی اور اہم فوائد کی طرف اشارہ ہو جو سائنس اور دیگر علوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ دریافت ہوتے جائیں اور جن کی طرف گزشتہ مباحث میں بھی اشارہ ہو چکا ہے۔ یا پھر ایسے فوائد اور منافع کی طرف اشارہ ہو جو ابھی تک انسانی علم و دانش کی تیز بین نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔

### ۳۔ ایک عظیم دانشور کا کلام

مرحوم علامہ مجلسی اپنی کتاب بحار الانوار میں جب پہاڑوں کے بارے میں بحث کرتے ہیں اور اس آیت کی تفسیر پر پہنچتے ہیں کہ ”خداوند عالم نے پہاڑوں کو زمین کی مینیں بنایا ہے“ تو اس کے سات تفسیریں ذکر کرتے ہیں جن میں سے تیسری تفسیر کچھ یوں ہے:

”جو بات میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ زمین کو ملنے مضطرب اور لرزہ بر اندام ہونے سے بچانے کیلئے پہاڑوں کا تاثیر کا سبب یہ ہے کہ (پہاڑ) زمین کی گہرائیوں میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور ایک جال کی حیثیت رکھتے ہیں، جس سے زمین متفرق اور پراگندہ ہونے سے بچی ہوئی ہے۔ وہ درحقیقت ایسی مینوں کی مانند ہیں جنہیں لکڑی کے مختلف ٹکڑوں سے جوڑ کر بنایا جائے اور اس میں مینیں ٹھوکی جائیں، جن کے ٹکڑے آپس میں جڑ جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو پاتے۔ یہ حقیقت ان لوگوں پر واضح ہے جو کونواں کھودتے ہیں کیونکہ اگر وہ اسی طرح زمین کو کھودتے جائیں تو سخت، ٹھوس اور پختہ پہاڑوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ زمین کے اکثر قطعے پہاڑوں کے درمیان ہوتے ہیں، جنہیں چاروں طرف سے پہاڑ گھیرے ہوئے ہوتے ہیں، گویا وہ نیچے سے آپس میں ملے ہوئے ہیں جیسے ایک ایک طرف ہوتا ہے جو زمین کے مختلف قطعوں کو متفرق اور پراگندہ ہونے سے بچاتا ہے اور جب لرزوں کے عوامل فراہم ہوتے ہیں تو وہ انہیں ان لرزوں سے محفوظ کر لیتا ہے۔“<sup>[۲]</sup>

اگر آپ اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ بعض دانشوروں نے یہ تصریح کی ہے کہ پہاڑوں کے بارے میں ابھی ایک صدی پیشتر نئی دریافتیں سامنے آئی ہیں، اسی طرح علامہ مجلسی مرحوم کا نظریہ بھی بہت ہی دقیق اور روزنی ہے کیونکہ اس عظیم اسلامی دانشور نے تین سو سال پہلے اس کی طرف توجہ مبذول کی ہے۔

[۱] بحار الانوار جلد ۳ ص ۲۱۔

[۲] بحار الانوار جلد ۶ ص ۱۰۶ (مطبوعہ دارالکتب الاسلامیہ)

## ۴۔ پہاڑوں کی تخلیق کے بارے میں اعجاز بھری حدیث

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ایک روایت میں ہے کہ کسی شخص نے حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے سوال کیا: ”هَيَّا خُلِقَتِ الْجِبَالُ“ پہاڑ کس چیز سے پیدا کئے گئے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا ”مِنَ الْأَمْوَاجِ“ (موجوں سے) یہ حدیث بھی موجودہ دور کے سائنسدانوں کے نظریہ سے مکمل مطابقت رکھتی ہے جو کہتے ہیں کہ ”بہت سے پہاڑ بوجہ قشر زمین کے سکڑنے کے اور اس میں نشیب و فراز کے وجود میں آجانے سے معرض وجود میں آئے ہیں“ (جیسا کہ سیب کے خشک ہو جانے کے بعد اس کی جلد پر نشیب و فراز وجود میں آجاتے ہیں) کیونکہ یہی نشیب و فراز بعینہ ان امواج کی مانند ہیں جو پانی کے سطح پر رونما ہوتی ہیں ”اور وَالْفِي الْأَرْضِ رَوَاسِي“ (خدا نے زمین میں ٹھوس اور محکم پہاڑ ایجاد کئے ہیں نحل/ ۱۵) بھی زمین کی تخلیق کے بعد پہاڑوں کی تخلیق کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔



## ۱۱۔ بادل، ہوا اور بارش کی پیدائش میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں

اشارہ:

بادلوں اور بادوباراں کا تعلق انسان اور کائنات کی دیگر زندہ اشیاء سے اس قدر واضح اور آشکار ہے کہ اس کی تشریح کی ذرہ بھر بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ زمین کے تقریباً تین چوتھائی حصے کو پانی نے گھیرا ہوا ہے لیکن ایک تو یہ پانی کھاری ہے جو زراعت اور کاشتکاری کیلئے قابل نہیں اور نہ ہی انسانوں اور حیوانوں کے پینے کے قابل ہے دوسرے بالفرض اگر تمام سمندروں کا یہ پانی شیریں ہوتا تو کون سا ایسا ذریعہ تھا جس سے اس پانی کو مرفع سر زمینوں اور ان زمینوں کو جو سطح سمندر سے کئی ہزار میٹر بلند ہیں، منتقل کیا جاتا؟ یہیں سے ہمیں عظیم مبداء کی قدرت نمائی کا واضح طور پر پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ یہ کام دھوپ کے ذمہ لگایا ہے کہ وہ سمندروں کی سطح پر پڑے اور ان کے پانیوں کو بخارات میں تبدیل کر کے انہی بادلوں کے ٹکڑوں کی صورت میں بدل دے، پھر ہواؤں کے تعاون سے انہیں خشک سر زمینوں کی طرف روانہ کرے اور پھر بارش کے چھوٹے چھوٹے اور پیارے پیارے دانوں کی صورت میں آہستہ آہستہ ان زمینوں پر بھیجے جس سے تمام روئے زمین پر زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور ہر جگہ آباد سرسبز اور خرم و شاداب ہو جاتی ہے، وہ بھی ایک نہایت ہی سچے تلے اور حساب شدہ نظم و نظام کے ساتھ۔ اس مختصر سے اشارے کے ساتھ اس بارے میں قرآن مجید کی آیات کی تلاوت کا شرف حاصل کرتے ہیں:

...اللَّهُ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَيُبْسِطُهُ فِي السَّمَاءِ كَيْفَ يَشَاءُ  
وَيَجْعَلُهُ كِسْفًا فَنَزِلُ الرِّيحُ بِمَنْجَرٍ مِنْ خَلَلِهِ فَإِذَا أَصَابَ بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ  
عِبَادِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ

(روم/۳۸)

...وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ يُرْسِلَ الرِّيحَ مُبَشِّرَاتٍ وَلِيُذِيقَكُمْ مِنْ رَحْمَتِهِ  
وَلِتَحَرِّيَ الْفُلُكُ بِأَمْرِهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ

(روم/۳۶)

...وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ حَتَّى إِذَا أَقَلَّتْ  
سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنْزَلَ لَنَايِبَهُ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا مِنْ كُلِّ

## الثَّهَابِ

(اعراف/۵۷)

۳... وَاللَّهُ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَيَسْقِيهِ إِلَىٰ بَلَدٍ مَّيِّتٍ  
فَأَحْيَيْنَاهُ الْإِرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا

(فاطر/۹)

۵... إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ  
مَاءٍ فَأَحْيَاهُ الْإِرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَرَكَ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيحِ  
وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ

(بقرہ/۱۶۴)

۶... أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ {} أَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ  
الْمُنزِلُونَ {} لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أَجَافًا فَلَوْ لَا تَشْكُرُونَ

(واقفہ/۶۸ تا ۷۰)

۷... أَمْ نَجْعَلُ الْأَرْضَ لِلَّذِينَ آمَنُوا خَلْقًا مِثْلَ خَلْقِ الَّذِينَ كَفَرُوا قَلِيلًا مِمَّا يَخْتَلَفُونَ  
فِي رَحْمَتِهِمْ إِنَّهُمْ لَأُولُو الْأَلْبَابِ {}

(نمل/۶۳)

۸... وَأَرْسَلْنَا الرِّيحَ فَا تَزْرَعُ لَنَا مِنْ السَّمَاءِ مَاءً فَاسْقِينَاكُمْ مِثْلَهُ وَمَا أَنْتُمْ لَهُ  
بِخَازِنِينَ

(حجر/۲۲)

۹... أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ ثُمَّ  
يُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ... إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرًا لَأُولِي الْأَلْبَابِ

(زمر/۲۱)



۱۰۔۔۔ وَأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا {۱} لِّنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا {۲} وَوَجِّعْنَا  
الْفَأْفَأَ

(نبا/۱۶۳۱۳)

۱۱۔۔۔ وَهُوَ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيحَ بُشْرًا لِّبَيْنِ يَدَيْهِ رَحْمَتِهِ وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ  
مَاءً طَهُورًا

(فرقان/۳۸)

۱۲۔۔۔ أَوَلَمْ تَرَوْا أَنَّ السَّمَوَاتِ أَلْفًا ثَلَاثِينَ وَالْأَرْضَ أَلْفًا ثَلَاثِينَ فَخَرِّجْ بِهَا  
زُرْعًا تَأْكُلُ مِنْهُ أَنْعَامُهُمْ وَأَنْفُسُهُمْ أَفَلَا يُبْصِرُونَ

(الم سجدہ/۲۷) □

## ترجمہ

۱۔۔۔ خداوندِ عالم وہی تو ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے تاکہ وہ بادلوں کو حرکت میں لے آئیں، پھر انہیں جس طرح وہ چاہتا ہے آسمان کی وسعتوں میں پھیلا دیتا ہے اور انہیں اکٹھا کرتا ہے، اس صورت میں تو بارش کے قطروں کو دیکھتا ہے کہ ان کے اندر سے باہر آتے ہیں اور جب اس زندگی عطا کرنے والی بارش کو اپنے ان بندوں تک پہنچاتا ہے جنہیں وہ چاہتا ہے تو وہ خوش ہو جاتے ہیں۔

۲۔۔۔ خدا کی (قدرت و عظمت کی) نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ ہواؤں کو خوشخبری عطا کرنے والے عنوان سے بھیجتا ہے تاکہ وہ تمہیں اپنی رحمت چکھائے (اور سیراب کرے) اور اس کے حکم کے مطابق کشتیاں چلتی رہیں اور تم اس کے فضل سے حصہ حاصل کرو، شاید اس کی نعمت کا شکر بجالاؤ۔

۳۔۔۔ وہ وہی تو ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے بھیجتا ہے، حتیٰ کہ جب وہ سنگین بادلوں کا بوجھ (اپنے

□ اس سلسلے میں قرآن مجید کی کئی اور آیات بھی موجود ہیں لیکن ہم نے جو چند ایک آیات اور پر لکھی ہیں ان سب کے نچوڑ کی حیثیت رکھتی ہیں جو ان تین اہم مسائل کی نشاندہی کرتی ہیں جو اوپر عنوان کے طور پر لکھے ہیں دوسری آیت مندرجہ ذیل ہیں: انعام/۹۹۔ ابراہیم/۳۲۔ نحل/۶۵۔ طہ/۵۳۔ حج/۶۳۔ نمل/۶۰۔ عنکبوت/۶۳۔ لقمان/۱۰۔ فاطر/۲۷۔ حم سجدہ/۳۹۔ رعد/۱۷۔ اعراف/۵۷۔ حجر/۲۲۔ نمل/۶۳۔

دوش پر) اٹھاتی ہیں تو ہم انہیں مُردہ زمینوں کی طرف بھیج دیتے ہیں اور اس ذریعہ سے ہم (زندگی عطا کرنے والا) پانی نازل کرتے ہیں اور اس سے ہر طرح کے میوے (تاریک مٹی سے) باہر نکالتے ہیں۔

۴۔۔۔ خداوندِ عالم وہی تو ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ بادلوں کو حرکت میں لے آئیں، پھر ان بادلوں کو ہم مردہ زمینوں کی طرف چلاتے ہیں اور اس کے ذریعہ زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرے۔

۵۔۔۔ آسمان وزمین کی پیدائش میں ن۔۔۔۔۔ اور اس پانی میں جو خداوندِ عالم نے آسمان سے نازل کیا ہے اور اس کے ذریعہ زمین کو اس سے مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا، اور کئی چلنے والی مخلوق کو اس میں پھیلا یا (اسی طرح) ہواؤں اور ان بادلوں کے راستوں میں بھی جو زمین اور آسمان کے درمیان معلق ہیں (اس کی پاک ذت اور توحید) کی ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے اور اس سے کام لیتے ہیں۔

۶۔۔۔ کیا تم اس پانی کے بارے میں بھی سوچتے ہو جو تم پیتے ہو؟ کیا تم اسے بادلوں سے نازل کرتے ہو یا ہم نازل کرتے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس خوشگوار پانی کو کڑوا اور نمکین بنا دیں، پس تم شکر کیوں نہیں کرتے؟

۷۔۔۔ یا وہ جو تمہیں خشکی اور تری کی تاریکیوں میں ہدایت کرتا ہے اور وہ جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے نازل ہونے سے پہلے خوشخبری دینے والا بنا کر بھیجتا ہے، تو کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ خداوندِ عالم اس سے بالاتر ہے کہ لوگ اس کیلئے جو شریک قرار دیتے ہیں۔

۸۔۔۔ ہم نے وہ ہوائیں بھیجیں جو بادلوں کو پانی سے بھرے ہوئے ہیں (ہو بادلوں کو پانی سے بارور کرتی ہے) اور ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا جس کے ذریعہ ہم نے تمہیں سیراب کیا، جب کہ تم اس کی حفاظت کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔

۹۔۔۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خداوندِ عالم نے آسمان سے پانی بھیجا اور اسے چشموں کی صورت میں زمین پر وارد کیا۔ پھر اس کے ساتھ زراعت کو باہر نکالتا ہے کہ جس کے مختلف رنگ ہیں۔۔۔۔۔۔۔ اس ماجرا میں صاحبانِ فکر (اور بلند سوچ رکھنے والوں) کیلئے یاد دہانی ہے۔

۱۰۔ اور بارش برسانے والے بادلوں سے ہم نے بڑی مقدار میں پانی نازل کیا تاکہ اس کے ذریعہ بہت سے دانے اور گھاس اگائیں۔۔۔۔۔ اور درختوں سے بھرے ہوئے باغات۔

۱۱۔۔۔ اور وہ وہی ہے جس نے اپنی رحمت کے آگے آتے ہواؤں کو خوشخبری دینے والا بنا کر بھیجا اور ہم نے آسمان سے پاک پانی اُتارا۔

۱۲۔۔۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم پانی کو خشک زمینوں کے طرف چلاتے ہیں اور اس کے ذریعہ زراعتوں کو آگاتے ہیں جس سے ان کو چوپائے بھی کھانے ہیں اور وہ خود بھی اُن سے خوراک حاصل کرتے ہیں، تو کیا وہ یہ نہیں دیکھتے؟

## الفاظ کے معانی اور تشریح

”ریاح“ کا لفظ دس مرتبہ قرآن پاک میں دہرایا گیا ہے اور نومرتبہ میں ان ہواؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو بادلوں کو متحرک کر کے برسنے کیلئے آمادہ کرتی ہیں۔

”ریاح“ اصل میں ”ریح“ کی جمع ہے جس کے معنی متحرک ہوا ہے، اس کا اصل ”روح“ ہے۔ عام طور پر اسے مؤنث لفظ سمجھا جاتا ہے۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرآن مجید میں جہاں پر بادلوں کی حرکت اور بارش کے نزول کا ذکر ہے وہیں پر جمع کا صیغہ (ریاح) استعمال کیا گیا ہے جس کو بعض حضرات اس بات کی دلیل سمجھتے ہیں کہ اگر ہوائیں اکٹھا ہو کر چلیں تو بادلوں کو آسمان میں پھیلا دیتی ہیں، بارشیں برساتی ہیں اور برکت کی حامل ہوتی ہیں لیکن جب ہوا اکیلی حرکت کرے تو ممکن ہے کہ بانجھ ثابت ہو اور اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو سکے بلکہ نقصان دہ بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دعائیں آیا ہے۔ ”اللہم اجعلہ ریاحاً والالتجعله ریحاً“ خداوند تو اُسے کئی ہوائیں قرار دے نہ کہ ایک ہوا۔<sup>[۱]</sup>

”راغب“، ”مفردات“ میں کہتے ہیں کہ خداوند عالم نے (قرآن مجید کے) جن جن مقامات پر لفظ ”ریح“ کو مفرد صورت میں ذکر فرمایا ہے وہاں پر عذاب کی حکایت کی گئی ہے اور جہاں پر جمع کا ذکر کیا ہے وہاں پر رحمت کی حکایت کی گئی ہے۔

راغب کا یہ فرمان ”جمع“ کے بارے میں تو صحیح ہے لیکن مفرد (ریح) کے متعلق عمومی نہیں ہے کیونکہ ریح کا لفظ قرآن مجید میں نعمت کے بارے میں بھی استعمال کیا گیا ہے، جیسا کہ سورہ یونس کی بائیسویں آیت میں ہے:

”حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلِكِ وَجَرَبَينَ بِهِمْ بِرِيحٍ طَبَّيْتَةٍ وَّفِرِحُوا بِهَا“ حتیٰ کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور بہتر اور موافق ہوا اُسے (منزل مقصود کی طرف) حرکت دیتی ہے اور وہ خوش ہوتے ہیں۔

حضرت سلیمان کے بارے میں بھی ہم پڑھتے ہیں۔ سورہ سبأ/ ۱۲)

”وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَاجُهَا شَهْرٌ“ ہم نے ہوا کو سلیمان کیلئے مسخر کر دیا کہ صبح کے وقت ایک ماہ کا راستہ طے

[۱] مجمع البحرین مادہ ”ریح“

ہوتا تھا اور شام کے وقت ایک ماہ کا راستہ۔

”تَضَرُّيْفِ الرِّيَاحِ“ کا معنی ہے ہواؤں کو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل کرنا (شمالی کو جنوبی کی طرف اور جنوبی کو شمالی کی طرف) اور یہ ”صرف“ (بروزن حرف) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہے کس چیز کو ایک حالت سے دوسرے حالت کی طرف پھیرنا یا کسی چیز کو دوسری چیز میں تبدیل کرنا۔ [۱]

ممکن ہے کہ یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ ہاگر ہوائیں ہمیشہ ایک رخ پر چلتی رہیں تو ممکن ہے سمندروں سے اٹھی ہوئی رطوبتوں اور بادلوں کو صرف ایک سمت چلاتی رہیں۔ لیکن ہواؤں کی تبدیلی اس بات کا سبب بن جاتی ہے کہ بادل ایک نقطے سے دوسرے نقطے تک اور ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف حرکت کرتے ہیں اور خشک زمینوں کا اکثر حصہ اس بارش سے زیادہ سے زیادہ بہرہ مند ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں، جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے، ہواؤں کا فائدہ صرف بادلوں کے چلانے ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ ان کے اور بھی بہت سے فوائد ہیں جنہیں ہم انشاء اللہ آیات کی تفسیر میں بیان کریں گے۔ [۲]

”سحاب“؛ ”سحب“ (بروزن محو) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں کھینچنا، اور چونکہ بادل ہواؤں کے ذریعہ کھینچے جاتے ہیں یا بادل پانی کو ہر طرف کھینچے پھرتے ہیں اسی لئے انہیں ”سحاب“ کہتے ہیں یہ لفظ کبھی تشبیہ کے طور پر سائب، ظلمت اور تاریکی پر بھی بولا جاتا ہے۔ یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ بعض آیات میں ”سقناہ“ کا لفظ ”سوق“ کے مادہ سے استعمال ہوا ہے جس کے معنی چلانا ہیں۔ یہ تعبیر اس لئے استعمال کی گئی ہے کہ خداوند عالم اسے معین اور مقررہ جگہ کی طرف تیزی سے چلاتا ہے (ہر چند کہ سحاب کی طبیعت میں ہی حرکت ہے)

”مُزْن“ (بروزن حُون) کا معنی ”روشن بادل“ ہے جب کہ بعض مفسرین نے ”بارش برسانے والے بادلوں سے اس کی تفسیر کی ہے۔ [۳]

اسی لئے جب چاند بادلوں کے درمیان سے رونما ہوتا ہے تو اسے ”ابن مزنہ“ یعنی بادل کا بیٹا کہتے ہیں۔ ”مازن“ ایک ایسی تعبیر ہے جو سفید چیونٹیوں کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

”بُشْر“ (بروزن عَشْر) مصباح اللغہ کے بقول ”بُشْر“ (بروزن عَشْر) سے لیا گیا ہے جس نے معنی خوشی اور سرور ہیں۔ [۴]

[۱] مجمع البحرین اور مفردات راغب

[۲] عرب حضرات ہوا کو چار قسموں میں تقسیم کرتے ہیں، ۱۔ شمال جو شمال کی جانب سے چلتی ہے۔ ۲۔ جنوب، جو جنوب کی طرف سے حرکت کرتی ہے۔ ۳۔ صبا، جو مشرق سے چلتی ہے۔ ۴۔ اور دبور، جو مغرب کی طرف سے چلتی ہے۔

[۳] ”مفردات راغب“ اور ”لسان العرب“ مادہ مزن

[۴] ”نشر“ اسم مصدر ہے جو اسم فاعل (خوشخبری دینے والا) کے معنی میں بھی آتا ہے۔



اسی سورہ روم میں فرماتا ہے:

”فَانظُرْ آلَىٰ اَثَارِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِي الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا“ خداوند عالم کی رحمت کے آثار کو دیکھو کہ وہ مردہ زمین کو کیونکر زندہ کرتا ہے؟ (روم۔۔۔ ۵)

اس آیت کے مفہوم کو سمجھنے کیلئے کافی ہے کہ ان تصویروں کو دیکھا جائے جو افریقی زمینوں کے صحراؤں اور زرعی علاقوں سے لی گئی ہیں۔ جہاں متواتر خشک سالی کی وجہ سے موت کے آثار نمایاں ہیں اور فرشتہ نیات وہاں سے اپنا بوریا بستر گول کر چکا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہوا کی یہی لطیف موجیں بارش کے قطرے بھی آسانی سے جن میں سوراخ کر دیتے ہیں جب حکم پالیتی ہیں تو بڑے بڑے تناور درختوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہیں اور سر بفلک عمارتوں کو زمین بوس کر دیتی ہیں، انسان کو اپنے ساتھ آسمان میں اڑائے پھرتی ہیں اور کہیں دور دراز علاقے میں جا گراتی ہیں۔

دوسری آیت بھی اسی چیز کو مختصر سے فرق کے ساتھ بیان کر رہی ہے جس میں ہواؤں کا تعارف خوشخبری دینے والے کے عنوان سے کرایا گیا ہے، ہواؤں کے ذریعہ بارش کے نازل ہونے کے علاوہ کشتیوں کو بھی حرکت میں لانے کا ذریعہ بتایا گیا ہے اور آخر میں فرمایا ہے۔ ”مَقْصِدِي هِيَ هِيَ كَمَا خَلَقْتُ الْاَرْضَ وَمَا لِي لَا اُحْيِي الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا“ (مقصد یہ ہے کہ تم خدا کے فضل کو حاصل کرو، شاید اس کا شکر بجالاؤ) (وَلْيَتَذَكَّرْ اِنْ لَّمْ يَرَوْا آيَاتِنَا وَمَا يَحْكُمُنَا لَآ اِلهَ اِلَّا اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ) (مقصد یہ ہے کہ وہ تمہیں اپنی رحمت سے چکھائے) کا جملہ ممکن ہے ہواؤں کے دوسرے فوائد کی طرف اشارہ ہو۔ مثلاً درختوں کے پھلوں کی افزائش، بد بوؤں کا دور کرنا اور فضا کو آلودگیوں سے صاف رکھنا وغیرہ جیسا کہ تفسیر ”المیزان“ میں بھی اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ [۱]

سچی بات تو یہ ہے کہ جب تک کوئی نعمت انسان سے سلب نہ ہو جائے اس وقت تک اسے اس کی قدر معلوم نہیں ہوتی۔ اگر کسی دن نسیم سحر اور یہ ہوائیں متوقف ہو جائیں تو بہترین باغوں اور بہاروں کی زندگی بھی کال کوٹھڑیوں کی زندگی سے بدتر ہو جائے۔ اسی طرح اگر قید تنہائی کی کال کھوٹھڑی میں باونیم کے جھونکے پہنچ جائیں تو اس کی قدر و قیمت کھلی فضا سے کم نہیں ہوتی۔ علی ہذا القیاس اگر سمندروں کی سطح پر چلنے والی ہوائیں بند ہو جائیں اور موجیں وجود میں نہ آئیں تو آکسیجن کی کمی کی بنا پر بہت سے سمندری جانوروں کی زندگی خطرے میں پڑ جائے، اور سمندر وحشت ناک بدبودار دلدلوں میں بدل جائیں۔

تیسری آیت میں بھی اسی معنی کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ البتہ یہ ضرور بتایا گیا ہے کہ ہوائیں اس کی رحمت کے آگے آگے چلتی ہیں اور بادلوں کی ”ثقال“ (ثقیل کی جمع اور بوجھل کے معنی ہے) کے ساتھ توصیف کی گئی ہے۔ کیونکہ بارش برسانے والے بادل دوسرے بادلوں کی نسبت زیادہ ثقیل ہوتے ہیں اور زمین سے نزدیکی فاصلے پر ہوتے ہیں۔ اسی لئے قرآن مجید نے انہیں ”ثقیل بادل“ کا نام دیا ہے۔

”اَقْلَتُ“، ”اَقْلَالُ“ (بروزن اجال) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں ایسی چیز کا ٹھکانا جو اٹھانے والے کی طاقت کے لحاظ سے

ہلکی ہوتی ہے اور اٹھانے والا اسے معمولی چیز سمجھے۔ مندرجہ بالا آیت میں اس تعبیر کا وجود اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ بھاری پھر کم اور ثقیل بادل جو بسا اوقات لاکھوں، کروڑوں ٹن پانی اپنے ساتھ لئے ہوتے ہیں، ہوا کے دوش پر زیادہ بوجھل نہیں ہوتے اور یہ خدا کی قدرت کی نشانی ہے چوتھی آیت میں ہواؤں کے ان عظیم امور کی انجام دہی کیلئے بھیجنے کو اسکی پاک ذات کے آثاروں میں شمار کیا گیا ہے کہ مردہ زمینوں کو ان کے ذریعہ زندہ کرتا ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں ”تغییر“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، یعنی ہوا میں بادلوں کو برا بھینٹہ کرتی ہیں۔ ممکن ہے کہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ بادلوں کا وجود میں آنا گرم علاقوں میں سمندروں کی سطح پر ہواؤں کے چلنے کا مرہون منت ہوتا ہے کیونکہ بادلوں کی حرکت کا مسئلہ ”فَنَسْفُتًا“ کے جملہ سے قابل توجہ قرار پاتا ہے۔ اس طرح بادلوں کے وجود میں آنے کیلئے ہواؤں کا بھی گہر تعلق ہوتا ہے کہ وہ انہیں خشک علاقوں میں حرکت میں لاتی ہیں پھر بلند فضا میں لے جا کر باتش برسنے کا ماحول پیدا کرتی ہیں۔

”تغییر“ کا جملہ فعل مضارع کی صورت میں ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ عمل دائمی اور ہمیشہ سے جاری ہے۔

بہر حال یہ مسئلہ بھی ایک تو خالق کائنات کے علم و قدرت کی نشانی ہے اور دوسرے اس کی معاد پر قدرت رکھنے کی دلیل ہے، لہذا اس قسم کی بعض آیات کے ساتھ ساتھ معاد کے مسئلہ کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

پانچویں آیت میں سات قسم کی مختلف چیزوں کی آفرینش کو ان لوگوں کے لئے خدا کی نشانیاں بتایا گیا ہے جو صاحبان عقل و فکر ہیں، آسمان وزمین کی تخلیق، رات اور دن کی آمد و رفت جو کشتیاں سطح سمندر پر لوگوں کے مفادات کیلئے چلتی ہیں ان کی حرکت، زندگی عطا کرنے والی بارش، ہواؤں کا الٹ پھیر اور ان بادلوں کی گردش، جو زمین و آسمان کے درمیان معلق ہیں۔

اس آیت میں بھی ایک تو ہواؤں کی مختلف حرکتوں کے مسئلہ کو بیان کیا گیا ہے (وَتَضْرِبُ الرِّيحُ) اور دوسرے ان بادلوں کی حرکتوں کو بیان کیا گیا ہے جو زمین اور آسمان کے درمیان معلق ہیں۔ (وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ) ایسے بادل جو پانی کے سمندروں کو اپنے اندر لئے ہوتے ہیں لیکن پھر بھی زمین اور آسمان کے درمیان معلق رہتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ چیز خداوند عالم کی عظیم ترین نشانیوں میں سے ایک ہے۔ اسی طرح ”زندگی عطا کرنے والی بارش کا نزول جو ایک طرف تو مردہ زمینوں کو زندہ کرتی ہے اور دوسری طرف روئے زمین پر چلنے والی چیز کو حرکت میں لاتی ہے“ (فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ)

اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس آیت میں ہواؤں اور بادلوں کا تذکرہ بارش کے نازل ہونے کے بعد ہوا ہے تو یہ شاید اس دقیق نکتے کی تعلیم کیلئے ہے کہ ہواؤں کا فائدہ صرف بادلوں کی حرکت اور نزول باران میں منحصر نہیں ہے بلکہ ان کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں کہ پہلے بھی جن کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے اور جمع بندی کے باب میں بھی اشارہ کیا جائے گا۔

اس طرح بادل بھی بارش کے نزول کے بغیر بذات خود ایک عجیب مسئلہ ہیں کیونکہ یہ پانی کے سمندر اپنے اندر لئے ہوتے ہیں لیکن اس

کے باوجود وہ زمین و آسمان کے درمیان معلق رہتے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

چھٹی آیت میں انسان کے پینے کے پانی کی بات کی گئی ہے اور ایک نئے نکتے کی یاد آوری کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ”کیا تم نے اس پانی کے بارے میں بھی سوچا ہے جو تم پیتے ہو؟ کیا تم بارش کے ساتھ نازل کرتے ہو یا ہم نازل کرتے ہیں؟“ پھر فرمایا ”اگر ہم چاہیں تو اس خوشگوار اومیٹھے پانی کو کڑوا یا نمکین بنا دیں پس تم اس عظیم نعمت کا شکر کیوں نہیں بجالاتے؟“ (لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ) اگر سمندر کا پانی تبخیر (بخارات بننے) کے موقع پر نمک کے چھوٹے چھوٹے ذرات اپنے ساتھ آسمان کی طرف لے جاتا اور بادلوں سے نمکین اور کڑوا پانی برستا تو سارے کا سارا کڑوا ارضی شورہ راز میں بدل جاتا نہ تو اس پر کسی قسم کی گھاس اُگتی اور نہ ہی کوئی درخت پیدا ہوتا، اگر انسان پیاس سے مرنے لگتا تو اس سے ایک گھونٹ پانی بھی نہ پی سکتا۔

یہی موضوع کہ اس نے پانیوں کو حکم دیا ہے کہ وہ بخارات بن جائیں اور سمندری پانی میں موجود نمک کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے جگہ پر باقی رہ جائیں، انسان بلکہ تمام چیزوں کی زندگی کے چہرے کو مکمل طور پر تبدیل کئے ہوئے ہے کیا کوئی شخص ساری زندگی صرف اسی ایک نعمت ہی کا شکر ادا کر سکتا ہے۔

”مزن“ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اس کے معنی بارش برسانے والے بادل ہیں اور ”اُجاج“ کے معنی وہ پانی ہیں جو زبردست کڑوا یا نمکین ہو۔

ساتویں آیت میں خداوند عالم کی اپنے بندوں پر عظیم نعمتوں میں سے دو نعمتوں کی طرف اشارہ ہے، ایک تو صحرا اور دریا کی (خشکی اور سمندری) تاریکیوں میں (ستاروں کے ذریعہ) ہدایت کی نعمت ہے اور دوسری بارانِ رحمت کا نزول سے پہلے خوشخبری عطا کرنے والی ہواؤں کا بھیجنا ہے کہ جہاں پر بھی بارانِ رحمت کا نزول ہوتا ہے وہیں پر زندگی کے نغمے گونجنے لگتے ہیں اور مختلف خیر و برکتیں وجود میں آتی ہیں۔ آیت کے آخری میں خداوند متعال کی وحدانیت پر ان دونوں موضوعات کو سند قرار دے کر مشرکین کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ خداوند متعال اس بات سے کہیں بلند و بالا ہے کہ اس کیلئے شریک قرار دیتے ہیں۔ (ء) إِلَهٌ مِّمَّكَ اللَّهُ تَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ“

ان دو عطیات کا ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب مطلع صاف ہو تو وہ ستاروں کے ذریعہ رات کے وقت منزل مقصود تک پہنچنے کیلئے راہیں تلاش کر لیتے ہیں اور اگر مطلع ابر آلود ہو تو ایک اور رحمت ان کے پاس آ جاتی ہے۔ لہذا دونوں صورتوں میں خدا کی رحمت اور عنایت ہے جو اس کی ذات پاک کی معرفت کی علامت ہے۔

آٹھویں آیت میں ایک نئی تعبیر کے ساتھ ہواؤں اور بارش کے نزول کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”ہم نے ہواؤں

[۱] تو ج رہے کہ یہ بادل وہی بخارات ہیں جو تہہ در تہہ موجود ہوتے ہیں، اگر زمین پر ہوں تو عرب انہیں ”ضباب“ (بروزنِ عراب) یعنی گہر کہتے ہیں اور جب آسمان پر چڑھ جاتے ہیں تو انہیں ”سحاب“، ”غیم“ اور ”غمام“ کہتے ہیں۔ (المیزان جلد اول ص ۴۱۱)



کو بارور کرنے کیلئے بھیجا ہے۔ (وَآزَسَلْنَا الرِّيحَ لَوَاقِحَ)

کیا بارور کرنے سے مراد نباتات کا بارور کرنا ہے اور وہ یوں کہ ہواؤں کے ذریعہ نباتات کا بومر مادہ نباتات کے بومر پر ڈالنا اور میوہ جات اور دانوں کو بارور کرنا ہے، یا بادلوں کے ٹکڑوں کو بارور کرنا اور انہیں آپس میں ملانا ہے؟ چونکہ آیت کے دوران فرماتا ہے۔ ”فَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنْبَتْنَا كُنُوزَهُ“ (ہم نے آسمان سے پانی بھیجا ہے اور تمہیں اس سے سیراب کیا ہے) لہذا دوسرا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، ہر چند کہ دونوں معانی سے باہم استفادہ بھی ممکن معلوم ہوتا ہے۔

بہر حال مندرجہ بالا تعبیر نہایت ہی دلکش ہے کیونکہ اس میں بادلوں کے ٹکڑوں کو ماں اور باپ سے تشبیہ دی گئی ہے جن کا ہواؤں کی مدد سے آپس میں ملاپ ہوتا ہے جس سے وہ باردار ہوتے ہیں اور وضع حمل کرتے ہیں اور اپنے نومولودوں یعنی بارش کے قطروں کو زمین پر بٹھاتے ہیں۔

آیت کے آخر میں زیر زمین پانیوں کے ذخائر کی طرف ایک سربستہ اشارہ ہے جو خداوند عالم کی طرف سے زمین کے اندر چھپائے گئے اور ارشاد فرمایا ہے ”تم ہرگز بارش کے پانی کو محفوظ اور ذخیرہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔“ (وَمَا أَنْتُمْ لَهُ بِخَازِنِينَ) یعنی یہ ہم ہیں کہ زمین کی فشر کو حکم دیا ہے کہ وہ بارش کے پانی کو اس کے نازل ہوتے ہیں صاف کر کے اپنے اندر ذخیرہ کر لے۔ یہ تمہارے کنوؤں اور کاریزوں کا پانی ہی تو ہے جو ذخیرے کی صورت میں ہزار ہا سال سے زیر زمین موجود ہے اور آج تم اس سے استفادہ کر رہے ہو۔ اب تک نہ تو آلودہ ہوا ہے اور نہ ہی خراب۔

یا پھر اسے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کی صورت میں منجمد کر کے رکھا ہوا ہے جو آہستہ آہستہ گھلتا رہتا ہے، جس سے تم بھی سیراب ہوتے ہو اور تمہارے جانور بھی اور کھیتوں کیلئے آبپاشی بھی کرتے ہو۔ کیا معلوم جو پانی آج تم استعمال کر رہے ہو وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کی صورت میں موجود ہزاروں سال قبل کا ہو!

نویں آیت میں آسمان سے پانی کے نازل ہونے کے علاوہ چشموں کی پیدائش کی طرف بھی اشارہ فرماتے ہوئے کہتا ہے۔ ”کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خداوند عالم نے آسمان سے پانی بھیجا ہے اور پھر اسے چشموں کی صورت میں زمین کے اندر داخل کر دیا ہے؟“ (الَّذِي أَنْزَلَ اللَّهُ أَنْزَلًا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ)

”ینابیع“، ”ینوع“ کی جمع ہے جس کے معنی چشمہ ہیں اور دراصل ”نوع“ کے مادہ سے ہے جس نے معنی ہیں پانی کا زمین سے پھوٹنا۔ البتہ زمین سے چشموں کی پیدائش جن سے انسان کسی طاقت کے خرچ کئے بغیر بہرہ مند ہوتا ہے، خاص شرائط کی مرہون منت ہے۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ زمین کی فشر پانی کے نفوذ کو قبول کرتی ہو تاکہ پانی اس کے اندر چلا جائے۔ پھر اس کا نچلا حصہ ایسی فشر ہو جو پانی کو قبول نہ کرے تاکہ پانی وہاں پر کارہے اور ذخیرہ کی صورت میں موجود رہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ پانی کے ذخیرے اور دوسرے نقاط کی سطح کا آپس میں فرق ہوتا کہ پانی وہاں سے بہہ کر دوسرے مقامات کو چلا جائے۔ ظاہری بات ہے کہ یہ سب کچھ ایک باقاعدہ منظم اور نیچے تلے پرور گرام کے بغیر ناممکن ہے اور یہ پرور گرام ایک مبدائے علم و قدرت کے نقشے کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔

اسی آیت میں آگے چل کر فرماتا ہے ”پھر خداوندِ عالم اس کے ذریعہ ایسی کھیتی اگاتا ہے جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔“ (تَمَّ بِخُرْجِ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ)

ممکن ہے رنگوں کا یہ اختلاف نباتات کے ان رنگوں کی طرف اشارہ ہو جو پوری طرح مختلف ہیں، یا مختلف نباتاتوں اور زینت کے پھولوں اور دواؤں، غذاؤں اور مصنوعات کے لئے استعمال ہونے والے پھولوں کی طرف اشارہ ہو جو حقیقت میں بے شمار انواع پر مشتمل ہیں۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ خداوندِ عالم اس بے رنگ پانی سے اس گلزارِ ہستی میں لاکھوں رنگ کے پھول اور سبزے آگاتا ہے اور بقول شاعر

زآب	بے	رنگ	صد	ہزاراں	رنگ
لالہ	وگل	نگردراہن	گلزار		
بے	بری	گر بہ	رازشان	دانی	
کہ	ہمیں	است	سرّ این	اسرار	
کہ	یکی	ہست	وہج	نیست	جزاؤ
وَخَدَّهٖ	اَلَا	اِلٰهَ	اِلَّا	هُو	

یعنی بے رنگ پانی سے لاکھوں رنگ کے گل اور لالے اس گلزارِ ہست و بود میں دیکھو۔ اگر تم اس بات پر غور کرو تو تمہیں ان تمام رازوں کا پتہ چل جائے کہ ان کا خالق ایک اور صرف ایک ہے جو وحدہ لا شریک ہے۔ اسی لئے آیت کے آخر میں فرماتا ”اس تمام ماجرا میں ان لوگوں کیلئے نصیحت کی باتیں ہیں جو صاحبانِ عقل و خرد ہیں“ (اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرًا لِّاُولٰٓئِی الالْبَابِ)

دسویں آیت میں ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ”ہم نے معصرات سے بڑی مقدار میں پانی نازل کیا ہے۔“ (وَ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمَعْصِرٰتِ مَآءً مُّجْتَابًا)

”معصرات“، ”معصر“ کی جمع ہے اور ”معصر“ یعنی نچوڑنے کے مادہ سے لیا گیا ہے، ”معصرات“ کے معنی ”نچوڑنے والے“ ہیں۔ اس تعبیر کا کیا مقصد ہے، اس بارے میں متعدد تفسیریں بیان کی گئی ہیں۔ بعض مفسرین نے اسے بادلوں کی صفت قرار دیا ہے، اور اسے ایک سسٹم کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ جب بادل آپس میں مل جاتے ہیں تو یہ سسٹم اس وقت ان پر حکم فرما ہوتا ہے، گویا وہ خود کو نچوڑتے اور خود پر دباؤ ڈالتے ہیں تاکہ ان سے بارش برسے اور اس تعبیر کو وہ قرآن پاک کے علمی معجزات میں سے ایک معجزہ سمجھتے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

لیکن بعض دوسرے مفسرین اس (معصرات) کو ہواؤں کی صفت سمجھتے ہیں اور ہوائی طوفانوں اور بگولوں کی طرف اشارہ جانتے ہیں جن کا موسمِ دھار بارش کے وجود میں آنے کا بڑی حد تک عمل دخل ہے (یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ”اعصار“ کے معنی بگولا ہیں۔

[۱] ”باد و باران“ نامی کتاب کے ص ۱۲۶ کا مطالعہ کریں۔

وہ کہتے ہیں کہ جب زبردست قسم کے بگولے سمندروں اور بحر اوقیانوس کی سطح پر چلتے ہیں تو وہ ان سمندروں کی سطح کے بخارات اپنے ساتھ اوپر لے جاتے ہیں اور جب وہ فضا کے بالائی حصے میں انہیں لے جاتے ہیں جو زبردست سرد ہوتا ہے تو وہاں پر شدید قسم کی موسلا دھار بارش کا وجود عمل میں آجاتا ہے۔ اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ ”شجاج“ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اور ”شجج“ (بروزن حج) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں ”پانی کا مسلسل اور زور زور سے گرنا“ یہ معنی اس قسم کی موسلا دھار بارش سے زیادہ مناسب رکھتے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

بعض مفسرین اسے ان بادلوں کی طرف اشارہ جانتے ہیں جو بگولوں اور طوفانوں کے ساتھ<sup>[۲]</sup> ہوتے ہیں۔ یہ طوفان بادلوں کو اٹھا کر اوپر لے جاتے ہیں اور انہیں فضا کے سرد علاقوں تک جا پہنچاتے ہیں۔ جہاں جا کر بارش کے قطروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ چونکہ یہ کام بڑی تیزی سے انجام پاتا ہے اسی لئے موسلا دھار بارش اور ”ماء شجاج“ کا وجود عملی آجاتا۔ اس قسم کی بارش عموماً موسم بہار میں ہوتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ اس موسم میں اس قسم کے بگولے اور طوفان زیادہ ہوتے ہیں۔

انہی آیت میں فرماتا ہے۔ ”مقصد یہ ہے، کہ اسکے ذریعہ سے ہم اناج، بڑی مقدار میں نباتات اور درختوں سے بھر ہوئے باغات اُگائیں۔“ (لِنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا وَأَنْجَابًا وَالْأَنْجَابُ) اور یہ تعبیر ہر قسم کی نباتات اور اناج اور پھل دار درختوں کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔

گیارہویں آیت میں، اس بیان کے بعد جو اس سے پہلی آیات میں گزر چکا ہے، (خداوند عالم وہی تو ہے جو اپنی رحمت کے نازل ہونے سے پہلے ہواؤں کو خوشخبری دینے والا بنا کر بھیجتا ہے) یوں فرماتا ہے: ”ہم نے آسمان سے پاک اور پاک کرنے والا پانی نازل کیا۔“ (وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا)

یہ ایک نیا نکتہ ہے جس پر اس آیت میں زور دیا گیا ہے۔

”طہور“، ”طھارت“ اور پاکیزگی کا مبالغہ کا صیغہ ہے جس میں ”پاک ہونے اور پاک کرنے“ کے معنی پائے جاتے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر پانی میں پاک کرنے کی خاصیت نہ ہوتی تو ایک ہی دن میں ہماری تمام زندگی اور تمام جسم و جان آلودہ ہو کر رہ جاتے۔ اس بات کی حقیقت کا ادراک تو ہم اس وقت کرے ہیں جب کسی ایسی جگہ پھنس جاتے ہیں جہاں نہانے اور دھونے کیلئے پانی موجود نہیں ہوتا، نہ تو وہاں پر غذا تیار کی جاسکتی ہے اور نہ ہی بدن کی صفائی، جس سے فرحت و سرور اور صحت و سلامتی کا فقدان ہو جاتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ پانی جراثیم کو ختم نہیں کرتا، لیکن چونکہ بہت سی چیزوں کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لہذا کسی قسم کے جراثیم کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔ اسی لئے یہ صحت و سلامتی کیلئے ایک نہایت موثر عامل ہے۔ اس کے علاوہ وضو اور غسل کے ذریعہ انسانی روح کو بھی آلودگیوں سے پاک کرتا ہے۔

[۱] ”عجاز قرآن از نظر علوم امروزی“ ص ۶۷

[۲] تفسیر کبیر از فخر رازی جلد ۳۱ ص ۸ میں اس معنی کو آیت کی ایک تفسیر کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے۔

اس لئے تو اس کے بعد کی آیت میں آیا ہے۔ ”لِنُحْيِي بِهِ بَلَدًا كَثِيرًا“ (تاکہ ہم اس کے ذریعہ مردہ زمین کو زندہ کریں) اسی سلسلے کی بارہویں اور آخری آیت میں ایک بار پھر ایک اور نئے نکتے سے آگاہ ہوتے ہیں، وہ یہ کہ خداوند عالم پانیوں کو ”جرز“ یعنی خشک و بے آب و گیاہ زمینوں کی طرف بھیجتا ہے۔ اشارہ ہوتا ہے۔ ”کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم پانی کو ایسی خشک زمین کی طرف ہٹا کر لے جاتے ہیں جس میں گھاس تک نہیں اُگی؟“ (أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ الْمَاءَ إِلَى الْأَرْضِ الْجَوْرِ) ”اور اس کے ذریعہ کھیتی اگاتے ہیں جس سے اُن کے چوپائے بھی کھاتے ہیں اور وہ خود بھی (فَنُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا تَأْكُلُ مِنْهُ أَنْعَامُهُمْ أَنْفُسُهُمْ)

ارباب لغت کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ ”جرز“ (بروزن شتر) دراصل جرر (بروزن مرض) کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں ”منقطع ہونا“ (پانی کا منقطع ہونا، گھاس اور نباتات کا منقطع ہونا، خوشی و خرمی اور تروتازگی کا منقطع ہونا) اسی لئے ”ناقتہ جروز“ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو سب کچھ کھائے اور منقطع کر دے اور ”رحل جروز“ اس شخص کو کہتے ہیں جو دسترخوان پر موجود سب کچھ چٹ کر جائے۔ [۱] آیت کے آخر میں خداوند عالم عظیم نعمتوں اور توحید کی نشانیوں کا دقیق مطالعہ کرنے کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے۔ ”کیا وہ نہیں دیکھتے؟“ (أَفَلَا يَبْصُرُونَ)

مندرجہ بالا آیت میں ”انعام“ (چوپاؤں) کو انسان پر کیوں مقدم کیا گیا ہے؟ اس بارے میں بعض مفسرین نے کہا ہے کیونکہ نباتات زمین سے اُگتے ہیں چوپاؤں کیلئے قابل استفادہ ہوتی ہیں۔ نیز چوپائے فقط نباتات سے ہی غذا حاصل کرتے ہیں جب کہ انسان دوسری غذائیں بھی کھاتا ہے۔ [۲]

## نتیجہ کلام

آیات بالا میں مذکور دقیق اور ظریف نکات کو پیش نظر رکھ کر اُن سے بات بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ ہواؤں، بادلوں اور بارشوں کے مسائل پر نہایت ہی چچا تلا اور حساب و کتاب شدہ نظام حاکم ہے۔ اس سلسلے میں انسان جتنا زیادہ غور کرے گا اسی قدر اس کی باریکیوں، ظرافتوں، فوائد اور برکات سے بیشتر مطلع ہوتا جائے گا۔ ان آیات کے ایک حصے میں پانی کو مایہ حیات بتایا گیا ہے کچھ آیات میں اُسے طہارت اور پاکیزگی کا ذریعہ، بعض میں بابرکت چیز (سورہ ق/۹) کہیں پر ایک خوشگوار مشروب قرار دیا گیا ہے (مَاءٌ فُرَاتًا۔ مرسلات/ ۲۷) مجموعی طور پر ہم اس کے جس گوشے اور پہلو پر نگاہ ڈالیں، وہیں ہمیں خداوند عالم اور اس کی حکمت کے آثار نظر آئیں گے اور جس حصے کو بھی دیکھیں وہیں اس کے نشانات دکھائی دیں گے۔

[۱] کتاب التحقیق فی کلمات الکریم، اور ”مصباح اللغۃ“

[۲] تفسیر فخر رازی جلد ۲۵ ص ۱۸۷

## چند ضروری وضاحتیں

### ۱۔ ہواؤں کی پیدائش اور ان کے فوائد

ہوا کی پیدائش کا سرچشمہ اور اصل سبب تو وہی زمین کے دو مختلف منطقوں کے درجہ حرارت کا اختلاف ہی ہے، جس کا ہم موسم سرما میں آسانی کے ساتھ تجربہ کر سکتے ہیں جب ہمارے کمرے کی فضا گرم ہو اور بیرونی فضا سرد ہو، جب ہم دروازے کو تھوڑا سا کھول دیں اور درموم بتیاں جلا دیں۔ ایک کو در کے اوپر اور دوسری کو نیچے رکھ دیں تو پتہ چلے گا کہ ٹھنڈی ہوا ثقیل ہونے کی وجہ سے نیچے سے داخل ہوتی ہے اور گرم ہوا ہلکا ہونے کی وجہ سے اوپر کی طرف سے باہر نکل جاتی ہے اور موم بتی کے شعلے کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں (گرم ہوا پھیلی ہوئی اور ہلکی ہوتی ہے جب کہ سرد ہوا سکڑی ہوئی اور بھاری ہوتی ہے۔ اگر ہواؤں میں یہ خاصیت نہ ہوتی اور ہوائیں رُک جاتیں تو اندازہ لگائیے کہ بنی نوع انسان پر کیا گزرتی؟)

یہ بات بھی ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ کرہ زمین پر تین منطقے ہیں، ایک نہات ہی سرد (قطبی علاقہ) دوسرا نہایت گرم (استوائی علاقہ) اور تیسرے معتدل (ان دونوں منطقوں کا درمیانی علاقہ) روئے زمین پر درجہ حرارت کا یہ اختلاف ہوا کے ہمیشہ کیلئے ایک طرف سے دوسری طرف کو چلنے کا سبب بنتا ہے جن میں سے اہم ترین ہواؤں کو ”آلیزہ“ کہتے ہیں (وہ ہوائیں جو قطبی علاقہ سے استوائی منطقہ کی طرف چلتی ہے۔ چونکہ یہ طبعی طور پر سرد ہوتی ہیں لہذا کرہ زمین کے قریب قریب چلتی ہے اور ان کو ”کاؤنٹر آلیزہ“ کہتے ہیں (وہ ہوائیں جو استوائی منطقہ سے قطبی علاقہ کی طرف چلتی ہیں۔ چونکہ گرم ہوتی ہیں لہذا فضا کے بالائی حصے میں چلتی ہیں۔) [۱]

علاوہ ازیں جب سمندروں پر سورج کی دھوپ پڑتی ہے تو ان کا پانی ساحل کی گرمی کے مطابق گرم نہیں ہوتا۔ پھر یہ کہ رات کے وقت سمندر کا پانی ساحل کی نسبت جلد ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ساحل اور سمندر کے درمیان درجہ حرارت کا یہ اختلاف بھی ہمیشہ کیلئے ہواؤں کے ساحل کی طرف سے سمندر کی طرف سے ساحل کی طرف چلنے کا سبب بنتا ہے۔

ان سب وجوہات سے قطع نظر زمین کو گول ہونا بھی اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ زمین کے بعض منطقے (بوقت ظہر) سورج کے عین سامنے آجاتے ہیں اور بعض دوسرے منطقوں میں سورج کی شعاعیں ترچھی پڑتی ہیں۔ (سورج کے طلوع اور غروب ہونے کے وقت) درجہ حرارت کا یہ اختلاف بھی مختلف علاقوں میں ہواؤں کی پیدائش کا ایک عامل ہے۔ (اسی طرح کئی اور پیچیدہ عوامل ہیں)۔

یہ سب عوامل مل کر اور ایک دوسرے کے نیچے میں پنچہ ڈال کر پورے کرہ زمین پر ہواؤں کو حرکت میں لاتے ہیں اور مندرجہ ذیل بہت سے فوائد کو ہمراہ لاتے ہیں جن کی طرف مذکورہ بالا آیات میں اشارہ ہو چکا ہے:

[۱] کتاب ”عجاظ قرآن از نظر علوم امروز“ ص ۶۵



مالیکیول ان سے جدا ہو چکے ہیں وہ بخارات کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ چنانچہ بادل اور بارش کی پیدائش کے بارے میں غور و فکر ہمیں ان کے بہت سے دلچسپ اسرار سے مطلع کرتا ہے، جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱۔ اکثر مائع چیزیں ایسی ہیں کہ جب تک وہ گھولنے کے درجہ تک نہ پہنچ جائیں، بخارات نہیں بنتیں۔ لیکن استثناء پانی ایک ایسا مائع ہے جو ہر طرح کے درجہ حرارت میں بخارات بن سکتا ہے۔ اگر پانی میں یہ خصوصیت نہ ہوتی تو سمندر کے پانی کا ایک قطر بھی بخارات نہ بن سکتا اور کوئی بادل پیدا نہ ہو سکتا۔ بارش نہ ہوتی تو تمام خشکی بے آبی کی وجہ سے جل جاتی۔

۲۔ یہ بات بھی زبردست اہمیت کی حامل ہے کہ بخارات بننے وقت صرف خالص پانی ہی بخارات بنتا ہے اور نمک اور دوسرے ذرات جو اس میں ہوتے ہیں، وہ اپنی جگہ پر باقی رہتے ہیں، یعنی ہمیشہ طبعی تصفیہ ہوتا رہتا ہے تاکہ انسان کو زیادہ سے زیادہ صاف اور خالص پانی ملتا رہے۔

۳۔ اگر فضا کا بالائی حصہ اس کے نچلے حصے سے زیادہ سرد نہ ہوتا تو فضا میں پھرنے والے سرگرداں بادل کبھی نہ برستے۔ لیکن درجوں کا یہ اختلاف بارش کے برسنے کا سبب ہوتا ہے۔ اور اگر بخارات کے ذروں کی کیفیت ٹھنڈی اور گرم ہوا میں ایک جیسی ہوتی تو بھی بارش نہ ہوتی۔ لیکن گرم فضا میں یہ قوت کم ہوتی ہے، لہذا بخارات کو پانی میں تبدیل کر کے نیچے بھیجتی ہے۔

۴۔ نباتات کی پرورش کیلئے ضروری پانی مہیا کرنے کے علاوہ بارش سطح زمین کو بھی دھو دیتی ہے اور ان تمام آلودگیوں کو اپنے ساتھ لے کر سمندر میں پہنچا دیتی ہے۔

۵۔ بارش فضا کو بھی دھوتی رہتی ہے اور فضا میں معلق گرد و غبار اور دوسرے ذرات کو اپنے اندر حل کر کے زمین پر لے آتی ہے۔ اگر بارش نہ برستی تو ایک عرصے کے بعد فضا اس قدر آلودہ اور غلیظ ہو جاتی کہ کسی ذی روح کیلئے سانس لینا بھی ناممکن ہو جاتا۔

۶۔ بارش پہاڑوں کے پتھروں کو آہستہ آہستہ ”حل کرتی“ رہتی ہے، ان سے استفادہ کے قابل مٹی کو وجود میں لاتی رہتی ہے اور اس مٹی کو کھلی زمینوں میں بہا کر لے آتی ہے۔

۷۔ بارش زرخیز مٹی کو دوردراز کے علاقوں سے اپنے ساتھ لے آتی ہے اور زرعی زمینوں کو طاقت ور بنانے کیلئے اسے اس طرح پھیلا دیتی ہے کہ بعض علاقوں (مثلاً نیل کے ساحلی علاقوں) میں یہ نباتات کیلئے طبعی کھاد کا کام دیتی ہے۔

۸۔ بارش صرف خشکیوں ہی میں زندگی عطا نہیں کرتی بلکہ سمندروں کیلئے بھی بہت موثر ہوتی ہے۔ بعض دانشوروں کے بقول اس کا اثر خشکی سے کم نہیں ہے کیونکہ سمندروں میں بارش کے ہونے سے پانی کی موجوں کے درمیان موجود گھاس اور دوسری نباتات کی پرورش ہوتی ہے جو مچھلیوں اور بعض دوسری سمندری مخلوق کی غذا ہوتی ہے۔ چنانچہ جس سال بارش کم برے اس سال مچھلی کے شکار کی حالت ناگفتہ بہ ہوتی ہے

۹۔ سطح زمین سے بادلوں کی بلندی روئے زمین کے بلند ترین مقامات سے بھی زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے زمین کا کوئی حصہ بارش سے محروم نہیں رہتا۔

۱۰۔ پہاڑوں کے بلند ترین مقامات پر درخت بھی اُگتے ہیں اور دو اور غذا کے کام آنے والی جڑی بوٹیاں بھی۔ اسی لئے بارش ان

کے پانی کا لازمی حصہ ان تک پہنچاتی ہے۔ اگر بارش نہ ہوتی تو وہ سب سوکھ کر ختم ہو جائے۔

۱۱۔ آج بڑے بڑے ڈیم بنائے جا چکے ہیں جن سے دنیا میں کام آنے والی بجلی کا بڑا حصہ تیار کیا جاتا ہے، اور اس سے عظیم کارخانے، بلیں اور فیکٹریاں چلائی جاتی ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ بھی کوہساروں پر بارش برسنے کی برکتیں ہیں۔

۱۲۔ بادلوں کی تراوش کا کچھ حصہ پہاڑوں پر برف کی صورت میں بیٹھ جاتا ہے جس کا زیادہ تر حصہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر پانی کے عظیم منبع کی صورت میں جمع ہوتا رہتا ہے اور دوسرے مناطق میں بھی کریرز میں آبی ذخائر کیلئے معاون ثابت ہوتا ہے، کیونکہ برف بتدریج پگھل پگھل کر کریرز میں چلی جاتی ہے۔ لیکن اگر بارش کی بجائے ہمیشہ برف ہی پڑتی رہتی تو اوپر بتائے گئے فوائد میں سے بہت سے فوائد حاصل نہ ہو سکتے۔

۱۳۔ بادل کیا ہیں؟ آسمانوں میں معلق سمندر ہیں۔ اور کس قدر عظیم ہے وہ خدا جو کوششِ ثقل کے قانون کے خلاف ان کو آسمان کی طرف بھیجتا۔ اور ایک نقطے سے دوسرے نقطے کی طرف بھیجتا ہے۔

۱۴۔ علاوہ ازیں بادل موسم سرما میں سردیوں کے کم کرنے اور موسم گرما میں گرمیوں کے کم کرنے میں نہایت ہی موثر ثابت ہوتے ہیں۔

۱۵۔ بادل مختلف برقی بار کے حامل ہوتے ہیں جو رعد و برقی کی پیدائش کا سبب ہوتے ہیں۔ انشاء اللہ ہم ان دنوں کی تاثیر کے بارے میں ”رعد و برقی“ کی بحث میں تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

مجموعی طور پر یہ دونوں چیزیں جن سے ہم بڑی حد تک مانوس ہو چکے ہیں اور انہیں عام اور معمولی سی چیز سمجھتے ہیں، نہایت ہی معجز العقول اور اسرار آمیز ہیں، ان کے اسرار میں خداوند عالم کی توحید ہے، عظیم آیات کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے اور ان عظیم نشانیوں سے اس بے نشان ذات کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

### ۳۔ اسلامی روایات میں ہو اور بارش کی حیثیت

توحید مفضل نامی مشہور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

”اے مفضل! میں تمہیں ہوا کے چلنے کے فوائد سے آگاہ کرتا ہوں۔ کیا تم نہیں دیکھتے جب ہوا رُک جاتی ہے تو انسان وجود میں کس قدر غم و اندوہ پیدا ہو جاتا ہے، سانس سینے میں رُک جاتی ہے، تندرست آدمی بیمار اور بیمار شخص مشکل میں پڑ جاتا ہے، پھل اور میوے خراب اور سبزیاں بدبودار ہو جاتی ہیں، غلوں میں دبا اور آفات پیدا ہو جاتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے ہواؤں کا چلنا بھی خداوند عالم کی تدبیر اور مخلوق کے احوال کی اصلاح کیلئے ہے۔“

اگر کوئی بادشاہ اپنی رعایا میں بڑی مقدار میں سونا اور چاندی تقسیم کرے تو کیا وہ ان کے دلوں میں محبوب اور نگا ہوں میں عظیم ہوگا اور اس کی شہرت ہر جگہ کے لوگوں کیلئے دور دور تک نہیں جا پہنچے گی؟ لیکن کہاں وہ اور کہاں ایک بابرکت اور وافر مقدار میں بارش، کیونکہ بارش



کے ذریعہ شہر آباد ہوتے ہیں اور غلہ جات اس قدر زیادہ ہوتے ہیں کہ روئے زمین پر موجود سونے اور چاندی کی مقدار سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ اچھی طرح غور کرو کہ بارش کیونکہ زمین پر برستی ہے۔ خداوند عالم اسے اوپر سے نیچے بھیجتا ہے تاکہ سخت اور ٹھوس زمینیں نراو سیراب ہوں اگر بارش ایک طرف سے آتی ہے تو بلند مقامات تک نہ پہنچ پاتی اور زراعت کم ہوتی۔ اس کے علاوہ بارشیں لوگوں کے آبپاشی کے بہت سے جھگڑوں اور طاقت وروں کے غریبوں پر بہت سے ظلم کو کم کر دیتی ہیں۔

”خداوند عالم اسے چھوٹے چھوٹے قطروں کی صورت میں بھیجتا ہے تاکہ وہ آہستہ سے زمین میں جائیں اور سیراب کریں۔ اگر اُسے تیز رفتار دھارے کی صورت میں نازل کرتا تو زمین کے اندر جانے کی بجائے کھیتوں اور کھلیانوں کا ستیاناس کر دیتی۔ علاوہ ازیں بارش کے برسنے سے ہوائیں مرطوب، بدن کی جلد نرم، ہوا کی آلودگی برطرف، وبا کی بیماری نابود، درختوں زراعت کی صفائی دھلائی اور زراعت کی بیماریاں ختم ہو جاتی ہیں۔“

اسی روایت کے اور حصے میں ارشاد فرماتے ہیں:

”اے مفصل! سوچو تو سہی کہ اس علم میں کس طرح صاف ہوا اور بارش ایک دوسرے کے پیچھے آتی رہتی ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک ہمیشہ جاری رہتی تو فاسد ہو جانے کا موجب بن جاتی۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ جب بارشیں پے در پے اور حد سے زیادہ ہونے لگیں تو سبزیاں اور کھیتیاں خراب ہو جاتی ہیں، جانوروں کے بدن سست پڑ جاتے ہیں، ہوا ٹھنڈی اور انواع و اقسام کی بیماریوں کا موجب بن جاتی ہے اور راستے خراب ہو جاتے ہیں اس کے برعکس اگر مطلع ہمیشہ کیلئے صاف ہوتا اور اس پر کبھی بادل کا نام و نشان نہ ہوتا تو زمین خشک ہو کر رہ جاتی، نباتات سوکھ کر جل جاتی، چشموں اور نہروں کا پانی نیچے چلا جاتا اور لوگوں کو نقصان پہنچاتا، ہوا کی خشکی کئی اور بیماریوں کا موجب بن جاتی۔ لیکن جب یہ دونوں کیفیات باری باری دنیا میں رونما ہوتی ہیں تو فضا میں اعتدال آ جاتا ہے، ان میں سے ہر ایک دوسرے کے نقصان کا ازالہ کرتی رہتی ہے اور ہر چیز رو بہ راہ رہتی ہے۔“<sup>[۱]</sup>

ایک اور حدیث میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

”خداوند عالم بارشیں آسمان سے اتارتا ہے تاکہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور ٹیلوں اور گڑھوں، غرض کہ تمام مرتفع اور ہموار علاقوں تک پہنچ جائیں (اور سب کو سیراب کریں) انہیں قطرہ قطرہ اور نرم صورت میں پے در پے برساتا ہے، کبھی موٹے موٹے دانوں کی صورت میں بھیجتا ہے تو کبھی نہات ہی خوشگوار پھوار کی شکل میں۔ تاکہ اچھی طرح زمین کے اندر چلی جائے اور اسے سیراب کرے۔ اسے سیلاب کی صورت میں نہیں برساتا کہ تمہاری زمینوں، درختوں، کھیتوں اور پھولوں کو خراب نہ کر دے۔“<sup>[۲]</sup>

[۱] بحار الانوار جلد ۳ ص ۹۱۱ تا ۹۲۱

[۲] تفسیر نور الثقلین جلد ۱ ص ۴۱، بحار الانوار جلد ۵۶ ص ۳۴ تا ۳۷ ص ۳۳ میں بھی ایسی روایات درج ہیں جن میں بادلوں اور بارشوں کی تشکیل کے بارے میں بہت سے رازوں کو بیان کیا گیا ہے۔



جو دس کلومیٹر کی بلندی پر ہوتے ہیں، یہ پر جوش خروش بادل پہاڑوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جن کا بالائی طبقہ برف کی سوئیوں اور ٹکڑیوں سے ڈھکا رہتا ہے اور بعض اوقات اولوں سے بھی لبریز ہوتا ہے۔

پہلی جنگ عظیم سے پہلے تک کسی کو معلوم نہیں تھا کہ آسمانی بادلوں میں تخی، برف اور اولے بھی ہوتے ہیں، لیکن اس جنگ کے موقع پر جب ہوائی جہاز ایسے بادلوں کے اوپر پہنچے تو پائلٹوں نے وہاں پر بلند بادلوں کی صورت میں برف کے بنے ہوئے پردے مشاہدہ کئے۔

مرطوب اور گرم شدہ ہواؤں کا انقلابی اور طبعی طبعے ہو کر اوپر چلے جانا، تخی زدہ بلند و بالا بادلوں کو پہاڑوں کی صورت عطا کر دیتا ہے، جن میں شدید اور موسلا دھار بارشیں بھی ہوتی ہیں اور پے در پے ظاہر ہونے والی رعد و برق بھی۔<sup>[۱]</sup>

یہ تصریحات سورہ نور کی ۴۳ ویں آیت کی تازہ تفسیر بن سکتی ہے جن کے ذریعہ قرآن پاک کے ایک دلچسپ علمی معجزہ سے پردہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

’وَيُنزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ فَيُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَصْرِفُهُ مَنْ يَشَاءُ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهِ  
يَذْهَبُ بِالْأَبْصَارِ‘ (یعنی خداوند عالم آسمان سے جو پہاڑ اس میں ہیں، ان میں سے اولے برساتا ہے اور ان کے ذریعہ جن کو چاہتا ہے  
نقصان پہنچاتا ہے اور جن سے چاہتا ہے یہ نقصان روکے رکھتا ہے، قریب کہ اس کی بجلی آنکھوں کو لے جائے۔“

آسمان میں کون سے پہاڑ ہیں جن میں اولے ہوتے ہیں ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب بہت سے لوگوں کیلئے مشکل اور پیچیدہ تھا۔ لہذا انہوں نے اس بارے میں مختلف تفسیریں کی ہیں۔

لیکن مذکورہ بالا دریافت کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مذکورہ بالا آیت کے لئے کسی قسم کی توجیہ، تقدیر، مجاز وغیرہ کے قائل ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور ان تصریحات کی روشنی میں آیت کی معنی بالکل واضح ہیں۔<sup>[۲]</sup>

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

[۱] کتاب ”باد و باران“ ص ۵۷ تا ۶۵ (خلاصہ کے ساتھ)

[۲] مزید تفصیل کیلئے تفسیر نمونہ، جلد ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱ کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیں۔

## ۱۲۔ رعد و برق کی پیدائش میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں

### اشارہ

بہت کم ایسے لوگ ہیں جو رعد و برق کے اسرار کے بارے میں مطالعہ کرنے سے پہلے ان کی کسی اہمیت کے قائل ہوں۔ عام طور پر ہر شخص بڑی سادگی کے ساتھ ان کے پاس سے گزر جاتا ہے۔ شاید بعض لوگ اسے فطرت کا مذاق سمجھتے ہیں جب کہ بعض لوگ انہیں خرافاتی افسانے کہتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ کہ یہ دونوں چیزیں ایک خاص قسم کے نظروں سے نظر آتی ہیں اور انسان کیلئے کئی قسم کے آثار اور بہت بڑی حد تک برکات کی حامل ہوتی ہیں جن کی تشریح مندرجہ ذیل آیات کی تفسیر میں آتی ہیں۔ اس مختصر سے اشارے کے ساتھ اس بارے میں قرآن مجید کی مندرجہ ذیل چند آیات کو گوش دل کے ساتھ سنتے ہیں:

۱۔۔۔ وَمِنْ آيَاتِهِ يُرِيكُمْ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنزِلُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيُحْيِي بِهِ  
الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ

(رعد/۲۴)

۲۔۔۔ هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ

(رعد/۱۲)

۳۔۔۔ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ  
فِيصِيبُ بِهَا مَن يَشَاءُ

(رعد/۱۳)

### ترجمہ

۱۔۔۔ اور اس کی آیات میں سے یہ ہے کہ وہ برق (اور رعد) تمہیں دکھاتا ہے جو خوف کا سبب بھی ہے اور امید کا بھی۔ (خوف بجلی کے گرنے کا اور امید بارش کے برسنے کی) اور آسمان سے پانی نازل کرتا ہے جس کے ذریعہ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کرتا ہے۔ اس میں ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔

۲۔۔ وہ وہی تو ہے جو تمہیں برق دکھاتا ہے، جو خوف اور اُمید کا سبب ہے اور بھاری اور بوجھل بادل پیدا کرتا ہے۔

۳۔۔ اور رعد اس کی تسبیح اور حمد بیان کرتا ہے اور فرشتے (بھی) اس کے خوف سے اور وہ صواعق (گرنے والی بجلیوں) کو بھیجتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے گرفتار کر لیتا ہے۔

## الفاظ کے معانی اور تشریح

”برق“ کے بارے میں راغب اپنی کتاب ”مفردات“ میں کہتے ہیں کہ اس کے معنی وہ چمک ہے جو بادلوں سے اٹھتی ہے، پھر اس کا استعمال ہر چمک دار چیز کے بارے میں ہونے لگا، مثلاً ”سیف باریق“ براق اور چمک دار تلوار کو کہتے ہیں۔  
”مقائیس اللغۃ“ سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ”برق“ کے اس کے علاوہ ایک اور معنی بھی ہیں یعنی کسی ایک چیز میں سفیدی اور سیاہی کا اکٹھا ہونا۔ لیکن بظاہر دوسرے معنی پہلے معنی کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ کیونکہ جب سفیدی سیاہی کے ساتھ مل جاتی ہے تو اس میں زیادہ چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض حضرات نے برق کے معنی میں شدت اور دباؤ کو بھی داخل سمجھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ”برق“ وہ مخصوص چمک ہے جو شدت اور دباؤ کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔<sup>[۱]</sup>

”رعد“ کے بارے میں ”مفردات“ میں ”راغب“ کہتے ہیں کہ اس کے معنی بادلوں کی گرج ہیں۔ کنایہ کے طور پر کسی بھاری چیز کے گرنے کے وقت جو آواز پیدا ہوتی ہے اُسے بھی ”رعد“ کہتے ہیں۔ لیکن ”مقائیس اللغۃ“ نے اس کے اصل معنی حرکت اور بے چینی بتائے ہیں۔ لیکن لغت کی کتابوں سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اصل معنی وہی بادلوں کی گرج ہی ہیں، دوسرے معانی حیثیت کنایہ کی ہے۔  
”صواعق“، ”صاعقہ“ کی جمع ہے جس کے معنی بجلی کی وہ کڑک ہیں جو فضا میں پیدا ہوتی ہے اور جسمیں کو نڈا بھی ہوتا ہے شدید آوازوں کے سننے کے بعد جو بہوشی طاری ہو جاتی ہے اس وقت بھی اسی مادے کو استعمال کیا جاتا ہے اور یہ کبھی ہلاک ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض ارباب لغت کہتے ہیں کہ ”صاعقہ“ کے استعمال کے تین مقامات ہیں، (۱) موت (۲) عذاب (۳) آگ۔<sup>[۲]</sup> لیکن ظاہر بات یہ ہے کہ یہ سب اس اصلی معنی کے لوازمات سے ہیں۔

[۱] کتاب ”التحقیق فی کلمات القرآن الکریم“ مادہ ”برق“

[۲] مفردات راغب، لسان العرب اور التحقیق فی کلمات القرآن الکریم۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### رعد و برق کی پیدائش کے اسرار

سب سے پہلی آیت میں بڑی صراحت کے ساتھ آسمانی بجلی کو خدا کی آیت میں شمار کرتے ہوئے فرماتا ہے ”ایک ایسی آیت ہے کہ جو کبھی تو خوف کے ہمراہ ہوتی ہے اور کبھی امید کے ساتھ ہوتی ہے۔“ (وَمِنْ آيَاتِهِ يُرِيكُمْ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا)

ایسا خوف جو اس کی مہیب آواز کے ساتھ ہوتا ہے، جس سے یہ احتمال ہوا ہے کہ اس میں مہلک کرنے والی بجلی ہے۔ اور طمع اور امید اس بات کی ہوتی ہے شاید بارش نازل ہو، کیونکہ بہت سے مواقع پر گرج اور چمک کے بعد بابرکت موسلا دھار بارش برتی ہے

شاید یہی وجہ ہے کہ اسی آیت میں فرماتا ہے کہ بُو آتی ہے، جو چند ایک معمولی اور موسلا دھار بارشوں کے بعد یوں زندہ ہو جاتی ہے اور سبزہ و گل اس میں اُگ آتے ہیں، گویا وہ پہلی زمین ہی نہیں۔ اس لئے تو آیت کے آخر میں تاکید کے طور پر فرماتا ہے۔ ”ان امور میں آیات

اور نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو سوچ و بچار سے کام لیتے ہیں۔“ (وَيُرِيكُمْ مِنْ السَّمَاءِ مَا أَنْفَخْتُمْ بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا) وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ چیزیں کوئی عام اور معمولی نہیں ہیں جو اتفاق سے اور اچانک وجود میں آگئی ہوں۔ وہ اس میں خوب

سوچتے ہیں اور ان کے اسرار و رموز سے آشنا ہوتے ہیں۔ یہی چیز اسی سلسلے کی دوسری آیت میں دوسرے الفاظ میں بیان کی گئی ہے اور اس میں خدا کے آثار کے ذریعہ اس کی ذات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ فرماتا ہے ”وہ وہی ہے جو تمہیں بجلی دکھاتا ہے، جو خوف کا موجب بھی ہے اور امید کا سبب بھی۔“ (هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا)

خوف تو اس کی کڑک سے ہوتا ہے اور امید بارش کے نازل ہونے کی، یا خوف مسافروں کو ہوتا ہے اور امید شہروں اور آبادیوں میں رہنے والوں کو۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اس کے فوراً بعد فرماتا ہے ”خداوند عالم سنگین بادلوں کو پیدا کرتا ہے۔“

(وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ)

اس جملے کی وضاحت کیلئے کہا گیا ہے کہ:

”شدید طوفانوں کے ساتھ ساتھ موسلا دھار بارش فضا کے بالائی حصہ سے لے کر زمین کی قریب کی فضا کو ڈھانپ لیتی ہے، فضا تاریک ہو جاتی ہے۔ ہواؤں کا تلام مسلل برق ایجاد کرتا اور اسے بے بار کرتا رہتا ہے۔ بجلی کی پے درپے گرج اور چمک زمین کو لرزہ

براندام کر دیتی ہے۔ آخر کار جو بادل گہرے اور فضا کے نچلے طبقے میں ہوتے ہیں ایک دوسرے پر سوار ہو جاتے ہیں اور اوپر لے جانے والی تیز و تند ہواؤں کی وجہ سے بارش کے کثیر مقدار میں موٹے موٹے قطرہوں کے حامل بن کر نہایت ہی ثقیل اور بوجھل بن جاتے ہیں۔“ [۱]

اسی سلسلے کی تیسری اور آخری آیت میں ”رعد“ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ ”رعد اس کی تسبیح اور حمد کہتا ہے۔“ (وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ)

یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ آسمانی مخلوق کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ خداوند عالم کے علم اور قدرت کو بیان کرنے والی چیز ہے، کیونکہ ”تسبیح“ کے معنی ہیں ہر عیب و نقص سے منزہ و مبرا سمجھنا، اور ”حمد“ کے معنی ہیں۔ کمالات کے مقابلے میں اس کی تعریف۔ اس طرح سے بجلی کی گرج اور کڑک خدا کی جمالی اور جلالی صفات کو بیان کرتی ہے۔

ممکن ہے اس کی یہ تسبیح ”زبان حال“ کے ساتھ ہو، جیسا کہ ایک اہم ایجاد ہے جو اس کے موجود علم اور سمجھ کو بیان کرتی ہے، ایک دل انگیز، شعر، شاعر کے ادبی ذوق کو بیان کرتا اور اس کی مدح و ثنا کرتا ہے، یا پھر ”زبان قال“ کے ساتھ ہو، جیسا کہ بعض مفسرین بھی اس کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس کائنات کا ایک ایک ذرہ اپنے لحاظ سے عقل و شعور کا حامل ہوتا ہے اور ان کی حمد و تسبیح بھی عقل و شعور اور اسی ادراک کی رو سے ہوتی ہے۔ حضرت فخر رازی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

”بعید نہیں ہے کہ خداوند عالم ابر کے اجزاء میں حیات، علم، قدرت اور نطق ایجاد کر دے اور بجلی کی جو آواز کانوں تک پہنچتی ہے یہ اس کے اختیاری افعال میں سے ہو جس طرح پہاڑوں نے حضرت داؤد کے زمانے میں اور کنکریوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں خدا کی تسبیح کہی ہے۔“ [۱]

احتمال جو بھی ہو اس سے ہماری بحث متاثر نہیں ہوتی بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آسمانی مخلوق میں کچھ اسرار پوشیدہ ہیں جو خالق کی عظمت کے غماز اور اس کی آیات میں سے ایک آیت ہیں۔

اصولی طور پر پانی اور بخارات نیز ان سے پیدا ہونے والے بادل ایسی چیزیں ہیں جو آگ کے مخالف ہیں، لیکن پروردگار کی قدرت کاملہ سے اس کے اندر سے ایسی عظیم آگ پیدا ہوتی ہے جو روئے زمین کی ہر قسم کی آگ سے زیادہ جلانے والی ہوتی ہے۔ اسی طرح بخارات میں جو نہایت ہی لطیف اجسام ہوتے ہیں، لیکن ان سے ایسی آواز اٹھتی ہے جو کسی سنگین اور بھاری بھر کم چیز کے دوسرے چیز پر گرنے سے پیدا نہیں ہوتی۔

ان تمام آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ”رعد“ ہو یا ”برق“ ہر ایک اس کائنات کی قابل توجہ مخلوق ہے، جن کا اچھی طرح سے مطالعہ کرنا چاہیے، ان کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے اور پھر اس سے خالق کی عظمت سے آشنائی حاصل کرنا چاہئے۔ اس بارے میں وضاحتوں کی بحث میں ہم مزید تفصیل سے بات کریں گے۔

## چند وضاحتیں

### ۱۔ جدید علوم کی روشنی میں برق و رعد کی پیدائش

دور حاضر کے سائنس دان اس بات کے معتقد ہیں کہ آسمان پر بجلی کا کوند اس وجہ سے وجود میں آتا ہے کہ برقی بار کے حامل دو ٹکڑے یعنی مثبت اور منفی آپس میں ٹکراتے ہیں، یہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے بجلی کی دو مثبت اور منفی تاریں آپس میں ٹکرائی ہیں تو ان سے چنگاری یا شعلہ اٹھتا ہے۔

چونکہ برقی بار کے حامل بادلوں کے ٹکڑوں میں بہت بڑی مقدار میں بجلی ہوتی ہے، لہذا اس کا کوند بھی بہت بڑا ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر کوند کی آواز ہوتی ہے اور طبعی طور پر کوند اجتنا بڑا ہوگا اس کی آواز بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ اسی لئے اس آسمانی کوند کے کوہیب آواز بھی اس قدر شدید ہوتی ہے کہ عمارتیں ہل جاتی ہیں اور بڑے بڑے بھوں کی صدا کی مانند اس کی بھی خوفناک آواز ہوتی ہے۔

لیکن یہ بجلی ہمیشہ دو بادلوں کے درمیان ہی ظاہر نہیں ہوتی جو انسانی پہنچ سے دور اور خطرے سے خالی ہوں، بلکہ بعض اوقات وہ بادل جن میں مثبت الیکٹرک سٹی ہوتی ہے، زمین کے نزدیک آجاتے ہیں۔ اور چونکہ زمین میں منفی الیکٹرک سٹی ہوتی ہے تو اس وقت ”زمین“ اور ”بادلوں“ کے درمیان میں ہی کوند ایجاد ہو جاتا ہے اور اس کا نام ”صاعقہ“ (گرگر جلا دینے والی بجلی) ہوتا ہے جو بہت ہی خطرناک ہوتا ہے۔ ایک تو اس سے اس علاقہ میں زبردست لرزہ پیدا ہوتا ہے، دوسرے اس میں اس قدر شدید اور حد سے بڑھ کر حرارت ہوتی ہے جہاں پر گرگتی ہے اسے جلا کر خاک کر دیتی ہے۔<sup>[۱]</sup>

چونکہ الیکٹرک سٹی ہمیشہ اجسام کی نوک سے خارج ہوتی ہے لہذا جنگلوں اور بیابانوں میں جہاں پر صاعقہ پیدا ہوتی ہے وہاں اس کا شعلہ چیزوں کے بلند حصوں مثلاً درختوں، بلند ترین شاخوں حتیٰ کہ راہ چلتے انسانوں کے سروں سے ظاہر ہوتی ہے۔ اسی لئے جب فضا کا ماحول طوفانی بن چکا ہو۔ اور فضا رعد و برق سے بھر چکی ہو تو کھلی زمین اور بیابانوں میں ٹھہرنا بہت ہی خطرناک ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر گڑھوں، درختوں کے نزدیک، پہاڑوں کے نچلے حصے اور ٹیلوں کے نیچے پناہ لینے سے کسی حد تک خطرہ کم ہو جاتا ہے۔ (البتہ درختوں یا آہنی کھڑکیوں وغیرہ سے ٹیک لگانا بھی خطرناک ہوتا ہے) مندرجہ بالا وضاحت سے برق کے خطرات اور خوف کے اسباب جن کی طرف اوپر اشارہ ہوا ہے بخوبی واضح ہو جاتے ہیں۔

[۱] اگرچہ صاعقہ کی مدت 10/1 سینڈ بلکہ بسا اوقات 100/1 سینڈ ہوتی ہے لیکن چونکہ اس سے پیدا ہونے والی حرارت ۱۵۰۰۰ درجے سینٹی گریڈ تک جا پہنچتی ہے، لہذا اس سے زبردست اور حد سے زیادہ خطرات پیدا ہو سکتے ہیں، جب کہ سورج کی حرارت صرف آٹھ ہزار سینٹی گریڈ درجے تک ہوتی ہے۔ (کتاب ”انجاز قرآن“



## ۲۔ رعد و برق کے فوائد

رعد و برق کے جو خطرات اُپر بیان ہو چکے ہیں، ان کے علاوہ ان دونوں کے فوائد بھی بہت زیادہ ہیں جن میں سے چند ایک کو یہاں پر بیان کیا جاتا ہے۔

## الف: آبپاشی

بجلیاں عام طور پر حد سے زیادہ حرارت پیدا کرتی ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات تو وہ پندرہ ہزار درجہ سینٹی گریڈ کی حد تک جا پہنچتی ہیں۔ یہ حرارت اطراف کی فضائی حدود کو جلادینے کیلئے کافی ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہوا کا دباؤ فوراً کم ہو جاتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ہوا کے کم دباؤ ہی میں بادل برستے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً بجلی کے کوندے کے فوراً ہی بعد موسلا دھار بارش شروع ہو جاتی ہے۔ موٹے موٹے قطروں کی صورت میں بادل برسنے شروع ہو جاتے ہیں اور آبپاشی کے اسباب فراہم ہو جاتے ہیں۔

## ب: زہرپاشی

جب بجلی اپنی اس حرارت کے ساتھ آشکار ہوتی ہے تو بارش کے قطروں میں اضافی آکسیجن کا کچھ حصہ مل جاتا ہے اور بھاری پانی OXIEGENATED وجود میں آ جاتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بھاری پانی کی خصوصیات میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ اجراثیم کو ختم کر دیتا ہے۔ اسی لئے اسے طبی مصارف میں زخموں کے دھونے کیلئے کام میں لایا جاتا ہے۔ اور جب OXIEGENATED پانی کے قطرے زمین پر پڑتے ہیں تو وہ نباتات کیلئے وجود میں آنے والی آفتوں اور بیماریوں کے ختم کو ہی ختم کر دیتے ہیں۔ اس طرح یہ زہریلی دواؤں کا کام دیتے ہیں۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ جس سال رعد و برق کم ہو اس سال نباتات کی آفتیں زیادہ ہوتی ہیں۔

## ج: غذا اور کھاد کا کام

برق اور اس کی شدید حرارت، نیز خصوصی ترکیب کی بنا پر بارش کے قطرے کاربن ڈائی آکسائیڈ کی حالت پیدا کر دیتے ہیں۔ پھر جب وہ زمین پر پھیلتے اور اس سے مل جاتے ہیں تو نباتات کے لئے ایک قسم کی موثر کھاد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جس سے نباتات اپنی غذا کا کام لیتی ہیں۔ بعض سائنس دان کہتے ہیں کہ کرہ زمین میں ایک سال میں برق سے پیدا ہونے والی کھاد کی مجموعی مقدار کئی لاکھ ٹن بنتی ہے اور یہ تعداد اور مقدار بہت زیادہ ہے۔

بنا بریں معلوم ہوا کہ یہ چیز جو ظاہراً عام اور معمولی سی ہے اور بظاہر بے خاصیت ہے، کس قدر مفید اور بابرکت ہے، آبپاشی کیلئے بھی اور غذا رسانی کیلئے بھی۔ یہ اس عالم ہستی کے وسیع اور حیرت ناک اسرار میں سے ایک مختصر سا نمونہ ہے جو خدا شناسی کی راہوں کی رہنمائی کرنے کے قابل ہو سکتا ہے۔

یہ سب برکتیں ہیں برق کی، لیکن ادھر اس کی ایک قسم یعنی صاعقہ سے آگ لگنے کا عمل بھی وجود میں آتا ہے جو ممکن ہے کہ کبھی انسان یا انسانوں یا ذراعت اور درختوں کو جلادے، ہر چند کہ یہ اتفاق بہت کم اور شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ عام طور پر اس سے بچا بھی جاسکتا ہے لیکن خوف اور ڈر کا موجب تو بن سکتا ہے۔ اس طرح جو ہم نے مندرجہ بالا آیت میں پڑھا ہے کہ برق موجب خوف بھی ہے اور باعثِ امید بھی، ان تمام امور کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔

نیز ممکن ہے کہ ”وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ“ کا جملہ جو آیت بالا کے آخر میں آیا ہے، برق کی اسی خاصیت کے ساتھ مربوط اور متعلق ہو کہ برق بادلوں کو بارش کے قطرات سے سنگین بھی بنا دیتی ہے۔



## ۱۳۔ سمندروں اور کشتیوں میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں

### اشارہ

ہم جانتے ہیں کہ زمین کا تین چوتھائی حصہ پانی پر مشتمل ہے اور چھوٹے بڑے سمندر سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ نیز یہ بھی جانتے ہیں کہ انسان سمندروں کے ذریعہ قدیم الایام سے نقل و حمل اور بار برداری کا کام لیتا آ رہا ہے۔ اس کے علاوہ اثنائے خوردنی اہم حصہ بھی سمندروں اور دریاؤں سے حاصل ہوتا ہے، اسی طرح صنعتوں میں کام آنے والا بہت سا مواد بھی۔ ان سب باتوں سے قطع نظر بادلوں کی ایجاد اور خشکیوں کی سیرابی کے بارے میں سمندروں کے تعلق سے تو کوئی بھی بے خبر نہیں ہے۔ اسی طرح سمندروں جانوروں اور ان کی مختلف بحیر العقول اقسام تقریباً سب ہی کو معلوم ہیں۔

یہی وجوہات ہیں کہ قرآن مجید نے سمندروں، دریاؤں اور کشتیوں کو حق کی آیات میں شمار کیا ہے اور انسانوں کو ان کے اسرار کے مطالعہ کی دعوت دی ہے۔

اس مختصر سے اشارے کے ساتھ اس سلسلے میں نازل ہونے والی کچھ آیات کو دل کے کانوں سے سنتے ہیں:

۱۔۔۔ وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِيَتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاجِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلِعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ

(نحل/۱۴)

۲۔۔۔ وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَهَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ كُلٌّ يَأْكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُونَ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ فِيهِ مَوَاجِرَ لِيَتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلِعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ

(فاطر/۱۲)

۳۔۔۔ اللَّهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمْ الْبَحْرَ التَّحْرِيَّ الْفُلْكَ فِيهِ بِأَمْرِهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلِعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ

(جاثیہ/۱۲)

۴۔۔۔ وَمِنْ آيَاتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ إِنَّ يَشَاءُ يُسْكِنِ الرِّيحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلَى ظَهْرِهِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ

(شوریٰ/۳۲/۳۳)

۵۔۔۔ أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِمِي فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللَّهِ لِيُرِيَكُمْ مِنْ آيَاتِهِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ

(لقمان/۳۱)

۶۔۔۔ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ----- وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِمِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ ----- لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ

(بقرہ/۱۶۴)

۷۔۔۔ رَبُّكُمْ الَّذِي يُزْجِي لَكُمْ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا

(اسراء/۶۶)

## ترجمہ

- ۱۔۔۔ وہ وہی ہے جس نے سمندر کو (تمہارے لئے) مسخر کر دیا ہے تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور پہننے کیلئے زینت کے وسائل اس سے باہر نکالو۔ اور تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ وہ سمندر کے سینے کو چیرتی ہیں تاکہ تم (تجارت کرو اور) خدا کے فضل سے بہرہ برداری کرو، ہو سکتا ہے کہ اس طرح سے اس کی نعمتوں کا شکر بجالاؤ۔
- ۲۔۔۔ یہ دو سمندر ایک جیسے نہیں ہیں۔ یہ وہ سمندر ہے جس کا پانی شیریں اور جس کو پینا خوشگوار ہے اور یہ جو نمکین اور کڑوا ہے (لیکن) تم دونوں سے تازہ گوشت کھاتے ہو اور زینت کے وسائل اس سے باہر نکالتے اور پہننے ہو۔ اور اس میں تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ پانی کو چیرتی (ہوئی آگے بڑھتی رہتی) ہیں تاکہ تم فضلِ خدا سے اپنا حصہ حاصل کرو۔ اور شاید اس کی نعمتوں کا شکر بجالاؤ۔

۳۔۔ خداوند عالم وہی تو ہے جس نے سمندر کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے تاکہ اس کے فرمان کے مطابق اس میں کشتیاں چلیں اور تم اس کے فضل سے اپنا حصہ حاصل کر سکو اور شاید اس کی نعمتوں کا شکر بجلاؤ۔

۴۔ اس کی نشانیوں میں سے وہ کشتیاں ہیں جو پہاڑوں کی مانند سمندروں میں روں دواں ہیں۔ اگر وہ چاہے تو ہوا کو روک دے اور وہ پشتِ سمندر پر رُک جائیں، اس میں ہر صبر کرنے اور شکر کرنے والے کیلئے نشانیاں ہیں۔

۵۔۔ کیا تو نے کشتیوں کو نہیں دیکھا کہ وہ خدا کے حکم سے سمندروں میں اس کی نعمت کی برکت سے چل رہی ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ تمہیں اپنی آیات کا کچھ حصہ دکھائے اور اس میں ان لوگوں کیلئے آیات اور نشانیاں ہیں جو صابر اور شکر گزار ہیں۔

۶۔۔ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات و دن کے آنے جانے میں اور کشتیوں میں جو لوگوں کے نفع کیلئے حرکت کر رہی ہیں (اس کی ذات پاک اور توحید) ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں اور سوچ و بچار سے کام لیتے ہیں۔

۷۔۔ تمہارا پروردگار تو وہ ہے جو تمہارے لئے کشتیوں کو سمندروں میں چلاتا ہے تاکہ تم اس کی نعمت سے بہرہ حاصل کرو، وہ ہمیشہ تمہارے ساتھ مہربان ہے۔

## الفاظ کے معانی اور تشریح

”مَسْحَرٌ“ کے بارے میں ”راغب“ اپنی کتاب ”مفردات“ میں کہتے ہیں کہ اس کے اصل معنی ہر وہ کھلی جگہ ہے جہاں پر پانی فراوانی کے ساتھ جمع ہو، پھر بطور کنایہ کے ہر وسیع شے کو ”بَحْرٌ“ کہتے ہیں۔ ”بَحْرٌ“ اور ”مَسْتَبْحَرٌ“ اس شخص کو کہتے ہیں جس کا علم وسیع ہو۔ جب شدید بیماریوں میں ناگہانی طور پر تبدیل آجائے تو طبیب لوگ اسے ”بحران“ کہتے ہیں۔ (پھر بحران کا لفظ دوسرے شدید حادثات پر بھی بولا جانے لگا ہے) بعض لوگوں نے نمکین ہونے کو بھی ”بحر“ کے مفہوم میں داخل سمجھا ہے جب کہ بحر کا اطلاق میٹھے پانی کے دریاؤں پر ہوتا ہے۔ [۱]

”فَلْکٌ“ (بروزن قفل) کا معنی کشتی ہے اور یہ لفظ مفرد، جمع، مذکر اور مؤنث پر یکساں بولا جاتا ہے۔ ”فَلْکٌ“ (بروزن فذک) کا لفظ جس کے معنی ستاروں کی حرکت کا مقام اور مدار ہیں، وہ بھی اسی مادہ سے لیا گیا ہے۔

”جواری“، ”جاریہ“ کی جمع ہے جو دراصل ”جری“ یعنی جلدی سے گزر جانا کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ ”جاریہ“ ان کشتیوں کو کہتے

[۱] صحاح اللغۃ، مقائیس اللغۃ، مفردات راغب، مجمع البحرین اور لسان العرب۔

ہیں جو سمندروں اور دریاؤں میں چلتی پھرتی ہیں لغت عرب میں نوجوان لڑکیوں کو بھی ”جاریہ“ کہتے ہیں کیونکہ ان کے مکمل وجود میں جوانی کی نشاٹ جاری اور ساری ہوتی ہے۔ کتاب ”مصباح المیز“ میں آیا ہے کہ کنیز پر ”جاریہ“ کے لفظ کا اطلاق اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اپنے مولا کے فرمان کے مسخر ہے اور اس کے حکم کی بجا آوری کیلئے ہمیشہ جاری و ساری رہتی ہے۔ سورج، دھوپ، اور چلتے پھرتے ستاروں پر بھی ”جاریہ“ کا لفظ بولا جاتا ہے۔

”موخر“، ”ماخر“، کی جمع ہے جس کے معنی کشتی ہیں۔ ”مخر“ (بروزن فخر) سے لیا گیا ہے، جس کے معنی زمین میں پانی کی پیشروی اور اُسے چیر کر آگے بڑھانا ہیں۔ اسی طرح کشتی کے سینے کے ذریعہ پانی کو دائیں اور بائیں طرف چیرنے کیلئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور ہواؤں کے چلنے کی آواز پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب پہلے معنی کے لوازمات سے ہیں۔ [۱]

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### سمندر اور اس کے عجائبات

سب سے پہلی آیت خداوند عالم کا تعارف کراتے ہوئے کہتی ہے ”وہ وہی ہے جس نے سمندر تمہارے لئے مسخر کر دیے ہیں“ (وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ)

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ سمندر اپنے تمام وجود کے ساتھ انسان کی خدمت میں ہے اور ہے بھی ایسا ہی زندگی کی سب سے پہلی کوئیل سمندر ہی سے پھوٹی اور اج بھی وہی سمندر انسان کی مختلف، اہم ضروریات اور اس کی زندگی کو برقرار رکھنے کا اہم ذریعہ ہے۔ اسی آیت کے تسلسل کو آگے بڑھاتے ہوئے تین موضوعات پر زیادہ تاکید کی گئی ہے پہلا یہ کہ انسان سمندر سے تازہ گوشت حاصل کرتا ہے۔ (لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا)

بڑی مقدار میں گوشت جس کی پرورش کی تم نے کوئی زحمت نہیں اٹھائی اور روئے زمین کے بہت سے مقامات پر انسان کے پاس مکمل طور پر تازہ صورت میں پہنچ جاتا ہے۔ اس گوشت کی تازگی کے علاوہ اس کی زبردست لطافت کا ذکر مچھلی کے گوشت کی طرف اشارہ ہے جو اس نکتہ کی یاد دہانی کر رہا ہے کہ اس اور میں تازہ گوشت کے حصول میں مشکلات اور دشواریوں کی وجہ سے پرانے گوشت کو استعمال کرتے تھے۔ اسی لئے یہ نعمت ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ موجودہ دور میں بھی کئی دوسرے لحاظ سے پُرانا اور تازہ گوشت بڑی مقدار میں موجود ہے۔ اسی لئے اس تعبیر کی اہمیت بھی نہایت مناسب ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ تعبیر نمکین اور کڑوے پانی میں لطیف اور خوش ذائقہ گوشت کی آفرینش خداوند عالم کی قدرت نمائی

[۱] مفردات راغب، مصباح المیزان، التحقیق فی کلمات القرآن الکریم اور سب العرب

کی طرف اشارہ ہے۔ [۱]

”لحم“ (گوشت) کی تعبیر، ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ مچھلی کا اکثر و بیشتر حصہ گوشت پر مشتمل ہوتا ہے اور اس میں ہڈی بہت کم ہوتی ہے، جب کہ دوسرے جانوروں میں ایسا نہیں ہوتا۔ پھر اس بات کو اگر پیش نظر رکھا جائے کہ عصر حاضر میں غذائی مواد کی کمی کی وجہ سے انسان کی خوراک کیلئے مچھلی سے استفادہ کی طرف زیادہ توجہ جارہی ہے تو اس خدائی نعمت کی اہمیت اور واضح ہو جاتی ہے۔ سمندر کا دوسرا فائدہ یہ بتایا ہے کہ اسے زیب و زینت اور آرائش کے وسائل اور مخصوص جواہر نکالے جاتے ہیں۔ (وَتَسْتَحْرِ جُوهًا مِنْهَا حَلِيَّةً تَلْبَسُونَهَا) گویا فرماتا ہے: غذائی مواد جیسی ضروری چیزوں سے لے کر غیر ضروری اور زینب کی چیزوں تک سمندر سے حاصل کی جاتی ہے اور یہ سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔

سمندر کے تیسرے فائدے کے بارے میں پیغمبرؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ ”آپ کشتیوں کو دیکھیں گے کہ سمندر کے سینے میں پانی کو چیرتی ہوئی آگے بڑھتی ہیں۔“ (وَتَرَى الْفُلَ مَوْجًا يَحْرِفِيهِ) خداوند عالم نے یہ نعمت تمہیں عطا کی ہے تاکہ تم اس فضل و کرم سے بہرہ برداری کرو۔ شاید اس کی نعمت کا شکر ادا کر سکو۔ (وَلْيَتَذَكَّرِ الْإِنْسَانُ لِقَدَرِهِ مِنْ حَيْثُ وَجَدَهَا وَكَانَ كَارِهَا لَاقِيًا)

کشتیوں سے چھوٹے اور بڑے سمندروں میں تجارت کا مال اٹھانے اور انسانوں کے سفر کیلئے سلسلہ وار چندا مور ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہوں گے تو کہیں جا کر ان سے یہ استفادہ کیا جاسکے گا۔ بھاری اور ہلکے مواد پر کچھ کیفیتیں اور قوانین حکم فرما ہیں جن کی وجہ سے کشتیاں پانی پر برقرار رہ سکیں، پانی کی لرزش، منظم ہوائیں جو سمندروں کی سطح پر چلتی ہیں اور سمندروں کی کافی حد تک گہرائی، غرض اس طرح کے اسباب اکٹھے ہوں تاکہ غول پیکر کشتیاں (اور جہاز) پانی سطح پر چل سکیں موجودہ دور کے جہاز جو بہاؤ کی طاقت سے سمندروں میں چلتے ہیں، انسانی مصنوعات کے اہم شاہکاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ بسا اوقات ان میں سے بعض تو پورے ایک شہر کی وسعت کے حامل ہوتے ہیں اور جو کام لاکھوں موٹر گاڑیاں انجام دیتی ہیں وہ تنہا اُسے بجالاتے ہیں (پانچ لاکھ ٹن کا وزن اٹھانے والے جہاز ڈسٹن کی حامل پچاس ہزار موٹر گاڑیوں کا اسباب اپنے ساتھ اٹھائے پھرتے ہیں!!!)

یہ بات ایک طرف ادھر دوسری طرف غذائی، آرائشی اور دوسرے قسم کے مواد کی بات اور ہے جو اس کے علاوہ ہے۔ یہ سب خالق کائنات کے علم اور قدرت کی روشن دلیل ہیں کہ اس نے یہ سب نعمتیں مفت میں انسان کو عطا فرمائی ہیں۔

دوسری آیت میں وہی تینوں نعمتیں بیان کی گئی ہیں جو اس سے پہلی آیت میں ذکر کی جا چکی ہیں (تازہ گوشت، زینت کے وسائل اور سطح سمندر پر کشتیوں کی آمد و رفت) اور اس بات پر ایک بار پھر زور دیا گیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس آیت کے آغاز میں نمکین اور میٹھے سمندروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے ”یہ دو سمندر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ان میں سے ایک کا پانی شیریں اور اس کا پینا خوشگوار ہے۔ اور وہ

دوسرا نمکین اور کڑوا ہے جو حلق سے نیچے نہیں اتر پاتا۔ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔“ (وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَهَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ)

اگر چہ روئے زمین کے اکثر سمندر، کڑوے اور شور زدہ ہیں لیکن میٹھے پانی کے سمندر، بحیرے اور جھیلیں بھی کم نہیں جن کا نمونہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں دیکھا جاسکتا ہے اور ان سے استفادہ بھی کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے دریا بھی ہیں جن کا پانی سمندر کے شور زدہ پانی میں گرتا ہے اور آگے بڑھتا چلا جاتا ہے جو کافی مدت تک اس سے نہیں مل پاتا اور عملی طور پر میٹھے پانی کا ایک سمندر بن جاتا ہے۔ جب مدوجزر کا موقع ہوتا ہے تو یہ پانی ساحل کی زمین کے وسیع رقبے کی آبپاشی کا کام دیتا اور بڑے بڑے باغات اور زرعی زمینوں کی پرورش کرتا ہے۔

فخر الدین رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں ”دو دریاؤں کے میٹھے اور کڑوے پانی کے ذریعہ مومنین اور کفار کی طرف اشارہ اور تمثیل بیان کی گئی ہے لیکن آیات کے لب و لہجہ پر غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد صفحہ گیت پر موجود خالق کا شاہکار بیان کرنا ہے۔“

تیسری آیت میں انسان کیلئے سمندروں کے مٹھر کرنے کی بات ہے، ارشاد ہوتا ہے۔ (اللَّهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمْ الْبَحْرَ) لیکن سمندر کی مختلف برکات میں سے صرف ایک بات کو بیان کیا گیا ہے اور وہ ہے کشتی رانی کا مسئلہ جس کی طرف پہلے بھی اشارہ ہو چکا ہے۔ چوتھی آیت میں ان بڑی بڑی کشتیوں کو خدا کی عظیم آیات میں شمار کیا گیا ہے جو پہاڑوں کی مانند سطح سمندر پر ظاہر ہوتی ہے، ارشاد ہوتا ہے۔“ (وَمِنْ آيَاتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ)

کس نے ان سمندروں کو اس قدر وسعت، گہرائی اور خصوصیات کے ساتھ خلق فرمایا ہے؟ کس نے لکڑی اور لوہے کو یہ خاصیت عطا فرمائی ہے کہ وہ صفحہ آب پر ثابت اور برقرار رہیں؟ اور کس نے ہواؤں کو حکم دیا ہے کہ وہ منظم صورت میں صفحہ سمندر پر چلیں اور انسان کو ایک نقطے تک جا پہنچنے اور لاکھوں کروڑوں کی ثروت و دولت کو سمندروں کے ذریعہ جا بجا کرنے کی اجازت دی ہے؟ کیا یہ پختہ اور محکم نظام، اسی طرح وہ نظام جو بخارات اور بجلی کی توانائی پر حکم فرما ہے، پروردگارِ عالم کے علم و حکمت کی روشن دلیل نہیں ہے؟

اس مقام پر قرآن مجید نے بڑی بڑی کشتیوں کو ”اعلام“ سے تشبیہ دی ہے۔ ”اعلام“، ”علم“، (بروزن قلم) کی جمع ہے جو دراصل (مفردات میں راعب کے بقول) اس اثر کے معنی میں ہے کہ جس کے ذریعہ کس چیز کا علم حاصل ہو جائے، جیسے وہ نشانات جو راستوں میں لگائے جاتے ہیں، یا لشکر کے جھنڈے وغیرہ۔ پہاڑ کو اسی لئے علم کہتے ہیں کہ وہ ایسا روشن نشان ہوتا ہے۔ جو دُور سے دیکھا جاتا ہے اور عظیم کشتیوں کو پہاڑ سے اس لئے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ پہاڑ کی مانند وہ بھی دُور سے ظاہر ہوتی ہے۔ مزید بات یہ ہے کہ قرآن اسی آیت کے اندر کہتا ہے

”اگر خدا چاہے تو ہوا کو روک دے تا کہ کشتیاں سمندر کی سطح پر رُک جائیں۔“ (اِنْ يَشَاءْ يُسَكِّنِ الرَّيْحَ فَيُظِلُّنَ رَوَاكِدًا عَلٰى ظَهْرِهِ) یا اگر چاہے تو ہواؤں کو اس قدر نامنظم اور درہم برہم کر دے کہ صرف یہی نہیں کہ کوئی کشتی منزل مقصود تک نہ پہنچ پائے، بلکہ وہ سمندر میں الٹ کر غرق ہو جائے۔ اسی لئے آیت کے آخر میں ایک بار پھر تاکید کے طور ارشاد فرماتا ہے۔ ”اس امر میں صبر و شکر کرنے والوں کیلئے



نشانیوں ہیں۔‘ (اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبّٰرٍ شٰكُوْرٍ)

وہی لوگ جو صبر و حوصلے کے ساتھ ان آفاقی آیات میں غور و فکر کرتے ہیں اور جب حقیقت کا ادراک حاصل کر لیتے ہیں تو پھر شکرگزاری کے مرحلہ تک جا پہنچتے ہیں اور حق کے با عظمت آستانے پر اپنی جبین جھکا دیتے ہیں۔

پانچویں آیت میں بھی اسی چیز کو بیان کیا گیا ہے۔ سمندروں میں کشتیوں کی حرکت کو خداوند عالم کی عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت کے طور پر بیان فرمایا ہے، البتہ قدرے فرق کے ساتھ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ ”اس نعمت کے عطا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ خدا تمہیں اپنی بعض آیات دکھائے۔“ (لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَاٰيٰتِهٖ)

نیز اسی وجہ سے چھٹی آیت میں جہاں پر حق تعالیٰ کی نشانیوں میں سے سات آیات کا ذکر کیا ہے اور تیسری آیت اور نشانی ان کشتیوں کو بتایا ہے جو سمندروں میں انسان کے مفادات میں چلتی پھرتی رہتی ہیں۔ (وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ) اسی آیت کے آخر میں تاکید کے ساتھ فرماتا ہے کہ ان امور میں خداوند کریم کی پاک ذات اور اس کی توحید کی نشانیاں ہیں، ان لوگوں کیلئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔“ (لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ)

ساتویں آیت میں خداوند تبارک و تعالیٰ کی ربوبیت کو بیان فرماتے ہوئے کہتا ہے۔ ”تم بتوں کے پیچھے مت بھاگو، کیونکہ وہ تمہارے خدا نہیں ہیں۔ بلکہ تمہارا پروردگار وہ ہے جو سمندر میں تمہارے مفادات کی خاطر آرام سے اور ہمیشہ کیلئے کشتیوں کو چلاتا ہے۔“ (رَبُّكُمْ الَّذِي يُرِيْجِيْ لَكُمْ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ)

یہاں پر ایک نئی تعبیر کا سامنا کر رہے ہیں۔ ”یُرِيْجِيْ“، ”ازجاء“ کے مادہ سے ہے۔ جس طرح کہ ”مصباح اللغۃ“ میں آیا ہے، اس کے معنی ”کسی چیز کو آہستہ آہستہ آرام آرام سے اور نرمی کے ساتھ چلانا“ ہیں۔ ”مقائیس اللغۃ“ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنی ”ہمیشہ چلانا“ ہیں۔ سطح سمندر پر کشتیوں کے چلنے میں یہی دونوں نکتے قابل توجہ ہیں، خاص کر بادی کشتیوں کے بارے میں عام طور پر ہوائیں ہمیشہ کیلئے کشتیوں کو نرمی اور استمرار کے ساتھ متحرک رکھتی ہیں۔ اگر ہواؤں میں شدید اتار چڑھاؤ ہوتا یا ان میں دوام و استمرار نہ ہوتا تو کشتیوں میں زبردست ہچکولے پیدا ہوتے اور وہ مستقل طور پر شدید لرزوں کی زد میں رہتیں، یا پھر سمندر کے درمیان میں ہی متوقف اور پریشان رہتیں۔ قرآن کی یہ تعبیر اس خدائی آیت کے نئے رازوں کا انکشاف کر رہی ہے۔

پس اس طرح مندرجہ بالا تمام آیات سے سمندروں کی تخلیق کے مختلف فوائد معلوم ہو جاتے ہیں جن میں سے ہر ایک فائدہ آیات الہی میں سے ایک آیت ہے، خصوصاً سمندروں کی سطح پر کشتیوں کی حرکت۔ ہمیشہ کسی نعمت کی اہمیت کا اس وقت پتہ چلتا ہے جب وہ ہاتھ سے چلی جائے۔ چنانچہ اگر سمندر نہ ہوتے تو صرف سمندروں کے راستے سے نقل و حمل ہونے والا مال ہی اپنی جگہ پر نہ پڑا رہتا بلکہ غذائی، صنعتی اور زرعی مواد کی بہت بڑی مقدار بھی حاصل نہ ہو پاتی۔ پھر ان سب سے بڑھ کر نہ تو کوئی بادل اٹھتا اور نہ کوئی بارش ہوتی، اور خشک اور بھسم کردینے والی ہوائیں چلتی رہتیں جو زندہ موجودات کا ستیاناس کرتی رہتیں۔

## چند ضروری وضاحتیں

### ۱۔ مختلف نعمتوں کا گھر۔۔۔۔۔۔۔۔ سمندر

جب سمندروں کا وجود عمل میں آیا اس وقت کوئی شخص موجود نہیں تھا کہ اسے معلوم ہوتا کہ وہ کس طرح وجود میں آئے ہیں۔ لیکن سائنسدانوں اور دانشوروں کا عقیدہ یہ ہے کہ ہمارا یہ خاکی کرہ گرم اور جھلسا دینے والے سورج سے جدا ہونے کے بعد بھی گرم رہا اور پھر آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونا شروع ہوا۔ اس کی پوست ایک پکے ہوئے اور خشک سبب کی پوست کی مانند ہو گئی جس میں سلوٹس بھی ہیں، دراڑیں بھی ہیں۔ نشیب و فراز ہیں اور اس میں پہاڑ اور سمندر ظاہر ہو گئے۔

ممکن ہے یہ سوال پیدا ہو کہ سمندروں کا پانی کہاں سے وجود میں آیا؟ یہاں دو طرح کے نظریے ہیں۔ بعض لوگ اس بات کے معتقد ہیں کہ یہ پانی کرہ زمین کی گہرائیوں میں موجود آکسیجن اور ہائیڈروجن کے مل جانے کی وجہ سے تشکیل پایا اور پھوٹ پھوٹ کر نکلنے والے چشموں کی مانند زمین سے باہر آیا جیسا کہ آج بھی باہر آ رہا ہے۔ پھر بتدریج قشر زمین کی پستیوں کو اس نے پُر کر دیا۔

لیکن زیادہ مشہور نظریہ یہ ہے کہ کرہ زمین کے آسمان کو گہرے بادلوں نے ڈھانپا ہوا تھا۔ جب وہ سرد ہوئے تو سیلابی بارشوں کی صورت میں زمین پر برس پڑے، ہزاروں سال تک برستے رہے اور اس کرہ ارضی کو طوفانوں نے اس حد تک اپنی لپیٹ میں لے لیا کہ جس کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے سمندر وجود میں آ گئے۔ البتہ ایک لمبے عرصے تک ان کے بے نظیر تلام بھی سمندروں کی گہرائیوں، چٹانوں اور ساحلوں کو گھساتے رہے اس کے بعد بتدریج ان میں سکون آتا گیا اور آج موجودہ صورت میں موجود ہیں۔

بہر حال سمندروں کی تاریخ بہت پرانی اور اسرار سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن اسے بھی زیادہ اہم ان کی برکتیں اور مفادات ہیں جو انسان کو ان سمندروں سے حاصل ہوتے ہیں۔ ہم اس جگہ فہرست وار ان میں سے چند ایک کو بیان کرتے ہیں۔ ان کی تشریح اس مختصر بحث سے خارج ہے۔

### ۱۔ کشتی رانی

انسانی نقل و حمل اور تجارتی مال کے جا بجا لے جانے میں سمندروں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں انسانوں کیلئے حمل و نقل کا اہم ترین ذریعہ یہی سمندر ہیں، خصوصاً جب کہ سمندری راستے طبعی طور پر روئے زمین کے تمام نقاط تک جا پہنچتے ہیں۔ ضروری ہے کہ ہم اس حقیقت کی طرف توجہ کریں کہ آج کے دور میں ایسے غول پیکر جہاز بھی تیار ہو چکے ہیں جو پانچ لاکھ ٹن تیل اپنے اندر لاد کر دنیا کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک پہنچاتے ہیں، جب کہ اس قدر وزن اٹھانے کیلئے بیس ٹن کا بوجھ اٹھانے والی ۲۵ ہزار موٹر گاڑیاں درکار ہوتی ہیں۔

## ۲۔ کھانے پینے کا مواد

سمندروں کے اہم ترین فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ انسان اس سے اپنے کھانے پینے کا مواد حاصل کرتا ہے۔ اس موضوع کی اہمیت کیلئے بس اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ ہر سال ۲۶ ملین (دو کروڑ ساٹھ لاکھ) ٹن مچھلی سمندروں سے پکڑی جاتی ہے۔ یہ اعداد و شمار آج سے تقریباً تیس سال پہلے کے ہیں اور یقیناً آج یہ تعداد اس سے کہیں زیادہ ہو چکی ہے۔ نہ صرف انسان بلکہ بہت سے پرندے بھی اپنی غذا سمندروں اور دریاؤں سے حاصل کرتے ہیں جو خشکی میں پیدا ہونے والی غذا کی بچت کا سبب ہے۔

بعض سائنسدانوں کے حساب کے مطابق صرف وہ پرندے جو ساحلی علاقوں یا چٹانوں والے جزائر میں رہتے ہیں کہ آج کے دور میں پولٹری فارموں (مرغی خانوں) کی غذا کا عمدہ حصہ سمندری مچھلی ہڈیوں سے یا خود مچھلیوں سے تیار کیا جاتا ہے اور پھر بالواسطہ طور پر یہ انسان کی غذا بنتی ہیں۔

## ۳۔ گھاس اور دوا کی جڑی بوٹیاں

سمندر کے ہر ایک ہیکٹر سے پانچ سو ٹن سبز گھاس حاصل ہوتی ہے جب کہ یہ زمین کے بہترین حصہ سے چارٹن سے زیادہ حاصل نہیں ہو پاتی۔ بعض ملکوں میں یہ گھاس جانوروں کو بھی کھلاتے ہیں اور اس کی خاکستر سے زمین کی کھاد کا کام لیتے ہیں۔ سمندری گھاس سے مختلف مواد حاصل ہوتے ہیں، مثلاً جامد الکوحل، سیلز، نشاستہ اور GELATIN (JELLY) جو کیمیکل صنعتوں اور غذاؤں (اور بعض دواؤں) کے کام آتے ہیں۔

## ۴۔ معدنیات اور تیل کے ذخائر

سمندر، معدنیات سے سرشار علاقہ ہے۔ ان معدنیات کا کچھ حصہ سمندر کی گہرائیوں میں ہے جب کہ ان کا اہم حصہ سمندر کے پانی پر تیر رہا ہے، معدنیات میں سے جن دھاتوں کو سمندر کے پانی سے نکالا جاسکتا ہے ان میں سے ایک MAGNESIUM میگنیزیم ہے، جو صنعتوں کے کام آتی ہے۔ اسی طرح پوٹاشیم POTASSIUM، برم BOTANIST اور سوڈیم سلفیٹ SODIUM SULPHATE وغیرہ ہیں۔

سائنسدان کہتے ہیں کہ چالیس عناصر سے زیادہ (علاوہ اس کے جو بتائے گئے ہیں) سمندر کے اندر موجود ہیں، جو مصنوعات میں استعمال ہوتے ہیں، حتیٰ کہ سونا بھی ملتا ہے، اگرچہ ابھی ان میں سے بہت سی دھاتوں کے نکالنے پر سنگین اخراجات اٹھتے ہیں جو ناقابل برداشت ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یک دن ایسا آئے کہ انسان ایسی دھاتوں کو مختصر سے اخراجات کے ساتھ نکال سکے۔ بعض بڑی بڑی کمپنیاں سمندر کے معدنی مواد سے پانچ سو سے زیادہ مختلف چیزیں تیار کرتی ہیں جب کہ سمندر کے پانی میں کروڑوں اربوں ٹن معدنی مواد موجود ہیں۔

اصولی طور پر تیل جو نہایت ہی قیمتی سرمایہ ہے، اس کا شمار بھی سمندر کے تحفوں میں ہوتا ہے، کیونکہ زیادہ قدیم میں اربوں سمندری

جانور سمندر کے عظیم علاقے میں اکٹھا ہوئے اور ان کے اوپر براعظموں کا جو عمل میں آ گیا، ریت اور مٹی کے ٹیلے بنے جو پہاڑوں کی شکل اختیار کر گئے۔ وہ اس میں دب کر رہ گئے اور جو تیل حاصل ہو رہا ہے وہ زمین کی گہرائیوں میں باقی رہ گیا۔

ایک اور اہم معدنی مواد جو سمندر سے حاصل ہوتا ہے، نمک ہے۔ نمک کا انسانی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور گذشتہ زمانے میں قلت کی وجہ سے اس کی اس قدر اہمیت تھی کہ لکھا ہے کہ رومی فوجی اپنی تنخواہ میں نمک وصول کیا کرتے تھے۔ اور روس میں تو نمک کی قیمتوں میں اضافہ کی وجہ سے ”نمکیں بغاوتیں“ سر اٹھاتی رہیں۔

نمک کے اخراج کا اہم ترین منبع بھی سمندر ہے حتیٰ کہ جہاں پر نمک کی کانیں ہیں اور ان کا قطرہ آٹھ آٹھ سو میٹر ہے وہ بھی سمندروں کے آثار میں سے ہیں، جب ایک زمانے میں وہ ساری زمین کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھے۔ ساری دنیا میں نمک کے سالانہ مصرف بائیس ملین (دو کروڑ بیس لاکھ) ٹن کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ یعنی اگر انسان اسی انداز سے خشکی کے نمک کا مصرف کرتے رہے تو جلد یا بدیر اس کی کانیں ختم ہو سکتی ہیں جب کہ سمندر نمک کا ایسا منبع ہے جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آئے گا، کیونکہ سمندر میں موجود نمک کا ذخیرہ اس حد تک زیادہ ہے جو ایک ملین سات سو ہزار (ست لاکھ) سال تک انسانی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے کافی ہے۔

## ۵۔ توانائی کی پیدائش کا بہترین ذریعہ

انسان نے قدیم الایام سے اس نکتہ کی طرف توجہ مرکوز کی ہوئی ہے کہ سمندر کے ”مد“ کے موقع پر جب اس کا پانی چڑھاؤ پر ہوتا ہے اُسے کنٹرول میں لایا جائے اور ”جزر“ کے موقع پر جب وہ گھاؤ کی طرف مائل ہوتا ہے، اس سے توانائی پیدا کی جائے اور پھر اس سے پن چکیاں وغیرہ کے چلانے کا کام لیا جائے۔

دورِ حاضر کے سائنسدانوں کے اندازوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس توانائی سے بڑی مقدار میں بجلی پیدا کی جاسکتی ہے اور اس سے توانائی کی پیدائش کے عظیم منبع کا کام لیا جاسکتا ہے۔ سمندر کے پانی کا مد و جزر جو چاند کی کشش کی وجہ سے رات دن میں دو مرتبہ معرض وجود میں آتا ہے، پانی کی سطح کو بڑی حد تک اوپر اور نیچے لے جاتا ہے اور اس سے توانائی کے حصول کے علاوہ سمندر کے ساحلی علاقوں کی آبپاشی کا بھی بہت بڑی حد تک کام لیا جاتا ہے۔ کیونکہ جس جگہ پر دریاؤں کا پانی سمندر میں گرتا ہے، وہاں پر بیٹھے پانی کا سمندر ہوتا ہے اور ”مد“ کی وجہ سے وہی شیریں پانی ساحل کی طرف دھکیلا جاتا ہے، جس سے بڑی مقدار میں زمین کی آبپاشی ہوتی ہے۔ اسی لئے انسان قدیم الایام سے ہی ایسے علاقوں میں نہریں کھود کر بڑی مقدار میں زمینوں کو زیر کاشت لایا ہے۔

آج بھی خلیج فارس کے ساحلی علاقوں میں شاید کروڑوں کھجوروں کے درخت ایسے ہیں جو صرف اسی طریقہ سے سیراب ہوتے ہیں کیونکہ وہ پانی کافی دور تک پیچھے کو ہٹ جاتا ہے اور یہ عذب و فرات (میٹھا اور خوشگوار) پانی جو ملح و اجاج (کڑوے اور کھاری) پانی کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے، لیکن اس میں مخلوط نہیں ہوتا، اس علاقہ کے ساحل نشینوں کیلئے ایک عظیم سرمایہ ہے۔

## ۶۔ مختلف زیورات

سمندر کے فوائد سے ایک اور فائدہ، آیات بالا میں بھی جس کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا گیا ہے وہ زیورات، میں جو سمندر سے حاصل کئے جاتے ہیں، جیسے وہ موتی ہیں جو مخصوص صدف کے سینے میں پروان چڑھتے ہیں، اور مرجان ہے جو ایک قسم کا دریائی جانور ہے لیکن درخت کی شاخوں کی صورت میں ہوتا ہے اور نہایت ہی دلکش اور دیدار زیب منظر کا حامل ہوتا ہے، زینت کے علاوہ طب میں بھی کام آتا ہے۔

## ۷۔ سمندروں کے ذریعہ موسم میں اعتدال

نہ صرف وہ ہوائیں جو سمندر سے خشکی کی طرف چلتی ہیں، ان سے موسم میں نمی آ جاتی ہے اور وہ حد اعتدال پر رہتا ہے بلکہ آپ تعجب نہ کریں تو خود دنیا کے عظیم سمندروں کے اندر بھی بڑے بڑے دریا بہ رہے ہیں جو گرم علاقوں سے سرد منطقوں کی طرف اور سرد علاقوں سے گرم منطقوں کی جانب رواں دواں ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کی اس قسم کی حرکت سے کرہ زمین پر موسم کے اعتدال پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔

ان دریاؤں میں سے زیادہ موثر اور طاقت ور ”گلف اسٹریم“ GULF STREAM ہے یہ عظیم دریا مرکزی امریکہ کے ساحلوں سے چلنا شروع ہوا ہے اور تمام اوقیانوس اطلس کو طے کرتا ہوا شمالی یورپ کے ساحلوں تک جا پہنچتا ہے۔ یہ پانی جو خط استواء کے نزدیکی علاقوں کے قریب جاری ہیں، گرم ہوتے ہیں، حتیٰ کہ بعض اوقات ان کا رنگ بھی پڑوسی پانیوں کے رنگ سے مختلف ہوتا ہے۔ پھر مزے کی بات یہ ہے کہ یہ عظیم سمندری دریا جس کا صرف عرض ڈیڑھ سو کلومیٹر اور گہرائی کئی سو میٹر ہے [۱] بعض علاقوں میں اس کی رفتار اس قدر ہے کہ ایک دن میں صرف ایک سو ساٹھ کلومیٹر سفر کرتا ہے اور اس کی حرارت کا نزدیک پانیوں کی حرارت سے پندرہ درجہ کا فرق ہوتا ہے۔

”گلف اسٹریم“ گرم ہواؤں کو وجود میں لاتا ہے اور اپنی حرارت کا بیشتر حصہ یورپ کے شمالی ملکوں کو بھیجتا ہے جس سے ان ملکوں کی آب و ہوا نہایت ہی خوشگوار رہتی ہے۔ اگر یہ صورت حال نہ ہوتی تو ان ملکوں میں زندہ رہنا اگر ناممکن نہ ہوتا تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ عظیم سمندری دریا جن کی پیدائش کا اصلی عامل زمین کے استوائی منطقہ کے درجہ حرارت اور قطبی منطقوں کے درجہ حرارت کا باہمی اختلاف ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنے اطراف کے پانی سے بہت کم مخلوط ہو پاتے ہیں اور اسی صورت حال کے ساتھ ہزاروں میلوں کا فاصلہ طے کرتے ہیں، سورہ الرحمن کی ۱۹ ویں آیت کا دلچسپ مصداق ہیں کہ ”مَوْجَ الْبَحْرِ يَلْتَقِيَانِ يَبْتَغِيَانِ فِي سِحِّ لَابِئِغِيَانِ“ خداوند عالم نے دو دریاؤں کو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ قرار دیا ہے اور ان کی حالت یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ تو چلتے ہیں لیکن ان کے درمیان رکاوٹ موجود ہے جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتے۔ [۲] یہ آیت مذکورہ کی ایک دلکش تفسیر ہے۔

[۱] بعض کتابوں میں صراحت کی گئی ہے کہ اس کی بعض علاقوں میں گہرائی آٹھ سو میٹر تک جا پہنچتی ہے۔ (کتاب ”دریا و بارعجا“ ص ۶۶)

[۲] اس بارے میں مزید تفصیل کیلئے تفسیر نمونہ جلد ۲۳ میں انہی آیات کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیں۔

## ۸۔ سمندری پانی سے طبی سہولتوں کا حصول

اس بات کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ سمندر کا پانی انسان کے بد اور اعصاب کے لئے نہایت ہی مفید ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کے اکثر نقاط میں بعض جلد ہی اور اعصابی بیماریوں کے علاج کیلئے یا مکمل صحت و سلامتی اور حفظانِ صحت کے حصول کیلئے، سمندری پانی سے استفادہ ایک معمول کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور اگر اخلاقی جرائم و مقاصد اور آلودگیوں کو اس سے نکال دیا جائے تو سمندر کا پانی انسان کی صحت و سلامتی اور فرحت و نشاط کا بہترین منبع بن سکتا ہے۔

## ۹۔ روئے زمین کے پانی کا اصل منبع

سمندر کا اہم ترین، عظیم ترین اور وسیع ترین فائدہ تو اس سے اٹھنے والے وہی بخارات ہیں جو بعد میں بادل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور وہ خشک اور پیاسی زمینوں کی طرف روانہ کر دیئے جاتے ہیں جو بارش کی صورت میں ان زمینوں کو زندگی عطا کرتے ہیں، جس کی تفصیل ہم باد و باران کی فصل میں بیان کر چکے ہیں۔

## ۱۰۔ میٹھے پانی کا حصول

آج بہت سے علاقوں میں جن کی میٹھے پانی تک رسائی نہیں ہے وہ اسی سمندری پانی کو عملِ تفسیر کے ذریعہ پینے کے قابل بنا کر اس سے استفادہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے ناقابلِ رہائش علاقے بھی رہنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ یہ سمندروں کی برکتوں اور فوائد کا مختصر سا نمونہ جن سے آج انسان واقف ہوا ہے اور معلوم نہیں کہ مستقبل میں اور کون سے فوائد انسان کو حاصل ہوتے ہیں؟ یہ ہیں سے ہم قرآن مجید کی اس تعبیر کی عظمت سے واقف ہوتے ہیں کہ فرماتا ہے ”وَسَجَّحْنَا لَكُمْ الْبَحْرَ“ (خدا نے سمندر کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے اور تمہاری خدمت میں فرار دے دیا ہے)۔<sup>[۱]</sup>

## ۲۔ سمندر۔۔۔ یا۔۔۔ عجائبات کا گھر!

اگر ہم خوب غور سے سوچیں تو معلوم ہوگا کہ ویسے تو دنیا کی تمام موجودات تعجب آور ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی سمندر کے اندر رہنے والے جانے پہچانے جانوروں کی اقسام ایک لاکھ چالیس ہزار تک بتائی ہیں۔ ان اقسام کی تعداد سمندروں کی سطح پر تو بہت زیادہ ہے، لیکن ہم جس قدر گہرائیوں میں چلتے جائیں اسی قدر ان کی تعداد کم تر یا کم از کم ہم ان سے کم تر پر مطلع ہو سکیں گے۔

[۱] اس سلسلے میں مندرجہ ذیل کتابوں کا مطالعہ فرمائیں: ۱۔ دریاد یار عجائب۔ ۲۔ اسرارِ دیا، ۳۔ شگفتہائے دریا، ۴۔ رسالہ بندرودریا، ۵۔ فرہنگ نامہ جلد ۱۲، ۶۔ بہترین

سمندروں کے بارے میں اہم بات یہ ہے کہ ماضی میں یہ تصور کیا جاتا تھا کہ سمندروں کی گہرائی میں قطعاً کوئی زندہ چیز موجود نہیں ہے، کیونکہ سورج کی شعاعیں زیادہ سے زیادہ چھ سو میٹر سمندری پانی کے اندر جاسکتی ہیں اور اس گہرائی میں آخری شعاع بھی ناپید ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ”تاریکی مطلق“ کی فرمانروائی ہوتی ہے۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ اس منطقہ میں سمندر کا پانی بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک اور بات زیادہ اہم ہوتی ہے، وہ یہ کہ وہاں پر موجود اشیاء پر پانی کا زبردست دباؤ ہوتا ہے، کیونکہ ایک کلو میٹر کی گہرائی میں پانی کا دباؤ سو کلو گرام فی مربع سینٹی میٹر ہوتا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ اگر کوئی انسان وہاں حفاظتی تدابیر کے بغیر چلا جائے تو اس کی ہڈیاں چکنا چور ہو جائیں۔<sup>[۱]</sup> یہی وجہ ہے کہ سمندروں کی گہرائی میں جانے کیلئے دس میٹر کے بعد کیلئے حفاظتی تدابیر اور حفاظتی لباس کے بغیر جانا قطعاً ناممکن ہے۔ اس سے بھی مزید نیچے جانے کیلئے تو فولاد کی موٹی موٹی چادروں کی مکمل پناہ گاہ کی ضرورت ہوتی ہے وگرنہ پانی کا دباؤ ہر چیز کا کچور نکال دے۔ اس سے بھی مزید نیچے جانے کیلئے بھی ذریعہ سے سفر بالکل ہی ناممکن ہے کیونکہ آج تک دنیا میں کوئی ایسی چیز تو ایجاد ہوئی ہے اور نہ ہی دریافت ہوئی ہے جو اس دباؤ سے بچا سکے۔

لیکن سائنسدانوں کے بعد کے مطالعات نے یہ چیز ثابت کر دی ہے کہ سمندر کی نہات ہی اتھاہ گہرائیوں میں بڑی تعداد میں اور نہایت ہی عجیب و غریب اقسام کی مخلوق رہتی ہے اور ان کے اندر جو قوت مدافعت ہوتی ہے اس کے ذریعہ وہ پانی کے عجیب دباؤ کا سامنا کرتی ہے۔ وہاں مطلقاً کسی قسم کے گھاس نہیں نہیں اُگتی جس سے بحری جانور غذا کے طور پر استفادہ کریں لیکن آفریدگار کائنات کا دستِ قدرت ان کی ضرورت کی غذا بھی تیار کرتا ہے، جو مختلف نباتاتی مواد ہوتے ہیں اور سمندر کی سطح اور نور آفتاب کے نیچے پرورش پاتے رہتے ہیں اور جب وہ غذا کیلئے آمادہ ہو جاتے ہیں تو آسمانی ماندہ کی صورت میں سمندر کی گہرائیوں میں رہنے والی مخلوق کے سر پر پہنچ جاتے ہیں۔ ان کے لاشے بھی ان کی لذیذ غذا کا کام دیتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنی تاریکی کی مشکل کو کیسے حل کرتے ہیں؟ جس قدرت نے انہیں اس منطقہ کیلئے پیدا کیا ہے اس نے ان کی روشنی کا بھی بندوبست کر دیا ہے کیونکہ ان میں سے سب سے جانور ایسے ہیں جو خود روشنی باہر نکالتے ہیں، ٹھنڈی روشنی جیسے جگنو کی ہوتی ہے۔ مچھلی کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس کے سر سے سرخ اور دم سے نیلی روشنی باہر آتی ہے جب کہ بعض مچھلیاں سرخ، سفید اور نیلی روشنی بھی باہر نکالتی ہیں۔ ایک سائنسدان کا کہنا ہے کہ سمندر کے عجیب ترین علاقوں میں وہ حصے ہوتے ہیں جو نہ تو آبی سطح کے نزدیک ہوتے ہیں اور نہ ہی سمندر کی تہیں ہوتی ہیں، بلکہ ان دونوں حصوں کے درمیان کا علاقہ ہوتا ہے۔ جس کے اوپر نہ تو آسمان ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے نیچے زمین ہوتی ہے، بلکہ اوپر، نیچے آگے اور پیچھے غرض ہر طرف پانی ہی پانی ہوتا ہے۔ جو مخلوق وہاں پر رہ رہی ہوتی ہے اس کا کوئی خانہ و کاشانہ نہیں ہوتا۔ اسی لئے وہ ہمیشہ چلتی پھرتی رہتی ہے۔ وہاں ایسی مچھلیاں رہتی ہیں جو آپ کو حیرت میں ڈال دیں۔ ان میں سے بعض کے دانت تو اس قدر لمبے ہوتے ہیں کہ وہ ان

[۱] غوطہ خور لوگ غوطہ خوری کا لباس پہنے بغیر تیس میٹر کی گہرائی تک جاسکتے ہیں اور لباس کے ساتھ ڈیڑھ سو میٹر تک، جبکہ سمندر کے گہرے سے گہرے مقام پر پانی کا دباؤ





حاصل کرتے ہیں کہ ”یَا مَهْنُ فِي الْبَحَارِ عَجَائِبُهُ“ (اے وہ ذات جس کی قدرت کے عجائبات سمندروں کے اندر موجود ہیں۔<sup>[۱]</sup> جس دن پیغمبر گرامی اسلام کی زبان مبارک سے یہ جمل نقل کیا گیا تھا اس دن تک سمندروں کے راز و اسرار کسی پر منکشف نہیں ہو پائے تھے۔ اور آج اس جمل کی عظمت ہمارے لئے دوسرے تمام ادوار کی نسبت زیادہ واضح اور روشن ہو جاتی ہے۔

حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی دعا و مناجات کا ایک اور جملہ ہے: ”أَنْتَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ عَظَمْتَكَ وَفِي الْأَرْضِ قُدَّرْتَكَ. وَفِي الْبَحَارِ عَجَائِبُكَ“ (تو تو وہ ذات ہے جس کی عظمت آسمان میں جس کی قدرت زمین میں اور اس کے عجائبات سمندروں میں ہیں۔<sup>[۲]</sup>

اس بحث کو امیر المؤمنین کی ایک اور حدیث کے ساتھ آگے چلاتے ہیں، امام فرماتے ہیں: ”سَخَّرَ لَكُمُ الْمَاءَ يَغْدُو عَلَيْكُمْ وَيُرْوَحُ صِلَا حَالِ الْمَعَاشِكُمْ وَالْبَحْرُ سَبَبُ الْكَثْرَةِ أَمْوَالِكُمْ“ (خداوند عالم نے پانی کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے، جو صبح کے وقت جاتا ہے اور شام کے وقت واپس آج جاتا ہے، تاکہ تمہاری زندگی کو سنوارتا رہے) ممکن ہے یہ تعبیر سمندر کے مد و جزر اور اس کے زندگی عطا کرنے والے اثرات کی طرف اشارہ ہو) اور سمندر کو تمہارے اموال کی کثرت اور فراوانی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔<sup>[۳]</sup>

اس بحث کو توحید مفضل کے ایک اہم اور برگزیدہ حصے کو بیان کر کے ختم کرتے ہیں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

’فَاذْأَرَدْتَ أَنْ تَعْرِفَ سَعَةَ حِكْمَةِ الْخَالِقِ وَقَصْرَ عِلْمِ الْبَخْلُوقِينَ فَانظُرْ إِلَى مَا فِي الْبَحَارِ مِنْ ضُرُوبِ السَّمَكِ وَدَوَابِّ الْمَاءِ، وَالْأَصْدَافِ وَالْأَصْنَافِ الَّتِي الَاتْحَظِي وَلَا تَعْرِفْ مَنَافِعَهَا إِلَّا الشَّيْءَ بَعْدَ الشَّيْءِ يَدْرُكُهُ النَّاسُ بِالسَّبَابِ تَحْدِثُ“ (اگر تم خالق کائنات کی حکمت کی وسعت اور مخلوقات کے علم کی کوتاہ دامن کی کو جاننا چاہتے ہو تو قدرے اپنی نگاہ اور قیاسوں اور سمندروں میں انواع و اقسام کی مچھلیوں، دوسرے چلنے پھرنے والے جانوروں اور صدقوں پر ڈالو۔ ان کی اس قدر انواع و اقسام ہیں کہ جن کی نیت کو کوئی حد ہے اور نہ ہی حساب اور جن کے فوائد بتدریج ان حالات کے پیش آنے کیلئے بعد ظاہر ہوتے رہیں گے جو) انسانی زندگی میں) رونما ہوں گے۔

پس سمندروں، دریائی جانوروں اور بحری نباتات وغیرہ میں ایسے فوائد اور برکتیں ہیں کہ جنوں، جو انسانی عمر آگے بڑھتی جائے گی اسی قدر ان کے نئے اسرار و رموز منکشف ہوتے جائیں گے اور نئے فوائد انسان کیلئے ظاہر ہوتے جائیں گے جن کی وجہ سے وہ ان نعمتوں کے خالق کے سامنے اپنے خضوع و خشوع کے اظہار پر مجبور ہو جائے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

[۱] دعائے جوش کبیر فضل ۷۷

[۲] بحار الانوار جلد ۹ ص ۹۳ (۹۳)

[۳] بحار الانوار جلد ۶ ص ۳۹ حدیث ۳ (باب الماء و انواعه و البحار)

## ۱۴۔ سایہ کی تخلیق میں خلاق عالم کی نشانیاں

### اشارہ

کیا سایہ بھی کوئی ایسی چیز ہے جس سے خالق کائنات کی عظمت کا پتہ چل سکتا ہو؟ قرآن پاک میں خداوند عالم کی نعمتوں کے بیان اور اس کی پاک ذات کے تعارف کے موقع پر اس بظاہر ہر سادہ سے مسئلہ کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس اسرار بھری کائنات میں جس چیز کی طرف بھی آپ دیکھیں گے اس میں اس کی عظمت کے آثار نظر آئیں گے اور تمام چھوٹی بڑی چیزوں کی پیشانی پر اس کی حکمت و عظمت کے دلائل ثبت ہیں مختصر سے اشارہ کے ساتھ ہم مندرجہ ذیل آیات کو گوش دل کے ساتھ سماعت کرتے ہیں:

۱۔۔۔ اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهُ سَاكِنَاتٍمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسُ عَلَيِّهِ دَلِيْلًا ثُمَّ قَبَضْنَاهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا

(فرقان/۳۵-۳۶)

۲۔۔۔ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِمَّا خَلَقَ ظِلَالًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَ اِيْلَ تَقِيْبِكُمْ الْحَرَّ وَسَرَ اِيْلَ تَقِيْبِكُمْ بَأْسَكُمْ كَذٰلِكَ يُتَمَّمُ نِعْمَتَهُ عَلَيِّكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسَلِّمُوْنَ

(نحل/۸۱)

۳۔۔۔ اَوَلَمْ تَرَ اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَقَّهُوْا اِظْلَالُهُ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَالِ سُجَّدًا لِلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ

(نحل/۳۸)

۴۔۔۔ وَاللّٰهُ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلَالُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاَضْحٰلِ

(رعد/۱۵)

## ترجمہ

- ۱۔۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے سایہ کو کس طرح پھیلا یا ہے؟ اور اگر وہ چاہتا تو اُسے ٹھہرائے رکھتا، پھر ہم نے سورج کو اس کے وجود پر دلیل قرار دیا۔ پھر اُسے آہستہ آہستہ اکٹھا کرتے ہیں۔
- ۲۔۔ خداوندِ عالم نے تمہارے لئے جو چیزیں خلق فرمائی ہیں ان کے سائے بھی بنائے ہیں، اور پہاڑوں سے پناہ گائیں اور تمہارے کپڑے بنائے جو تمہیں (سردی اور) گرمی سے محفوظ رکھیں، اور کرتے جو تمہیں جنگ سے بچاتے ہیں۔ یوں خدا اپنی نعمت تم پر پوری کرتا ہے تاکہ تم اس کی فرمانبرداری کرو۔
- ۳۔۔ کیا انہوں نے خداوندِ عالم کی مخلوقات کو نہیں دیکھا کہ ان کے سائے ان کے دائیں بائیں حرکت کرتے ہیں اور خضوع و خشوع کے ساتھ خدا کا سجدہ کرتے ہیں۔
- ۴۔۔ جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے طوعاً و کرہاً اور اسی طرح ان کے سائے بھی صبح و شام کو خدا کا سجدہ کرتے ہیں۔

## الفاظ کے معانی اور تشریح

”ظلال“، ”ظل“ کی جمع ہے جس کا معنی سایہ ہے۔ لیکن دانش اور مشہور مفسر ”راغب“ اپنی کتاب ”مفردات“ میں کہتے ہیں کہ جہاں پر سورج کی روشنی نہ پڑی ہو، سایہ شمار ہوتا ہے۔ خواہ اس سے پہلے اس پر وہ روشنی پڑی ہو یا نہیں! لیکن فنی (بروزن شیعے) اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پہلے سورج کی روشنی اور پھر سایہ پڑ گیا ہو، جب کہ بعض ارباب لغت نے ان دونوں الفاظ کو ایک ہی معنی میں لیا ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ ”ظل“ صبح سے ظہر تک کے اور ”فنی“ ظہر کے بعد کے سایہ کو کہتے ہیں۔ لیکن ان دونوں الفاظ کے استعمال کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلے معنی بہتر نظر آتے ہیں۔ ”ظل“ کا لفظ کنایہ کے طور پر عزت، قدرت، رفاہ اور آرائش و آرام کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے، کیونکہ یہ چیزیں عموماً سایہ میں حاصل ہوتی ہے۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### کیا سایہ بھی ایک عظیم نعمت ہے؟

ان آیات میں سایوں کی بات کی گئی ہے۔ بات تو بظاہر سادہ سی ہے لیکن اس کا عمیق مطالعہ ہمیں خالق کائنات سے زیادہ قریب اور بہتر آشنا کر سکتا ہے۔

”سب سے پہلے آیت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے ”کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے پروردگار نے سایہ کو پھیلا یا ہے؟“ (الَّذِي تَرَىٰ رَبَّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ) ”اگر وہ چاہتا تو اسے ایک جگہ پر ٹھہرائے رکھتا۔“ (وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهُ سَاكِنًا) اس آیت مبارکہ کے ذیل میں ارشاد ہوتا ہے: ”پس ہم نے سورج کو سایہ کے وجود پر دلیل قرار دیا۔“ (ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسُ عَلَیْهِ دَلِيلًا) اس آیت کے آخر میں فرماتا ہے ”پھر ہم اُسے آہستہ آہستہ اکٹھا کرتے ہیں“ (مَرَقَبَضْنَا كَاِیْنًا قَبْضًا یَّسِیْرًا)

یہاں کون سا سایہ مراد ہے جسے خدا پھیلاتا اور بتدریج سمیٹتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد رات کا سایہ ہے جو بتدریج تمام زمین پر پھیلتا اور سمیٹتا ہے، اور سورج کا وجود اس بات کا گواہ اور اس پر دلیل ہے، کیونکہ ہر چیز کو اس کی ضد سے پہچانا جاتا ہے، یعنی (تَعْرِفُ الشَّيْءَ بِأَصْدَادِهَا)

بعض مفسر اسے اس لمبے اور وسیع سائے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو بین الطلوعین (صبح اور طلوع آفتاب کے درمیانی وقت) صفحہ زمین کو ڈھانپ لیتا ہے۔ اس وقت یہ نہایت ہی پُر لطف سایہ اور پُر کیف لمحات ہوتے ہیں۔ بعض مفسرین اس سے مراد وہ سایہ سمجھتے ہیں جو دن کے وقت پہاڑوں، درختوں اور دوسرے اجسام پر سورج کی شعاعیں پڑنے سے معرض وجود میں آتا ہے اور بتدریج گھٹتا اور بڑھتا رہتا ہے۔ چونکہ ان تینوں تفسیروں کے درمیان کسی قسم کا کوئی تضاد نہیں ہے اور آیت کی تعبیر بھی مطلق اور جامع ہے لہذا ہو سکتا ہے کہ ان سب کی طرف اشارہ ہو جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر ایک انمول نعمت ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ رات درحقیقت زمین کے اس نیم کرے کا سایہ ہے جو سورج کے مقابل میں ہوتا ہے۔ یہ ایک مخروطی شکل کا سایہ ہوتا ہے جو فضا میں مخالف سمت میں پھیلا ہوا ہوتا ہے اور بطور دائم چلتا رہتا ہے۔ اگر رات کا سایہ نہ ہوتا تو دھوپ اور اس کی گرمی سے تمام موجودات جل کر راکھ ہو جاتیں اور نسل انسانی بہت جلد صفحہ ہستی سے مٹ جاتی۔

اگر دوسرے سائے نہ ہوتے اور انسان کو مجبوراً سارا دن دھوپ میں بسر کرنا پڑتا تو وہ بہت مشکل سے دو چار رہتا اور اس کیلئے موسم گرما میں زندہ رہنا ہی دشوار ہو جاتا۔ خداوند کریم نے انسان کو سائے جیسی نعمت عطا فرمائی ہے کہ اس سے وہ خود بھی اور اس سے متعلق دوسری چیزیں بھی آرام و آسائش سے رہ سکیں۔

بالفاظ دیگر کچھ چیزیں ایسی ہیں جو ”گدلی“ پیدا کی گئی ہیں اور بعض وہ ہیں جو شفاف“ خلق فرمائی گئی ہیں اور روشنی جن کے اندر سے



طریقے انسان کے پاس زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن اس بات کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ عربی ادب میں بہت سے مقامات پر جہاں دو متضاد چیزوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں تو ایک کو اختصار کیلئے حذف کر دیتے ہیں اور صرف ایک ہی کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں جس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اسی آیت کے آخر میں ان تین نعمتوں (سائے، مساکن، اور لباسوں کے ذکر) کے بعد فرماتا ہے: ”اس طرح سے خداوندِ علم اپنی نعمتیں تم پر مکمل کرتا ہے تاکہ تم اس کے فرمان کے مطابق سر تسلیم خم کر دو۔“ (كَذَٰلِكَ يُتَمِّمُ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُونَ)

ان نعمتوں اور ان کے مختلف اسرار کی طرف توجہ ایک تو انسان کو خدا کے علم اور اس کی قدرت سے آشنا کرتی ہے اور دوسرے حسن شکرگزاری کے متحرک ہو جانے سے اسے خداوندِ متعال کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر آمادہ کرتی ہے کہ یہ خداوندِ عالم ہی ہے جس کے اس قدر احسان اور مہربانیاں ہیں۔

تیسری آیت میں توحیدی آیات کی صورت میں مشرکین کو حنبوڑ کر فرماتا ہے ”کیا انہوں نے خدا کی مخلوق کو نہیں دیکھا کہ ان سے سائے دائیں اور بائیں سے خدا کا کیونکر سجدہ کرتے ہیں جب کہ وہ خضوع کی حالت میں ہوتے ہیں۔“ (أَوَلَمْ تَرَ إِلَىٰ مَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ يَتَّبِعُهُ أَطْلَاقُهُ، عَنِ الْيَمِينِ وَالشَّمَائِلِ سُجَّدًا لِلَّهِ وَهُمْ ذَاخِرُونَ) [۱]

کس قدر بہتر ترین تعبیر ہے کہ تمام سائے زمین پر سر نہکائے اسکی پاک ذات کے سامنے سجدہ ریز ہیں کیونکہ اس کے فرمان کے تابع ہیں اور ان کا یہ خضوع اور سر تسلیم خم کرنا، پیش گاہ حق میں ان کے سجدہ کی تخلیق کے قوانین کے آگے خضوع و خشوع کا اظہار ہے۔ لیکن انسان سایہ سے بھی کتنا گھبراہٹا ہوتا ہے کہ وہ بتوں کے آگے تو سر تسلیم کرتا ہے لیکن پروردگار کا سجدہ نہیں کرتا۔

سایوں کا سجدہ زمین و آسمان میں موجود تمام موجودات کے عمومی سجدہ کا ایک جز ہے۔ لہذا آیت کا سلسلہ جاری ہے اور اس میں عمومی سجدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ ”زمین و آسمان میں جو بھی چلنے والی چیز ہے خدا کیلئے سجدہ کرتی ہے۔“ (وَاللَّهُ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ ذٰلِكَ) (نحل - ۶۹)

یہاں پر ایک تفصیلی بحث ہے جسے ”حق کے آگے کائنات کا عمومی سجدہ“ کے عنوان سے بیان کیا جائے گا۔ بہر حال یہ آیت بھی سایوں اور ان کے آثار کی اہمیت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے جو توحید کے الہام عطا کرنے والے منبع کے عنوان سے توجہات کا مرکز بن سکتی ہے۔

چوتھی آیت میں سایوں کو آسمان و زمین کی تمام موجودات کے رولیف میں بیان فرمایا ہے جو سب کی سب خدا کیلئے خضوع و خشوع اور سجدہ کرتی ہے۔ اشارہ ہوتا ہے۔ ”تمام مخلوقات جو بھی آسمان اور زمین میں ہیں، اسی طرح ان کے سائے بھی ہر صبح و شام

[۱] ”بعضیو“، ”ذبی“ کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں بازگشت اور لوٹنا۔ بعض حضرات اسے موجودات کے ان سایوں میں منحصر سمجھتے ہیں جو بوقت عصر ہوتے ہیں، جب سورج لوٹ رہا ہوتا ہے۔ اس لفظ کا اطلاق جنگی غنیمتوں کے ایک حصے پر اس لئے ہوتا ہے کہ یا تو مسلمانوں کی طرف رہا ہوتا ہے یا اس لئے کہ اسے بھی سائے کی مانند زوال اور فنا ہے اور ”داخر“ کا معنی تو اضع کرنے والا

اطاعت و تسلیم یا جبر و اکراہ کے ساتھ خدا کیلئے سجدے کرتے ہیں۔ (وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظُلْمًا لَّهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاَضَالِ)

”طوعاً و کرہاً“ کی تعبیر ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ عقلمند اور باشعور مخلوق اپنی رضا و رغبت سے اور عقل سے عاری مخلوق، جیسے سایہ وغیرہ، تخلیق عالم کے لازمی قوانین کے تحت فرمان الہی کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔

یابہ کہ موثنین تو اپنی خوشی اور رضا سے لیکن غیر موثنین جو خود اختیاری طور پر سجدہ کرنے کیلئے حاضر نہیں ہوتے ان کے وجود کا ایک ایک حصہ تخلیق کائنات کے لازمی قوانین کے مطابق خداوند عالم کے حکم کے آگے سر جھکائے ہوئے ہے اور اس کی ذات پاک کے سامنے سجدہ تکوینی بجلا رہا ہے۔ یابہ کہ موثنین تمام حالات میں (خوشی اور غم کے زمانے میں بھی سکون اور بے چینی کے دور میں بھی) خدا کے آگے سر بسجود ہوتے ہیں، لیکن کفار صرف مجبوری اور مشکلات کے موقع پر اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ان تینوں تفسیروں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اور ان سب کو اسی آیت کے مفہوم میں جمع کیا جاسکتا ہے۔

مندرجہ بالا آیت ”من“ کی تعبیر سے اگرچہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق صاحبان عقل سے ہے، لیکن یہ احتمال زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کا مفہوم عام ہے اور تمام عاقل و غیر عاقل مخلوق اس میں شامل ہے اور ”من“ کی تعبیر غلبہ کے باب سے ہے۔ (کیونکہ عقلمندوں کے بے عقلوں پر غلبہ حاصل ہے)

البتہ ”غدا“ اور ”اصال“ (صبح اور شام کا وقت) کی تعبیر شاید اس وجہ سے ہے کہ دن کے درمیانی حصہ میں بعد مواقع پر سایہ مٹ جاتا ہے، یا پھر نہات ہی محدود اور بالکل چھوٹا ہوتا ہے جب کہ صبح اور شام کے وقت ایسا نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں یہ تعبیر بہت سے مواقع پر دوام اور عموم کے بیان کرنے کیلئے بھی آتی ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ ”فلاں آدمی ہر صبح و شام درس پڑھتا ہے“ یا ”فلاں شخص صبح و شام دوسروں کے کام میں مداخلت کرتا ہے“ یعنی ہمیشہ ایسا ہوتا ہے۔ ان تمام آیات سے یہ بات بخوبی سمجھی جاسکتی ہے کہ قرآن مجید سایہ تک کی خصوصی اہمیت کا قائل ہے اور اُسے خداوند عالم کی عظمت کی آیات میں شمار کرتا ہے۔ ”سجدہ“ کی تعبیر جو خضوع و خشوع کی آخری حد ہوتی ہے، اسی بات کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔

## چند ضروری وضاحتیں

### اگر سایہ نہ ہوتا

کسی چیز کی اہمیت کا اندازہ لگانے کیلئے ضروری ہے کہ ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ ایک لمحہ یا ایک دن یا ایک ماہ کیلئے وہ ختم ہو چکی ہے اور پھر اس کے انجام کا اندازہ کریں۔ سایہ جو کہ بادی النظر میں ایک عام اور سادہ سی چیز ہے جس کی بظاہر کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اس کے بارے میں بھی ایسا ہی فرض کیا جاسکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک ہفتہ کیلئے ہر قسم کا سایہ کرہ ارض سے اٹھایا جا چکا ہے، نہ پہاڑوں کا سایہ ہے اور نہ ہی

درختوں، دیواروں، چھتوں کا سایہ حتیٰ کہ زمین کی نیم کرہ کا سایہ بھی موجود نہیں ہے جسے رات کہتے ہیں، اور ہر قسم کے یہ سائے ایک ہی مرتبہ اٹھالئے گئے ہیں، اس کائنات کی ہر چیز بلوری (شیشے کی) صورت اختیار کر چکے ہیں اور دھوپ ان کے آر پار ہو رہی ہے آپ ہی بتائیے کہ زندہ رہنا کس قدر مشکل اور طاقت فرسا بن چکا ہے؟ مسلسل دھوپ پڑ رہی ہے، ہر شے پر اس کا دباؤ ہے، انسان اور دوسری تمام مخلوق سے آسائش و آرام سلب ہو چکا ہے۔ اگر یہ مفروضہ موسم گرمہ میں عمل پذیر ہو تو ایک ہفتہ کی یہ مختصر مدت تمام زندہ چیزوں کو ہلاک کر ڈالے۔ بنا بریں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ سائے کا وجود انسانی زندگی کیلئے بہت ہی مؤثر ہوتا ہے اور اسے حیات بخشتا ہے، کیونکہ:

۱۔ سورج کی روشنی اور حرارت کی حد اعتدال پر رکھنے کیلئے سائے کا ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ سورج کی حیات عطا کرنے والی شعاعیں اگر سایہ کی تدریجی نوازشوں سے معتدل نہ ہوں تو وہ مختصر اور کوتاہ مدت میں ہر چیز کو پڑمردہ کر کے جلا ڈالیں۔ فخر رازی اپنی تفسیر میں کہتے ہیں:

”خالص تاریکی سے انسان نفرت کرتا ہے اور خالص روشنی بھی اُسے تکلیف پہنچاتی ہے۔ اسی لئے بہترین حالت سایہ ہی ہے، جو بہشت کی ایک بہترین نعمت کے طور پر ”ظل مدود“ (دراز سایہ) کی صورت میں مذکور ہوا ہے۔ [۱]

۲۔ سایہ کی اہمیت خصوصاً متحرک سایہ کی اہمیت مسافرین اور بیابان میں چلنے والے لوگوں کے لئے اور بھی زیادہ ہوتی ہے کیونکہ ایسے لوگ سائبانوں، خیموں اور دوسرے چھت والے ذرائع حمل نقل کی کمک سے اپنے آپ کو دھوپ سے بچا سکتے ہیں۔

۳۔ ایک اور بات جو نہایت ہی قابل توجہ ہے، یہ ہے عام تصور کے برخلاف کسی چیز کو دیکھنے کیلئے صرف روشنی ہی کافی نہیں، بلکہ نور کے ساتھ ہمیشہ ”سایہ“ بھی ہوتا کہ اشیا کے دیکھنے کا امکان حاصل ہو۔ بالفاظ دیگر اور واضح تر کہ اگر کسی جسم کے چاروں طرف سایہ اور نیم سایہ کا وجود نہ ہو تو روشنی میں غرق وہ جسم کسی بھی طرح قابل مشاہدہ نہیں۔ پس جس طرح مطلق تاریکی میں انسان کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتا اسی طرح مطلق روشنی میں بھی وہ کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتا۔ بلکہ یہ دونوں باہم ہوں تو چیزوں کے مشاہدہ کو ممکن بنا سکتی ہیں۔ (غور کیجئے گا)

جس خالق نے سایہ جیسی بظاہر عام اور سادہ سی چیز کو اس قدر اہمیت عطا فرمائی ہے وہی ہر قسم کی بندگی، خضوع اور سجدے کے لائق ہے۔ ہم اپنی اس گفتگو کو ایک مفسر کے ایک جملہ کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ اس نے ایک ایسے شخص سے جو خالق کے سجدہ کو فراموش کر چکا تھا، کہا تیرا سایہ (جو کمزور اور بے قیمت سی چیز ہے) وہ تو خدا کا سجدہ کرتا ہے لیکن تو خود سجدہ نہیں کرتا،“ (یہ کس قدر بری اور ناشائستہ بات ہے۔ [۲])

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

[۱] تفسیر فخر رازی جلد ۲۳ ص ۸۸

[۲] تفسیر فخر رازی جلد ۲۰ ص ۲۳



## ۱۵۔ نباتات اور میوہ جات میں پروردگارِ عالم کی نشانیاں

اشارہ:

روئے زمین پر موجود وسیع ترین مخلوق نباتات ہے، انواع و اقسام اور کثرت، عجائبات، شگفتگی اور حسن کے لحاظ سے بھی اور افادیت کے نقطہ نظر سے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اپنی توحیدی آیات میں بارہا نباتات کی پیدائش اور ان کی مختلف خصوصیات پر زور دیا ہے اور انسان کو کائنات کی ان میرا عقول مخلوقات کے اسرار کے مطالعہ کی دعوت دی ہے، ایسی مخلوق کہ جس کا ایک ایک پتا معرفت پروردگار کی ایک کائنات لئے ہوئے ہے۔ اس اشارے کے ساتھ آئیے مل کر مندرجہ ذیل آیات اور ان کے دلچسپ نکات کو گوش جان سے سماعت کرتے ہیں:

۱۔۔۔ اَوْلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ {ان في ۱}

ذٰلِكَ لَايَةٌ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (شعراء ۸۰/۴)

۲۔۔۔ اَمَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْبَتْنَا

بِهٖ حَدَآئِقَ ذٰتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تَنْبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ هُمْ

قَوْمٌ يَعْدِلُوْنَ (ممل ۱۰/۱)

۳۔۔۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بَغِيْرٍ عَمْدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوْاسِئًّ اَنْ تَمِيْدَ

بِكُمْ بَتَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ ذٰبَّةٍ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ

زَوْجٍ كَرِيْمٍ {هٰذَا خَلَقَ اللّٰهُ فَاَرْوٰنِىْ مَا ذَا خَلَقَ الدِّيْنِ مِنْ دُوْنِهٖ بَلِ

الظّٰلِمُوْنَ فِى ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ} (لقمان ۱۰/۱۱)

۴۔۔۔ وَايَةٌ لَّهُمْ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ

يَاْكُلُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ

الْعِيُوْنِ ﴿۳۴﴾ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ۗ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ سُبْحٰنَ

الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَمَّا لَا

يَعْلَمُونَ ﴿٣٦﴾ (یس/ ٣٦-٣٧)

٥... وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ۖ فَأَخْرَجْنَا بِهِ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَأَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُتَرَاكِبًا ۖ وَمِنَ النَّخْلِ مِنَ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَجَنَّاتٍ مِنْ أَعْنَابٍ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۗ انظُرُوا إِلَى ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَيَنْعِهِ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٩٩﴾ (انعام/ ٩٩)

٦... وَفِي الْأَرْضِ قِطْعٌ مُتَبَجِرَاتٌ وَجَنَّاتٍ مِنْ أَعْنَابٍ وَزُرْعٌ وَنَخِيلٌ صِنَوَانٌ وَغَيْرُ صِنَوَانٍ يُسْقَى بِمَاءٍ وَاحِدٍ وَنُفِضَ لِبَعْضِهَا عَلَى بَعْضٍ فِي الْأَكْلِ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿٥﴾ (رعد)

٧... هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَكُمْ مِنْهُ شَرَابٌ وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ ﴿١٠﴾ يُنْبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُونَ وَالنَّخِيلَ وَالْأَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿١١﴾ (نحل/ ١٠-١١)

٨... وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَ جَنَّاتٍ مَعْرُوشَاتٍ وَغَيْرَ مَعْرُوشَاتٍ وَالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا أُكْلُهُ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۗ كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ ۗ وَلَا تُسْرِفُوا ۗ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ﴿١٣٠﴾ (انعام/ ١٣١)

٩... وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْزُونٍ ۗ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرِزْقِينَ ۗ (حجر/ ٢٠-١٩)

١٠... إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَى... ذَلِكَمُ اللَّهُ فَأَتَى تَوَّ

## فَكُونْ (انعام / ۹۵) [۱]

## ترجمہ

۱۔۔ کیا انہوں نے زمین میں نگاہ نہیں کی ، ہم نے اس میں کس قدر انواع و اقسام کی نباتات اُگاتی ہیں؟۔۔۔ اس میں (خدا کے وجود) روشن نشانیاں ہیں، لیکن ان میں سے اکثر لوگ مومن نہیں تھے۔

۲۔۔ کیا وہ بت جو تمہارے معبود ہیں بہتر ہیں یا وہ جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ اور تمہارے لئے آسمان سے پانی بھیجا ہے جس سے ہم سے خوبصورت اور مسرت بخش باغ اُگائے ہیں، تمہارے بس کی بات نہیں تھی کہ تم ان درختوں کو اُگاؤ کیا ایسی صورت میں خُدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ ہرگز نہیں وہ ایسے لوگ ہیں (جو بے سمجھی کی وجہ سے) خُدا کی مخلوق کو اس کے برابر قرار دیتے ہیں۔

۳۔۔ اُس نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے بغیر پیدا کیا ہے جو قابلِ رویت ہیں۔ اور زمین میں پہاڑوں کو ڈال دیا ہے تاکہ وہ تمہیں لرزے میں نہ ڈال دے اور اس پر ہر قسم کے چلنے والی مخلوق کو پھیلا دیا۔ اور ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعہ روئے زمین میں مختلف قسم کے نباتات کے قیمتی جوڑے اُگائے۔۔۔۔۔ یہ خدا کی تخلیق ہے لیکن مجھے خُدا کے علاوہ وہ معبود دکھاؤ کہ انہوں نے کیا پیدا کیا ہے؟ لیکن ظالم لوگ واضح گمراہی میں ہیں۔

۴۔۔ مُردہ زمین اُن کیلئے ایک آیت ہے۔ ہم نے اُسے زندہ کیا ہے اور اس سے دانے باہر نکالے ہیں اور وہ اس سے کھاتے ہیں اور اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغات بنائے ہیں اور اس سے چشمے باہر نکالے ہیں۔۔۔ تاکہ وہ ان کے میوے کھائیں جب کہ ان کے ہاتھوں کا اُن کی تخلیق میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ کیا وہ خدا کا شکر نہیں بجاتے؟۔۔۔ پاک ہے وہ خُدا جس نے تمام ”جوڑے“ بنائے، ان سے بھی جو زمین سے اُگتے ہیں اور خود ان سے بھی جو وہ نہیں جانتے۔

[۱] قرآن مجید میں اور بھی بہت سی آیات ہیں جو اسی چیز کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ مثلاً سورہ نبا کی آیت / ۱۵۔ طہ / ۵۳۔ عبس / ۲۷۔ ق / ۷۔ بقرہ / ۲۶۱۔ بقرہ / ۲۲۔

ابراہیم / ۳۲۔ انعام / ۱۴۱۔ اعراف / ۵۷۔ نحل / ۲۷۔

۵۔۔۔ وہ وہی تو ہے جس نے آسمان سے پانی نازل کیا ہے اور اس کے ذریعہ مختلف قسم کی نباتات اُگائی۔ اور ہم نے اس سے تنے اور سبز شاخیں نکالیں، اور اس سے ایک دوسرے میں جڑے ہوئے دانے، اور کھجور کے درخت کے شگوفوں سے باریک لڑیوں کے ساتھ خوشے باہر نکالے، اور انگور، زیتون اور انار کی مختلف قسمیں جو ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور مختلف بھی ہیں۔ ان کے میوؤں اور ان کے پکنے کے طریقہ کار کو دیکھو جب کہ میوے بن رہے ہوتے ہیں کیونکہ اس میں ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو صاحب ایمان ہیں۔

۶۔۔۔ روئے زمین میں کئی ایسے ٹکڑے بھی ہیں جو ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں جو آپس میں مختلف ہیں اور انگور کے باغات ہیں اور زراعتیں اور کھجور کے درخت ہیں جو کبھی تو ایک تنے پر اُگتے ہیں اور کبھی دو پر۔ وہ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔ اور اس صورت میں ہم ان میں سے کچھ کو پھلوں کی وجہ سے ایک دوسرے پر برتری عطا کرتے ہیں۔ اس میں ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔

۷۔۔۔ وہ وہی تو ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا کہ جس سے تم پیتے ہو، اور اس سے گھاس اور درخت اُگتے ہیں کہ تم اپنے جانوروں کو وہاں پر چرانے کیلئے لے جاتے ہو۔۔۔۔۔ خداوندِ عالم اس (بارش کے پانی) سے تمہارے لئے زراعت، زیتون، کھجور اور انگور اگاتا ہے اور مختلف قسم کے میوے۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کیلئے روشن نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔

۸۔۔۔ وہ وہی خدا تو ہے جس نے بہت سے باغ پیدا کئے، جو کچھ تو (ٹٹیوں پر) چڑھائے ہوئے ہیں اور (کچھ) بے چڑھائے ہوئے، اور کھجوروں اور مختلف زراعتوں کو جو ذائقے کے لحاظ سے باہم مختلف ہیں۔ (نیز) زیتون اور انار کے درختوں کو جو ایک لحاظ سے تو آپس میں ملتے جلتے ہیں اور دوسرے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں (پتوں اور درختوں کی ساخت کے لحاظ سے تو ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں جب کہ ان کے پھلوں کا ذائقہ مختلف ہوتا ہے) جب وہ پک کر تیار ہو جائیں تو ان کے پھل اور میوے کھاؤ، اور ان کی چنائی اور کٹائی کے موقع پر ان کا حق ادا کرو، اور اسراف نہ کرو کہ خدا اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

۹۔۔۔ اور ہم نے زمین کو بچھایا اور اس میں استوار پہاڑ ڈال دیئے اور ہر موزوں نباتات کو اس میں اُگایا۔ اور اس میں تمہارے لئے زندگی کے کئی قسم کے وسائل قرار دیئے اور ان لوگوں کیلئے بھی جنہیں تم روزی نہیں دے سکتے۔

۱۰۔۔ خداوند عالم دانے اور گٹھلی کے چیرنے والا ہے۔ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے، یہ ہے تمہارا خدا، پس تم حق سے کیونکر روگردانی کرتے ہو؟ یہ اس خداوند عالم کے اندازے ہیں جو ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

## الفاظ کے معانی اور تشریح

”نبات“ دراصل ہر قسم کی انگری ہے جو زمین سے اُگتی ہے خواہ اس کا تنا ہو جیسے درخت وغیرہ یا جیسے گھاس وغیرہ کہ عرب جسے ”نجم“ کہتے ہیں۔ لیکن عام طور پر یہ لفظ ایسی نباتات کیلئے بولا جاتا ہے جس کا تنا نہیں ہوتا اور زیادہ وسیع تعبیرات کے مطابق ”نبات“ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس میں نشوونما پائی جاتی ہے، خواہ وہ نباتات ہوں یا حیوانات اور انسان۔<sup>[۱]</sup>

”شجر“ ایسی نباتات کو کہتے ہیں جس کا تنا ہو اسی لئے قرآن میں ”نجم“ کے مقابلے میں ذکر ہوا ہے کہ جس کا تنا نہیں ہوتا۔ ”وَالشَّجَرُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ“ یعنی گھاس اور درخت اسے سجدہ کرتے ہیں (سورہ رحمان/۶)

”مقائیس اللغۃ“ میں ہے کہ دراصل ”شجر“ کے دو معانی ہیں: ۱۔ اونچائی اور بلندی۔ ۲۔ کسی چیز کے اجزاء کا ایک دوسرے میں داخل ہونا۔ چونکہ درخت بلند بھی ہوتے ہیں اور اُن کی ٹہنیاں بھی ایک دوسرے میں داخل ہوتی ہیں، لہذا انہیں ”شجر“ کہا جاتا ہے۔ ”مشاجرۃ“ کا معنی لڑائی، جھگڑا، اختلاف باہم اور زبانی کلامی لڑائی ہے، کیونکہ اس طرح سے فریقین کی باتیں ایک دوسرے میں داخل ہو جاتی ہیں۔

لیکن بعض حضرات کا عقیدہ ہے کہ اس مادہ کے اصل معنی ایسی چیز ہیں، جس میں نشوونما پائی جاتی ہے وہ اُوپر کو اٹھتی اور شاخیں اور پتے وغیرہ لے آتی ہے۔ کبھی معنوی امور پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جیسے۔ ”وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ“ (بنی اسرائیل/۶۰) (کہ جسے ”زقوم کے درخت“ یا ”قوم یہود“ یا ”بنی امیہ“ سے تفسیر کیا گیا ہے)<sup>[۲]</sup>

”زرع“ کے بارے میں جس طرح کہ لغت کی مختلف کتابوں سے معلوم ہوتا ہے، اس کا اصل معنی بیج اور دانوں کو زمین میں ملانے کا نام ہے۔ چونکہ نباتات کا اگانا اور اس کے محصول کی برداشت، زمین میں بیج ملانے کے بعد ہوتا ہے۔ اسی لئے ان امور کو ”زرع“ کہتے ہیں۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ ”زرع“ کا معنی اُگانا ہے اور یہ درحقیقت خدا کا کام ہوتا ہے۔ اگر زراع کا لفظ بندوں پر بولا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کے اسباب اور مقدمات فراہم کرتے ہیں۔ کبھی ”مزروع“ (اُگی ہوئی چیز) کو بھی ”زرع“ کہا جاتا ہے۔ ”زرع“ کا لفظ عام طور پر گندم اور جو پر بولا جاتا ہے لیکن حقیقت میں اس کا مفہوم وسیع ہے ان دو کو بھی شامل ہے اور ان کے علاوہ کو بھی شامل ہے۔<sup>[۳]</sup>

”شمر“ کے بارے میں کتاب ”مقائیس اللغۃ“ میں آیا ہے کہ دراصل اس لفظ کا معنی ”ہر وہ چیز ہے جو دوسری چیز سے پیدا ہو۔“ بعض

[۱] ”نبات“ میں مصدری اور اسم مصدری دونوں قسم کے معانی پائے جاتے ہیں۔

[۲] مفردات راغب، مقائیس اللغۃ، مصباح اللغۃ اور التحقیق فی کلمات القرآن الکریم۔

[۳] مفردات راغب، لسان العرب اور التحقیق فی کلمات القرآن الکریم و صحاح اللغۃ۔

حضرات نے کہا ہے کہ اس کا معنی فقط وہ نتیجہ اور پھل ہے جو درخت سے حاصل ہوتا ہے۔ بعض دیگر ارباب لغت کا کہنا ہے کہ ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز سے متولد اور حاصل ہو، خواہ کھائی جاتی ہو یا کھائی نہ جاتی ہو، حسبِ منشا ہو یا نہ ہو شیریں ہو یا تلخ ”ثمر“ کہلاتی ہے۔

لیکن ظاہر یہ ہے کہ ثمر دراصل ایک محدود مفہوم کا حامل ہے جو صرف اس میوہ پر بولا جاتا ہے جو درخت سے حاصل ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں اس مفہوم نے وسعت پیدا کر لی اور کنایہ کی صورت میں ہر چیز کے محصول اور مولود پر بولا جانے لگا حتیٰ کہ کہا جانے لگا کہ اس مکتب یا ان تعلیمات کا ثمرہ یا میوہ یہ ہے چیز ہے اور روایت میں ہے ”أُمَّكَ أَعْطَيْتَكَ مِنْ ثَمَرَةِ قَلْبَيْهَا“ (تیری ماں نے تجھے اپنے دل کا میوہ عطا کیا ہے یعنی ماں کے دودھ یا مامتا کی طرف اشارہ ہے) اور روایات میں اولاد کو بھی ”ثمرہ نواذ“ (دل کا میوہ) کہا گیا ہے۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### سبز درختوں کے پتے۔۔۔۔۔۔۔۔!

سب سے پہلی آیت میں مشرکین یا منکرین خدا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے، ”کیا انہوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے کس قسم کی قیمتی نباتات اس میں اُگائی ہیں؟“ (أَوَلَمْ يَرَوْا لَبِيَ الْأَرْضِ كَمْ أَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ) پھر صراحت کے ساتھ فرماتا ہے۔ ”اس موضوع میں خدا کے وجود پر روشن نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ ہرگز ایمان نہیں لاتے۔“ (إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ)

اگر وہ لوگ ان تمام رنگارنگ نباتات، پھولوں، پھلوں، درختوں، سبزہ جات سنبل کے درختوں اور مختلف النوع زراعت کی طرف غور سے نگاہ کریں تو ان میں اس کی نشانیوں کی اچھی طرح پائیں گے۔ لیکن وہ ایمان نہیں لانا چاہتے اور اس کی ذاتِ مقدس کے چہرہ کو چشمِ دل سے نہیں دیکھنا چاہتے، وگرنہ اس کا جمال کسی پر مخفی نہیں۔ پس نہ تو وہ سننے والے کان رکھتے ہیں جن سے وہ خدا کی تشریحی آیات کو سن اور نہ ہی دیکھنے والی آنکھیں روکھتے ہیں جن سے اس کی تکوینی آیات کو دیکھ سکیں۔ یہاں پر ”زوج“ سے کیا مراد ہے؟ بہت سے مفسرین نے اس کی صنف اور نوع کے معنی میں تفسیر کی ہے اور اسے نباتات کی کئی مختلف اقسام کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو واقعاً کسی حد اور حساب سے باہر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک خدا کی آیات شمار ہوتی ہے۔

کئی اور مفسرین کا احتمال ہے کہ ”زوجیت“ کے مسئلہ کی طرف اشارہ ہے جو عالم نباتات میں (نر اور مادہ کی صورت) میں ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بات کا انکشاف سوئڈن کے مشہور ماہر نباتات BOTANIST مسٹر ”لینے“ نے وسیع تجربے کی بنیاد پر اٹھارہویں صدی عیسوی کے درمیان کیا کہ اکثر نباتات بھی حیوانات کی مانند نر اور مادہ کی باہمی ملاقات سے بارور ہو کر اپنا ثمر دیتے ہیں جب کہ قرآن مجید نے یہ حقیقت کئی صدی پہلے بتادی ہے۔ چونکہ ان دونوں معانی کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے لہذا دونوں معانی کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔

”زوج“ کی صفت ”کریم“ کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور ”کریم“ کے معنی قیمتی چیز کے ہوتے ہیں۔ لہذا اس سے نباتات کی مختلف انواع کی اہمیت اور ان کی بے حد و حساب قدر و قیمت کی طرف اشارہ ہے۔ نباتات کی انواع و اقسام اس قدر زیادہ ہیں کہ بعض سائنسدانوں نے لکھا ہے کہ ”کھجور“ کی تین ہزار سے زائد قسمیں ہیں، ”انجیر ہندی“ یا برگد کی ایک ہزار سات سو سے زائد، ”گل ثعلب“ کی بارہ سو سے زائد، ”کھمبیوں“ کی ایک لاکھ سے زائد اور ”جلبک“ (کوندر) کی چار ہزار سے زائد قسمیں ہیں۔ اسی طرح ”سیب“ کی سات ہزار انواع اور گندم کی پینتیس ہزار اقسام ذکر کی گئی ہیں۔<sup>[۱]</sup> واقعی ان انواع کے ساتھ نباتات کا یہ وسیع عالم کس قدر عجیب ہے اور ان کا خالق ومدبر کس قدر عظیم ہیں؟ دوسری آیت میں ”توحید معبود“ کے اثبات کیلئے لوگوں کو زمین و آسمان کی تخلیق اور نزولِ باران کے اسرار کے مطالعہ کی دعوت دینے کے بعد فرماتا ہے۔ ”ہم نے اس کے ذریعہ خوبصورت تروتازہ اور سرسبز و شاداب باغات اُگائے ہیں۔“ (فَأَنْبَتْنَا بِهِ حَدَائِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ)<sup>[۲]</sup>

”تم ان باغات کے خوبصورت درختوں کو ہرگز نہیں لگا سکتے۔“ (مَا كَان لَكُمْ أَنْ تَنْبِتُوا اشْجَرَهَا)

”کیا ایسی صورت میں بھی کہتے ہیں کہ خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟“ (أَلَا اللَّهُ مَعَ اللَّهِ)

لیکن یہ نادان لوگ ہیں جو اپنے عظیم پروردگار سے منہ موڑے ہوئے ہیں جو ان تمام عجائبات اور مجرا العقول اشیاء کا خالق ہے اور ایسی موجودات کو اس کا شریک اور برابر قرار دیتے ہیں جن میں کسی قسم کی قدرت اور توانائی نہیں ہے۔ (بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَعْدِلُونَ)

”يَعْدِلُونَ“ کی تعبیر یا تو اس لئے بیان ہوئی ہے کہ اس میں عدول کا معنی پایا جاتا ہے اور مراد خداوند واحد ولا شریک سے ان کا عدول ہے یا پھر اس کا عدیل اور شریک قرار دیتے ہیں۔ یقیناً انسان کا کام بیج ڈالنا اور پانی دینا وغیرہ ہوتا ہے۔ لیکن جو ذات اس چھوٹے سے بیج کے دل میں زندگی کی روح ڈالتی اور اسے اس قدر قدرت عطا کرتی ہے کہ وہ ایک بلند قامت درخت کی صورت اختیار کر کے بارور، خرم سرسبز و شاداب ہو کر باغات میں دل فریبی کا منظر اختیار کر لیتا ہے اور جسے دیکھ کر انسان وجد اور سرور میں آجاتا ہے، خداوند عالم ہی ہے۔

اگر بہار کے کسی دن میں انسان ان خرم و سرسبز و شاداب باغات میں سے کسی ایک میں قدم رکھے اور ظاہری آنکھوں کے ساتھ دل کی آنکھوں کو بھی کھول کر ان انواع و اقسام کی زیبائوں، شگفتگیوں، رنگ برنگے پھولوں، پتوں اور مختلف پھل اور میوؤں کو دیکھ تو بادہ توحید سے یوں سرمست ہو جائے کہ بے اختیار نغمہ توحید الا پنا شروع کر دے اور اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہو جائے کہ:

یک ہست و بیج نیست جز او  
وَحَدَاةٌ لَا آلَةَ إِلَّا هُوَ

[۱] کتاب ”جہان گاہ“، صفحہ ۹۹ تا ۱۱۸

[۲] ”حدائق“، ”حدیقہ“ کی جمع ہے جس کا معنی باغ ہے اور دراصل یہ اس زمین کے معنی ہے جہاں پر پانی اکٹھا ہو۔ بہت سے مفسرین نے اس کی ایسے باغ کے معنی سے تفسیر کی ہے جس کی چار دیواری ہو اور اس میں کافی مقدار میں پانی ہو۔

(صرف اور صرف وہی ایک ذات ہی ہے جو وحدہ لا شریک ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں) اور یہیں پر اس مطلب کو تسلیم کر لے کہ:

ہر گیا ہی کہ از زمین رودید  
وَحَدَّاهُ لَا شَرِيكَ لَهُ

(جو تکا بھی زمین سے اُگتا ہے، ”وَحَدَّاهُ لَا شَرِيكَ لَهُ“ کہتا ہے)

مندرجہ بالا آیت میں تیسری آیت میں پروردگار عالم کی توحید کے پانچ دلائل اور ان کی آفاقی آیات (آسمان کی غیر مرئی ستونوں کے بغیر تخلیق، پہاڑوں کی پیدائش، حیوانات اور زمین کے دوسرے چلنے والوں کی آفرینش، بارش کی پیدائش اور نباتات کی تخلیق) کے ضمن میں مشرکین کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے، ”یہ خداوند عالم کی تخلیق ہے، لیکن تم مجھے دکھاؤ کہ اس کے علاوہ دوسرے معبودوں نے کس چیز کو پیدا کیا ہے؟“ (هَذَا خَلْقُ اللَّهِ فَأَرُونِي مَاذَا خَلَقَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ)

آیت کے آخر میں فرماتا ہے ”بلکہ عالم (مشرک) لوگ کھلم کھلا گمراہی میں ہیں۔“ (بَلِ الظَّالِمُونَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ) یہ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص چشم بینا بھی رکھا ہو اور کائنات میں پروردگار عالم کی قدرت اور حکمت اور عظمت کے آثار کو بھی آنکھوں سے دیکھے، پھر بھی اس کے غیر کے آگے سر تسلیم خم کرے!

ان آیات میں ایک بار پھر نباتات کے بارے میں ہم ”كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ“ کے جملہ کو پاتے ہیں جس میں مفید اور سود مند نباتات کی حد سے زیادہ انواع و اقسام اور عالم نباتات میں ان کے جوڑا جوڑا ہونے کی غمازی ملتی ہے اور اہ توحید کے تمام راہبوں کو اس موضوع کی اہمیت سے آگاہ کرتا ہے۔

”ظلم“ کا لفظ وسیع مفہوم کا حامل ہے جس میں ہر چیز کو اس کے غیر محل میں رکھنا بھی شامل ہے۔ چونکہ مشرکین اس کائنات کا نظم و نسق سنبھالنے کا اختیار بتوں کیلئے سمجھتے تھے یا نہیں خلق اور خالق کے درمیان واسطہ سمجھ کر ان کے آگے سجدہ کرتے تھے، لہذا بہت بڑے گناہ اور ضلالت کے مرتکب ہوتے تھے۔ پس یہ حکم آیت بالا میں شرک کے معنی میں آیا ہے یا پھر اپنے وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے اور شریک اس کا واضح ترین مصداق ہے۔ بغیر بتائے یہ بات واضح ہے کہ ”ارونی“ (مجھے دکھاؤ) کا جملہ درحقیقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی ہے۔ بالفاظ دیگر آنجناب کا حکم دیا گیا ہے کہ یہ جملہ مشرکین سے کہیں کیونکہ خدا کو دکھلانا تو بے معنی بات ہوتی ہے۔

اسی سلسلے کی چوتھی آیت میں جو سورہ یس کی آیت ہے صراحت کے ساتھ فرماتا ہے ”جس مردہ زمین کو ہم نے زندہ کیا ہے، ان کیلئے پروردگار عالم کی ایک اہم آیت اور نشانی ہے۔“ (وَآيَةٌ لَهُمُ الْأَرْضُ الْمَيِّتَةُ أَحْيَيْنَاهَا)

حقیقت یہ ہے کہ حیات و زندگی کا مسئلہ توحید کے اہم ترین دلائل میں سے ایک ہے خواہ یہ عالم نباتات میں ہو یا حیوان اور انسانوں کی دنیا میں یہ ایک نہایت ہی اسرار آمیز اور محیر العقول مسئلہ ہے۔ جس نے بڑے بڑے دانشوروں کے افکار کو ورطہ حیرت میں ڈال رکھا ہے۔ سائنس کی اس قدر عظیم پیمانے پر ترقی کے باوجود زندگی کا معمہ ہنوز حل نہیں ہو سکا اور کوئی شخص اچھی طرح نہیں جانتا کہ کس طرح اور کن عوام کی



بنیاد پر بے جان مخلوق، زندہ مخلوق میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد مردہ زمینوں کے زندہ ہونے، غذا کے طور پر استعمال ہونے والے اناج (مثلاً گندم، جَو، جوار، باجرہ، مکئی وغیرہ) انگور کے سرسبز باغات، نخلستانوں اور آب زلال کے چشموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے، ”مقصد یہ ہے کہ وہ ان میوؤں کو کھائیں، ایسے میوے جن کے باغات میں ان کے ہاتھوں کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس کے باوجود بھی وہ خدا کا شکر بجا نہیں لاتے؟“ (لَیْسَ کُلُّوْا مِنْ ثَمَرِهِۦ وَمَا عَمِلْتُمْ اَفَلَا تَشْكُرُوْنَ)

”وَمَا عَمِلْتُمْ اَفَلَا تَشْكُرُوْنَ“ (ان کے ہاتھوں کو ان کی تخلیق میں کوئی دخل حاصل نہیں) اس بات کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ پھل میوے ہر لحاظ سے آمادہ غذا ہوتے ہیں، مکمل اور پسندیدہ غذا جسے نہ تو پکانے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی جس میں کسی اور چیز اضافہ کرنے کی، وہ کچی پکانی مکمل غذا ہوتے ہیں۔ نہ تو خود ان کے اصل وجود میں انسان کو کوئی دخل حاصل ہے اور نہ ہی ان کے کھانے کیلئے آمادہ کرنے میں انسان کا کام تو صرف بیج ڈالنا اور کھیتی کا سینچنا ہوتا ہے اور بس! [۱]

بہر حال ان تمام رنگ برنگ نعمتوں کی تخلیق کا مقصد یہ نہیں تھا کہ انسان انہیں جانوروں کی طرح چٹ کر جائے! اور صحرائے زندگی میں انہیں چرتا پھرتا اسی حالت میں عمر ضائع کر دے۔ پھر مر جائے اور مٹی بنی جائے!! یہ مقصد نہیں تھا۔ منہائے مقصود یہ تھا کہ انہیں دیکھے اور شکر گزاری کی حس اس میں زندہ ہو اور ”شکرِ منعم“ کے راستے سے ان نعمتوں کے عطا کرنے کی معرفت حاصل کرے جو سب سے بڑھ کر ایک نعمت ہے اور انسانی ارتقاء کا بالاترین مرحلہ ہے۔

ایک نکتہ جو مندرجہ بالا آیت میں مکمل طور پر توجہ مبذول کراتا ہے وہ یہ ہے کہ نباتات کی دنیا میں جوڑا جوڑا ہونے کے مسئلہ کو انسانوں کی دنیا کے جوڑا جوڑا ہونے کے ساتھ ساتھ فرماتا ہے اور کہتا ہے ”پاک ہے وہ کہ جس نے تمام جوڑوں کو خلق فرمایا، وہ بھی زمین سے اُگتے ہیں، خود انسان کے وجود سے اور وہ بھی جوہ نہیں جانتے۔“ (سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاٰیٰتٍ لِّعٰلَمِیْنَ)

یہ تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں مرد و مادہ کی جنس سے اور نباتات کی دنیا میں زوجیت کے وجود کو وسیع انداز میں ثابت کرتا ہے جو قرآن مجید کے علمی معجزات میں سے ایک ہے، کیونکہ اس زمانے میں یہ بات انسان کو معلوم نہیں تھی کہ نباتات میں بھی نر اور مادہ حصے ہوتے ہیں اور سفوف جو کہ نر کا نطفہ ہوتا ہے نباتات سے اُڑ کر مادہ حصے پر جا بیٹھتا ہے اور اس ملاپ کا کام دیتا ہے، جس سے نباتات کا نطفہ منعقد ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ ”وَمَا عَمِلْتُمْ اَفَلَا تَشْكُرُوْنَ“ (اور ان چیزوں سے جو تم نہیں جانتے) کے جملہ سے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ زوجیت کا مسئلہ بہت وسیع ہے اور ابھی کس قدر موجودات ایسی ہیں جن کی زوجیت کے وجود سے تم آگاہ نہیں ہو اور علم و دانش اور سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی

[۱] یہ اس صورت میں ہے جب ”معاملتہ ایدھم“ کے جملہ میں ”ما“ نافیہ ہو (اور ظاہر اے بھی ایسا ہی) لیکن بعض نے احتمال دیا ہے کہ شاید موصولہ ہو، ان میوؤں کی طرف اشارہ ہوگا جو پوند کی وجہ میں آتے ہیں، اور جن میں انسان کو عمل دخل حاصل ہوتا ہے یا پھر وہ چیزیں مراد ہوں جو پھلوں سے حاصل کی جاتی ہیں۔ مثلاً انگور اور کھجور سے حاصل ہونے والا شیرہ یا سرکہ ہے۔ البتہ پہلی معنی زیادہ مناسب ہیں۔

اس سے پردہ اٹھائے گی۔ (جیسا کہ یہ مسئلہ ایٹموں ATOMS کے بارے میں پایہ ثبوت تک پہنچ چکا ہے کہ وہ دو مختلف حصوں سے مرکب ہیں، جیسا کہ دو جفت ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ ایک الیکٹران ELECTRON اور دوسرا پروٹون PROTON ہے۔ الیکٹران میں منفی الیکٹرک سٹی ہوتی ہے اور پروٹون میں مثبت) اس طرح کے کئی اور موضوعات ہیں جہاں تک ہنوز انسانی علم و دانش کی رسائی نہیں ہو سکی ہے۔

پانچویں آیت میں جو مختلف طریقوں سے خداوند عالم کے تعارف کے ساتھ شروع ہو رہی ہے، پہلے تو آسمان سے بارش کے نزول کی طرف اشارہ کیا ہے پھر فرماتا ہے۔ ”ہم نے اس کے ذریعہ ہر قسم کی اگنے والی چیزوں کو زمین سے نکالا“ (فَأَخْرَجْنَا بِهَا نَبَاتٍ كَلِّبَ شَيْعٍ) ممکن ہے کہ یہ ”نبات کَلِّبَ شَيْعٍ“ (ہر چیز کی نباتات) سے مراد مختلف نباتات کی طرف اشارہ ہو جن کی ایک ہی پانی سے آبیاری ہوتی ہے اور ایک ہی قسم کی مٹی سے پرورش پاتی ہیں۔ لیکن ان کی صورتیں مختلف، ذائقے مختلف اور خواص مختلف بلکہ بسا اوقات متضاد ہوتے ہیں۔ یہ چیز خداوند عالم کی تخلیق کے عجائبات میں سے ہے۔

یاد رہے کہ اس سے مراد ایسی نباتات ہیں جو تمام پرندوں اور بڑی اور بھری جانوروں اور انسانوں کی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ [۱] دونوں معانی کو یکجا کرنا ممکن ہے (پھر ایک اور نکتہ کو بیان کرنے کیلئے فرماتا ہے، ”پھر ہم اس (پانی یا نباتات) سے سبز تھے، شاخیں اور پتے باہر نکالتے ہیں۔“ (فَأَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا)

اس طرح نباتات کے سبز مادہ ”کلوروفیل“ CHLOROFIL کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو نباتات کا ایک اہم ترین اور مفید ترین جزو ہے۔ وہی خوبصورت، دلربا، دلکش اور فرحت بخش سبزہ جو تاریک مٹی اور بے رنگ پانی سے وجود میں آتا ہے۔

”خَضِرًا“ کی تعبیر اگرچہ مطلق ہے، لیکن بعد کے جملہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے فرماتا ہے۔ ”ہم اس سے وہ دانے باہر نکالتے ہیں جو ایک دوسرے پر سوار ہوتے ہیں“ (مُخْرَجٌ مِنْهَا حَبًّا مُمْتَرًا كَبًّا) جو اشارہ ہے گندم، جو، جوار، باجرہ اور کی وغیرہ کے تنے اور خوشوں کی طرف۔ [۲]

اس کے بعد کھجور کے درختوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے فرماتا ہے ”طلع (کھجور کے سر بستہ خوشے جو سبز رنگ کے خوبصورت غلاف میں لپٹے ہوئے ہیں) سے باریک اور لطیف ریشے باہر آتے ہیں“۔ (وَمِنَ النَّخْلِ مِمَّنْ طَلَعَهَا قِنْوَانٌ ذَانِيَةٌ)

”قِنْوَانٌ“؛ ”قِنْو“ (بروزن حزب) کی جمع ہے جس کے معنی باریک ریشے ہیں جو ”طلع“ کے پھٹنے کے بعد اس سے باہر نکلتے ہیں اور بعد میں کھجور کے خوشے ان سے تشکیل پاتے ہیں۔

”ذانیۃ“ (نزدیک) کی تعبیر سے شاید ان خوشوں کے آپس میں قریب ہونے کی طرف اشارہ یا پھر کھجور کے پھل کی وجہ سے سنگین

[۱] اس صورت میں جملہ کا مفہوم (فاخر جنابہ نباتا لکل شیء) ہوگا۔

[۲] ”متر اکب“؛ ”رکوب“ کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں سوار ہونا اور یہ ان دونوں کی طرف اشارہ ہے جو خوشے (بالی) کی صورت میں ایک دوسرے پر سوار ہوتے ہیں اور نہایت ہی خوبصورت منظر پیش کرتے ہیں۔

ہو کر ان کے زمین کی طرف بھگنے کی طرف اشارہ ہے۔ بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ چونکہ خرما کے خوشے مختلف ہوتے ہیں، بعض تو کھجوروں کی نچلی طرف واقع ہوتے ہیں اور آسانی کے ساتھ ان تک رسائی ہو جاتی ہے اور بعض انسانی کی دسترس سے دور ہوتے ہیں جن سے استفادہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ خداوند عالم نے پہلی قسم کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو زیادہ مفید ہوتی ہے۔ [۱]

آیت کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے انگور، زیتون اور انار کے باغات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ (وَجَنَّاتٍ مِنْ أَعْنَابٍ وَالزَّيْتُونِ وَالرَّهْمَانِ) کہ ایک دوسرے کے مشابہ ہونے کے باوجود بھی آپس میں مختلف ہوتے ہیں، اور مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ (مُشْتَبِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ)

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ میوہ جات اور پھل دیکھنے میں تو ایک جیسے ہوتے ہیں لیکن ذائقے میں مختلف ہیں (جیسے کھٹے میٹھے انار و انگور)۔ بعض دوسرے حضرات کہتے ہیں ان میں سے کچھ کے درختوں کے پتے آپس میں ملتے ہیں جیسے زیتون اور انار کے پتے، جب کہ ان کے پھل مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ اس آیت کا وسیع تر مفہوم بیان کیا جائے جو مختلف قسم کی شاہتوں اور باہمی فرق کی طرف اشارہ ہو۔ پھر مزے کی بات یہ ہے کہ آیت کے آخر میں سب لوگوں کو پھلوں کے مطالعہ کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے۔ ”میوے کی ساخت کی طرف دیکھو جب وہ ظاہر ہو جاتا ہے، میوے کے پکنے کی کیفیت کو دیکھو۔“ (اَنْظُرْ وَ اِلَى ثَمَرِهِ اِذَا اَخْضَرَ وَيَنْجِعِهِ)

”کیوں اس میں خداوند عالم کی عظمت، قدرت اور حکمت کی ان لوگوں کیلئے آیات اور نشانیاں ہیں جو ایمان رکھتے ہیں۔“ (اِنَّ فِيْ

ذٰلِكَ لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ)

ایک نشانی نہیں بلکہ کئی نشانیاں ہیں۔ کیونکہ پھلوں کی پیدائش بھی عالم حیوانات میں بچوں کی پیدائش کی مانند ہوتی ہے۔ نر کا نطفہ ہواؤں یا حشرات کے ذریعہ مادہ حصہ میں جا بیٹھتا ہے اور ”لقاح“ کے عمل اور ایک دوسرے سے مل جانے کے بعد سب سے پہلا تخم اور نطفہ تشکیل پاتا ہے پھر اس کے اطراف میں میوے کا تانا بانا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر عضلات، گودا اور باریک اور ظریف رگیں اسے غذا پہنچانا شروع کر دیتی ہیں۔

اس چھوٹے سے پھل کے اندر ایک عظیم لیباٹری پنہاں ہے جو مسلسل سرگرم رہتی ہے اور تازہ ترین خواص کے ساتھ نئی نئی ترکیبیں عمل میں لاتی رہتی ہے۔ پھل آغاز میں تو بے مزہ ہوتا ہے، پھر مکمل طور پر ترش اور بعد میں بطور کامل شیریں۔ ہر وقت کوئی نئی ترکیب اس میں وجود میں آتی رہتی ہے اور اس کا رنگ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ یہ خدائی تخلیق کے عجائبات میں سے ایک ہے اور خداوند عالم نے قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیات میں انسان کو خصوصی طور پر اس کے مطالعہ کی دعوت دی ہے۔

اسی سلسلے کی چھٹی آیت میں پہلے تو زمین کے مختلف قطعات کی طرف اشارہ کیا ہے جن میں مختلف درختوں اور دیگر نباتات وغیرہ کی پرورش کی استعداد پائی جاتی ہے پھر فرمایا ہے۔ ”زمین میں مختلف قطعات ہیں جو ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔“ (جن میں مکمل

طور پر مختلف طرح کی لیاقتیں اور استعداد پائی جاتی ہیں) (وَفِي الْأَرْضِ قِطْعٌ مُّتَّبَعَاتٌ)

باوجودیکہ یہ قطعات ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہوتے ہیں، ان میں سے کچھ تو شیریں اور زراعت کے قابل ہوتے ہیں اور بعض شورہ زار کہ جھاڑی تک جس میں نہیں اُگ پاتی۔ بعض ایسے قطعے ہوتے ہیں جو صرف درختوں یا ان کی بھی کسی خاص قسم کیلئے کاشت کا کام دیتے ہیں۔ جب کہ دوسرے بعض جو زراعت یا زراعت کی بھی کسی خاص قسم کیلئے مناسب ہوتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ زمینیں تو آپس میں ملی ہوتی ہیں لیکن ان کے کام جدا جدا ہوتے ہیں۔

اس مقدمہ کے ذکر کے بعد درختوں اور زراعت کی دیگر مختلف قسموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ”اور اسی زمین میں انگور، زراعت اور کھجور کے باغات کی مختلف قسمیں ہیں جن میں سے کچھ تو ایک تنے پر اُگتی ہیں اور کچھ کئی تنوں پر“ (وَجَنَّاتٌ مِّنْ أَعْنَابٍ وَزُرُوحٌ وَأَنْخِيلٌ صِنَوَانٌ وَعَيْبٌ صِنَوَانٍ)

”اعناب“۔ ”عنب“ کی جمع ہے جس کے معنی انگور ہے اور ”انخیل“، ”نخل“ اور ”نخیلہ“ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں کھجور کا درخت۔ ان ونوں صیغوں کو جمع کی صورت میں شاید اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ یہ انگور اور کھجور کی مختلف اقسام کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ان دونوں کی سینکڑوں بلکہ ہزاروں مختلف قسمیں ہیں۔

’صِنَوَانٌ عَيْبٌ صِنَوَانٍ‘ کی تعبیر اس بات کی پیش نظر رکھتے ہوئے کہ ”صنوان“، ”صنو“ کی جمع ہے جس کے معنی وہ شاخیں ہیں جو درخت کے اصلی تنے سے نکلتی ہیں۔ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ مختلف اور گونا گوں بیوندوں کے ذریعہ ایک درخت میں مختلف میوہ جات کی پرورش کی صلاحیت پیدا کی جاسکتی ہے۔ اس طرح یک ہی تنے، ایک ہی جڑ، ایک ہی پانی اور ایک ہی مٹی سے ایک درخت کی ایک شاخ کی مختلف ٹہنیوں پر گونا گوں میوے ظاہر ہوتے ہیں اور یہ تخلیق عجائبات میں سے ایک ہے۔ ممکن ہے یہ تفاوت شاخوں کے اس تفاوت کی طرف اشارہ ہو جو ایک ہی تنے پر تو اُگتی ہیں لیکن ان کے طبعی پھلوں میں فرق پایا جاتا ہے۔

پھر صراحت کرتے ہوئے فرماتا ہے، ”یہ اپنے تمام تر فرق کے باوجود ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔“ (يُسْقَىٰ بِمَاءٍ وَاحِدٍ) ”اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم میووں کے لحاظ سے بعض کو دوسرے بعض پر فضیلت دیتے ہیں۔“ (وَنُفُضِلُ بَعْضَهَا عَلَىٰ فِي الْأُكُلِ) یقینی بات ہے کہ اس بارے میں عقلمندوں کیلئے کئی آیات اور نشانیاں ہیں۔“ (إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ)

یقیناً تعجب آور ہے یہ بات کہ پانی بھی ایک ہے اور مٹی بھی ایک ہے، لیکن ان پھلوں کا باہمی فرق اس قدر زیادہ ہے کہ ایک تو مکمل طور پر شیریں ہے اور دوسرا پوری طرح کھٹا (بہت سے علاقوں میں لیموں اور کھجوروں کے درخت ساتھ ساتھ اُگتے ہیں) یا ایک ہی کھیت میں روغن دار اجناس کو کاشت کیا جاتا ہے۔ جن کے خواص یقیناً مختلف ہوتے ہیں، حتیٰ کہ خود ان پھلوں یا ان غلات کی بھی کئی قسمیں ہیں جن کا آپس میں بھی فرق ہوتا ہے۔ یہ کسی عجیب و غریب مشینری درختوں کی شاخوں اور ان کے رگ و ریشوں میں چھپی ہوئی ہے جس میں اس قدر قدرت ہوتی ہے کہ وہ مختلف کیمیکل مواد کو مکمل طور پر مختلف خواص میں تبدیل کر دے اور وہ بھی ایک قسم کی مٹی اور پانی سے استفادہ کرتے ہوئے!!

اگر خالق کائنات کے علم و قدرت پر اسی مسئلے کے سوا کوئی اور دلیل نہ بھی ہوتا ہم وہ اس عظیم مہذبہ کی معرفت کیلئے یقیناً کافی تھا،

اور بقول یکے از شعرائے عرب:

والارض فیہا عبرة للمعتبر  
تخبر عن صنع ملیک مقتدر  
تسقی بماء واحدا شجارها  
وبقعة واحدة قرارها  
والشمس والهواء لیس یختلف  
واكلها مختلف لایألف  
نما الذی اوجب ذالتفاضلاً  
الاحکیم لہ یرده جابلاً

یعنی زمین عبرت حاصل کرنے والے کیلئے عبرت ہے، کیونکہ وہ ایک صاحب اقتدار سلطان کی مصنوعات کی خبر دے رہی ہے۔ اس کے تمام درخت ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں، ایک ہی زمین ان کی قرار گاہ اور ان کے اُگنے کا مقام ہے۔ دھوپ اور ہوا بھی مختلف نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود اس کے تمام پھل اور میوے مکمل طور پر مختلف ہیں ان تمام اختلافات کا باعث کون سی چیز ہے سوائے اس خداوند حکیم کے جس کا عظیم ہدف ہے، اس کے ارادہ میں باطل کا کوئی دخل نہیں ہے۔<sup>[۱]</sup>

ساتویں آیت میں جو اپنے سیاق و سباق کے لحاظ سے توحیدی دلائل کی تشریح اور خدا شناسی کے دلائل کی تفصیل بیان کر رہی ہے، ارشاد ہوتا ہے، ”خداوند عالم وہی تو ہے جس نے آسمان سے پانی بھیجا جو ایک تو تمہارے پینے کی ضروریات کو پورا کرتا ہے اور دوسرے اس سے درخت اور دیگر نباتات کو اُگاتا ہے جس میں تم اپنے جانوروں کو چراتے ہو“ (هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَكُمْ مِنْهُ شَرَابٌ وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ)

نہ تو ہر پانی انسان کے پینے کی صلاحیت رکھتا ہے اور نہ ہی ہر پانی نباتات کی پرورش کیلئے مفید ہوتا ہے، لیکن آسمانی پانی ہر ایک کیلئے مفید اور سرمایہ حیات ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ”شجر“ کے لغوی معنی بڑی وسعت کے حامل ہیں۔ اس میں ہر قسم کی نباتات شامل ہیں خواہ ان کا تنا ہوتا ہے یا نہیں ہوتا اور ”تسیمون“ کا لفظ ”اسامہ“ سے اور وہ ”سوم“ کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ”جانوروں کا چرانا“ ہیں۔<sup>[۲]</sup> اور چونکہ جانور چرتے وقت گھاس اور درخت کے پتوں دونوں قسموں سے استفادہ کرتے ہیں، اس لئے درختوں کے پتوں کی شجر سے تعبیر نہایت ہی مناسب

[۱] تفسیر روح المعانی جلد ۱۳ ص ۹۳

[۲] البتہ ”سوم“ کا اصل معنی تو ہے ”علامت لگانا“ اور چونکہ جانور چرنے کے موقع پر درحقیقت زمین پر علامت لگاتے ہیں اسی لئے یہ لفظ ان کے استعمال ہوتا ہے۔

معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ ہر دو کو شامل ہے۔

پھر فرماتا ہے ”خداوند عالم تمہارے لئے بارش کے اس پانی کے ذریعہ زراعت، زیتون، کھجوریں اور انگور کی تمام قسمیں اگاتا ہے اور ہر قسم کے دوسرے میوہ جات بھی۔“ (يُنْعِدْتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُونَ وَالنَّخِيلَ وَالْأَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ) یہ بات قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں تمام میوؤں، تمام قسم کی زراعت اور غلہ جات کا ذکر آجاتا ہے۔ لیکن تین قسم کے پھلوں پر خصوصاً زیادہ زور دیا گیا ہے اور یہ ان کی حد سے زیادہ اہمیت کے پیش نظر ہے کیونکہ یہ تینوں میوے غذائی نقطہ نظر سے بھی اور وٹامن کی کئی اقسام کے لحاظ سے بھی جو آج کے سائنسی دور میں واضح تر ہو چکی ہیں، بڑی افادیت کے حامل ہیں۔ [۱]

اس آیت کے آخر میں ایک بار پھر تاکید کے ساتھ فرماتا ہے، ”ان امور میں خداوند عالم کی حکمت، عظمت اور قدرت کی ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو صاحبان عقل و فکر ہیں۔“ (إِنَّ فِي ذَلِكَ لآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ)

اور جو لوگ ان واضح اور آشکار آیات میں غور و فکر سے کام نہیں لیتے وہ انسان کہلانے کے اہل نہیں ہیں اور بقول شاعر

اسنہمہ	نقش	عجب	بردرد یوار	وجود
ہر کہ	فکرت	نکند نقش	بود برد یوار	
کہ	تواند کہ	دہد میوہ	رنگین	از چوب؟
یا کہ	داند کہ	بر آرد گل	صدرنگ	از خار
”ارغوان“	ریختہ	برد رگہ	خضرائی	”چمن“
چشمہ	ہائی	کی	در آن	خیرہ
				بماند
				ابصار

”یعنی شہر وجود کے درد یوار پر یہ عجیب و غریب قسم کے نقش و نگار موجود ہیں، اور جو شخص اس بارے میں غور و فکر سے کام نہ لے اسے

دیوار دے مارا جائے۔

کس کی جرأت ہے کہ لکڑی سے رنگین قسم کے پھل نکالے؟ یا کون ایسا ہے جو کانٹوں صدرنگ کے پھول اُگائے؟

”ارغوان“ کے پھول ”چمن“ کے سبزہ زار کی بارگاہ پر نچھاور کئے ہیں اور ایسے چشمے جاری کئے ہیں جن کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ

ہو جاتی ہیں۔

آٹھویں آیت میں عالم نباتات کی ایک قسم کا تذکرہ ہے جسے توحید کی دلیل اور عظمت پروردگار کے تعارف کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے ”وہ وہی ہے جس نے ایسے باغات پیدا کئے جو (چھجوں کی ٹٹیوں پر) چڑھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ایسے باغات بھی جن کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ (وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَ جَنَّاتٍ مَّعْرُوسَاتٍ وَعُغَيْرَ مَعْرُوسَاتٍ)

[۱] اس گفتگو کی تفصیل تفسیر نمونہ جلد ۱۱ میں مطالعہ فرمائیں۔

”معروش“، ”عرش“ کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں بلند پاپوں والاحت یا چھت اس آیت میں اس کا کیا مفہوم ہے، اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ معروشات کے لفظ سے ایسے باغات کی طرف اشارہ ہے جس کے درخت کو چھجے کی ٹیٹوں SHEAFFOLDING پر چڑھاتے ہیں جیسے انگور کی بیلیں ہیں کہ جن کیلئے بہت سے مقامات پر ایسے چھجے بنائے جاتے ہیں۔ ”غیر معروش“ ایسے باغات ہیں جن کے درختوں کیلئے اس قسم کے چھجوں کی ٹیٹوں کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، یعنی جیسے کھجوروں کے یا سیب اور انجیر کے باغات ہیں۔

جب کہ بعض دوسرے مفسرین نے ”معروش“ کو گھریلو درختوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو باغ کی دیواروں کے ذریعہ محفوظ کئے جاتے ہیں اور ”غیر معروش“ کا جنگل اور بیابان کے درختوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ اس بارے میں تیسرا نظریہ یہ ہے کہ پہلا لفظ ان درختوں کی طرف اشارہ ہے جو اپنی بلند قامتی کے ساتھ پوری رعنائی کے ساتھ سراٹھائے کھڑے ہیں اور دوسرا ان درختوں کی طرف جو بیلوں کی صورت میں زمین پر لیٹے ہوئے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

لیکن پہلی تفسیر سب زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال یہ عجیب بات ہے کہ سرد اور صنوبر جیسے بلند و بالا درخت جو بالکل سیدھے اور مستقیم، آسمان کی طرف سراٹھائے کھڑے ہیں اور اس حد تک پائیداری اور رعنائی کے ساتھ ڈٹے ہوئے ہیں، آندھیوں کے زبردست جھکڑ اور پے در پے طوفان بھی انہیں اپنے اس ”صراط مستقیم“ سے ذرہ برابر بھی منحرف نہیں کر سکتے، جب کہ بعض دوسرے درخت جیسے بیلیں وغیرہ ہوتی ہیں، جو بل کھاتی اور پیچ و خم کے ساتھ آگے بڑھتی رہتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک قسم اپنے اندر ایک کائنات لئے ہوئے ہے۔

انگور کی بیلیں اپنے کثیر تعداد میں وزنی خوشوں کے ساتھ صنوبر کے درخت کی مانند اٹھی ہوئی ہوتیں تو ایک ہی دن میں ٹوٹ کر زمین پر آرتیں۔ پھر یہ بھی کہ انسانوں کی دسترس سے مکمل طور پر دور ہو جائیں جب کہ انگور کے باغات میں ایک بچہ بھی تمام انگور چن سکتا ہے۔ پھر چار قسم کے میوہ جات اور زراعت پر زور دیتے ہوئے فرماتا ہے ”اور کھجور اور زراعت کہ جس کے مختلف پھل ہوتے ہیں، اسی طرح زیتون اور انار ہیں جو ایک لحاظ سے تو آپس میں ملتے جلتے ہیں اور دوسرے لحاظ سے مختلف ہیں، یعنی ان کی ظاہری ساخت تو ایک جیسی ہوتی ہے جبکہ ان کے پھل ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ (وَالتَّجْلِ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا أَكْلُهُ، وَالرَّاتِنُونَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ) اس بات کی طرف بھی توجہ رہنی چاہیے کہ ”جنات“، ”جنت“ کی جمع ہے جس کا اطلاق باغ پر بھی ہوتا ہے اور زراعت سے ڈھکی ہوئی زمین پر بھی، اور ”اکل“ (بروزن دُہل) ”اکل“ (بروزن مکر) کے مادہ سے ہے جس کا اطلاق کھائی جانے والی تمام چیزوں پر ہوتا ہے۔ بہر حال صرف درخت، زراعت اور نباتات ہی ظاہری طور پر انواع و اقسام کی حامل نہیں ہیں بلکہ ان کے میوے اور دیگر محصولات بھی بہت مختلف انواع و اقسام پر مشتمل ہیں۔ رنگ ذائقے اور ظاہری شکل و صورت کے لحاظ سے بھی غذائی مواد اور گونا گوں خواص کی حیثیت سے بھی۔ علاوہ ازیں ان میں کچھ ایسے قسمیں بھی ہوتی ہیں جو حد سے زیادہ مرغوب اور پسندیدہ ہوتی ہیں اور کچھ ایسے جو درمیانی قسم کی ہوتی ہیں۔ یہ سب قدرتِ کاملہ کے

[۱] مذکورہ تینوں تفسیریں قرطبی جلد ۴ ص ۲۵۳ میں بیان ہوئی ہیں۔

شاہکار ہیں کہ خالق کائنات نے اس قسم کی عظیم انواع و اقسام کی چیزوں کو نہایت وسیع پیمانے پر عالم نباتات میں خلق فرمایا ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے انداز میں اس کی حمد و ثنا بجالا رہی ہے۔

آیت کے آخر میں حکیمانہ طور پر فرماتا ہے ”ان کے پھلوں سے کھاؤ اور ان کے (چنے یا) کاٹنے کے وقت ان کا حق بھی ادا کرو اور اسراف نہ کرو کیونکہ خداوند عالم اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا“ (كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ تَنْبَهُ فَوَا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ)

اس طرح سے ”کھاؤ“ (تم کھاؤ) کا فرمان ان چیزوں کے حلال ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن دو شرائط کے ساتھ ایک تو ضرورت مند افراد کا حق ادا کرنے اور دوسرے اسراف نہ کرنے کے ساتھ۔ اگرچہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں پر ”حق“ سے مراد زکوٰۃ ہے لیکن بہت سے مفسرین نے اہل بیت اطہار علیہم السلام اور حضرات اہلسنت کے طریقوں سے بیان ہونے والی روایات کی روشنی میں یہ صراحت کی ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ کے علاوہ حق ہے۔<sup>[۱]</sup>

بنا بریں ایک خدائی حکم کے عنوان سے بہتر یہی ہے کہ زراعت اور باغات کے مالکان جب زراعت اور میوہ جات کا محصول اٹھانے لگیں تو ضرورت مند اور صاحبان احتیاج افراد کیلئے زکوٰۃ کے علاوہ ایک حصہ ضروری پیش نظر رکھیں۔ اس حصہ کی شریعت میں حدود معین نہیں ہیں بلکہ یہ ان کی ہمت پر منحصر ہے کہ وہ زیادہ نکالیں یا کم!

اس طرح آیت کا اختتام ایک اخلاقی حکم پر ہوتا ہے جب کہ اس کا آغاز درس توحید سے۔

نویں آیت درختوں اور نباتات کی دنیا کے عجائبات کے ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ زمین کے بچھانے اور پہاڑوں کی تخلیق کے مسئلہ کے ذکر کے بعد فرماتا ہے ”اور ہم نے زمین میں ہر قسم کے موزوں نباتات کو پیدا کیا“ (وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ)

اگرچہ ”موزوں“ کا لفظ ”وزن“ کے مادہ سے لیا گیا ہے، لیکن یہاں پر نیچے تلے اور مکمل طور پر ہم آہنگ نظم و نظام کی طرف اشارہ ہے جو نباتات کے ایک ایک ذرے پر حکم فرما ہے۔ علاوہ ازیں مفردات میں راغب کے بقول ”وزن“ کے اصل معنی ہر چیز کے اندازہ کی شناخت ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ اس تعبیر سے مراد یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ہر نباتات کو انسانوں کی ضروریات کے مطابق پیدا کیا ہے۔<sup>[۲]</sup> نیز یہ بھی کہا ہے کہ ”موزوں“ سے مراد یہ ہے کہ پانی، ہوا، مٹی اور دھوپ ایک معین اندازے کے مطابق ملکر کام کریں تاکہ نباتات آگیں۔ بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی پیش کیا ہے کہ ”کل شیء“ کی تعبیر معدنیات کو بھی شامل ہے لیکن چونکہ ”انبتا“ (ہم نے اگایا)

[۱] سنن بیہقی جلد ۴ ص ۱۳۲، وسائل الشیعہ جلد ۶ کتاب الزکوٰۃ ابواب غلات الزکوٰۃ تفسیر المیزان، تفسیر نمونہ اور تفسیر قرطبی میں انہی آیات کے ذیل میں۔

[۲] فخر رازی نے اپنے تفسیر میں اس کو پہلے احتمال کے عنوان سے اور دوسری تفسیر کو تیسرے احتمال کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔ (جلد ۱۹ ص ۱۷۱)



کا جملہ معدنیات سے قطعاً مناسبت نہیں رکھتا لہذا یہ تفسیر بعید معلوم ہوتی ہے۔ البتہ دونوں تفسیروں کو جمع کرنا ممکن ہے اور بعض روایات میں بھی دوسرے معنی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ [۱] اس کے فوراً بعد انسان اور ان حیوانات کی زندگی کے مختلف وسائل کی طرف اشارہ ہے جو انسان کے بس میں ہوتے ہیں یا اس کے بس سے باہر ہوتے ہیں۔ سب اسی دسترخوان سے روزی پارہے ہیں۔ فرماتا ہے ”وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ“

”معايش“، ”معیشت“ کی جمع ہے اور اس کے بہت وسیع معنی ہیں۔ یہ ہر اس چیز کو شامل ہے جو انسانی زندگی کا وسیلہ بن سکتی ہے۔ ”وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ“ کا جملہ حیوانات اور ان دوسری چیزوں کی طرف اشارہ ہے جنہیں روزی بہم پہنچانا انسان کے بس سے باہر ہے اور خداوند متعال اس دنیا پر حکم فرما خاص نظم کے تحت ان میں سے ہر ایک کیلئے مناسب غذا فراہم کرتا ہے۔ اگر ہم اپنی آنکھیں اور عالم نباتات سے حیوانات کی روزی کے حصول کے طریقوں کو غور سے دیکھیں تو اس میں ہمیں معرفت الہی کے دلائل کی ایک کائنات ملے گی۔ کچھ مخلوقات پھل میوے کھاتے ہیں، کچھ دانے، کچھ پتوں سے استفادہ کرتے ہیں، بعض تنے سے درخت کی چھال کھاتے ہیں بعض پھولوں کے شیریں شیرے سے کام و دہن کی تواضع کرتے ہیں جب کہ بعض وہ ہیں جو جڑوں کو کھاتے ہیں۔

اسی سلسلے کی دسویں اور آخری آیت میں ایک بار پھر نباتات کی دنیا کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے زمین کے اندر دانوں اور گٹھلیوں کے شگافتہ ہونے کا مسئلہ۔ چنانچہ اس آیت میں خداوند عالم کا اس طرح تعارف کرایا گیا ہے: ”خداوند عالم دانے اور گٹھلی کو شگافتہ کرنے والا ہے۔“ (إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَى)

”فالق“، ”فلق“ (بروزن خلق) کے مادہ سے ہے اور مفردات میں راعب کے بقول کسی چیز کے چیرنے یا پھاڑنے اور ایک حصے کو دوسرے حصے سے جدا کرنے کے معنی میں ہے۔ [۲] اور ”حَبِّ“ کا معنی کھانے کا دانہ ہر قسم کا نباتاتی دانہ ہے اور ”نَوَى“ کا معنی گٹھلی ہے۔ اگر بعض لوگوں نے اس کو کھجور کی گٹھلی سے تفسیر کیا ہے تو اس لئے کہ اُس ماحول میں کھجوریں زیادہ تھیں۔

بہر حال نباتات کا ایک اہم اور دلچسپ ترین مرحلہ دانے اور گٹھلی کے شگافتہ ہونے کا مرحلہ ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ حالت ماں کے پیٹ سے بچے کے متولد ہونے سے ملتی جلتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ نباتات کی سب سے پہلے کو نپل نہایت ہی باریک اور ظریف ہونے کے باوجود اس محکم اور مضبوط قلعے کو شگافتہ کر کے اپنا سراسر سے باہر نکالتی ہے اور اندر سے ایک زندہ موجود باہر آتا ہے جو اس لمحہ تک دانے یا گٹھلی کے مضبوط اور ضخیم پردوں میں محبوس تھا اور اس کا باہر کی دنیا سے بالکل کوئی رابطہ نہیں تھا۔ یہ پیدا ہو کر فوراً اپنا رابطہ بیرونی دنیا سے استوار کرتا ہے، مٹی کے غذائی سے بہرہ

[۱] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۶۔ اس روایت میں حضرت امام علیہ السلام نے مختلف معدنیات اور ان کی کانوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ جنہیں خداوند عالم نے پہاڑوں میں بنایا ہے اور ان کی خرید و فروخت وزن کے ساتھ ہوتی ہے۔

[۲] یہ لفظ کبھی ”تخلیق“ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، گویا عدم کا ظلمات پر پردہ شگافتہ ہو جاتا ہے اور وجود کا نور اس سے آشکار ہوتا ہے۔ (تفسیر روح المعانی جلد ۷ ص ۱۹۶ صبح کی سفیدی کو بھی اسی لئے ”فلق“ (بروزن شفق) کہتے ہیں۔

مند ہوتا ہے، اپنے اطراف میں موجود پانی اور رطوبتوں سے سیراب ہوتا ہے اور بڑی سرعت کے ساتھ دو مختلف اطراف میں حرکت کرنا شروع کر دیتا ہے، ایک طرف تو جڑ کی صورت میں زمین کے اندر اور دوسری طرف تنے کی صورت میں زمین کے اوپر۔ زندگی کے اس مرحلہ میں نباتات کی دنیا پر حساب شدہ اور نچے نچے قوانین حکم فرما ہیں جو یقیناً حیرت انگیز اور پروردگار عالم کے علم و قدرت پر زندہ دلیل شمار ہوتے ہیں۔

ان تمام قرآنی آیات سے جو کہ نباتات کی تخلیق اور ان کی مختلف خصوصیات کے سلسلہ میں بیان ہوئی ہیں، اس بے نشان ذات کی نشانیاں، ربوبیت کی توحید اور ہر قسم کے شرک کی نفی کی زندہ دلیل ہیں۔ نباتات کے اُگنے سے لے کر ان کی مختلف انواع و اقسام کی روئیدگی اور بالیدگی، باروری اور زوجیت، انسانوں اور جانوروں کیلئے مختلف غذائی مواد بننے تک، اور کھجور کے پھلوں کا اُن کے خوشے سے نمودار ہونے، گندہ اور جو کے دانوں کا بالیوں میں ایک دوسرے پر سوار ہونے، ایک ہی مٹی اور پانی سے مختلف الانواع میووں اور زراعت کے پیدا ہونے، تمام مراحل میں ان سب پریکٹس قوانین کے حکم فرما ہونے اور دانے اور گٹھلی کے شکاف سے ہونے، غرض تمام امور میں اس کی ذات اقدس کی نشانیاں موجود ہیں۔

## چند ضروری وضاحتیں

### ۱۔ نباتات کی حیرت انگیز ساخت

عام طور پر جو چیز ہماری آنکھوں میں معمول کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے اسرار اور عجائبات بھی نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں۔ سورہ یوسف کی ۱۰۵ ویں آیت وَكَأَيِّنْ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ کے مصداق ہم ان کے پاس سے سادگی کے ساتھ گزر جاتے ہیں جب کہ ان میں خالق کی قدرت اور عظمت کی ایک کائنات مخفی ہوتی ہے۔ سب سے پہلے ہم نباتات کی جڑوں سے شروع ہوتے ہیں، جڑیں جو کہ نہایت ہی لطیف اور نرم و نازک ہوتی ہیں، اُن میں حیرت انگیز طاقت پانی جاتی ہے جس کے ذریعہ وہ سخت پتھروں اور سنگلاخ زمینوں کے اندر گھستی چلی جاتی ہیں۔ بسا اوقات تو کئی کئی ٹن بھاری پتھروں کے اندر گھس کر انہیں اوپر اٹھا دیتی ہیں۔ کنکر بیٹ سے بنی ہوئی عمارتوں اور حوضوں کے اطراف میں درختوں کے اُگنے سے اُن کے اندر دراڑیں پڑ جاتی ہیں اور وہ ”لرز“ جاتے ہیں۔ جڑوں کا کام ہر طرف سے غذائی مواد اور رطوبتوں کا جذب کرنا ہوتا ہے، گویا وہ اپنے عجیب احساس کے ساتھ رطوبتوں اور غذائی مواد کے مراکز کو پہچان کر اُن کی طرف آگے بڑھتی رہتی ہیں۔

ہر ایک جڑ اپنے طور پر ایک عظیم کارگاہ workshop کی حیثیت رکھتی ہے جو غذا کی نوع کا انتخاب کر کے اسے خصوصی توانائی کے ذریعہ تبدیل کر دیتی ہے اور غذائی مواد میں تبدیلی پیدا کر کے اسے شاخوں کی طرف بھیج دیتی ہے، وہاں سے میووں کی جانب، اور اس بارے میں ہر ایک مرحلے پر نئے نئے کیمیکل تغیر و تبدل اور فعل و افعال وجود میں آتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے تاریک مٹی سے شہد کی طرف میٹھے پھل یا شفاء عطا کرنے والی دوائیں وجود میں آ جاتی ہیں۔

جڑوں کا ایک اہم ترین کام AZOTE یا NITROGEN کی جمع آوری بھی ہوتا ہے جو نباتات کی نشوونما اور ساخت و پرداخت کیلئے

ضروری ہوتی ہے اور نباتات کا کوئی اور جزا سے جذب نہیں کر سکتی۔ پھر پتوں کی ساخت ہے جو ان سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ اگر ایک پتے کو آفتاب کے سامنے کر کے دیکھیں تو اس میں نہایت ہی باریک باریک رگیں نظر آئیں گی جو منظم صورت میں تمام پتے میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں جن کا کام پتے کے تمام خلیوں تک آب و غذا کا پہنچانا ہوتا ہے۔ درحقیقت ہر ایک پتہ بذات خود ایک شہر کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں موجود یہ رگیں اس میں پانی کے نلوں کی حیثیت رکھتی ہیں جن میں چھوٹے اور بڑے نل ہوتے ہیں اور ان کا تعلق سب سے بڑے نل سے ہوتا ہے۔

باوجود نرم و نازک ہونے کے پتے کے سات طبقتے ہوتے ہیں اور ہر ایک طبقہ کی اپنی مخصوص ساخت اور خصوصی پروگرام ہوتا ہے جسے معلوم کر کے انسان وراطہ حیرت میں پڑ جاتا ہے۔ پتے کے اوپر کی نازک پوست ایسے ہے جیسے انسان کی جلد ہوتی ہے جس میں نہایت ہی باریک باریک سوراخ ہوتے ہیں اور ہر سوراخ کی ایک حفاظتی چوکی ہوتی ہے جو اس کے کھلنے اور بند ہونے کا کام دیتی ہے۔

پتے انہی سوراخوں سے سانس لیتے ہیں اور ہوا کو اپنے اندر لے جاتے ہیں، جو کاربن CARBON کو اس سے جدا کر کے اس سے بناتی ”کلوروفل“ بناتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ہوا کو صاف ستھرا رکھنے کیلئے آکسیجن اور رطوبت کی صورت میں دو عظیم تحفے عالم انسانیت کی خدمت میں پیش کرتی ہے۔ سائنس دان اس موقع پر جو اعداد و شمار بیان کرتے ہیں وہ بڑے حیرت انگیز ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

”نباتات کے ایک پونڈ شکر پیدا کرنے کیلئے تین لاکھ گیلن ہوا کی ضرورت ہوتی ہے جو پتوں کی ذریعہ اندر جا کر تحلیل ہو جائے“۔

پھولوں اور انکے بعد پھولوں کی ساخت تو پتوں سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ نر اور مادہ کی تقسیم، نر کے نہایت ہی ظریف اور باریک سفوف کے مادہ کے ساتھ ملنے کی کیفیت، پھر اس خاموش شادی کے نتیجے میں وجود میں آنے والے تخم کی تشکیل اور اس کی پرورش کی کیفیت، غرض ان میں سے ہر ایک اپنی ذات میں عجائبات کی ایک دنیا لئے ہوئے ہے جس سے انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور دریائے حیرت میں غرق ہو جاتی ہے۔

نباتات، پھولوں اور پھولوں کی جسمانی ساخت کی مکمل تشریح اس مختصر کتاب میں نہیں لکھی جاسکتی۔ دانشوروں اور سائنسدانوں کی طرف سے اس بارے میں بہت سی کتاب لکھی جا چکی ہیں اور اس سلسلے میں علم النباتات BOTANY نامی علم وسیع پیمانے میں وجود میں آچکا ہے۔ بہتر ہے کہ اس مقام پر ایک ماہر زراعت کی باتوں کو کافی سمجھتے ہوئے اس گفتگو کو یہیں پر ختم کرتے ہیں مشہور ماہر نباتات ”چرالدت“ کہتے ہیں:

”خدا موجود ہے اور یہ اس کے نباتات کی دنیا میں برقرار ثابت اور اسرار بھرے قوانین کو چلانے سے ظاہر ہوتا ہے“۔ اس کی تجلی کا ظہور ان طریقوں سے ہوتا ہے۔

۱۔ نظم اور ترتیب: جو کہ نباتات کی نشوونما اور تولید نسل اور خلیوں کی تقسیم اور نباتات کی مختلف اجزاء کی تشکیل میں منظم طور پر انجام دیتا ہے۔

۲۔ پیچیدگی: انسان کے ہاتھوں سے بنی ہوئی کوئی بھی مشینری ایک معمولی سی نباتات کی پیچیدہ اور تعجب خیز مشینری سے قابل قیاس نہیں ہے۔

۳۔ خوبصورتی: تنے، پتے اور پھول کی خوبصورتی ایک خداداد چیز ہے، کیونکہ کوئی بھی ماہر مجسمہ ساز اور کوئی بھی نقاس ان جیسا نہ تو کوئی خوبصورت مجسمہ بنا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی دلاویز سینری تیار کر سکتا ہے۔

۴۔ توارث: نباتات کی ہر قسم اپنی جیسی چیز کو ہی پیدا کرتی ہے اور نسل کی یہ تولید مکمل طور پر مشیت اور پروگرام کے تحت انجام پاتی ہے، خواہ

اُسے کسی جگہ پر کاشت کریں اور جس طرح کاشت کریں تو ”گندم از گندم برودید جو ز جو“ یعنی گندم سے گندم ہی اُگے گی اور جو سے جو۔ وہ کہتے ہیں ”میرے نظریہ کے مطابق یہ سب کچھ خالق کائنات کے وجود اور اس کی حکمتِ کاملہ اور بے انتہا قدرت کے مظاہر ہیں۔“<sup>[۱]</sup>

ٹائیلر یونیورسٹی کے سابق BIOLOGIST مسٹر ”مجنسٹر“ کہتے ہیں کہ:

”شدر“ CLOVER کے ایک پودے کی پیش نظر لائیے جو سڑک کے کنارے پوری آب و تاب کے ساتھ اپنی رعنائی دکھا رہا ہے۔ اب تک جو مشینیں بھی ایجاد ہو چکی ہیں کیا کوئی ایک مشین بھی اس خود رو پودے کی برابری کر سکتی ہے؟ یہ پودے بذاتِ خود ایک ایسی مشین ہے جو محیر العقول اور تعجب خیز ہے جو ہمیشہ نشوونما کی صورت میں رہتا ہے اور روزانہ ہزاروں کیمیکل اور فزیکل تبدیلیاں انجام دیتا رہتا ہے وہ سب ایک ہی PROTOPLASMA پمادہ کے زیر کنٹرول ہوتے ہیں جس سے تمام طبعی حیات تشکیل پاتی ہے۔ یہ عجیب زندہ مشین کس کی قدرت کا شاہکار ہے؟“<sup>[۲]</sup>

## ۲۔ نباتات کے فوائد اور برکتیں

کرہ زمین پر نباتات کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے اور باقی تمام زندہ موجودات انہی کے رحم و کرم پر ہیں۔ نباتات کے بہت زیادہ فوائد ہیں جن میں سے بارہ فوائد کو فہرست وار ذکر کیا جاتا ہے۔

### ۱۔ بہترین غذائی مادہ

ہم انسانوں کی مناسب ترین غذائیں نباتات، غلے اور میوہ جات سے ہی تیار ہوتی ہیں۔ ہمیں توانائی، قوت اور سلامتی بھی نباتاتی غذائیں کھا کر ہی حاصل ہوتی ہے۔ بہت سے پرندے، چوپائے، رینگنے والے جانور اور مچھلیاں بھی نباتات ہی سے استفادہ کرتی ہیں۔ اسی بنا پر جو ملک بھی زرعی محصولات یعنی پیداوار کے ذریعہ اپنی غذائی ضروریات پورا کر سکتا ہے، وہی درحقیقت خود کفیل ملک کہلاتا ہے۔

### ۲۔ ہوا میں تبدیلی

ہم جانتے ہیں کہ انسان اور بہت سی دوسری زندہ موجودات ہمیشہ آکسیجن گیس استعمال کرتی اور اُسے جلاتی رہتی ہیں۔ اگر اس کمی کو پورا کرنے کیلئے کوئی منبع اور مرکز نہ ہوتا تو بہت کم عرصے میں زمین کی فضا میں موجود تمام آکسیجن ختم ہو جاتی اور سانس لینے والی تمام مخلوق دم گھٹ کر مر جاتی۔ لیکن حکمت کے مالک خدا نے اس نقصان کو پورا کرنے کا کام نباتات کے ذمہ لگا دیا ہے۔ وہ انسانوں کے سانس لینے کے برعکس سانس لیتی ہیں۔ وہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کو استعمال کرتی ہیں اور اس کا تجزیہ کر کے اسے آکسیجن کی صورت میں واپس لوٹاتی ہیں۔

[۱] کتاب ”جہان گلہا“ (اختصار اور تلخیص کے ساتھ)

[۲] کتاب ”جہان گلہا“ (اختصار اور تلخیص کے ساتھ)

بہی وجہ ہے کہ باغات اور کھیتوں کی ہوا مسرد رکن اور کیف و نشاط سے معمور ہوتی ہے۔ اسی لئے حفظانِ صحت کے اصولوں کے طور پر اس بات کی سفارش کی جاتی ہے کہ ہر شہر میں درختوں پر مشتمل پارک بنائے جائیں اور ماہرین فی نفر مربع میٹر کے حساب سے ہر شخص کا ایسے پارکوں میں حصہ پیش نظر رکھتے ہیں۔

### ۳۔ لباس اور پوشاک

ہمارے لباس کا عمدہ حصہ نباتاتی ریشوں سے تیار کیا جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انسانی پوشاک کا کبھی ختم نہ ہونے والا منع پہلے درجہ میں نباتات ہی ہیں۔

### ۴۔ گھراور اس کا اثاثہ

اگر ہم اپنے اطراف میں نگاہ دوڑائیں تو ہمیں اس کے بہت سے در، دروازے، کھڑکیاں الماریاں، روشندان وغیرہ درختوں کی لکڑی ہی سے بنے ہوئے نظر آئیں گے، اور وہ بھی اس طرح کہ اگر ہم چاہیں کہ انہیں اپنی زندگی کے حصے سے حذف کر دی تو ہمارے لئے زندہ رہنا دو بھر ہو جائے۔ بعض علاقوں میں تو لوگ اپنے تمام گھروں کو لکڑی سے بناتے ہیں اور اس قسم کے گھروں کو خصوصیات حاصل ہوتی ہیں۔ آج کے دور میں ہماری زندگی کے اہم وسائل میں سے ٹائر یا ربڑ سے اور ہم جانتے ہیں کہ وہ ”کاوچو“ CAOUTCHOUE نامی درخت کے شیرے سے حاصل ہوتا ہے۔

### ۵۔ نباتاتی دوائیں

گذشتہ زمانے میں اکثر دوائیں جڑی بوٹیوں ہی سے حاصل کی جاتی تھیں اور آج بھی ان کا عمدہ حصہ انہی جڑی بوٹیوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ کیمیکل دواؤں کے نامطلوب ردعمل اور منفی اثرات کی وجہ سے ان کے خلاف اور نباتاتی دواؤں کے حق میں تحریک شروع ہو چکی ہے اور ایسے دواخانے اور میڈیکل سٹورز ہیں جو نباتات کی دوائیں بناتے ہیں۔

### ۶۔ چلتی ریت کے آگے رکاوٹ

جو شہر تیلے بیاناؤں اور صحراؤں کے نزدیک واقع ہیں ان کیلئے سب سے بڑا خطرہ چلتی پھرتی ریت ہے کہ جو بعض اوقات تو اچھی خاصی آبادیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اس قسم کی ریت کے آگے رکاوٹ کھڑی کرنے کا بہترین راستہ یہ ہوتا ہے۔

### ۷۔ کاغذ کی تیاری

ہم جانتے ہیں کہ کاغذ کی ایجاد کا انسانی تمدن اور اس کے علم و دانش کی ترقی اور پیش رفت میں بہت بڑا حصہ ہے۔ اس کا اصل

منج یہی نباتات ہیں۔

## ۸۔ موسم میں اعتدال

نباتات سے ملائم اور معتدل رطوبتیں پیدا ہو کر فضا میں پھیلتی رہتی جن کی وجہ سے سردی کی شدت اور گرمی کے دباؤ پر بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ درختوں سے معمور علاقوں کی آب و ہوا معتدل ہوتی ہے۔

## ۹۔ ذرائع آمدورفت

زمانہ ماضی اور حال میں بھی بڑے بڑے بحری جہازوں اور کشتیوں کو لکڑی ہی سے بنایا جاتا ہے جو انسان کے ذرائع آمدورفت اور حمل و نقل کا بہت اہم ذریعہ ہیں، ماضی میں بھی اور اب بھی۔

## ۱۰۔ خوبصورتی اور تروتازگی

درختوں، پودوں اور پھولوں کی یہ دلکش اثر کسی سے پوشیدہ نہیں ہے جن کی زیبائی اور خوبصورتی سے انسانی روح کو فرحت، دل کو سکون اور زندگی کے سخت دباؤ کے موقع پر ذہنی سکون ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ ہسپتالوں کو مختلف درختوں اور پودوں سے مزین کرتے ہیں، تاکہ مریضوں کو تسکین حاصل ہو۔ عمومی حالت میں بھی تھکاوٹ دور کرنے کیلئے ہمیشہ انسان کو درختوں باغوں اور لہلہاتے کھیتوں کی فطری آغوش میں ہی پناہ ملتی ہے۔

## ۱۱۔ توانائی کا اہم منبع

ماضی اور حال میں ENERGY یعنی توانائی اور حرارت و گرمی پیدا کرنے کا ایک اہم ترین ذریعہ درختوں کی لکڑی پتے، اور ان کی دوسری چیزوں ہیں۔ حتیٰ کہ پتھر کا کونکہ بھی جو انرجی پیدا کرنے کا ایک اہم ترین ذریعہ ہے۔ درختوں اور دوسری نباتات سے حاصل شدہ مادہ ہے۔ درختوں کی لکڑی اور پتوں سے حاصل ہونے والی حرارت زیادہ مناسب ہے اور ماحولیات کے لئے ان کی آلودگی بہت کم ہوتی ہے، حتیٰ کہ درختوں کے جلنے سے حاصل ہونے والی راکھ بھی انہی درختوں کیلئے کھاد کا کام دیتی ہے جن سے دوبارہ استفادہ کیا جاتا ہے۔

## ۱۲۔ مختلف عطریات اور کیمیکل مواد

ہم جانتے ہیں کہ روح اور جان کو ہشاش بشاش رکھنے کیلئے ماضی سے لے کر اب تک پھولوں کے نچوڑ سے بہترین عطریات تیار کی جاتی رہی ہیں، حتیٰ کہ خود ایسے درخت اور دوسری نباتات جو معطر اور خوشبودار ہیں، وہ بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ بھی مختلف مصنوعات میں استعمال کیلئے نباتات ہی سے کیمیکل مواد لیا جاتا ہے۔

بزرگ ہے وہ خدا جس نے اس قسم کی مخلوق میں اس قدر فوائد اور برکتیں پیدا کی ہیں اور انہیں اپنے علم و قدرت کی آیات میں سے ایک عظیم آیت قرار دیا ہے۔ جو جامع تعبیرات ہم آیات بالا میں پڑھ چکے ہیں ان میں سے ایک جملہ یعنی ”معاش“ کی تعبیر بھی ہے جو ”معیشہ“ کی جمع ہے جس کا معنی وسیلہ زندگی ہے، جس میں یہ تمام فوائد جمع ہیں۔

### ۳۔ نباتات کی بے شمار قسمیں

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے نباتات کی اقسام اس قدر زیادہ ہیں جن کی کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی، یہاں تک کہ درخت خرما کی تین ہزار قسمیں ہیں، برگد یا انجیر ہندی کی سترہ سو اقسام ہیں، اور گل ثعلب کی بارہ سو انواع ہیں۔

”جہان گلہا“ (پھولوں کی دنیا) نامی کتاب کے مصنف مسٹر ”فرڈینالڈن“ نے مخفی دانے والی نباتات کی ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ قسمیں بتائی ہیں۔ نباتات شناسی BOTANY کی بعض کتابوں میں نباتات کی اٹھارہ ہزار سے زیادہ اقسام کی تشریح اور توضیح کی گئی ہے۔<sup>[۱]</sup>

کھمبیوں کی ایک لاکھ اقسام شمار کی گئی ہیں، جب کہ ”ALGAE“ کی چالیس ہزار سے زیادہ سبب کی چار ہزار اور گندم کی پینتیس ہزار اقسام پر تحقیقات کی گئی ہیں۔<sup>[۲]</sup>

نباتات میں کچھ ایسی قسمیں بھی پائی جاتی ہیں جو خوردبینوں ہی کے ذریعہ سے دیکھی جاسکتی ہیں اور کچھ ایسی ہیں جن کی لمبائی پچاس میٹر تک جا پہنچتی ہے۔ کچھ نباتات ایسی ہیں جو پتھروں کے درمیان سے اگتی ہیں اور کچھ وہ ہیں جو پانی کے درمیان تیرتی رہتی ہیں بعض وہ ہیں جن کی جڑیں پانی کے اندر اور پھول پانی سے باہر ہوتے ہیں۔ بہر حال قسم کوئی بھی ہو ہر ایک کا اپنا مقام، اپنی خصوصیت اور مخصوص منظر ہوتا ہے جو اپنی دنیا میں توحید کے نغمے الاپ رہی ہے۔

### ۴۔ نباتات کی بوالعجبیاں

جو کچھ نباتات کے بارے میں عام طور پر بیان کیا گیا ہے، اگر ہم ان سے گزر کر تو نباتات کی دنیا میں ہمیں بڑے عجائبات نظر آئیں گے جن میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو اس قدر عام ہیں اور ہمارے لئے عادی بن چکے ہیں اور ہم انہیں فراموش کر چکے ہیں۔ عظیم درختوں کے تنے اور شاخیں کشش ثقل کے قانون کے خلاف روزانہ لاکھوں کروڑوں ٹن پانی زمین سے اٹھا کر اوپر لے جاتے ہیں اور پھر بخارات کی صورت میں اسے فضا میں پھیلا دیتے ہیں۔ اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ کون قانون ہے جو نباتات کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ کشش ثقل کے قانون جس کے تحت ہر چیز نیچے کو کھینچتی ہے۔ خاص کر پانی۔۔۔۔۔ وہ اس کے خلاف اسے اوپر لے کر اپنی قدرت کا مظاہرہ کرتی ہیں؟

[۱] تاریخ علوم ص ۳۵۲

[۲] شناخت خدا ص ۲۹۱ و ۲۹۲

سورج مکھی کے پھول سورج کی حرکت کے ساتھ ساتھ حرکت کرتے رہتے ہیں۔ صبح کے وقت ان کا رخ مشرق کی طرف ہوتا ہے تو غروب کے وقت مغرب کی جانب۔ اس قسم کے دوسرے پھول بھی کم نہیں ہیں۔ نباتات کی دنیا میں گوشت خور پودے تو بہت ہی میسر العقول ہیں۔ ”فرانسیسی طبعی تاریخ کے قومی عجائب خانہ“ کے ڈائریکٹر پروفیسر ”لئون برٹین“ نے اس عجیب قسم کی نباتات کے بارے میں کافی ریسرچ کی ہے۔ وہ کہتے ہیں ”سائنسدانوں نے اب تک گوشت خور نباتات کی چار سو قسمیں دیکھی ہیں جن میں سے دس تو صرف فرانس میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل قسمیں زیادہ مشہور ہیں:

”آلڈروونڈ“ جو اس ملک کے مغربی صوبے ”جیرونڈ“ میں اوقیانوسِ اطلس کے ساحلوں میں اُگتا ہے، اس کے دو مخصوص پتے ہوتے ہیں جو کتاب کے دو صفحوں کی مانند آمنے سامنے کھلے ہوتے ہیں جو نیچے کی طرف سے ایک مخصوص ٹلی کے ذریعہ آپس میں چپکے ہوئے ہوتے ہیں اور پتوں کو حواسِ قسم کی مٹھل نے چھپایا ہوتا ہے۔ جب کوئی بد بخت مکھی اس کے قریب پھٹکتی ہے اور اس کا پاؤں یا جسم کا کوئی حصہ اس سے چھو جاتا ہے تو دونوں صفحے جلدی سے ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور یہ بیچاری اس میں گرفتار ہو جاتی ہے اور آخر کار ایک مخصوص شیرے کے ذریعہ جو پتوں سے ٹپکتا ہے بتدریج حل ہو کر اس پودے کا جزو بن جاتی ہے۔

”دروزرا“ اس قسم کی ایک اور نباتات ہے جس کے پتے سرخ رنگ کے ہوتے ہیں، جن پر باریک باریک بال ہوتے ہیں۔ جب کوئی حرمان نصیب مکھی اپنا راستہ گم کر کے ادھر آ پہنچتی ہے اور ان پتوں کو خلوت اور سکون کا مقام سمجھ کر ستانے کیلئے ان پر بیٹھتی ہے تو وہ باریک بال فوراً اس کے سامنے سے اوپر کو اٹھ جاتے ہیں۔ اسے دست بستہ پتے کے اندر بھیج دیتے ہیں اور وہ اس کے لیسدا مادہ کے درمیان پھنس کر اس کے اندر ہضم اور جذب ہو کر رہ جاتی ہے۔

”نینٹس“ گوشت خور نباتات کی عجیب ترین قسم ہے۔ اس کی باریک شاخوں کے آخر میں چھوٹے کوزے کی مانند ایک چیز ہوتی ہے جس کا منہ اوپر کو ہوتا ہے اور اس کا مخصوص دروازہ ہوتا ہے جو عام طور کھلا ہوتا ہے۔ یہ کوزہ بے احتیاط اور لا ابالی قسم کے حشرات کیلئے خطرناک دام ہوتا ہے۔ اس کوزہ کے اندر ہمیشہ شہد کی مانند لیسار اور شیریں مادہ ہوتا ہے جو ”شکم پرست“ حشرات کو اپنی طرف بلا تا ہے۔ خوش ذوق“ حشرات کیلئے کوزے کا خوبصورت اور شفاف رنگ بھی کشش کا باعث ہوتا ہے۔ اگر کوئی حشرہ ہوائے نفس کا اسیر ہو کر اس کے اندر آ جائے تو وہ فوراً اپنے منہ کو بند کر لیتا ہے اور وہ ایسے زندان کے اندر چلا جاتا ہے جس سے کبھی بھی چھٹکارا حاصل نہیں ہو سکتا۔ بہر حال یہ کوزہ اس نباتات کیلئے معدہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے اندر موجود شیرہ بھی معدوں میں موجود شیروں کی مانند ہوتا ہے جو حشرات کو جذب ہونے کے قابل بنا دیتا ہے۔ سائنسدان کہتے ہیں کہ یہ پودا حشرات کا شکار اس لئے کرتا ہے کیونکہ اس کے ریشے آکسیجن AZOTE کے جذب کرنے پر قادر نہیں ہوتے لہذا وہ اپنی کمی اس طریقے سے پوری کرتے ہیں۔

سائنسدانوں نے اس امید کا اظہار کیا ہے کہ شاید ایک دن ایسا آئے کہ اس قسم کے پودوں کی گھروں میں اور دوسرے اہم مقامات پر پرورش کیا جائے اور اس صحیح و سالم اور طبعی ذریعہ سے مکھیوں اور دیگر موذی جانوروں کو تلف کیا جاسکے۔ سیاحوں کی یادداشتوں میں آدم خورد رختوں کی بھی عجیب و غریب داستانیں ملتی ہیں۔ بعض سائنسدان کہتے ہیں یہ درخت ان حشرہ خوار پودوں کی ہی ایک قسم ہو جو زیادہ قابل



زمینوں میں پروان چڑھ کر اس خصوصیت کے حامل ہو چکے ہوں اور بڑے بڑے جانوروں کو اپنی شاخوں اور پتوں میں گرفتار کر کے بتدریج چٹ کر جاتے ہوں۔ (لیکن اس نظریہ کی تائید یا اسے قبول کرنا آسان نہیں ہے) [۱]

نباتات کا عجیب ترین اور دلچسپ ترین حصہ پھل اور میووں کی ساخت ہے۔ اُن کے سینکڑوں دلچسپ نکات میں سے ایک یہ ہے کہ ان میں بہت سے میووں میں نہایت ہی شیریں اور لذیذ جُوس چھوٹے چھوٹے مخصوص پیکٹوں میں نہایت ہی خوبصورت اندازہ میں اُن کے اندر بھر دیا گیا ہے کہ ہمارا ترقی یافتہ دور میں کی جائے والی پیکٹ بندی ابھی ابتدائی کوشش معلوم ہوتی ہے۔

ایک مالٹے کو کھول کر دیکھئے گویا اس کی ایک قاش سینکڑوں چھوٹی چھوٹی شیشیوں سے بھری ہوتی ہے، جس میں نہایت ہی لذیذ اور خوشبودار جُوس ہوتا ہے، اور شیشیاں بھی ایسی کہ جو کسی فاصلے کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوتی ہیں۔ (اگر ان میں فاصلہ اور خلا ہوتا تو وہ بہت جلد خراب ہو جاتیں)

لیکن یہ شیشیاں کبھی نہیں ٹوٹتیں اور پوری طرح حمل و نقل کے قابل ہوتی ہیں۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے اندر موجود مواد کے ساتھ کھانے کے قابل ہوتی ہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی اور باریک شیشیوں کا ہر ایک مجموعہ ایک ضخیم پوست میں بند کیا گیا ہے جو ایک ڈبہ CARTON کی حیثیت رکھتا ہے اور قاش کی صورت اختیار کئے ہوتا ہے (یہ ڈبہ بھی اپنے اندر موجود مواد سمیت کھانے کے قابل ہوتا ہے، بلکہ ہاضمہ کے لئے بہت مفید ہوتا ہے)

یہ چھوٹے چھوٹے ڈبے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ جڑے ہوتے ہیں جن کے درمیان نہ تو کسی قسم کا فاصلہ ہوتا ہے اور نہ ہی ہوا کا گزر، اور حفاظت و بچاؤ کیلئے چند مختلف لفافوں میں لپٹے ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر ایک بندل کی صورت میں میں دور ترین فاصلوں تک لے جانے کیلئے حمل و نقل کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہی صورت حال بلکہ اس سے بھی لطیف اور ظریف صورت میں انگور، انار اور انجیر میں دیکھی جاسکتی ہے

خوب غور کیجئے کہ اگر ان میوہ جات میں سے کسی ایک کے جوس کو کھلی فضا میں رکھ دیا جائے تو ایک گھنٹہ کے اندر اندر اس میں تبدیلی پیدا ہو جائے گی اور بسا اوقات چند گھنٹوں میں خراب اور بدبودار ہو جائے گا۔ لیکن قدرتی طور پر ان کی پیکنگ اس طرح سے منظم طریقہ پر کی گئی ہے کہ ان کے اندر ہوا کے نفوذ کی اجازت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ پھل کئی کئی مہینوں تک خراب نہیں ہو پاتے۔ یہ بات تو صرف سادہ طریقہ پر پیکنگ کے بارے میں ہے، لیکن ان میں سے ہر ایک پھل کی کیمیکل ترکیب، غذائی اور طبی خواص و ٹامنز کی اقسام اور ان کے حیاتی مواد کی انواع کی بجائے خود اپنی ایک نہایت مفصل داستان ہے جو ماہرین غذا کی بحث کا موضوع ہے اور اس بارے میں بہت سی کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ اگر ہم ان مسائل کی تفصیل میں پڑ جائیں تو تفسیری کتاب کی صورت میں نکل جائیں گے اور پھر کئی کتابوں کی ضرورت ہوگی۔

[۱] کتاب ”نظریہ طبیعت و اسرار ان“ ص ۱۳۱ تا ۱۳۴ مؤلفہ لٹون برٹین (کچھ تلخیص کے ساتھ)

## ۵۔ توحید مفصل میں نباتات کی تخلیق کے اسرار

توحید مفصل میں نباتات میں ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی زبانی یوں پڑھتے ہیں:

”اے مفصل! اس نباتات اور اس کے مختلف فوائد کے بارے میں غور کرو۔ اس کے پھل، میوے، انسانوں اور بسا اوقات جانوروں کی غذا کا کام دیتے ہیں۔ ایندھن آگے جلانے کیلئے اور لکڑی مختلف مصنوعات کے کام آتی ہے۔ اس کی چھال، پتے، ریشے اور مختلف قسم کی گوند غرض ان میں سے ہر ایک کے اپنے مخصوص فوائد ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو ہماری زندگی میں کس قدر مشکلات پیدا ہوتیں۔ علاوہ ازیں ہم ان کے روح پرور اور جاذب نظر مناظر سے جولذت اٹھاتے ہیں، دنیا میں کوئی منظر اس کی برابری نہیں کر سکتا۔“

”اے مفصل! ذرا سوچو کہ بعض اوقات ایک دانے سے سویا کم وبیش دانے وجود میں آتے ہیں جب کہ ہونا تو یہ چاہیے کہ ایک دانہ سے صرف ایک ہی دانہ پیدا ہو۔ یہ صرف اور صرف اس لئے ہے کہ انسان کیلئے وسعت پیدا ہو اور وہ اگلے سال تک اپنی خوراک کو پورا کر سکیں۔“

”اچھی طرح غور کرو! عدس، ماش، باقلا جیسے غذائی دانے کس قسم کی پوست اور تھیلیوں میں رکھ کر آفات سے بچائے جاتے ہیں۔ بالکل ویسے ہی جنین کی ایک باریک سی جھلی میں حفاظت کی جاتی ہے۔ پھر گندم اور اس جیسے دوسرے غلات کی بالیوں پر نظر ڈالو کہ اس خصوصیت کے علاوہ ہر بالی کے سر پر نیزوں کے مانند سیخیں ہوتی ہیں تاکہ وہ پرندوں کے حملوں سے بچی رہیں۔“

”درختوں اور دوسری نباتات کی تخلیق کے بارے میں اچھی طرح غور و فکر کرو۔ ان سب کو بھی غذا اور خوراک کی ضرورت ہوتی ہیں حالانکہ وہ خود حرکت نہیں کر سکتے۔ لہذا ان کی جڑیں زمین کی گہرائیوں تک پہنچی ہوئی ہیں تاکہ وہ غذائی مواد کو وہاں سے حاصل کر کے ہر ایک حصے تک پہنچائیں۔ یہ جڑیں غذائی مواد کو زمین سے چوستی ہیں، جیسا کہ شیر خوار جانوروں کے بچے ماں کے پستانوں سے دودھ چوستے ہیں۔ کیا نہیں دیکھتے ہو کہ جڑوں کے ریشے خیمہ کی طنابوں کی مانند زمین کے اندر ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں تاکہ بلند قامت درختوں کو سیدھا اور برقرار رکھیں؟ اگر جڑیں نہ ہوتیں تو کھجور کے اس قدر بلند اور بالا درخت اپنی بڑی بڑی اور ہر طرف پھیلی ہوئی شاخوں کے ساتھ طوفانوں اور جھکڑوں کا مقابلہ کیونکر کر سکتے؟“

”اے مفصل! پتوں کی آفرینش کے بارے میں بھی اچھی طرح غور و فکر سے کام لو۔ ان میں تم نہایت ہی باریک اور ظریف ریشے دیکھو گے جس طرح جسم کی نرم و نازک رگیں ہوتی ہیں، جن میں سے کچھ تو ضخیم اور نہایت ہی لمبے ہوتے ہیں اور کچھ بالکل ہی ظریف اور پتلے۔ اگر انسان ان میں سے کسی ایک پتے کو بنانا اور اس لطافت اور ظرافت کے ساتھ اس کا تانا بانا بنانا چاہے تو ایک سال تک بھی ایسا نہیں کر پائے گا اور کس قدر اوزار اور آلات کی ضرورت پیش آئے گی؟ لیکن بہار کے چند دنوں میں درختوں پر اسقدر پتے ظاہر ہو جاتے ہیں کہ کوہ صحرا اور زمین کے کئی دوسرے علاقے ان سے بھر جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ پروردگار عالم کے ناقابل تریدارادے اور کائنات میں اس کے واجب الطاعت امر سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔“

امام علیہ السلام سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے پھل میووں اور گٹھلیوں کے عجائبات بیان فرماتے ہیں، ہر سال نباتات کی زندگی اور موت کا فلسفہ ارشاد فرماتے ہیں، نباتات کی باروری کا طریقہ ذکر کرتے ہیں کہ کیونکر زحصر سے مادہ حصہ کی آمیزش ہوتی ہے، اسی طرح یہ بھی فرماتے ہیں کہ

صحت عطا کرنے والی دوائیں کس طرح جڑی بوٹیوں سے حاصل کی جاتی ہیں۔ پھر جانوروں کی غذا بننے والی اناجوں اور دوسری نباتات کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے ہر ایک کی دلچسپ تشریح فرماتے ہیں۔ اگر اختصار مطلوب نہ ہوتا تو ان سب کو یہاں پر ذکر کیا جاتا۔ ضرورت مند حضرات مندرجہ بالا طویل حدیث کی طرف رجوع فرما سکتے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

اس لمبی چوڑی بحث کو ہم مجبوراً یہاں پر سمیٹ رہے ہیں اور اُسے توحید پر مبنی چند خالص اشعار کے ساتھ ختم کر رہے ہیں۔ اگر عنانِ قلم کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس بارے میں کئی کئی کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔

آفرینش ہمہ تنبیہ خداوندِ دل است  
دل ندارد کہ ندارد بہ خداوندِ اقرار  
کوہ و دریا و درختان ہمہ در تسبیح  
نہ ہمہ مستمع فہم کن داین اسرار  
عقل حیران شود از خوشہ زرین عنب  
فہم عاجز شود از حقہ یاقوتِ انار  
بندہائی راطب از نخل فرو آویزند  
نخل بندان قضا و قدر شیریں کار  
تانہ تاریک بود سایہ انبوہ درخت  
زیر ہر برگ چراغی بنہد از گل نار  
ژالہ بر لالہ فرو آمدہ نزدیک سحر  
راست چون عارض گلبوی عرق کردہ یار  
گونظر باز کن خلقتِ نارنج جبین  
ایکہ باور کنی ”فی الشجر الاخضر نار“  
پاک وبے عیب خدائی کہ بہ تقدیر عزیز  
ماہ و خورشید مسخر کند و لیل و نہار<sup>[۲]</sup>

[۱] بحار الانوار جلد ۳ ص ۱۲۹ تا ۱۳۶ (تفصیل کے ساتھ)

[۲] کلیات سعد، حصہ قصائد، ص ۲۲۳

ترجمہ : ان سب چیزوں کی تخلیق درحقیقت دلوں کے مالک خدا کی تشبیہ ہے۔ جو شخص خدا کا اقرار نہیں کرتا اس کا دل ہی نہیں ہے۔ پہاڑ، دریا، سمندر اور درخت سب خدا کی تسبیح میں مشغول ہیں، لیکن یہ ایسی اسرار بھری تسبیح ہے جسے ہر سننے والا نہیں سمجھ سکتا۔

انگور کے سنہری گچھے کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے اور یا تو قوی انار کی ڈبیہ کو دیکھ کر فہم انسانی عاجز ہو جاتی ہے۔

کھجوروں کے پھل اس کے خوشوں کے نیچے جھکے ہوئے ہیں، فضا و قدر کے مشتاق ہاتھوں نے اس میں شیرینی بھر دی ہے۔

جب تک درختوں کے انبوہ کے سائے تار یک اور گھنے نہ ہوں اس وقت تک ہر پتے کے نیچے گل انار کے چراغ روشن نہیں ہو سکتے۔

بوقت سحر گل لالہ پر شبنم کے قطرے یوں آ کر بیٹھے ہیں جیسے گل رُخ محبوب کے رخساروں پر پسینہ آیا ہوا ہو۔ جو لوگ ”فی الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا“ کو نہیں مانتے اُن سے کہو کہ وہ اپنی آنکھیں کھولیں اور نارنگی کی تخلیق کو دیکھیں۔

پاک اور بے عیب ہے وہ خدا جس نے اپنی غالب تقدیر کے ذریعہ سورج چاند اور لیل و نہار کو مسخر کیا ہوا ہے۔



## ۱۶۔ عمومی رزق کی پیدائش میں خالق کائنات کی نشانیاں

اشارہ:

ہر زندہ موجود کو اپنی زندگی کی بقاء کیلئے کچھ چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، یا بالفاظ دیگر زندگی کی سرگرمیاں تو انسانی پیدا کرنے والے مواد چاہتی ہیں جو ہمیشہ اس زندگی موجود کو ملتے رہیں جو ضائع ہو جانے والے مواد کی تلافی کریں۔ صحیح معنی میں اور ہر لحاظ سے ان مواد کو اس زندہ موجود کے مناسب ہونا چاہیے تاکہ وہ ان سے کما حقہ استفادہ کر سکے۔

عالم تخلیق میں رزق اور روزی کا نظام، اس کے تیار کرنے کی کیفیت ک، پھر اس کا ہر زندہ چیز کے اختیار میں ہونے کا طریقہ کار اور اسی طرح ان سے استفادہ کرنے کا انداز نہایت ہی ظریف، پیچیدہ بلکہ اسرار آمیز ہیں جن میں خداوند عالم کی توحید، علم اور قدرت کی اہم نشانیاں پوشیدہ ہیں۔ اسی لئے قرآن مجید نے مختلف آیات میں کئی بار انہی چیزوں پر زور دیا ہے۔ اس مختصر سے اشارے کے ساتھ ہم قرآن کی طرف لوٹتے ہیں اور مندرجہ ذیل آیات کو جان و دل سے سماعت کرتے ہیں۔

۱۔۔۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ ۚ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرِ اللَّهِ

يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِلَّا هُوَ فَاتُّوْا فُكُوْنَ (فاطر/۳)

۲۔۔۔ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ۗ هَلْ مِنْ شَرِّ كَآبِكُمْ

مَنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِنْ شَيْءٍ ۗ سُبْحٰنَهُ وَتَعٰلٰی عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۰﴾

(روم/۳۰)

۳۔۔۔ اَمْ مَنْ يَّبْدُوْا الْخُلُقِ ثُمَّ يُعِيْدُهُ ۗ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ ۗ اِلٰه

ۙ مَعَ اللّٰهِ قُلْ هَاتُوْا هٰنَا نَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (نمل-۶۴)

۴۔۔۔ اَمْ مَنْ هٰذَا الَّذِي يَّرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهُ ۗ بَلْ لَّجُوْا فِيْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ ﴿۲۱﴾

(ملک/۲۱)

۵۔۔۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ

لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُوْنَ (روم/۳۷)

- ۶۔۔۔ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينِ (ذاریات/۵۸)
- ۷۔۔۔ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُبِينٍ (هود/۶)
- ۸۔۔۔ قُلْ مَنْ يَزُرُّكُمْ مِنْ السُّهُوتِ وَالْأَرْضِ قُلِ اللَّهُ وَإِنَّا أَوْيَاكُمْ لَعَلَى هُدًى أَوْ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ (سبا/۲۳)
- ۹۔۔۔ وَتَزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُبْرَكًا فَأَنْبَتْنَا بِهِ جَنَّاتٍ وَحَبَّ الْحَصِيدِ ۝ وَالنَّخْلَ بَسَقَتِ لَهَا طَلْعٌ نَضِيدٌ ۝ رِزْقًا لِلْعِبَادِ ۝ ﴿ق/۱۱﴾
- ۱۰۔۔۔ فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَى طَعَامِهِ ۝ أَتَا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ۝ فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ۝ وَعِنَبًا وَقَضْبًا ۝ وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ۝ وَحَدَائِقَ غُلْبًا ۝ وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ۝ مَتَاعًا لَكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ۝ ﴿عبس/۳۲ تا ۳۷﴾

## ترجمہ

- ۱۔۔۔ اے لوگو! خدا کی اپنے اوپر نعمت کو یاد کرو، کیا خدا کے علاوہ کوئی اور خالق ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دے؟ اس کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں ہے تو پھر تم باطل کی طرف کیوں رخ کرتے ہو؟
- ۲۔۔۔ خداوند عالم وہی تو ہے جس نے تم پیدا کیا، پھر تمہیں روزی دی، پھر تمہیں موت دے گا، پھر زندہ کرے گا کیا جو خدا تم نے بنا رکھے ہیں، ان کاموں میں سے کوئی کام انجام دے سکتے ہیں؟ وہ پاک و پاکیزہ اور برتر ہے اس سے کہ جو تم اس کے شریک قرار دیتے ہو۔
- ۳۔۔۔ یا وہ جس نے تخلیق کا آغاز کیا اور پھر اس کی تجدید کرے گا اور وہ جو تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ کہہ دیجئے کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل لے آؤ!

□ اس بارے میں اور بھی بہت سی آیات قرآن مجید میں موجود ہیں جو مندرجہ بالا آیت سے ملتی جلتی ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ آیات ہیں۔ یونس ۳۱/، بقرہ/۱۷۲، روم/۲۸، شوریٰ/۱۹، رعد/۲۶، شوریٰ/۱۲، بقرہ/۲۲، ابراہیم/۳۲، نحل/۷۳، عنکبوت/۱۷، مؤمن/۱۳۔

- ۴۔۔۔۔۔ یا وہ کہ جو تمہیں روزی دیتا ہے، اگر وہ اپنی روزی کو روک لے (تو پھر تمہاری ضروریات کو کون پورا کرے گا) لیکن وہ لوگ سرکشی اور حقیقت سے فرار کرنے میں ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہیں۔
- ۵۔۔۔۔۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ خداوندِ عالم جس کیلئے چاہے روزی کشادہ کر دے اور جس کیلئے چاہے تنگ کر دے؟ اس بارے میں اُن لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو ایمان لے آئے (اور حق قبول کرنے کو تیار ہیں)
- ۶۔۔۔۔۔ خداوندِ عالم ہی تو روزی رساں اور صاحبِ قدرت و طاقت ہے۔
- ۷۔۔۔۔۔ زمین پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں ہے مگر یہ کہ اس کی روزی خدا پر ہے، وہ ان کے ٹھکانے اور آنے جانے کی جگہوں کو جانتا ہے، یہ سب کچھ (خداوندِ عالم کے علم) کی واضح کتاب ہے۔
- ۸۔۔۔۔۔ کہہ دو! کون ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے؟ کہو! اللہ!! اور ہم تمہارے ساتھ ہدایت پر ہیں یا کھلم کھلا گمراہی میں!
- ۹۔۔۔۔۔ اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی نازل کیا، اور اس کے ذریعہ باغات اور اُن دانوں کو اُگایا جو وہ کاٹتے ہیں اور بلند قامت کھجوروں کو کہ جن کے پھل ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے ہیں۔ یہ سب کچھ بندوں کو روزی عطا کرنے کیلئے ہے۔
- ۱۰۔۔۔۔۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی غذا کی طرف دیکھے۔ ہم نے فراوانی کے ساتھ پانی کو آسمان سے بھیجا ہے۔ پھر زمین کو شگافتہ کیا ہے۔ اور اس میں فراوان صورت میں دانے اُگائے۔ اور انگور اور بہت سی سبزیاں۔۔۔۔۔ اور زیتوں اور بڑی مقدار میں کھجور۔۔۔۔۔ اور درختوں سے لدے پھندے باغات۔۔۔۔۔ اور میوہ اور چراگاہ۔۔۔۔۔ تاکہ وہ خود تمہارے اور تمہارے جو پاؤں کیلئے بہرہ مندی کا ذریعہ بنیں۔

## الفاظ کے معانی اور تشریح

”رِزْق“ کے بارے میں راغب نے مفردات میں لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں مسلسل عطا اور بخشش، خواہ وہ دنیاوی ہو یا اُخروی، نصیب اور حصہ کو بھی رزق کہتے ہیں۔ اسی طرح اس غذائی مواد کو بھی رزق کہا جاتا ہے جو انسان کے پیٹ کے اندر جاتا ہے۔

”ابن منظور“ کتاب ”لسان العرب“ کہتے ہیں کہ ”رزق“ کی دو قسمیں ہیں، ایک جسمانی رزق، جیسے مختلف قسم کی غذائیں ہیں

اور دوسرے دل و جان کیلئے روحانی رزق جیسے مختلف علوم و معارف۔

کتاب ”التحقیق“ میں بھی آیا ہے کہ رزق کے معنی ہیں ”وہ خاص عطا و بخشش جو فریق ثانی کے حال کے مطابق اور اس کی ضروریات کے پیش نظر ہوتی ہے جس سے وہ زندہ رہتا ہے۔“

قرآن مجید میں بھی دونوں معانی استعمال ہوئے ہیں۔ چنانچہ سورہ ملک کی پندرہویں آیت میں ہم پڑھتے ہیں کہ:

”هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ ذُلُولًا فَأَمْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ“ ”وہ وہی تو ہے جس نے زمین

کو تمہارے لئے رام کر دیا ہے، لہذا تم اس کے شانوں پر چلتے رہو۔ اور خدا رزق کھاتے رہو۔“

اور سورہ آل عمران کی ۱۶۹ ویں آیت میں شہداء کے بارے میں اشد ہوتا ہے:

”بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ“ ”وہ تو زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے پاس سے روزی پاتے ہیں۔

لیکن عام طور پر اس کا استعمال مادی رزق کیلئے ہوتا ہے، ہر چند کی معنوی روزی کیلئے بھی اس کا استعمال کم نہیں ہے۔ اور چونکہ مختلف

مادی اور معنوی روزیوں کا عطا کرنے والا خدا ہے لہذا ”رزق“ کا لفظ اس کی خصوصی صفات میں سے ہے۔<sup>[۱]</sup>

”طعام“ میں مصدر اور اسم مصدر دونوں قسم کے معنی پائے جاتے ہیں، یعنی ”غذا کھانے“ کو بھی اور خود ”غذا“ کو بھی طعام کہتے ہیں۔

کبھی یہ لفظ خاص طور پر گندم پر بھی بولا جاتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم فرمایا کہ زکوٰۃ فطرہ

ایک صاع (تین کلو) ”طعام“ سے، یا ایک صاع ”شعیر“ (جو) سے ادا کیا جائے۔ (اس مقام پر طعام بمعنی گندہ ہے جو کہ جو کے مقابلے میں

استعمال ہوا ہے)

”لسان العرب“ میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ طعام ایک ایسا جامع اسم ہے جو ہر قسم کی کھانے کی چیزوں پر بولا جاتا ہے

، لیکن خود لسان العرب میں اور راغب کی کتاب مفردات میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ یہ لفظ پینے کی چیزوں پر بھی بولا جاتا ہے، جیسے

سورہ بقرہ آیت ۲۴۹ میں ہے:

”فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّيْ“ ”جو اس سے پئے گا وہ مجھ سے نہیں اور جو نہیں پئے اوہ مجھ سے

ہے۔ خلیل بن احمد نے بھی اپنی کتاب ”العمین“ میں کہا ہے۔

”کلام عرب میں عام طور پر طعام خصوصی طور پر گندم کو کہا جاتا ہے (لیکن ظاہراً یہ اس لئے ہے کہ غالباً اصل غذا روٹی ہوتی ہے اور وہ

بھی گیہوں سے تیار کی جاتی ہے وگرنہ بہت سے ارباب لغت نے تصریح کر دی ہے کہ طعام کا مفہوم عام ہے)۔<sup>[۲]</sup> بعض حضرات نے یہ بھی

کہا ہے کہ طعام بمعنی خرما ہے۔ یہ بھی بظاہر اس لئے ہے کہ اس درو اور ماحول میں خرما (کھجور) ایک اصل غذا تھی۔

[۱] لسان العرب، مفردات راغب، مجمع البحرین اور التحقیق فی کلمات القرآن الکریم۔

[۲] لسان العرب، مفردات، العمین اور نہایہ ابن اثیر



## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

ہے اس خوانِ نعمت پہ دشمن و دوست!

ہم بارہا بتا چکے ہیں کہ عرب کے مشرکین کبھی بھی بتوں کو اپنا خالق نہیں سمجھتے تھے لیکن ان کا عقیدہ تھا کہ اس کائنات کے چلانے، انسانوں کی مشکلات کے حل کرنے اور انہیں نعمتیں عطا کرنے میں ان کا دخل ہے، کیونکہ وہ اللہ کی بارگاہ میں ہمارے شفع ہیں یا یہ کہ اس حصے میں کائنات کا چلانا ان کے ذہ لگایا گیا ہے۔ اسی لئے مندرجہ بالا آیات میں اس خرافاتی عقیدہ کی نفی کیلئے مختلف تعبیرات کے ساتھ اس بات پر زور دیا گیا ہے۔ خالق اور رازق ایک ہی ہے اور ہر قسم کی روزی اسی کی طرف سے ہے۔

واضح سی بات ہے کہ جب کسی شخص کو کھانے کی دعوت دی جاتی ہے اور دسترخوان پر رنگ برنگے کھانے چنے جاتے ہیں تو وہ اپنا اولین فریضہ یہی سمجھتا ہے کہ اپنے میزبان کا شکر یہ ادا کرے۔ اسی لئے وہ اپنے میزبان کو تلاش کرتا ہے تاکہ اسے پہچانے، کائنات میں تخلیق عالم کے دسترخوان سے بڑھ کر بھی کوئی دسترخوان ہو سکتا ہے؟ کیا ایسا دسترخوان جس پر دوست اور دشمن بیٹھ کر بہرہ ور ہوتے ہیں اس کے مالک کو نہ پہچانا جائے اور جس کی نعمتیں سر سے پاؤں تک اور ظاہر اور باطن کے طور پر ہمیں ڈھانپے ہوئے ہیں اس کا شکر یہ ادا نہیں کرنا چاہئے؟ یہی وجہ ہے کہ ”معرفة الہی“ اور اسی طرح اس کی شناخت کی راہوں میں سے ایک یہی رزق اور روزی ہے۔ اسی لئے سب سے پہلی آیت میں تمام لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے: ”اے لوگو! اپنے اوپر خدا کی نعمت کو یاد کرو۔“ (يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ)

”کیا خدا کے علاوہ کوئی اور خالق ہے جو تمہیں آسمان وزمین سے روزی بہم پہنچاتا ہے؟“ (هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ يَزِدُّكُمْ

مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ)

آسمان سے تمہارے لئے آفتاب عالمتاب کی زندگی عطا کرنے والی روشنی، بارش کے حیات عطا کرنے والے قطرے اور نسیم کے روح پرور جھونکے بھیجتا ہے اور زمین سے مختلف نباتات، میوے اور دوسرا غذائی مواد اُگاتا ہے۔ زمین کے اندرونی ذخائر اور کانین ان کے علاوہ ہیں۔ اسی لئے تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ”اس کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں اور تمہاری عبادت کی لائق بھی صرف وہی ہے۔ پھر تم راہِ راست سے منہ کیوں موڑتے ہو اور اس عظیم خالق اور روزی رساں کی طرف پشت کر کے بتوں کے آگے کیوں سجدہ کرتے ہو؟“ (أَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ فَاَلَيْ تَتَوَفَّكُونَ) [1]

دوسری آیت میں توحید ربوبیت (خدا کی وحدانیت) نیز توحید عباس کے اثبات کیلئے چار چیزوں پر زور دیا گیا ہے، یعنی انسانی تخلیق

[1] ”تو تم کون“، ”آفک“ (بروزن صفت) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا اصلی حالت سے وگرگوں ہونا۔ اس لئے جھوٹ، تہمت اور حق سے باطل کی طرف

انحراف کو بھی ”آفک“ کہتے ہیں۔ اسی طرح ان ہواؤں کو ”موتفکة“ کہتے جو اپنے مقررہ راستوں سے ہٹ کر چلتی ہیں۔ (ملاحظہ ہو مفردات راغب)

، اسے روزی عطا کرنے، موت اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے جیسے مسائل ہیں۔ یہ تمام امور خدا کی طرف انجام پاتے ہیں، کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا اپنا مخصوص اور پیچیدہ نظام ہے اور وہ علم و قدرت کے مبداء سے وجود میں آتا ہے۔ ارشاد فرماتا ہے:

”خداوند عالم وہی تو ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے، پھر روزی عطا کی، اس کے بعد تمہیں مارے گا اور جلانے گا۔“ (اللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ يُحْيِيكُمْ)

”کیا جن لوگوں کو تم خدا کا شریک قرار دیتے ہو ان میں سے کوئی بھی اس طرح کے کاموں کی قدرت رکھتے ہیں۔“ (هَلْ مِنْ شَرِكٍ كَأَنَّكُمْ مَنْ يَفْعَلُ مِنْ ذَٰلِكُمْ مِنْ شَيْءٍ)

اسی لئے تمہیں اس بات کا اقرار کرنا چاہیے کہ ”وہ اس بات سے پاک و پاکیزہ اور برتر ہے کہ تم اس کا شریک قرار دو۔“ (سُبْحٰنَہٗ وَتَعَالٰی عَمَّا يُشْرِكُوْنَ)

جب ہم یہ جان لیں گے کہ ہماری پیدائش، روزی، موت اور حیات غرض سب کچھ اسی کے پاس ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس کے علاوہ کسی اور کی عبادت کریں اور اس کے غیر کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ پیدائش اور تخلیق کا مسئلہ رزق، موت اور حیات کو شامل ہے کیونکہ ہر قسم کے رزق کی بازگشت خدائی تخلیق کی طرف ہی ہے۔ اسی طرح حیات بھی خداوند عالم کی خلقت اور روزی کی طرف لوٹ جاتی ہے، جب کہ موت، زندگی کے واپس لے لئے جانے کا نام۔ بنا بریں ان تین چیزوں پر ہی اکتفا کرنا اس لئے کافی ہے کہ یہ تخلیق کے علاوہ کوئی اور چیز ہے، بلکہ اس کلی موضوع کے اہم مصداق ہیں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنا، اگرچہ مشرکین عرب کے نزدیک قابل قبول نظر یہ نہیں تھا، لیکن یہ آیت اس استدلال کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔ پہلی تخلیق اور اوائل کار میں حیات کی نعمت بروز قیامت اس کے تکرار کی روشن دلیل ہے۔ بلکہ اگر ہم اچھی طرح غور و فکر سے کام لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ موت و حیات کا مسئلہ تو اسی دنیا میں بھی مستقل طور پر جاری و ساری ہے۔ ہر سال اور ہر مہینے میں بلکہ ہر روز ہر گھڑی انسانی وجود موت اور حیات کا تختہ مشق بنا ہوا ہے۔ ہزار ہا خلیے مر رہے ہیں تو ہزار ہا پیدا ہو کر ان کے جانشین بن رہے ہیں اور معاد کا مسئلہ دائمی صورت میں اسی دنیا میں موجود ہے۔ پھر اگر یہ کہہ دیا جائے کہ آخرت میں تمام مردے نئی زندگی کی طرف آئیں گے تو اس میں تعجب کیسا؟

تیسری آیت میں جو کہ توحیدی آیات کی لڑی میں واضح ہوئی ہے اور آسمان و زمین میں توحید کی نشانیوں کا پتہ بتا رہی ہے، ایک بار پھر تین چیزوں کو تاکید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، تخلیق کا آغاز، اس کی بازگشت اور آسمان و زمین سے انسان کو روزی کی قرآنی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ”کیا تمہارے معبود بہتر ہیں یا وہ جس نے تخلیق کا آغاز کیا اور پھر اسے پلٹا دے گا؟“ (أَمْ مَنْ يَبْدُو ۗا الْخَلْقِ ثُمَّ يُعِيدُہٗ) [۱]

اور وہ

[۱] اس جملے کا ایک محذوف ہے کہ جو سابقہ (اسی سورت کی ۵۹ ویں آیت) کے قرینہ سے واضح ہوتا ہے اور تقدیری طور پر یوں ہے ”من یبدو الخلق ثم یعیدہ۔۔۔۔۔ خیرام

ما یشرکون“ (کیا جس خدا نے آفرینش کا آغاز کیا ہے۔۔۔۔۔ بہتر ہے ان کے معبود؟)

جو اس آغاز اور اس کے بازگشت کے درمیانی وقفہ میں آسمان اور زمین سے تمہیں روزی عطا کرتا ہے۔“ (وَمَنْ يَزُوقْكُمْ مِنْ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ) آخر میں فرماتا ہے ”پھر بھی خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟“ (إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ) ”آپ کہہ دیں کہ میں نے تو خدا کی الوہیت کی دلیل پیش کر دی ہے۔ اگر تم سچ کہتے ہو تو اپنی دلیل لے آؤ“ (قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ) بالفاظ دیگر ”یہ وہ برکتیں ہیں جن کا براہ راست تعلق خداوند عالم کی پاک ذات سے ہے۔ لیکن ہر خوبی سے عاری بتوں سے کسی خیر اور برکت کی امید نہیں رکھی جاسکتی، ان کا لائق عبادت ہونا تو دور کی بات ہے۔“

اس آیت میں ”خیر“ (بہتر) کی تعبیر جو کہ اس میں محذوف ہے اور سابقہ آیات کے قرینہ کی رو سے معلوم ہوتی ہے، اس لئے نہیں ہے کہ بتوں میں کسی قسم کا فائدہ اور خیر و خوبی پائی جاتی ہے جو خدا کے مقابلے میں کم ہے۔ بلکہ یہ تعبیر اس جگہ پر بھی استعمال ہوتی ہے جہاں پر کسی قسم کی خیر و خوبی کا سر و کار نہیں ہوتا، مثلاً کہا جاتا ہے کہ فلاں غذا سے پرہیز کرو تا کہ صحیح سالم رہو، کیا تندرستی بیماری سے بہتر نہیں ہے؟“ ظاہری بات ہے کہ بیماری کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے جس سے تندرستی بہتر ہو۔ قرآن مجید میں بھی ہے ”وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ“ (مومن بندہ، مشرک اور بت پرست سے بہتر ہے۔ بقرہ/۲۲۱)

ایک اور جگہ فرماتا ہے ”قُلْ أَذْكَاءٌ خَيْرٌ أَمْ جَنْثَةٌ الْخُلْدِ“ (کہہ دو کہ آیا دوزخ کے دردناک غذا بہتر ہیں یا جاودانی بہشت؟) (فرقان/۱۵)

خلاصہ کلام لفظ ”خیر“، اگرچہ ”فعل التفضیل“ کا صیغہ ہے اور اس کو دو چیزوں کے بارے میں استعمال ہونا چاہیے جن میں سے ایک خوب ہوتی ہے اور دوسری خوب تر، لیکن بہت سے مقامات پر مقصد یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کو غور و فکر میں ڈال دیا جائے اور اسے باور کرایا جائے کہ اس نے جس چیز کا انتخاب کیا ہے اس میں کسی قسم کی اچھائی اور خوبی نہیں ہے۔

معاد کے مسئلہ پر زیادہ تاکید جب کہ مشرکین اس پر ایمان نہیں رکھتے تھے، اس لئے ہے کہ پہلی تخلیق، معاد کی دلیل ہے۔ چوتھی آیت میں یہی بات ایک اور طریقے سے بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ”اگر خداوند عالم اپنا رزق تم سے روک لے تو پھر کون ہے جو تمہیں روزی دے؟“ (أَمَّنْ هَذَا الَّذِي يَزُوقْكُمْ إِنْ أَمْسَكَ رِزْقَهُ) [۱]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر خدا کے حکم سے ایک سال آسمان سے بارش نہ برسے تو زمین سے کسی قسم کی نباتات نہ اُگنے پائے گی، خشک اور قحط سالی ہر جگہ کو اپنی لمبیٹ میں لے لے گی۔ کیا یہ بت یا کوئی اور چیز اس بات پر قادر ہوگی کہ تمہیں روزی بہم پہنچائے؟ یا اگر آسمانی روحانی، یا معنوی رومی منقطع ہو جائے تو تمہیں کون ہدایت کر سکتا ہے؟ ظاہری بات ہے کہ ان تمام سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔ پھر بت پرست اس بیہودہ عقیدہ پر کیوں اڑے ہوئے ہیں؟ کیا یہاں ہٹ دھرمی، ضد اور تعصیب کے علاوہ کوئی اور عامل ہے؟ اس لئے تو آیت

[۱] اگرچہ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ آیت میں محذوف موجود ہے لیکن بظاہر موجود نہیں ہے اور اس کے معنی یوں ہیں۔ ”ان امسک الله رزقه من هذا الذي يوزقكم“ اور یہاں پر ”ام“، ”بل“ کے معنی میں ہوگا۔ (غور کیجئے گا)

کے آخر میں فرماتا ہے ”بلکہ وہ توسرکشی اور حقیقت سے فرار پراڑے ہوئے ہیں۔“ (بَلْ لَّجُّوْا فِي عُتُوٍّ وَنُفُوْرٍ) [۱] پانچویں آیت میں رزق کے مسئلے کے بارے میں ایک اور نکتے کی وضاحت کی گئی ہے اور یہ بات ذہن نشین کرائی جا رہی ہے کہ رزق کی کشادگی یا تنگی خدا کی منشاء کے مطابق ہوتی ہے۔ فرمایا ہے ”کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ خداوند عالم جس کے لئے چاہے روزی کو کشادہ کر دیتا ہے اور جس کیلئے چاہے تنگ کر دیتا ہے۔“ (اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ) یہ ٹھیک ہے کہ انسان کی کوشش و تلاش، لیاقت اور شائستگی بھی رزق و روزی کے حصول میں بڑی حد تک موثر ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ یہ دنیا عالم اسباب ہے اور جو لوگ اس کی تلاش میں لگے رہتے ہیں انہیں اس کا کافی حد تک حصہ ملتا ہے جب کہ سست اور کابل افراد اس سے کمتر حصہ پاتے ہیں لیکن پھر بھی اس سلسلے میں مستثنیات زیادہ ہیں، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اپانچ اور بے دست و پا افراد کو بڑی حد تک روزی ملتی ہے جب کہ روزی کی لگن میں افراد کو بڑی حد تک ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اور عرب کے مشہور شاعر کے بقول:

کم عاقل عاقل اعیبت مذاہبہ  
وجاہل جاہل تلقاہ مرزوقاً

کتنے عقلمند اور زیرک انسان ایسے ہیں جن پر زوری کی رائیں مسدود ہیں جب کہ بہت سے بے عقل اور نالائق افراد مختلف قسم کی روزی سے بہرہ مند ہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ انسان صرف عالم اسباب ہی میں کھو کر نہ رہ جائے اور اسے معلوم جانا چاہیے کہ اس کے پیچھے دست قدرت بھی کار فرما ہے جو تمام طاقتوں سے بالاتر ہے۔ نیز صاحبان ثروت اور تمام وسائل سے بہرہ مند ہونے والے لوگ بھی مغرور نہ ہوں اور سرکشی اور غرور کی رائیں نہ اپنائیں، اسی طرح تنگ دست افراد مایوس اور ناامید نہ ہوں، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کسی بھی وقت خدا کے ارادے اور مشیت سے حالات پلٹا کھالیں۔

بالفاظ دیگر ہر انسان کو رزق اور روزی فراہم کرنے کیلئے بیسیوں اسباب باہم جمع ہوں تاکہ انہیں روزی میسر ہو جن میں سے ایک انسان کی اپنی سعی و کوشش بھی ہے۔ بلکہ سعی و کوشش پر اس کی قدرت بھی اور اس کا موجب بھی خدا ہے۔ اس مقام پر انسان روزی کی تنگی یا وسعت کا مسئلہ خدا کی ذات کی طرف لے جاسکتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید اس آیت کے آخر میں فرماتا ہے: ”اس میں ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو ایمان رکھتے ہیں۔“ (اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ)

وہی جو اپنے ایمان کی وجہ سے حق کے قبول کرنے کی آمادگی رکھتے ہیں اور ان آیات کو دیکھ کر روز بروز خدا سے زیادہ آشنا ہوتے جاتے ہیں۔ درحقیقت مندرجہ بالا آیت جس کا مضمون اور مواد قرآن کی دس آیات میں دہرایا گیا ہے اس بات سے ملتی جلتی ہے جو حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے فرمائی ہے کہ: ”عَرَفْتُ اللّٰهَ سُبْحٰنَهُ، بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ وَحَلِّ الْعُقُوْدِ وَنَقْضِ

[۱] ”لجوا“، ”لجأت“ کے مادہ سے ہے اور ”عتو“ کا معنی سرکشی ہے اور ”نفور“ کا معنی کسی چیز سے دوری اور فرار ہے۔

الْهِمَّةُ“ میں نے اللہ سبحانہ کو ارادوں کو ٹوٹنے، گرہوں کے کھلنے اور ہمتوں کے ناکارہ ہوجانے کی وجہ سے پہچانا۔<sup>[۱]</sup>  
اس بات سے بھی ملتی جلتی ہے جسے بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ ایک عالم سے پوچھا گیا کہ خداوندِ وحدہ لا شریک لہ کے وجود کی کیا دلیل؟ اس نے فرمایا:

”تین دلیلیں ہیں، یعنی (۱) بہت سے عقلاء کی ذلت و رسوائی۔ (۲) لائق اور شائستہ افراد کی غربت و تنگدستی اور۔ (۳) حکیموں کی بیماری۔ یعنی ”ذُلُّ اللَّيْبِ وَفَقْرُ الْأَدْيِبِ وَسَقَمُ الطَّيِّبِ“<sup>[۲]</sup>  
”اَوَلَمْ يَرَوْا“ (آیا انہوں نے نہیں دیکھا) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر انسان لوگوں کی زندگی کے بارے میں تھوڑا سا غور و فکر کرے تو اس طرح کے نشیب و فراز کا بخوبی مشاہدہ کر سکتا ہے۔ اس نکتے کو بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ خدا کی مشیت اور اس کے ارادے سے روزی کی تنگی یا وسعت یا تعلق ایسی مشیت کے معنی میں ہے جس میں اس کی حکمت کا فرما ہوتی ہے، ورنہ نہ تو یہاں اور نہ ہی کسی اور موقع پر غرض کہیں بھی اس کی مشیت، حکمت اور حساب سے خالی نہیں ہوتی ہے۔

ضمنی طور پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ اس آیت میں (اور دوسری دس آیات میں) روزی کی تنگی کا مطلب روزی سے مطلقاً محرومی نہیں ہے، تاکہ سورہ ہود کی چھٹی آیت وغیرہ کے اس کا تضاد اور منافات نہ ہو، جس میں فرماتا ہے ”وَمَا مِنْ ذَاتَةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا“ (زمین پر ہر چلنے والے کی روزی کا ذمہ خدا پر ہے)، بلکہ یہاں پر روزی کے وجود کے ساتھ ہی اس میں محدودیت اور قلت مراد ہے۔  
چھٹی آیت میں پہلے تو اس نکتے پر تاکید کرتا ہے کہ خداوندِ عالم کو بندوں کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ انہیں اپنی بندگی اور اطاعت دیتا ہے تو اس لئے نہیں کہ اسے ان کی عبادت و اطاعت کی ضرورت ہے (سورہ ذاریات/ ۵۶-۵۷) فرماتا ہے کہ صرف خداوندِ عالم ہی روزی عطا کرنے والا اور صاحبِ قوت و قدرت ہے، (إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ)

”رِزَّاق“ مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت زیادہ روزی دینے والا، اور یہ صرف خداوندِ عالم کی ذات پاک پر ہی صادق آتا ہے جو اس وسیع کائنات کے ہر گوشے اور کنارے میں، پہاڑوں کی بلند و بالا چوٹیوں پر، پتھروں کے دلوں کے اندر، پہاڑ کے دڑوں اور تاریک غاروں میں، سمندروں کی گہرائیوں میں، غرضیکہ کائنات کے ایک ایک گوشے میں ہر زندہ موجود کو روزی بہم پہنچاتا ہے اور وہ اس کے فیض عام سے بہرہ مند ہو رہے ہیں۔ چونکہ اس قسم کی عطا اور بخشش اور بے حد و حساب احسان و فضل کیلئے بے انتہا قدرت اور مکمل قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے اس وصف کو بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے کہ وہ ”ذُو الْقُوَّةِ“ (قدرت) اور ”الْمَتِينُ“ (بہت بڑی طاقت) کا مالک ہے۔

”متین“، ”متن“ کے مادہ سے ہے جس کا معنی وہ دو طاقت ور پٹھے ہیں جو پیٹھ کے مہروں کے دونوں طرف واقع ہیں اور انسان کی

[۱] منج البلاغ کلمات قصار جلد ۲ ص ۲۵۰

[۲] تفسیر روح البیان جلد ۷ ص ۳۹

پشت کو بھاری کاموں کے انجام دینے کیلئے محکم کرتے ہیں۔ یہاں پر حد سے زیادہ قدرت اور طاقت سے کنا یہ ہے۔ یہ جملہ درحقیقت روزی عطا کرنے کے طریقوں میں اس کی پاک ذات کی توصیف بیان کر رہا ہے، کیونکہ یہ صفت صرف اسی ہی کی پاک ذات کے ساتھ خاص ہے۔ دوسروں کے پاس جو کچھ بھی ہے اسی سے لیا ہوا ہے۔ اگر بعض لوگوں یا طبعی اسباب کو ”روزی رسان“ کی صفت سے موصوف کیا جاتا ہے تو درحقیقت و فیض کے انتقال میں واسطہ کے معنی میں ہوتے ہیں نہ کہ خود فیاض اور نعمت آفرین۔

ساتویں آیت میں ایک اور نکتے کو بیان کیا گیا ہے وہ ہے خدا کی رزق کی ہر چلنے پھرنے والے تک رسائی، اور یہ وہ کام ہے جو کائنات کی تمام چیزوں کو مکمل طور پر جانے بغیر قطعاً ناممکن ہے۔ میزان پہلے ہی سے مہمانوں کی تعداد، ان کی ضرورت کی مقدار اور ان سے برتاؤ کے طریقوں کا علم رکھتا ہو، تاکہ مناسب طور پر ان کی خاطر تواضع کر سکے۔ اسی لئے اس آیت میں فرماتا ہے ”روئے زمین پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں ہے جس کا رزق اور روزی خدا کے ذمہ نہ ہو۔“ (وَمَا مِنْ دَابَّةٍ اَلَا رِزْقُهَا عَلَى اللّٰهِ رُزْقًا حَسْبًا)

اس تعبیر سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ اس نے تمام بندوں کی روزی اپنے ذمہ لی ہوئی ہے تاکہ اس طرح ایک تو کچھ لوگوں کے حرص اور لالچ کا سدباب کیا جاسکے اور دوسرے کچھ لوگوں کا بعض دوسرے افراد پر ظلم و ستم، ان کے حقوق کا غصب، ذخیرہ اندوزی، مصنوعی قلت کی ایجاد یا کم از کم خدا کے اس وسیع دسترخوان سے استفادہ کرنے کیلئے تلاش و کوشش کا ترک کر دینا۔ غرض یہ ایسے عوامل اور اسباب ہیں جو تا تو اکیلے اور فی نفسہ یا دوسرے اسباب کے ساتھ ملکر کچھ لوگوں کی ان کی رزق و روزی سے محروم ہوجانے کا موجب بن جاتے ہیں، وگرنہ خدا نے تو ہر چلنے والے کی روزی اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ چونکہ انہیں روزی کا پہنچانا، ان کے ٹھکانوں اور ان خصوصیات کو مکمل طور پر جانے بغیر ممکن نہیں ہے لہذا فرماتا ہے ”وہ ان ٹھکانوں اور آنے جانے کی جگہوں کو اچھی طرح جانتا ہے“ (وَيَعْلَمُ مَسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا)

”یہ سب کچھ ایک واضح اور آشکارا کتاب (لوح محفوظ، لوح علم پروردگار) میں درج ہے“ (كُلُّ شَيْءٍ كِتَابٍ مُّبِينٍ)

”دَابَّة“، ”دبیب“ کے مادہ سے ہے جس کے معنی آہستہ آہستہ چلنا ہیں۔ یہ لفظ (دابہ) چلنے والوں، جانوروں اور حشرات الارض پر بولا جاتا ہے۔ ہر چند کہ بعض تعبیرات میں خاص طور پر گھوڑے کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے، لیکن مسلم ہے کہ یہاں پر اس کے وسیع معنی مراد ہیں جو تمام چلنے والوں کو شامل ہے۔<sup>[۱]</sup>

”مستقر“ کے لفظ کا معنی رہائش گاہ اور مستقل ٹھکانہ ہے۔ یہ دراصل ”قر“ (بروزن حُر) کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی سخت سردی ہیں جس سے انسان گھر میں دبا کر بیٹھ جاتا ہے۔

”مستودع“ کا معنی ”غیر مستقل ٹھکانہ ہے“ جو ”ودیعة“ کے مادہ سے لیا گیا ہے، جس کے اصل معنی کسی چیز کا ترک کرنا اور اسے چھوڑ دینا ہیں، اسی لئے ناپائیدار امور کو ”مستودع“ کہا جاتا ہے۔

یہ تعبیرات اس بات کی طرف اشارہ ہیں کہ تم یہ نہ سمجھو کہ خداوند عالم مخلوقات کی روزی صرف ان کے گھروں میں ہی انہیں بہم

پہنچاتا ہے بلکہ وہ جہاں بھی ہوں اور زمین و آسمان کے جس کسی کو نے میں بھی رہتے ہوں، خدا ان کی ہر ہر جگہ کو جانتا ہے، انہیں دیکھتا ہے اور ان کی روزی وہیں پران کے حوالے کرتا ہے۔ چنانچہ اسی آیت کے ذیل میں بعض مفسرین نے ایک روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی (اور وہ بیابان اور طور وادی میں اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ تھے) جس میں انہیں حکم ملا کہ وہ فرعون کے پاس جائیں، لیکن اس وقت ان کی توجہ اپنے بیوی بچوں کی طرف تھی کہ ان کا کیا حال ہوگا؟ خداوند عالم نے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنا عصا چٹان پر ماریں۔ چنانچہ چٹان شگافتہ ہوئی جس سے ایک اور چٹان ظاہر ہوئی۔ انہوں نے اس پر پھر عصا مارا تو وہ بھی شگافتہ ہو گئی۔ اس کے اندر سے تیسری چٹان نکلی جس پر انہوں نے عصا مارا تو دیکھا کہ اس کے اندر چھوٹی کے برابر ایک کیڑا ہے جس کے منہ عذائے جیسی چیز ہے جسے وہ کھا رہا ہے۔ اس وقت خداوند عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کانوں سے پردے اٹھا دیئے تو انہوں نے سنا کہ کیڑا یوں کہہ رہا ہے:

”سُبْحَانَ مَنْ يَرَانِي، وَيَسْمَعُ كَلَامِي، وَيَعْرِفُ مَكَانِي، وَيَدْرُكُنِي وَلَا يَنْسَانِي“ پاک ہے وہ ذات جو مجھے دیکھ رہی ہے،

میرا کلام سن رہی ہے، میری رہائش کی جگہ کو جانتی ہے، مجھے یاد رکھتی ہے اور مجھے فراموش نہیں کرتی۔ [۱]

نیز ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی ایک تلوار تھی جس پر یہ چار جملے لکھے ہوئے تھے: ”الْزُّقُ مَقْسُومٌ وَالْحَرْيُضُ مَحْرُومٌ، وَالْبَيْخِيلُ مَذْمُومٌ، وَالْحَاسِدُ مَعْمُومٌ“ رزق تقسیم شدہ ہے، لالچی شخص محروم ہے، بخیل قابل مذمت ہے اور حاسد مغموم ہے۔ [۲]

اس گفتگو کو ہم شعرائے عرب میں سے ایک شاعر کے دو اشعار پر ختم کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں۔

كيف اخاف الفقر والله رازق  
ورازق لهذا الخلق في العسر واليسر  
تكفل بالارزاق للخلق كلهم  
وللضب في البيداء وللحوت في البحر

میں فقرہ تنگدستی سے کیوں ڈروں جب کہ خدا میرا بھی روزی دینے والا ہے اور دوسری تمام مخلوقات کا بھی روزی دینے والا ہے، سختی میں بھی اور آسانی میں بھی۔ وہ تمام مخلوق کی روزی اپنے ذمہ لئے ہوئے ہے، حتیٰ کہ سوسمار کو خشک صحرا میں اور مچھلی کی سمندر و دریا میں روزی دیتا ہے [۳]

آٹھویں آیت میں گویا مشرکین کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر کے ان کے عقیدہ کے باطل ہونے کو کائنات کی ہر چیز کو روزی

[۱] تفسیر فخر رازی جلد ۱ ص ۱۸۶، تفسیر روح البیان جلد ۴ ص ۹۷، تفسیر روح المعانی جلد ۱۲ ص ۲

[۲] تفسیر روح المعانی جلد ۴ ص ۹۷

[۳] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۵۱۸ مادہ ”رزق“

پہنچانے کے ذریعہ روشن اور واضح کرتا ہے اور توحید ربوبیت کو آشکارا کرتے ہوئے فرماتا ہے، ”ان سے پوچھو کہ تمہیں آسمانوں اور زمین سے کون روزی عطا کرتا ہے؟“ (قُلْ مَنْ يَزِيْرُ زُقُكُم مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ)

سورج کی روشنی سے، بارش کے زندگی بخش قطروں سے، اس زندگی آفرین ہوا سے اور اسی طرح مختلف غذائی مواد سے جو تارک مٹی کے دل میں چھپے ہوتے ہیں اور میوؤں، نملوں اور انواع و اقسام کی سبزیوں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ پھر ان کے کسی قسم کے جواب کا انتظار کئے بغیر خود ہی جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے ”کہہ دو کہ خدا ہے جو ہمیں یہ سب روزیاں عطا کرتا ہے“ (قُلِ اللّٰهُ)

”بنابریں ہم یا تم میں سے ایک ہدایت پر اور دوسرا واضح گمراہی پر ہے۔“ (وَ اِنَّا اَوٰیَا كُمْ لَعَلٰی هُدٰی اَوْ فِی ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ) کیونکہ دو متضاد عقیدے باہم اکٹھے نہیں ہو سکتے اور چونکہ تم بتوں کے برکات کا سرچشمہ ہونے پر کوئی دلیل نہیں رکھتے، لہذا معلوم ہوتا ہے کہ ہم حق پر ہیں اور تم کھلم کھلا گمراہی میں ہو۔ اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس مقام پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے جواب کے انتظار میں نہیں بیٹھتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ واقعاً ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا، سوائے شرمساری بھرے سکوت کے، اسی لئے اس قسم کے مقامات پر ایک فصیح مقرر کو از خود سلسلہ گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے جواب بھی خود دینا چاہیے۔

فنون فصاحت میں سے ایک فن یہ بھی ہے کہ بعض مقامات پر مد مقابل کے ساتھ سربستہ گفتگو کی جاتی ہے اور اس کا فیصلہ خود انہی پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ لہذا یہاں بھی فرماتا ہے ”کہہ دو ہم یا تم میں سے ایک ہدایت پر ہے اور دوسرا آشکار گمراہی پر۔“ یقینی بات ہے کہ یہاں پر گمراہ شخص بھی معین تھا اور ہدایت یافتہ بھی معین تھا۔ اور کس قدر بہتر بات ہے کہ ظاہری عبادت سربستہ راز رہے تاکہ ان کی ہٹ دھرمی کی حس بھی نہ پھڑکے اور نتیجہ نکالنا بھی انہی کے ذمہ رہے۔

تعب کی بات ہے کہ بعض مفسرین نے اس جملہ کو ”تقیہ“ پر محمول کیا ہے جب کہ یہاں پر تقیہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور بات ----- بڑی لطافت کے ساتھ ----- بیان کر دی گئی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ پہلے تو فرماتا ہے ”ہم“ اور پھر کہتا ہے ”تم“ اور اس کے بعد فرماتا ہے ”ہدایت“ پر یا ”گمراہی“ پر ہیں۔ یہ ترتیب بھی بات کو مزید واضح کر رہی ہے۔

نویں آیت میں پہلے تو آسمان سے بابرکت پانی نازل ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے پھر روزی کے تین عمومی فوائد پر تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے ”ہم نے آسمان سے بابرکت پانی نازل کیا اور اس کے ذریعہ باغات اور اناج اُگائے جو تم کاٹنے ہو۔“ (وَ تَزٰوْنَا مِن السَّمٰوٰتِ مَآءً مُّبٰرَکًا فَاَنْبَتْنَا بِهٖ جَبٰلًا وَّ حَبَّ الْحَصِیْدِ) اور بلند قامت کھجوروں کو بھی کہ جن کے میوے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ (وَ النخْلِ) باسقا تِلْہَا طَلْعٌ نَضِیْدٌ [۱]

”یہ سب کچھ بندوں کی روزی کیلئے ہے“ (رَزُّ قَالِ الْعِبَادِ)

[۱] ”حصید“ کا معنی کٹا ہوا (یا کٹنے کے قابل) ہے۔ ”باسقات“ م ”باسقۃ“ کی جمع ہے جس کا معنی بلند ہے۔ ”طلح“ کے معنی درخت خرما کا وہ پھل ہوتا ہے جو آغا ز پیدا نش میں ہوتا ہے۔ اور ”نضید“ کا معنی جڑا ہوا اور کثیر تعداد میں ہے جو خاص طور پر درخت خرما پر ہی قابل دید ہوتا ہے۔



درحقیقت اس آیت میں خاص طور پر میوہ جات اور غذائی اناجوں پر خاص طور پر تاکید کی گئی ہے جو انسانی غذا کا اہم ترین اور صحیح و سالم ترین حصہ ہیں، پھل میووں میں سے خرما پر زیادہ تاکید کی گئی ہے کیونکہ اس میں غذائی مواد سب سے زیادہ ہوتا ہے جس کے بارے میں ہم بڑی تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ رزق اوروزی کی ان تین قسموں پر زیادہ زور اس لئے دیا گیا ہے کہ ان میں کچھ خصوصیات پائی جاتی ہیں جو صرف انہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ کیونکہ بعض نباتات ایسی ہیں جو ہر سال پھل دیتی ہیں اور نئے سرے سے بیج ڈالنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے جیسے کئی پھلدار درخت ہیں اور کچھ ایسی ہیں جن کے لئے ہر سال بیج ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے، جیسے دانے دار غذائی نباتات (مثلاً گندم، ججو، چاول اور مکئی وغیرہ) اور کچھ ایسی ہیں جو ان دونوں کے درمیان درمیان ہیں، جیسے خرما کا درخت، جس کا اصل تو ثابت اور برقرار ہے لیکن ہر سال ”گردہ ڈالنے“ POLLINATION کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ نر کے سفوف یا گردے POLLEN کو لے کر مادہ کے ثمر پر چھڑک دیتے ہیں تاکہ وہ مکمل طور پر بارور ہو جائے، البتہ ایسا کئے بغیر بھی ان کا بارور ہونا ممکن ہے (ہواؤں اور حشرات کے ذریعے سے) لیکن صحیح معنوں میں بارور نہیں ہوں گی۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ”رِزْقًا لِّلْعِبَادِ“<sup>[۲]</sup> کی تعبیر اس حقیقت کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ غذائی نعمتوں کو اس کی بندگی اور عبادت کی راہوں میں کام میں لانا چاہیے۔ یہ تمام موجودات بطور کامل انسان کے آگے سر تسلیم خم کئے ہوئے اس کے تابع فرمان ہیں تاکہ وہ رزق حاصل کر کے غفلت کے ساتھ نہ کھائے۔ بقول شاعر۔

خوردن برای زیستن و ذکر کردن است  
تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

کھانا چینی اور خدا کو یاد کرنے کیلئے ہے۔ تو نے سمجھ رکھا ہے کہ جینا کھانے کیلئے ہے۔ اسی سلسلے کی دسویں اور آخری آیت میں ان مختلف غذاؤں پر زیادہ تاکید کی گئی ہے جنہیں خداوند متعال نے انسانوں اور جانوروں کے اختیار میں دے رکھا ہے اور انسان کو ان کے بارے میں مطالعہ کی دعوت دی ہے تاکہ ایک تو اس کی شکرگزاری کی حس کو اجاگر کیا جائے اور پھر اس کے ساتھ ہی منع حقیقی کی پہچان اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی معرفت کیلئے آمادہ کرے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ ”انسان کو چاہیے کہ اپنی غذا کی طرف دیکھے“ (فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَى طَعَامِهِ)

ذرا دیکھو تو سہی سورج، زمین، ہوا اور بارش جیسے مختلف عوامل ایک دوسرے سے مل کر رزق و روزی کی پیدائش کا سبب بنتے ہیں۔ یہ سب نعمتیں انسان کے اختیار میں آتی ہیں۔ اور یہ بھی دیکھے کہ کس طرح ”ہم نے آسمان سے زیادہ مقدار میں پانی نازل کیا ہے، پھر زمین کو شگافتہ کیا ہے اور اس سے کھانے کے اناج بڑی مقدار میں پیدا کئے ہیں؟“ (أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا)

[۱] تفسیر نمونہ جلد ۱۳ میں سورہ مریم کی ۲۵ آیت کا مطالعہ کریں

[۲] ”رِزْقًا“؛ ”مفعول لہ“ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور ”مفعول مطلق“ یا ”حال“ کا احتمال بہت بعید ہے۔

”اسی طرح انگور اور بڑی تعداد میں سبزیاں“ (وَعِنَبًا وَقَضْبًا) [۱]

اور زیتوں اور نخل اور درختوں بھرے باغات اور میوہ اور چراگاہ (وَزَيْتُونًا وَمُخَلَّاتًا وَخَدَائِقَ غَلْبًا وَفَاكِهَةً وَأَبًّا) [۲]  
 اگرچہ ”فاکھہ“ بمعنی ”میوہ“ ہے جو ہر قسم کے میوں کو شامل ہے اور ”خداائق“ کا معنی ”باغات“ ہے، جس میں ہر قسم کے باغات شامل ہیں۔ تاہم ”انگور“، ”زیتون“ اور ”خرما“ کا خصوصی ذکر اس لئے ہے کہ ان تین میوؤں کے بہت اہم خواص ہیں اور آج علم غذا شناسی نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

اگرچہ ”طعام“ عام طور پر جسمانی طعام کے معنی ہے، خاص کر اس آیت میں، کیونکہ اس کے بعد مادی غذا اور میوہ جات اور خوراک کی اناجوں کا ذکر آیا ہے، لیکن جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے طعام کے وسیع معنی ہو سکتے ہیں جو کہ معنوی طعام کو بھی شامل ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اچھی طرح نگاہ کرے کہ وہ جس علم و دانش کو حاصل کرنا چاہتا ہے کس سے حاصل کرے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس میں زہریلی تعلیمات نہ ہوں۔  
 اس آیت شریفہ کے بارے میں آخری بات یہ ہے کہ ”فلینظر“ (چاہیے کہ دیکھے) کا جملہ ہو سکتا ہے کہ مبداء اور معاد کے اسرار پر غور کرنے کو بھی شامل ہو اور خبیث و ناپاک سے پاک و پاکیزہ کو ناپاک سے پاک و پاکیزہ کو ناپاک سے پاک اور مضرا و نقصان دہ سے مفید اور فائدہ مند نوع کو انتخاب کرنے کو شامل ہو۔ ان آیات کی تشریح میں کچھ بتایا گیا ہے اس سے مجموعی طور پر بخوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ خداوند عالم کی خداداد مختلف روزیاں اس کی آیت اور اس کی عظمت کے آثار ہیں۔ ان کی ساخت میں استعمال ہونے والا محیر العقول نظم، ہر ایک پر حکم فرما خصوصیت، ہر ایک میں موجود حیاتیاتی مواد اور اسی طرح ان زرقوں کو ضرورت مندوں تک پہنچانا اور ان کی ضروریات کی تشخیص کرنا، غرض ان میں سے ہر ایک اس کی ذات پاک کی حکمت اور عظمت کی ایک ایک آیت اور نشانی ہے۔

## چند ضروری توضیحات

### ۱۔ رزق کی دنیا میں محیر العقول کارنامے

یہ حقیقت ہے کہ اگر ہم دنیا میں موجود چیزوں کے طبعی منابع سے روزی حاصل کرنے کے بارے میں قدرے غور و فکر سے کام لیں تو پروردگار عالم کی قدرت کے بڑے دلچسپ اور حیرت انگیز نکتے ہم پر روشن ہوں گے۔ سب سے پہلی بات جو دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ روئے زمین پر موجود غذائی مواد محدود ہونے کے باوجود ہزاروں، لاکھوں سال سے انسانوں اور جانوروں کے استفادہ کے باوجود کم نہیں ہوتا، آخر کیوں

[۱] ”قضب“ (بروزن جذب) جس کا معنی کاٹنا اور چننا ہے اور مفسرین نے اس کی تفسیر ان سبزیوں سے کی ہے جنہیں کئی بار چننا جاتا ہے۔

[۲] ”خداائق“، ”حدائق“ کی جمع ہے جس کا معنی وہ باغات ہیں، جس کے اطراف میں دیوار کھینچ کر اسے محصور کر دیا جائے۔ ”غلب“، ”اغلب“ کی جمع ہے جو ”غلبہ“ کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہٹا کٹنا اور موٹا تازہ ہیں، اور ”اب“ کا معنی خود روگھاس یا طبعی چراگا ہیں ہے یا وہ میوے ہیں جنہیں سکھایا یا محفوظ کیا جاسکتا ہے۔

؟ یہ بے دریغ جوان نعمت جو ہر جگہ پھیلا ہوا ہے، ختم ہونے میں نہیں آتا، آخر کس لئے؟

جب ہم اچھی طرح غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کا غذائی مواد اپنی ایک مخصوص صورت رکھتا ہے کہ اگر کروڑوں اربوں سال تک بھی اس سے استفادہ کیا جاتا رہے تو پھر بھی سوئی کی نوک کے برابر اس میں کمی واقع نہ ہو اور یہ سب کچھ اس کی ”دورانی گردش“ کی وجہ سے ہے۔ مثلاً پانی، سمندر سے بخارات میں تبدیل ہو کر بادل اور بارش کی صورت اختیار کر لیتا ہے اس کا ایک حصہ پھر سمندر میں چلا جاتا ہے، ایک حصہ انسانوں جانوروں اور نباتات کے بدن کا جز بن جاتا ہے اور وہ بخارات میں تبدیل ہو کر فضا میں منتشر ہو جاتا ہے۔ دورانی گردش کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ درخت زمین سے غذائی مواد کو حاصل کرتے ہیں جس سے ان کی شاخیں اور پتے پروان چڑھتے ہیں، پتے جھڑتے ہیں تو گل سڑ کر کھاد کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور پھر انہی درختوں کیلئے غذائی مواد کا کام دیتے ہیں۔ جانور غذائی مواد سے استفادہ کرتے ہیں اور پھر مٹی بن کر زمین کے غذائی مواد میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

انسان اور جانور سانس کے ذریعہ ”آکسیجن“ اپنے اندر لے جاتے ہیں اور ”کاربن ڈائی آکسائیڈ“ خارج کرتے ہیں جب کہ درخت اس کے برعکس عمل کرتے ہیں۔ وہ ”کاربن ڈائی آکسائیڈ“ استعمال اور ”آکسیجن“ خارج کرتے ہیں اور یہ باہمی تبادلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ ہمیں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا یہ بچھا یا ہوا دسترخوان ہمیشہ سے بچھا ہوا ہے اور آئندہ بھی بچھا رہے گا۔ تمام زندہ مخلوق اس خوانِ نعمت پر بیٹھی اپنا رزق کھا رہی ہے اور اس میں کسی قسم کی کمی وجود میں نہیں آتی۔ مختلف نباتات کی روزی کے حصول کا طریقہ کار بھی عجیب ہے بعض نباتات، غذائی مواد اور رطوبتیں زمین سے حاصل کرتی ہیں بعض پانی سے (جیسے تیرنے والی گھاس)، بعض ہوا سے اور بعض دوسری نباتات کے ساتھ وابستہ ہونے کی وجہ سے (جیسے آکاس نیل وغیرہ)

سمندر کی گہرائیوں میں رہنے والے جانور ایسی جگہ زندگی بسر کرتے ہیں جہاں گھاس وغیرہ کا نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ کیونکہ سورج کی شعاعیں زیادہ سے زیادہ چھ یا سات سو میٹر تک مکمل طور پر مٹ جاتی ہیں اور اس کے بعد مکمل پر سمندر کے پانی پر تاریک اور جاودانی رات کی حکمرانی ہوتی ہے، لیکن خداوند عالم ان کی روزی کا بھی بندوبست کرتا ہے، وہ اس طرح کی سطح سمندر پر وہ تیار ہوتی ہے اور سمندر کی گہرائیوں میں بھیج دی جاتی ہے جو نباتات بڑی تعداد میں موجود ہیں اور سورج کی روشنی کے مقابل پرورش پاتی ہیں، جب وہ قابل استفادہ ہو جاتی ہیں تو سطح سمندر میں موجود زندہ مخلوق کو ان کا حصہ دیتی ہیں اور باقی بوجھل ہو کر اس کی گہرائیوں میں از خود چلی جاتی ہی، اسی طرح سطح سمندر پر باقی رہ جانے والی زندہ مخلوق بھی آسانی فائدہ کی صورت میں سمندر کی گہرائیوں میں موجود زندہ مخلوق کی طرف بھیج دی جاتی ہے۔

کبھی ہوا کے پرندوں کو دریا کی مچھلیوں کے نصیب میں کر دیا جاتا ہے تو کبھی دریا کی مچھلیوں کو ہوا کے پرندوں کے نصیب میں کبھی نباتات کو حیوانات کی غذا قرار دیا جاتا ہے تو کبھی گوشت خور نباتات کیلئے جانوروں کو ان کی غذا بنایا جاتا ہے، کبھی ایک مخلوق کی بچی ہوئی اور اس کیلئے مشکل پیدا کر دینے والی غذا کو دوسری مخلوق کیلئے لذیذ غذا بنا دیتا ہے (مثال کے طور پر بعض سمندری مگر مچھ، مچھلیاں کھاتے ہیں۔ اس غذا سے ان کے دانتوں میں کچھ بچ رہتی ہے۔ پھر وہ ساحل پر آ جاتے ہیں اور اپنی غا ز منہ کھول دیتے ہیں۔ ساحلی پرندوں کا ایک دستہ ان کے منہ کے اندر چلا جاتا ہے اور وہ ان کے دانتوں میں بچے کچھے گوشت کو کھانا شروع کر دیتے ہیں جو ان کی لذیذ غذا ہوتا ہے۔ اس طرح وہ ان کیلئے

مسواک کا کام دیتے ہیں اور وہ بھی ان کے اس تعاون کی قدر کرتے ہیں جب تک آخری پرندہ ان کے منہ سے باہر نہیں آجاتا اپنا منہ بند نہیں کرتے۔ جب تمام کام مکمل ہو جاتا ہے اور مشکل پیدا کرنے والی غذا مکمل طور پر ختم ہو جاتی ہے۔ جب پرندے بھی اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں تو وہ جانور اپنا منہ بند کر کے دوبارہ پانی کے اندر چلا جاتا ہے۔<sup>[1]</sup>

قصہ مختصر یہ کہ ہم جس قدر اس مسئلہ کی گہرائی میں جائیں خالق کائنات کے علم و حکمت اور رزق رسانی کی تدبیر کے سلسلے میں اسی قدر تازہ ترین نکات ہمیں حاصل ہوں گے، اور وہ بھی اس طرح کہ ”چانک“ ہر قسم کے احتمال کی نفی کریں گے۔ ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ہم انسان کے تین ادوار کے بارے میں دور جنین (دور رضاعت یا دودھ پینے کا دورانیہ اور غذا کھانے کا دورانیہ) غور و فکر کریں کہ کس طرح خداوند عالم اس کے حال کے مطابق ان تین حساس مراحل میں بغیر کسی کمی و پیشی کے اسے غذا بہم پہنچاتا ہے۔ جب وہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو PLACENTA بند ناف اور ماں کے خون سے مستقیم پیوند کے پیچیدہ سسٹم کے ذریعہ، اور پیدا ہو جانے کے بعد جب نہ تو غذا چبانے کیلئے اس کے دانت ہوتے ہیں اور نہ ہی غذا کے ہضم کرنے کیلئے مضبوط معدہ آنتیں تو اس وقت ماں کے دودھ بھرے پستان اس کے اختیار میں دے دیتا ہے، جو تمام حیاتیاتی مواد سے بھر پور ہوتے ہیں، نہ سرد ہوتے ہیں نہ گرم، نہ زیادہ میٹھے نہ کھاری، نہ جنہیں چبانے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی معدے کو ہضم کرنے کیلئے زیادہ فعالیت کی ضرورت۔

تیسرے مرحلہ پر ”خوشگوار“ غذا اس کے اختیار میں دے دیتا ہے۔ درحقیقت اگر انسان اور دوسرے جانوروں کیلئے ”خوشگوار“ غذا کا بندوبست نہ ہوتا اور کڑوی دوا کی مانند اسے استعمال کیا جاتا تو انسانی زندگی میں کتنی مشکل درپیش ہوتی، اور کیا اکثر لوگ صحیح غذا نہ ملنے کی وجہ سے نیست و نابود نہ ہو جاتے؟ پھر یہ کہ انسان کے اندر بھوک اور پیاس کا احساس پیدا کر دیتا کہ خود کا صورت میں جب بھی اسے ان دو حیاتیاتی مواد کی ضرورت درپیش آئے تو ان کی طرف متوجہ ہو جائے۔ ذرا سوچتے تو سہی کہ اگر یہ احساس اس کے اندر نہ ہوتا تو کیا صورت حال ہوتی؟ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام مشہور حدیث توحید مفصل میں فرماتے ہیں:

”اے مفصل! ان کاموں میں اچھی طرح غور کرو جو خدا نے انسان کے اندر قرار دیئے ہیں؟ مثلاً کھانا کھانا، سونا، جنسی ملاپ اور جو تدبیر ان میں کار فرما ہے۔ خداوند عالم نے ان میں سے ہر ایک کیلئے انسانی طبع میں محرک اور عامل قرار دیئے ہیں تاکہ وہ اس کی طرف حرکت کرے۔ بھوک، انسان کو کھانے کی طرف بھیجتی ہے، جس میں جسم کی حیات اور استوار ہے۔ تھکاوٹ نیند کا تقاضا کرتی ہے جس میں جسم کی راحت اور تروتازگی ہے۔ اور شہوت جنسی اسے جنسی ملاپ کی دعوت دیتی ہے جس میں نوع انسانی کی بقاء ہے۔ اگر انسان میں ایسے عوامل اور محرکات نہ ہوتے اور وہ سوچ و بچار کے ذریعہ ہی اپنی ساری ضرورتیں پوری کرتا رہتا تو ان امور کو تا ہی برتنے کی وجہ سے تھوڑے عرصے ہی کے اندر ہلاک ہو جاتا۔ لیکن خداوند بزرگ و برتر نے ان اہم ترین ضرورتوں کے پورا کرنے کیلئے انسانی طبع میں کچھ محرک پیدا کئے ہیں جو اسے ان کی طرف

[1] فخر رازی اپنی تفسیر میں اس موضوع کی طرف مختصر سا اشارہ کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ اس قسم کے پرندوں کے سر پر ”کانخ“ کی مانند کوئی چیز ہوتی ہے۔ لہذا اگر کسی

وقت کوئی گر چھان پرندوں کو نگلنے کا ارادہ کرتا بھی ہے تو وہ کانخا سے ایسا نہیں کرنے دیتا۔ (تفسیر فخر رازی جلد ۲۴ ص ۱۱)

لے جاتے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

یہی وجہ ہے کہ تندرست انسان کیلئے کس قسم کی رغبت، خاص کر اس کی غذا کی طرف، بدن کی ضرورت کی دلیل ہے، نیز اسی وجہ سے اس قسم کے لوگ ایسی اندرونی رغبت کا مثبت جواب دیتے ہیں مشہور روسی دانشور ”پالوف“ کہتے ہیں:

”طبعی اور مفید غذا وہ ہوتی ہے جو لذت اور بھوک کے ساتھ کھائی جائے۔“ اسی لئے ان غذاؤں کے مقابلے میں جن کی انسان کو خواہش ہوتی ہے، کسی خاص قسم کے چارت کے مطابق غذا کا استعمال ایک تندرست اور صحیح سالم انسان کیلئے بے معنی سی بات ہے کیونکہ انسان کا غذاؤں کی طرف رغبت کرنا ہی بدن کی ضرورت کی ایک بہترین دلیل ہے۔ آخر یہ کون سی تشکیلات ہیں جو اس قدر منظم اور حساب و کتاب کے تحت کام کر رہی ہیں۔ جو خود ہی اپنی ضروریات کی تعیین کر رہی ہیں، ادھر ذرا سی کمی محسوس ہوئی اور ادھر راز بھرے موصلاتی ذریعہ نے انسانی طبع کو بیدار کر دیا اور اس کیلئے اسے روانہ کر دیا۔ کیا اس قسم کے امور کو اتفاق“ کا شاخسانہ قرار دیا جاسکتا ہے؟ کیا عقل اور وسیع تدبیر کے بغیر ایسا منظم کام کرنا ممکن ہے؟

## ۲۔ کیا روزی تقسیم شدہ ہے؟

مندرجہ بالا آیات میں سے بعض آیات میں یہ نکتہ آیا ہے کہ ہر چلنے والے کا رزق خدا پر موقوف ہے اور خدا ہی ان کی کفالت کرتا ہے، جیسے ارشاد ہوتا ہے۔ ”وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَ اللَّهِ رِزْقُهَا.....“ (ہود/۶) جب کہ بعض دوسری آیات میں آیا ہے کہ رزق کی وسعت اور تنگی خدا کی منشاء کے مطابق ہوتی ہے، جیسے سورہ روم کی ۷۳ ویں آیت میں اور اس کے علاوہ دوسری بہت سی آیات ہیں۔

روایات میں بھی اسی چیز کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: ”وقدر الارزاق فكثرها وقللها وقسمها على الضيق واسعة“ خداوند عالم نے روزیوں کو مقدر کر دیا ہے، زیادہ اور کم بنایا ہے اور معیشت کو تنگی اور وسعت کی بنیادوں پر تقسیم کیا ہے۔<sup>[۲]</sup> اور آپ ہی تحصیل علم کا شوق دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

”ان طلب العلم اوجب عليكم من طلب المال، انَّ الْمَالِ مَقْسُومٌ مَضْمُونٌ لَكُمْ قَدْ قَسَمَهُ عَادِلٌ بَيْنَكُمْ وَضَمَنَهُ وَسِيفِي لَكُمْ، وَالْعِلْمُ مَخْزُونٌ عِنْدَ أَهْلِهِ قَدْ امْرَأْتُمْ بِطَلْبِهِ“ تم پر علم کا طلب کرنا مال کے طلب کرنے سے زیادہ واجب ہے، کیونکہ رزق تقسیم شدہ ہے اور اس کی ضمانت دی جا چکی ہے اور وہ اس کو پورا کرے گا لیکن علم و دانش اہل علم کے پاس ہے اور تم کو اس کے طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔<sup>[۳]</sup>

[۱] بحار الانوار جلد ۳ ص ۸۷، ۸۸، توحید مفضل

[۲] نخب البلاغ، خطبہ ۹۱

[۳] معالم (الدین فی) الاصول ص ۹

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعاً ایسا ہے تو پھر روزی اور معاش کے حصول اور معاشرہ کی اقتصادی بہبود کیلئے منصوبہ بندی کے کیا معنی؟ لیکن باقی دوسری آیت اور روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ہم ان کو آپس میں ملا کر دیکھیں تو اس سوال کا جواب روشن ہو جائے گا کہ خداوند عالم کی طرف سے روزی اور رزق کی ضمانت، اس کی طرف سے روزی کی کفالت اور تقسیم سے مراد مسائل کا فراہم کرنا اور ان کے لئے راہ ہموار کرنا ہے۔ ان میں سے کچھ تو انسانی وجود سے باہر ہیں اور کچھ اس کے اندر جب یہ سب آپس میں مل جائیں تو انسان کو اپنی روزی کا حصہ مل جاتا ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھیے جیسے کسی ادارے کے ملازمین کی تنخواہیں اس ادارے کے سربراہ کے ذریعہ مقرر ہوتی ہیں، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ان کی یہ تنخواہیں ان کو گھر بیٹھے مل جائیں اور وہ کوئی کام نہ کریں۔ نہیں! بلکہ انہیں کام کرنا ہوگا۔ ذاتی طور پر حاضر ہو کر تنخواہ رجسٹر پر دستخط کرنا ہوں گے اور خود تنخواہ وصول کرنا ہوگی۔ یہ نکتہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ خداوند عالم بسا اوقات ایسے لوگوں کو روزی عطا کرتا ہے جو قطعاً محنت نہیں کرتے اور ایسے لوگوں کو محروم کر دیتا ہے جو سعی و کوشش میں لگے رہتے ہیں، تاکہ لوگ ”عالم اسباب“ میں گم ہو کر روزی کی صرف تلاش و کوشش میں ہی محدود نہ سمجھیں بلکہ یہ سمجھیں کہ اس سب کچھ کے پیچھے کوئی اور قدرت ہے جو اس نظام کو چلا رہی ہے۔ (لیکن یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ یہ چند استثنائی مثالیں ہوتی ہیں، اصل بنیاد جب کہ تلاش اور کوشش ہی ہے)

شاید اسی لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

”واعلموا ان الرزق رزقان تطلبونه و رزق یطلبکم ، فاطلبوا رزاقکم من حلال ، فانکم ان طلبتموها من وجوہها اکلتموها حلالاً وان طلبتموها من غیر وجوہها اکلتموها حراماً“ جان لو کہ رزق دو قسموں پر ہے، ایک رزق وہ ہے جس کے پیچھے تم جاتے ہو اور دوسرا وہ ہے جو تمہارے پیچھے آتا ہے۔ اسی لئے رزق کو حلال راہوں سے طلب کرو کیونکہ اگر تم حلال طریقوں سے طلب کرو گے تو حلال کر کے کھاؤ گے اور اگر غلط طریقوں سے طلب کرو گے تو اسے حرم کر کے کھاؤ گے۔ [۱]

رزق کی ان دو قسموں پر تقسیم درحقیقت ان آیات اور روایات کو جمع کرنے کی دلیل ہے جن میں روزی کی تقسیم اور ضمانت کی بات کی گئی ہے اور جس کے نقطہ مقابل میں روزی کا حصول جدوجہد اور سعی و تلاش کے ساتھ مشروط بتایا گیا ہے۔ [۲]

علاوہ ازیں رزق کی ان دو قسموں میں تقسیم سے آگاہی اس بات کا موجب ہوتی ہے کہ حریم اور لالچی لوگ حرص اور لالچ سے باز رہیں، مؤمنین زیادہ رزق کے حصول کیلئے اپنے آپ کو حرام کاموں سے آلودہ نہ کریں اور رزق سے محروم لوگ مایوسی و ناامیدی کا شکار نہ ہو جائیں۔

[۱] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ ص ۲۹

[۲] ان روایات سے مطلع ہونے کیلئے کتاب وسائل الشیعہ جلد ۱۲ کتاب التجارہ صفحات ۱۶، ۱۸، ۲۲، ۲۳، ۲۶ اور ۲۶ کا مطالعہ فرمائیں۔

### ۳۔۔۔۔۔ پھر یہ بھوکے کیوں ہیں؟

آیات بالا میں یہ حقیقت اچھی طرح بیان کی گئی ہے کہ خداوند عالم نے تمام زندہ مخلوق کی روزی اپنے ذمہ لے رکھی ہے اور وہ جہاں بھی ہوں روزی انہیں وہیں پرل کر رہتی ہے۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس دنیا میں تاریخی طور پر کچھ لوگ بھوک کی وجہ سے مر چکے ہیں اور مر رہے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ کہ ان کی روزی کی ذمہ داری نہیں لی گئی تھی؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کیلئے مندرجہ ذیل نکات کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

اولاً: روزی کی ضمانت اور ذمہ داری کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے غفلت مند اور باشعور افراد کیلئے فراہم کر دیا گیا ہے اور ان کے گھروں میں بھیج دیا جاتا ہے، یا لقمہ بنا کر ان کے منہ میں دیا جاتا ہے۔ نہیں بلکہ اس کیلئے راہیں ہموار ہوتی ہیں اور انسان کی تلاش اور کوشش اس کے حصول کی شرط ہے، حتیٰ کہ جناب حضرت مریم سلام اللہ علیہا جو ایک خاموش بیابان میں وضع حمل کی سخت تکلیف میں مبتلا تھیں اور خداوند عالم نے اس بیان میں موجود خرما کے ایک درخت پر تازہ کھجوروں کے پھل ظاہر کر دیئے، انہیں بھی تحریک کرنے کا حکم ملا اور اس جملہ سے انہیں خطاب ہوا "وَهُزِّيْ اِلَيْكَ بِجَنَّةِ النَّخْلَةِ..." (اے مریم! تم اس درخت خرما کو ہلاؤ تاکہ تم پر تازہ کھجوریں گریں۔)

ثانیاً: اگر کچھ لوگ ماضی یا حال میں دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالیں اور انہیں غصب کریں تو یہ خدا کی طرف سے روزی کی عدم ضمانت کی دلیل نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر سعی اور کوشش کی شرط کے علاوہ عدالت اجتماعی کا وجود ہونا بھی ضروری ہے، جو روزی کی منصفانہ تقسیم کیلئے بنیادی شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر اس مقام پر یہ کہا جائے کہ پھر خداوند عالم ظالموں کے ظلم کا ادراک کیوں نہیں کرتا، تو ہم جواب میں کہیں گے کہ انسانی زندگی کی اساس اس کے ارادے کی آزادی پر ہے تاکہ سب کی آزمائش ہو، نہ کہ جبر و اکراہ پر۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر ارتقاء کا امکان مدوم ہو جاتا ہے۔ (غور کیجئے گا)

ثالثاً: اس کثرۃ ارضی میں غذا کے حصول کے کئی منبع (ذرائع) موجود ہیں جنہیں سوچ و بچار اور عقل و شعور کے ذریعہ دریافت کیا جاسکتا ہے۔ اگر اس بارے میں انسان کوتاہی کرے تو خود ہی قصور وار ہوگا نہ کہ خدا!

ہمیں فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ افریقی علاقے جہاں کے باسی بھوکوں مر رہے ہیں، ان میں سے بعض تو دنیا کے دولت مند ترین علاقے ہیں لیکن مذکورہ بالا تباہ کن عوامل جن کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے انہیں یہ روز بد دکھا رہے ہیں۔ اس اجمالی بحث کو ہم نچ البلاغہ خطبہ ۱۸۵ سے مولانا علی علیہ السلام کے فرمان مبارک پر ختم کرتے ہیں۔ امام فرماتے ہیں:

”انظروا الى النملة في صغر جثتها ولطافة هيئتها لا تكاد تنال يلحظ البصر ولا بمستدرک لفكر كيف دبت على ارضها. وصبت على رزقها. تنقل اجثة الى جحرها وتعدّها في مستقرها. تجمع في حرها لبردھا وفي وردھا لصدرها“ اس چوٹی کو دیکھو جس کا جثہ بہت چھوٹا لیکن اندام بہت نازک ہیں جو اس کے چھوٹا اور لطیف ہونے کی وجہ سے آنکھوں سے نہیں دیکھے جاسکتے نہ ہی اس بارے میں عقل سے سوچا جاسکتا ہے کہ وہ کیونکر زمین پر چلتی ہے اور کیسے اپنی روزی تلاش کرتی ہے وہ

دانوں کو اپنے بل میں لے آتی ہے، مخصوص جگہ پر انہیں محفوظ کر لیتی ہے اور گرمی کے موسم میں سردیوں کے ایام اور ان دنوں کیلئے جب نکلنا ممکن نہیں ہوتا اسے ذخیرہ کر لیتی ہے۔

### ۳۔ رزق میں وسعت اور تنگی

مندرجہ بالا آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ خداوند عالم جس کیلئے چاہے روزی وسیع کر دے اور جس کیلئے چاہے تنگ کر دے یہ اکثر آیات میں بیان ہوا ہے، جس سے ہو سکتا ہے کہ یہ شبہ پیدا ہو کہ روزی کا نظام ایسا نظام ہے جو مکمل طور پر انسان کے بس سے باہر ہے۔ لہذا اگر اس دنیا میں کچھ لوگ مالدار اور دولت مند ہیں، یا کچھ غریب اور محروم ہیں تو یہ سب کچھ خدا کی مرضی ہی سے ہے اور اس میں ہمارا کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ نظریہ ان لوگوں کیلئے مناسب و ستاویز قرار پا سکتا ہے جو خود مذہب ہی کو شکوک و شبہات کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور اسے استعاری چالوں اور سامراجی سازشوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن اگر ان آیات و احادیث میں ہی غور و فکر سے کام لیں اور روزی کی وسعت اور تنگی کے اسباب پر غور کریں تو ان آیات کی تفسیر اور احادیث کے اسرار مکمل طور پر روشن ہو جائیں، تمام زہریلا پروپیگنڈا فور ہو جائے اور ایسے اہم نکات سامنے آجائیں جو نہایت ہی کارآمد ہوتے ہیں۔ ہم کئی دفعہ کہہ چکے ہیں کہ ”مشیت الہی“ کا مطلب حد و حساب سے خارج ارادہ نہیں، بلکہ ”حکمت“ بھر ارادہ مراد ہے۔ خداوند عالم کی حکمت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ جو شخص جتنی سعی و کوشش اور اخلاص و فداکاری سے کام لے گا اتنا ہی اس کی روزی کشادہ اور رزق وسیع ہوگا۔ کیونکہ ”وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى“ (نجم/ ۳۹) یعنی ہر شخص کا حصہ اس کی کوشش کے مطابق ہے، اور ”وَكُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ“ (مدثر/ ۳۸) یعنی ہر شخص اپنی کوشش اور اعمال کے گروی ہے۔ ”وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ“ (طلاق ۲-۳) یعنی جو شخص تقویٰ اختیار کرے گا خداوند عالم اس کے لئے راہیں کھول دے گا اور اسے وہاں سے روزی عطا کرے گا جہاں سے اس کا گمان بھی نہیں ہوگا۔ تقویٰ اجتماعی عدالت کی حکمرانی کا اور اجتماعی عدالت روزی کی وسعت کا موجب ہوتی ہے اس لئے مذکورہ بالا تعلیمات صرف سکون اور ترک تلاش کا ہی موجب نہیں بلکہ اس کا ایک مؤثر عامل بھی ہیں۔ اس کی گواہ مولانا علی علیہ السلام کی وہ حدیث ہے جسے ہم ذیل میں نقل کر رہے ہیں۔

”ان الاشياء لما ازدوجت ازدوج الكسل والعجز فننتجا بينهما الفقر“ جب (ابتدائے کار میں) کائنات کی چیزوں نے باہم ازدواج کیا تو ”کاہلی“ اور ”نا توانی“ نے آپس میں عقد کر لیا۔ اس سے جو اولاد پیدا ہوئی اس کا نام ”فقر“ ہے۔ [۱]

حقیقت یہی ہے کہ کسی قوم کی تنگدستی اور غربت ان کی کمزوریوں اس سستیوں کا براہ راست نتیجہ ہوتی ہے اور خداوند کریم کی حکمت اس بات کا موجب بنتی ہے کہ ایسے لوگوں کی روزی تنگ کر دے۔ اسلامی روایات کے مطابق رزق و روزی کی وسعت اور تنگی کے عوامل کے بارے میں غور و فکر اس امر کا ایک اور شاہد ہے۔ چنانچہ انہی روایات کے مطابق جو امور روزی کی وسعت اور اضافے کا موجب بنتی ہیں، ان میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں: صلہ رحمی



گھر، برتنوں اور جسم کی صفائی، مسلمان بھائیوں سے موساسات اور ہمدردی، صبح سویرے کام پر جانا، نعمتوں کا شکر ادا کرنا، حرص کو ترک کر دینا، جھوٹی قسم سے پرہیز کرنا، گناہوں سے توبہ اور استغفار کرنا، ہر کام میں نیک نیتی کا اظہار کرنا، ہمسایوں سے نیک کرنا اور خدا کی طرف متوجہ ہونا۔<sup>[۱]</sup>

معاشرے کو صحیح خطوط پر چلانے، اقتصادی مقاصد کی ترقی کی راہیں ہموار کرنے اور رزق و روزی کے اضافے کیلئے ان میں سے ہر ایک امر کی تاثیر و روشن کی طرح واضح ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ:

”طَيْبُ الْكَلَامِ يَزِيدُ فِي الْأَرْزَاقِ“ پاکیزہ کلام روزی کے اضافے کا موجب ہوتا ہے۔<sup>[۲]</sup>  
امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

”فِي سَعَةِ الْأَخْلَاقِ كُنُوزُ الْأَرْزَاقِ“ روزی کے خزانے وسیع اور کھلے اخلاق میں پوشیدہ ہیں۔<sup>[۳]</sup>  
حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

”كَثْرَةُ السُّخْتِ يَمْحَقُ الرِّزْقَ“ حرام کی کثرت روزی کو نیست و نابود کر دیتی ہے۔<sup>[۴]</sup>

[۱] بحار الانوار جلد ۳ ص ۱۳۱۴ اور کے بعد (باب مایورث الفقر والغنی) اور سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۵۱۹ و ۵۲۰

[۲] بحار الانوار جلد ۳ ص ۱۳۱۴ اور کے بعد (باب مایورث الفقر والغنی) اور سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۵۱۹ و ۵۲۰

[۳] بحار الانوار جلد ۳ ص ۱۳۱۴ اور کے بعد (باب مایورث الفقر والغنی) اور سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۵۱۹ و ۵۲۰

[۴] بحار الانوار جلد ۳ ص ۱۳۱۴ اور کے بعد (باب مایورث الفقر والغنی) اور سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۵۱۹ و ۵۲۰

## ۱۔ پرندوں کی تخلیق میں خالق کائنات کی نشانیاں

### اشارہ

انسان ہمیشہ سے اور تاریخی طور پر پرندوں کو دوست رکھتا چلا آ رہا ہے، ان کی زندگی سے لطف اندوز ہوتا چلا آ رہا ہے اور دیکھ رہا ہے کہ وہ بڑے خوبصورت انداز میں اوپر آسمان کی بلندیوں میں محور پرواز ہیں۔ یہ چیز اس کے تعجب کا سبب بنی ہوئی ہے کہ ایک بھاری بھر کم جسم زمین کی کشش کے برخلاف آسانی کے ساتھ آسمان کی طرف کیونکر اٹھتا اور تیزی کے ساتھ پرواز کرتا ہے؟

صرف یہ خصوصیت ہی نہیں بلکہ اور بھی کئی خصوصیات ہیں۔ مثلاً پرندوں کے رنگ برنگے پر، ان میں سے بعض کا پیارے انداز میں آوازیں نکالنا اور چہچہانا، گھونسلے اور آشیانے بنانا، اپنے نومولود بچوں کی پرورش اور انہیں غذا کھلانا، کچھ پرندوں کا لمبی مدت کیلئے ہجرت کر جانا اور اس طرح کے کئی دوسرے امور انسان کے تعجب کے سبب بنے ہوئے ہیں، اگرچہ ایسے حالات کا تکرار اس بات کا موجب بنا ہے کہ کچھ لوگ انہیں عام اور معمولی باتیں سمجھتے ہیں۔

قرآن مجید نے توحیدی آیات کے حصے میں اس مسئلہ کی نشاندہی کی ہے اور ساتھ ہی سب لوگوں کو پرندوں کی دنیا کے مطالعہ کی دعوت بھی دی ہے تاکہ خداوند عالم کی آیات اور نشانیوں کو ان کے اپنے ہر ایک مقام پر دیکھیں۔ اس مختصر سے اشارے کے ساتھ اب ہم مندرجہ ذیل آیات کو گوش جان سے سماعت کرتے ہیں:

۱۔۔۔ اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرَاتٍ فِي جَوِّ السَّمَاءِ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ اِنَّ فِي

ذٰلِكَ لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُوْنَ (نحل/۴۹)

۲۔۔۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَفًّٰتٍ وَ يَقْبِضُنَّ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا

الرَّحْمٰنُ اِنَّهٗ بِكُلِّۢ شَيْءٍۢ بَصِيْرٌ (ملك/۱۹)

۳۔۔۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗۤ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرِ صَفًّٰتٍ كُلُّ

قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗۤ وَتَسْبِيْحَهٗۤ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ (نور/۴۱)

۴۔۔۔ وَمَا مِنْ دَابَّةٍۭ فِي الْاَرْضِ وَلَا طَيْرٍۭ يَّطِيْرُۭ مِجْنَا حَيْثُۭ اِلَّا اَمَمٌۭ اِمْتَا لَكُمْ

مَا فَرَطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍۭ ثُمَّۤ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ (انعام/۳۸)

## ترجمہ

- ۱۔۔ کیا انہوں نے پرندوں کی طرف نہیں دیکھا جو آسمان کی بلندیوں میں مسخر ہیں، جنہیں خدا کے علاوہ کسی نے نہیں روکا ہوا، اس میں اُن لوگوں کیلئے (خداوندِ عالم کی عظمت اور قدرت کی) نشانیاں ہیں جو ایمان رکھتے ہیں
- ۲۔۔ کیا انہوں نے پرندوں کی طرف نہیں دیکھا جو ان کے سروں پر اپنے پروں کو پھیلاتے اور سمیٹتے ہیں، خداوندِ رحمان کے علاوہ انہیں آسمان کی بلندیوں پر اور کوئی نہیں روکتا، کیونکہ وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے۔
- ۳۔۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خداوندِ عالم کیلئے ہر وہ تسبیح کرتا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہ پرندے جو پرواز کے وقت آسمان کی بلندی میں پر پھیلائے ہوتے ہیں، ان میں سے ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کو جانتا ہے اور خداوندِ عالم اس چیز کو جانتا ہے جو وہ انجام دیتے ہیں
- ۴۔۔ زمین پر کوئی چلنے والا اور کوئی پرندہ جو اپنے دو پروں سے پرواز کرتا ہے کچھ نہیں ہے مگر تمہاری مانند امتیں ہیں۔ ہم نے اس کتاب میں کسی چیز کو فرو گذاشت نہیں کیا، پھر سب کو اپنے پروردگار کی طرف محشور ہونا ہے۔

## الفاظ کے معانی اور تشریح

”طیر“، ”طائر“ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں وہ جانور جس کے پروں ہوتے ہیں اور وہ ہوا میں حرکت کرتا ہے اور اس کا مصدر ”طيران“ ہے [۱] ”تطير“ اس بدشگونی کو کہتے ہیں جو زمانہ جاہلیت میں پرندوں کی وجہ سے لیا کرتے تھے لیکن بعد میں ہر قسم کی بدفالی اور بدشگونی کو ”تطير“ کہا جانے لگا۔

”تطایر“ کا لفظ بھی پھرتی سے چلنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ [۲]

”صافات“، ”صف“ کے مادہ سے ہے جس کے معنی چیزوں کو ایک مساوی خط میں قرار دینے کے ہیں، جیسے وہ لوگ یا درخت جو ایک خط میں قرار پاتے ہیں۔ جب یہ لفظ طیر کیلئے استعمال ہوتا ہے اور کہا جاتا ہے۔ ”وَالطَّيْرُ صَافَّاتٍ“ تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ وہ آسمان میں حرکت کے وقت اپنے پروں کو پھیلائے ہوئے ہیں جب کہ اس کے مقابل میں نقطہ ”بِقَبْضِن“ ہے، جس کے معنی ہیں وہ اپنے پروں کو جمع کرتے اور سمیٹتے ہیں۔

[۱] کبھی اس فعل کے مصدر کو بھی ”طیر“ کہتے ہیں اور ”طیور“ جمع کی جمع ہے۔ (طیر کی جمع) اور بعض حضرات نے ”طیور“ کو ”طائر“ کی جمع بتایا ہے۔

[۲] مفردات راغب، لسان العرب، کتاب العین اور مجمع البحرین۔

”اصطافات“ کا لفظ تسلیم محض اور مکمل خضوع و اطاعت سے کنایہ ہے جو ان نوکروں چاکروں اور خدمت گاروں کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو ایک صف میں کھڑے ہو کر خدمت کے لئے تیار ہوتے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

یہ احتمال بھی ہے کہ ”طیر صافات“ کے ذریعہ ان پرندوں کی طرف اشارہ ہو جو اجتماعی صورت میں ایک یا کئی صفوں میں پرواز کرتے ہیں اور ان کی ہم آہنگی بڑی دلچسپ ہوتی ہے لیکن ”مقبضن“ کا جملہ اس تفسیر سے مانع ہے۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### پرندے تو تسبیح پڑھیں اور میں۔۔۔۔۔۔۔؟

اس سلسلے کی سب سے پہلی آیت میں اس بات پر تاکید کی گئی ہے کہ زمین کی کشش ثقل کے باوجود پرندوں کی آسمان پر بلندیوں میں پرواز خداوند عالم کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ”کیا انہوں نے ان پرندوں کی طرف نہیں دیکھا جو آسمان کی بلندی پر اڑتے پھرتے ہیں۔“ (الْأَلَمْ يَرَ وَآلِ الطَّيْرِ مُسَخَّرَاتٍ فِي جَوِّ السَّمَاءِ)،<sup>[۲]</sup>

چونکہ اجسام کی فطرت میں زمین کی طرف کھینچنا ہوتا ہے، فضا کی بلندیوں میں پرندوں کا نحو پرواز ہونا تعجب انگیز ہوتا ہے اسے معمولی بات نہیں سمجھنا چاہیے۔ یقیناً اس موقع پر پرندوں میں کچھ خاص قسم کی خصوصیات ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ مختلف اور پیچیدہ فطرت قوانین کے ذریعہ آسمان میں آسانی کے ساتھ پرواز کر سکتے ہیں۔ اس میں ذرہ بھر بھی شک نہیں ہے کہ ان عجائبات اور قوانین کا خالق ایسا قادر ہے جو پوری طرح حکمت کا مالک ہے اور تمام علوم کے اسرار و موز سے پوری طرح باخبر ہے۔ بلکہ علوم ان قوانین کے علاوہ اور کچھ نہیں جو اس نے مقرر فرمائے ہوئے ہیں۔ اسی لئے تو آگے فرماتا ہے ”خدا کے علاوہ کوئی اور انہیں آسمان میں نہیں روکتا“ (مَا يُمَسِّكُهُنَّ إِلَّا اللَّهُ)

آیت کے آخر میں فرماتا ہے ”اس امر میں خداوند عالم کی عظمت اور قدرت کی ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو ایمان لاتے ہیں اور حق کو قبول کرنے کیلئے آمادہ ہوتے ہیں۔“ (إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ)

انشاء اللہ العزیز ان آیات کے آخر میں ”ضروری وضاحتوں“ کے ضمن میں ہم بتائیں گے کہ وہ کون سے ایسے پیچیدہ قوانین ہیں جو اگر باہم مل جائیں تو ”طیران“ (پرواز) نامی عمل وجود میں آئے۔ اسی لئے تو قدم قدم پر ہمیں اس مبدائے بزرگ و تربر کی نت نئی نشانیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔

[۱] تحقیق فی کلمات القرآن الکریم، مفردات راغب

[۲] ”جَوِّ“ کے لفظ کو بعض مفسرین نے زمین سے دور کی فضا کے معنی میں لیا ہے اور بعض نے اس کے معنی ”فضا“ لیا ہے۔ خواہ وہ زمین کے نزدیک ہو یا دور۔ لیکن جو بات روزمرہ کے استعمالات سے ذہن میں آتی ہے وہ پہلا معنی ہے اور آیت بالا سے بھی یہی معنی مناسبت رکھتا ہے۔

دوسری آیت بھی کئی لحاظ سے پہلی آیت سے ملتی جلتی ہے، لیکن ان دونوں کے درمیان کئی طرح کے فرق بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان آیات میں انسانوں (خصوصاً مشرکین) کو پرندوں کے حالات کے مطالعہ کی دعوت دی گئی ہے، ایسی مخلوق جو زمین کی کشش ثقل کے باوجود زمین سے اٹھتی ہے اور بڑی آسانی کے ساتھ، نہایت ہی تیزی کے ساتھ کئی ہفتے حتیٰ کہ کئی مہینے تک مسلسل (اور وقفہ کے بغیر) آسمان کی بلندیوں میں اڑتی پھرتی ہے، ایسی پرواز جو نرم بھی ہوتی ہے اور تیز بھی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پرواز میں کسی قسم کی کوئی مشکل درپیش نہیں آتی ہے۔

ارشاد فرماتا ہے ”ان لوگوں نے اپنے سروں پر اڑنے والے پرندوں کی طرف نہیں دیکھا جو اپنے پروبال پھیلاتے ہیں اور سمیٹتے ہیں۔“ (اَوَّلَهُمْ يَبْرُوا إِلَى الظَّيْرِ فَوَقَّهُمْ ضَمَّتْ وَيَقْبِضْنَ) [۱]

”کوئی بھی خداوندِ رحمان کے علاوہ، جس کی رحمتِ عامہ تمام موجودات پر چھائی ہوئی ہے انہیں ایسی حالت میں نہیں روک سکتا“ (مَا يَجْتَسِ كُفْهِنَّ إِلَّا الرَّحْمَنُ)

درحقیقت یہ خداوندِ عالم ہی ہے جس نے پرواز کے تمام وسائل انہیں عطا فرمائے ہیں اور ساتھ ہی انہیں اس کے راہِ و رسم بھی سمجھائے ہیں۔ نیز ایسے قواعد و قوانین مقرر فرمائے ہیں جن سے استفادہ کر کے وہ پرواز کے قابل ہوتے ہیں۔ ”کیونکہ وہ تو ہر چیز کی ضروریات سے اچھی طرح باخبر ہے اور ہر چیز کو دیکھتا ہے“ (اِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بِصِيْرٌ)

ایسی ذرات سے لے کر منظومہ شمسی اور دوسرے کئی منظوموں تک، خود ربینوں کی مدد سے دیکھی جانے والی نباتات اور حیوانات سے لے کر غول پیکر موجودات تک، غرض سب کچھ اسی کی تدبیر سے چل رہا ہے، ایسی تدبیر جو ہر مرحلہ پر ہمیں نئی آیاتِ قدرت سے آشنا کرتی ہے۔ ہر قسم کے ”اتفاق“ اور ”اچانک“ وجود میں آجانے کی نفی کرتی ہے اور اس کے ایمان اور عشق سے دلوں کو معمور کر دیتی ہے۔

”ضُمَّتْ“ اور ”يَقْبِضْنَ“ کی تعبیر شاید اس لئے ہے کہ یہ پرندوں کی اس کیفیت کی طرف اشارہ ہے کہ کبھی تو وہ اپنے پروں کو پھیلاتے اور کبھی سمیٹتے ہیں اور وہ ان دو طریقوں سے پرواز کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ بات شاید پرندوں کی قسموں کی طرف اشارہ ہے، ایک قسم تو وہ ہے جس کے پروبال فضا میں عموماً کھلے اور پھیلے ہوتے ہیں اور وہ ہوا کی موجوں پر سوار بڑی تیزی کے ساتھ ادھر ادھر چلتے پھرتے رہتے ہیں، گویا کوئی مخفی طاقت ہے جو انہیں متحرک رکھتے ہوئے ہے اور وہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے۔

پرندوں کی دوسری قسم وہ ہے جو ہمیشہ اپنے پر پھڑ پھڑاتے رہتے ہیں یعنی پھیلاتے اور سمیٹتے رہتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو ان دو قسموں کے درمیان

[۱] بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اگر ”رؤیت“ کو ”الی“ کے ساتھ متعدی ہو تو اس کا معنی ”حسی مشاہدہ“ ہے اور اگر ”فی“ کے ساتھ متعدی ہو تو اس سے قلبی اور فکری مشاہدہ

درمیان ہیں۔<sup>[۱]</sup>

تیسری آیت میں پرندوں کی زندگی سے متعلق امور میں توحید کی نشانیاں بتائی گئی ہیں آیت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے ”کیا آپ نے ان سب کو نہیں دیکھا جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، خدا کی تسبیح کرتے اور اس کو ہر نقص و عیب سے پاک و پاکیزہ جانتے ہیں“ (اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْبُحُ لَهٗ مِنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) اسی طرح وہ پرندے ہیں جو آسمان میں پُر پھیل کر پرواز کرتے ہیں۔ (وَالتَّيْرُ صَافًۢتٍ)

وہ پرندے جو صف در صف آسمان کی بلندیوں میں محو پرواز ہیں اور اس قدر شکوہ و عظمت و زیبائی اختیار کئے ہوئے ہیں کہ آنکھ ان کے مشاہدہ اور دیدار سے کبھی سیر نہیں ہوتی، اس قدر منظم انداز میں صف باندھے اور مختلف ہندسی شکلیں اختیار کر لیتے ہیں جس سے انسان محو حیرت ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ سینکڑوں یا ہزاروں پرندے باہم پرواز کرتے ہیں، ایک مخفی فرمان کے ذریعہ اپنی راہیں تبدیل کرتے رہتے ہیں اور اس بارے میں ان کے درمیان کسی قسم کا تصادم بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی آیت میں فرمایا ہے ”ان میں سے ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کو جانتا ہے“ (كُلُّۢمَّا فَعَلُوۡا لَهٗ صَلَٰتًا وَّ تَسْبِيْحًا)<sup>[۲]</sup>

جی ہاں! ان میں سے ہر ایک کیلئے اپنے طو پر نماز، راز و نیاز اور دعا ہوتی ہے، اور ہر ایک کی اپنی تسبیح و تقدیس اور حمد و ستائش ہوتی ہے۔ اصولی طور پر ان میں سے ہر ایک کے وجود کا ذرہ، ذرہ، ان کے مختلف اعضاء کی ساخت، حرکات و سکنات ایسے عظیم مبداء کا پتہ دیتی ہیں جو تمام صفات کمال کا جامع اور ہر قسم کے نقائص سے منزہ و مبرا ہے جو اپنی زبان حال سے ہمیشہ اس کی حمد و ثنا میں مشغول ہیں۔ بعض حضرات کا عقیدہ ہے کہ ان کی حمد و تسبیح اور نماز آگاہانہ طور پر انجام پاتی ہے اور ان میں سے ہر ایک کیلئے عقل و شعور کے قائل ہیں حتیٰ کہ ان چیزوں کیلئے جنہیں ہم جامد اور بے روح سمجھتے ہیں، ہر چند کہ ہم اس سے ناواقف ہیں، جیسا کہ سورہ اسرار کی ۴۴ ویں آت میں ہم پڑھتے ہیں:

[۱] ”صافات“ اسم فاعل کا صیغہ ہے اور ”یتقبضن“ فعل مضارع کی صورت میں آیا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ اس بارے میں مفسرین نے کئی تفسیریں ذکر کی ہیں جن میں سے سب سے بہتر تفسیر ہے کہ یہ کہا جائے کہ جب پرندہ پر کھولتا ہے تو اس کی کیفیت ایک جیسی ہوتی ہے، جب کہ پروں کے سمیٹنے اور پھیلانے کی صورت میں یہ عمل مسلسل دہرایا جاتا ہے۔ اس لئے یہ فعل مضارع سے زیادہ مناسب رکھتا ہے جو کہ استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ ایک اور تفسیر کتاب تفسیر کثاف میں مذکورہ مولیٰ ہے اور کچھ مفسرین نے بھی اس کی پیروی کی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ یہ اس لئے بیان ہوا ہے کہ پہلی صورت پرندوں کی پرواز کی اصلی حالت ہوتی ہے جب وہ پرواز کرتے ہیں جب کہ دوسری حالت عارضی ہوتی ہے، لیکن مفہوم پھر بھی روشن نہیں ہے

[۲] اس مقام پر آیات میں ضمیر ”اللہ“ کی طرف لوٹ رہی ہے یا ”کل“ کی طرف، اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن آیت کی کیفیت سے جوابات زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ”کل“ کی طرف لوٹ رہے ہیں جو یاں پر ”کل واحد“ کے معنی میں ہے، یعنی زمین و آسمان میں موجود ہر مخلوق اور پرندے ہر ایک اپنی اپنی نماز اور تسبیح بخوبی جانتے ہیں۔

’وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَّا تُفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ‘ ہر ایک شے خدا کی تسبیح اور حمد کرتی ہے لیکن تم نہیں سمجھتے۔

ان دونوں میں سے جو تفسیر بھی صحیح ہو ہمارے اس دعویٰ کی شہادت دیتی ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز، خاص کر آسمان کی بلند یوں پر محو پرواز پرندے، خالق کائنات کے علم و قدرت کی نشانیاں ہیں۔ آیت کے آخر میں فرماتا ہے ”خداوند عالم ہر اس چیز سے آگاہ ہے جو وہ انجام دیتے ہیں۔ (وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ)

وہ تمام اعمال، سب پروگراموں اور ان کی ضروریات کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اس آیت میں صرف پرندوں کے پروں کے پھیلاؤ پر ہی کیوں زور دیا گیا ہے جیسے ”صافا“ ہے؟ جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں یہ شاید اس لئے ہے کہ ان کی یہ حالت سب سے زیادہ حیرت انگیز ہوتی ہے کہ پروں کے ہلنے بغیر بڑی تیزی کے ساتھ آسمان کی بلند یوں میں حرکت کرتے ہیں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے ان پرندوں کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے جو اجتماعی طور پر حیرت ناک طریقے سے آسمان میں حرکت کرتے رہتے ہیں، ایسی حرکت جو منظم اور سلیقے پر مبنی ہوتی ہے اور مکمل طور پر ہم آہنگ، جب کہ بظاہر ان کا کوئی رہبر اور لیڈر بھی نہیں ہوتا۔ اسی سلسلے کی چوتھی اور آخری آیت میں پرندوں کے ایک اور حیرت انگیز نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ”زمین پر نہ کوئی چلنے والا ایسا ہے اور نہ ہی کوئی ایسا پرندہ ہے جو اپنے دو پروں کے ساتھ پرواز کرتا ہے مگر یہ کہ وہ تمہاری مانند امتیں ہیں“ (وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَلُكُمْ) ”اُمم“ جو ”امت“ کی جمع ہے، کی تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنے لحاظ سے عقل و شعور رکھتے ہیں اور ”مثالکم“ (تمہارے جیسے) کی تعبیر اسی بات کی تاکید ہے، کیونکہ انسان جیسا ہونا صاحب درک و شعور ہونے کی دلیل ہے۔ یہ آیت، سابقہ آیت کی تفسیر کی تاکید ہے یعنی وہ بھی اپنے طور پر آگاہی اور سوجھ بوجھ کے ساتھ خدا کی حمد و تسبیح بجالاتے ہیں۔ [۱]

پرندوں اور دوسرے جانوروں میں موجود قرآن بتاتے ہیں، بلکہ اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ ان میں ہوش اور شعور موجود ہے۔ اولاً بہت سے حیوانات، گھونسلہ بنانے، دانہ و نکا اکٹھا کرنے، نومولود بچوں کی تربیت کرنے، ان کی حفاظت کرنے اور زندگی کی دوسری ضروریات کو پیدا کرنے کیلئے اس قدر ماہرانہ اور زیرکانه عمل کرتے ہیں کہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کام عقل و شعور کی وجہ سے عمل میں نہیں آیا۔ وہ ایسے حوادث کے مقابلہ میں بھی مناسب رد عمل کا اظہار کرتے ہیں جن کے بارے میں انہیں کسی قسم کا تجربہ نہیں ہوتا، مثلاً جس بکری نے زندگی بھر بھیڑیے کو نہیں دیکھا اس کے خطرات سے ضرور آگاہ ہے اور اس کے مقابلے میں ہر ممکن صورت میں اپنا دفاع کرتی ہے۔

بہت سے جانوروں کو اہم مقاصد کیلئے سدھایا جاتا ہے جیسے چٹھی رساں کبوتروں اور بازار سے سودا سلف خرید کر لانے والے جانوروں کی تربیت، یا شکاری جانوروں کی تربیت کتوں کو منشیات کا پتہ چلانے اور مجرموں کا پیچھا کرنے اور اس قسم کے دوسرے کاموں کیلئے

[۱] مفسرین نے ان کی انسان کے ساتھ مشابہت کے بارے میں بہت سے احتمالات ذکر کئے ہیں لیکن ہم نے جو اوپر بیان کیا ہے وہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے

ہر چند کہ ان احتمالات میں کوئی تضاد بھی نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو تفسیر المنار جلد ۷ ص ۱۳۹۲ اور تفسیر قرطبی جلد ۴ ص ۲۴۱)

ترہیت کی جاتی ہے اور وہ بھی اس انداز میں بسا اوقات وہ انسان سے بھی زیادہ زیرک اور بہتر انداز میں اپنا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ آج جب کہ جرائم کا پتہ چلانے کیلئے نئے انداز اختیار کئے جا رہے ہیں، انسان اس قسم کے کتوں کی ضرورت سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

بعض پرندے ایسے ہیں جن کی زندگی نہایت پراسرار اور بہت دقیق ہے جسے غریزہ کی پیداوار نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ غریزے عمومی طور پر ایک ہی نوعیت کی طرز کے ہوتے ہیں جب کہ ان حیوانات کی زندگی اس طرح نہیں ہے ان کے اعمال نسبتاً عقل و شعور کی غمازی کرتے ہیں، مثلاً شہد کی مکھیاں، چیونٹیاں، دیک اور بعض اس قسم کے پرندے ہیں، مثلاً مہاجر پرندے اور بعض بحری جانور مثلاً آزاد مچھلیاں ہیں جو انڈے دینے کے وقت ہزاروں کلومیٹر بحری راستے طے کر کے اپنی اصل زادگاہ کو جا پہنچتی ہیں۔ تفسیر ”روح المعانی“ کے مصنف کہتے ہیں:

”مجھے یہ بات کہنے میں باک نہیں ہے کہ حیوانات کیلئے نفسِ ناطقہ، عقل اور شعور بھی ہے۔ وہ بھی انسان کی طرح ادراک کے مراتب میں ایک دوسرے مختلف ہیں، لیکن وہ کسی بھی طرح انسان کی حیثیت کو نہیں پہنچ سکتے۔ اس بات کے کئی دلائل ہیں اور ان دلائل کے مقابلے میں کوئی ایسی قطعی دلیل بھی موجود نہیں ہے جس کی وجہ سے ان دلائل کی توجیہ یا تاویل کی جاسکے۔“<sup>[۱]</sup>

بظاہر شواہد سے ان کی مراد وہ اشارے یا تصریح ہے جو ”ہدہد اور سلیمان“ اور ”چیونٹی اور سلیمان“ کی داستان میں قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں۔ نیز وہ روایات بھی ہیں جو اسی آیت کی تفسیر میں نقل ہوئی ہیں کہ قیامت میں حیوانات کا بھی حشر و نشر اور حساب و کتاب ہوگا۔<sup>[۲]</sup>

لیکن اس سے مراد خواہ ان کے اعمال اور کردار ان کے عقل و شعور کی وجہ سے ہوں یا ان کے غریزے کی بنا پر یہ بات ہماری بحث میں مؤثر نہیں ہے، بلکہ ہر حالت میں حق کی آیات میں سے ایک آیت اور اس کے علم و قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ آیت کے آخر میں فرماتا ہے ”ہم نے اس آسمانی کتاب میں کسی چیز کو نہیں چھوڑا“ یعنی خدا کی عظمت کی جو جو بھی اور کائنات کے کسی بھی گوشے اور کنار میں موجود نشانیاں ہیں ہم نے اس کی تشریح کر دی ہے۔ (مَا فَرَقْنَا بِمَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مِنَ الْكِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ)

”پھر وہ سب اپنے پروردگار کی طرف محسوس کئے جائیں گے۔“ (ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ)

”حشر“ کی تعبیر سے ثابت ہوتا ہے کہ حیوانات بھی ایک طرح کے عقل و شعور کے حامل ہیں۔ مذکورہ بالا تمام آیات سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے کہ مختلف جہات کے پیش نظر پرندے بھی حق کی نشانیوں میں سے ہیں اور یہ نہایت ہی ظریف، پیچیدہ اور اسرار بھری مخلوق قطعاً اندھے اور بہرے اتفاقات یا بے شعور طبیعت کا معلول نہیں ہو سکتے۔

[۱] تفسیر روح المعانی جلد ۷ ص ۱۲

[۲] تفسیر مجمع البیان جلد ۳ ص ۲۹۸

[۳] ”فرطنا“ کا لفظ ”تفریط“ کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں کام انجام دینے میں کوتاہی کرنا اور اسے طرح ضائع کر دینا کہ وہ پھر ہاتھ نہ آئے (سبح اللغہ) یہ احتمال بھی ہے کہ اس آسمانی کتاب میں عدم تفریط سے مراد یہ ہے کہ قرآن ایک جامع مفہوم کا حامل ہے جس میں تمام انسانی ضروریات کو ملحوظ رکھا گیا ہے لیکن مندرجہ بالا مفہوم آیت کے ذیل میں پیش نظر رکھتے ہوئے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔



## چند ضروری توضیحات

### ۱۔ پرواز کا پیچیدہ فن

سالہا سال سے انسان اس سوچ میں پڑا ہوا تھا کہ وہ کون سی مخفی طاقت ہے جو پرندوں کے کسی حد تک سنگین جسم کو کشش ثقل کے باوجود آسانی سے اوپر لے جاتی ہے۔ نرمی، آسانی اور چابکدستی کے ساتھ انہیں آسمانی بلندیوں پر اڑانے پھرتی ہے۔ بڑی تیزی کے ساتھ انہیں ادھر ادھر لے پھرتی ہے؟ لیکن ہوائی جہاز کی ایجاد اور اس کی تکمیل کے ساتھ ہی یہ بات سامنے آئی کہ ایک طاقت موجود ہے جس کا نام ELEVATOR FORCE ”اوپر لے جانے والی طاقت“ ہے اور یہ صرف پرندوں ہی کو نہیں بلکہ نہایت ہی بھاری اجسام کو بھی آسمان میں اڑا سکتی ہے جس کی وضاحت ہر قسم کی فنی اصطلاحات سے ہٹ کر نہایت ہی سادہ لفظوں میں یوں کی جاسکتی ہے۔

اگر کسی جسم کی دو مختلف سطحیں ہوں (جیسے پرندوں یا ہوائی جہازوں کے پر ہوتے ہیں اور ان کے اوپر کی سطح مٹی اور ابھار والی ہوتی ہے) اور اس قسم کا جسم افقی صورت میں حرکت کرے تو اس میں ایک خاص طاقت پیدا ہو جاتی ہے جو اسے اوپر کی طرف چلاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہوا کا دباؤ اس کی اوپر کی سطح کی نسبت اس کی نچلی سطح پر زیادہ ہوتا ہے (کیونکہ اوپر کی سطح نیچے کی سطح سے زیادہ ہوتی ہے)

اس قانون سے استفادہ ہی ہوا میں سنگین اجسام کی پرواز کا اصل مرکز تشکیل دیتا ہے۔ چنانچہ اگر ہم پرندوں کے پروں کو خوب غور سے دیکھیں تو ہمیں یہ فزیکل قانون واضح طور پر نظر آئے گا۔ لیکن یہ پرواز بیسیوں اہم مسئلوں میں صرف ایک مسئلہ ہے اور اس کی تکمیل میں مندرجہ ذیل امور کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

۱۔ اوپر لے جانے والی طاقت کی ایجاد کیلئے ابتدائی رفتار (ہوائی جہاز یہ رفتار حاصل کرنے کیلئے کافی دیر تک زمین پر چلتے ہیں، لیکن پرندے تھوڑی دیر کیلئے دوڑتے ہیں یا فضا میں ایک تیز رفتار جھٹکے سے یہ مقصد حاصل کرتے ہیں)

۲۔ نیچے اترنے کیلئے اس طاقت کو ختم کرنے کی کیفیت (یہ صورت حال پرندوں اور ہوائی جہازوں میں رفتار کو کم کرنے اور پروں کی صورت کو تبدیل کرنے سے حاصل ہوتی ہے)

۳۔ بوقت پرواز راستہ تبدیل کرنے کی کیفیت۔ (یہ صورت حال بھی عام طور پر ہوائی جہاز کی دم کی حرکتوں اور پرندوں کی دم کے مخصوص پروں کے ذریعہ عمل میں آتی ہے اور پرندہ جدھر کا ارادہ کرتا ہے اسی طرح کو لے جاتی ہے)

۴۔ پرواز کیلئے مناسب صورت اختیار کرنا، اس طرح کہ پرندے کے جسم کیلئے ہوا کی مزاحمت کم سے کم ہو سکے۔ (پرندوں کیلئے یہ بات ان کی THREAD SPUN ON A SPINDLE کی صورت میں جسم، گول اور بیضوی سر اور لمبی اور تیز چونچ کی صورت میں حاصل ہوتی ہے اور ہوائی جہاز کی شکل و صورت میں بھی پرندوں کی تقلید کی گئی ہے)

۵۔ پرواز سے ہم آہنگ کیفیت۔ (یہ کیفیت پروبال کا لباس پہننے سے حاصل ہوتی ہے، جس سے وہ ہوا کے دوش پر ہوتے ہیں

حاملہ ہونے کے کی بجائے انڈے دیتے ہیں تاکہ ان کا جسم سنگین نہ ہونے پائے، تیز بین نگاہیں ہوتی ہیں تاکہ وہ دور سے اپنی منزل مقصود، غذا یا شکار کو دیکھ سکیں، وغیرہ)

۶۔ ایک مدت تک سائنسدانوں اس بات پر سوچ رہے تھے کہ ہوائی جہاز کے پیسے WHEEL ایک تو اس کی رفتار میں کمی کا باعث بنتے ہیں دوسرے پرواز کے دوران خطرے سے خالی بھی نہیں ہیں۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ پرواز کے آغاز کے وقت پرندے اپنے پاؤں کیسٹر لیتے ہیں اور زمین پر اترنے سے ذرا پہلے اپنے پاؤں کھول دیتے ہیں، تو انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہوائی جہازوں کیلئے متحرک پہیوں سے استفادہ کرنا چاہیے تاکہ جب وہ بلندی پر پہنچ جائے تو پیسے اٹھے ہو جائیں اور جب زمین پر اترنے لگے تو لینڈنگ سے کچھ دیر پہلے کھل جائیں۔ اصولی طور پر اگر آپ تعجب نہ کریں تو ہم آپ کو یہ بات بھی بتاتے چلیں کہ ایک طویل عرصے سے سائنسدان پرندوں کی مختلف انواع کے بارے میں مطالعات کرتے چلے آ رہے ہیں کہ ان کی پرواز کی کیا کیفیت ہے، وہ زمین پر کیسے اترتے ہیں، ان کے پروں اور دموں کی کیا کیفیت ہے، وغیرہ وغیرہ، انہی مطالعات کی روشنی میں وہ پرندوں کی مختلف انواع کی تقلید کرتے ہوئے ہوائی جہاز تیار کر چکے ہیں۔ (غور کیجئے گا)

پرواز کے جو اصول ابھی بتائے جا چکے ہیں کیا ان کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب اندھی اور بہری فطرت (نیچر) کا عطیہ ہیں؟ کیا یہ سب کچھ مبداء آفرینش کیلئے بے مثال علم و قدرت کا شاہکار نہیں ہے؟ کیا ”مَا يُنْسِكُنَّ إِلَّا اللَّهُ وَرَحْمَتُ اللَّهِ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ“ (بے شک وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے) اس معنی کی تکمیل نہیں کرتا؟

## ۲۔ پرندوں کے ”عجائبات“ اور عجیب“ پرندے

پرندوں کے مختلف قسمیں ہیں اور ساری عجیب۔ لیکن ان میں کچھ ایسی قسمیں بھی ہیں جو دوسروں سے زیادہ عجیب ہوتی ہیں۔ بعض دانشور کہتے ہیں کہ اب تک کبوتروں کی ۲۸۹ قسمیں، کبک کی ۲۰۹ قسمیں اور پروانوں کی ایک لاکھ قسمیں دیکھی جا چکی ہیں۔ [۱] عجیب اور استثنائی پرندوں میں سے ”چگا ڈر“ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ وہ دوسرے پرندوں کے برخلاف سورج کی روشنی سے بیزار ہوتی ہے اور رات کی ظلمت اور تاریکی میں بڑی شجاعت کے ساتھ اور بے کانہ طور پر ہر سو پرواز کرتی ہے۔ اس کے جسم پر ایک ”پر“ بھی نہیں ہے بلکہ اس کے پر گوشت کی نازک جھلی کے بنائے ہوئے ہیں۔ حاملہ ہوتی ہے۔ اس کے پستان ہیں عورتوں کی طرح ”ایام“ دیکھتی ہے اور گوشت کھاتی ہے، کہتے ہیں کہ تمام پرندے اس کے دشمن ہوتے ہیں اور وہ دوسرے تمام پرندوں کی مخالف ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ تنہائی میں رہتی ہے۔

[۱] ”اسرار زندگی حیوانات“ نامی کتاب کے صفحہ ۱۳۲ تا ۱۹۶، مجلہ ”شکار و طبیعت“، مہریر مرداد ۵۳، ۱۳، ہجری شمسی کا مطالعہ فرمائیں۔

رات کی تاریکی میں کسی رکاوٹ سے ٹکرائے بغیر اس کی تیز اور بے باک پرواز حیرت انگیز ہے۔ بہت سے بیچ و خم کے درمیان سے بڑی آسانی کے ساتھ گزر جاتی ہے، کسی چیز سے بھی نہیں ٹکراتی اور اپنا راستہ بھی نہیں کھوتی۔ اپنی خوراک کو بھی اچھی طرح تلاش کر لیتی ہے خواہ وہ کہیں بھی چھپی ہوئی ہو۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اس کے پاس ”ریڈار“ RADAR کی مانند مشینری سیٹ ہوتا ہے۔

وہ اپنے کان سے ”دیکھتی“ ہے (جی ہاں کان سے) کیونکہ وہ اپنے نخرے سے مخصوص لہریں WAVES ایجاد کرتی اور اپنی ناک کے ذریعے انہیں باہر بھیجتی ہے۔ یہ لہریں ہر اس رکاوٹ سے جا ٹکراتی ہیں جو اس کے اطراف میں ہوتی ہے، ٹکڑا کر فوراً واپس آ جاتی ہیں، وہ اپنے کانوں سے لہروں کے رد عمل کو حاصل کرتی ہے، اپنے اطراف میں موجود صورت حال کا جائزہ لیتی اور ان رکاوٹوں کا پوری طرح ادراک کر لیتی ہے۔

اس کے نخرے، ناک اور کان کی ساخت بھی واقعاً عجیب ہوتی ہے اور اس کے اندر بے انتہا غور و فکر کی طاقت ہوتی ہے جو کسی بھی دوسرے پستان دار جانور میں نہیں ہوتی۔ وہ جو لہریں باہر بھیجتی ہے وہ ماوراء صورت (ریڈیائی لہریں) ہوتی ہیں جسے ہم نہیں سن سکتے۔ جب کہ وہ یہ لہریں ایک سیکنڈ میں ۳۰ سے ۶۰ بار اپنے اطراف میں پھیلاتی اور اس کے رد عمل کو دریافت کرتی ہے۔

چوگا ڈر کے بارے میں بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور اس بارے میں بے انتہا مقالہ جات لکھے جا چکے ہیں جن میں خدا شناسی کے درس کی ایک دنیا پنہاں ہے۔ اسی لئے تو حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے نبی البلاغہ کے ایک خطبہ میں جس کا نام ہی ”خطبہ نفاش“ (چوگا ڈر پر مبنی خطبہ) ہے، اس جانور کے بارے میں گفتگو فرمائی ہے اور اس کے وجود کی باریکیوں اور ظرافتوں کو فصیح و بلیغ انداز اور زور و دربار بیان کے ساتھ ظاہر فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

”خداوند عالم نے اپنی ذات کی صفت کے عجائبات اور اپنی تخلیق کی محیر العقول حکمت کے پیچیدہ اسرار ہمیں چوگا ڈر کے وجود میں دکھائے ہیں۔“ پھر اس کی بلیغ انداز میں توصیف فرمائی ہے۔<sup>[۱]</sup>

بہت کم جانور ایسے ہیں جو اپنے بچے کو اپنی آغوش میں لے کر چلتے پھرتے ہیں۔ اگر آپ تعجب نہ کریں تو ان نادر جانوروں میں سے ایک چوگا ڈر بھی ہے جو بوقت پرواز رات کی اس تاریکی میں اپنے نونہال کو اپنے پروں میں لے کر یا اپنے منہ میں اٹھا کر ادھر ادھر اڑتی پھرتی رہتی ہے، اور اڑتے ہوئے بھی اسے دودھ پلاتی رہتی ہے۔<sup>[۲]</sup>

اس طرح ایک اور پرندہ بھی ہے جس کا نام ”طاؤس“ (مور) ہے۔ اس کا شمار بھی عجائبات خلقت میں ہوتا ہے۔ اس کے ایسے خوبصورت پر ہوتے ہیں کہ جب انسان ان پروں کے بارے میں غور کرتا ہے تو ان کی رنگ آمیزی پر ششدر رہ جاتا ہے، گویا ابھی ابھی وہ کسی ماہر اور زبردست نقاش کے ہاتھوں سے نکل کر باہر آیا اور رنگ سے رنگا گیا ہے۔ زیبا، دل انگیز، مسرور کن، پختہ، پائیدار اور صاف و شفاف لیکن دلکش رنگ، اوپھران پروں کا ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ اور پہلو پہلو قرار پانا، پھر مور کا ان پروں سے چھتری بنانا جو عجیب بھی معلوم ہوتی

[۱] نبی البلاغہ خطہ ۱۵۵

[۲] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۲۰۳

ہے اور ناقابل فراموش بھی۔ یہ سب کچھ خدائی تخلیق کی آیات میں سے ایک اور آیت ہے۔ اسی لئے تو توحید اور خدا شناسی کے عظیم معلم علی بن ابی طالب علیہ السلام نوح البلاغہ کے ایک اور خطبہ میں جس کا نام ”طاؤس“ (مور پر مبنی خطبہ) ہے، اسی چیز پر زور دے دے کر فرماتے ہیں:

”ومن اعجبها خلقا الطاووس الذی اقامه فی احکم تعدیل۔۔۔۔۔“، تخلیق کے لحاظ سے پرندوں میں سے ایک پرندہ ہے جس کا نام مور ہے، جسے خداوند عالم نے موزوں ترین شکل میں پیدا کیا ہے اور مختلف رنگوں کے ساتھ عالی ترین صورت میں رنگ آمیزی کی ہے۔

اپنی مادہ کی طرف بڑھتے وقت اپنے پروں کو پھیلا دیتا ہے اور چھتری کی مانند اپنے سر پر سائبان بنا لیتا ہے، گویا وہ کسی کشتی کا بادبان ہے جسے ملاح نے اس کے اوپر پھیلا دیا ہے اور ہر لمحہ اسے کسی نہ کسی طرف گھماتا ہے۔ وہ اس خوبصورتی اور رنگوں کی زیبائش کی وجہ سے دریائے غرور میں غرق ہو جاتا ہے اور اپنی ناز و ادا کی چال پر اترا تا اور فخر کرتا ہے۔۔۔۔۔ [۱]

”مہاجر پرندے“ بھی پرندوں کی محیر العقول قسموں میں سے ہیں۔ وہ کبھی کبھار تو قطب شمالی اور قطب جنوبی کے درمیان کی تقریباً تمام مسافت طے کر جاتے ہیں اور پھر اپنی پہلی منزل پر واپس آ جاتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک نہایت ہی طولانی اور دور دراز سفر جو ہزاروں کلومیٹر بنتا ہے طے کرتے ہیں۔ اس بارے میں جو قابل غور بات ہے وہ یہ ہے کہ وہ اس دور دراز کے طویل ترین سفر میں مخفی راہنمائی کے وسائل سے استفادہ ہیں اور ان کی مدد سے جنگلوں، پہاڑوں، دریاؤں اور صحراؤں میں بھی اپنی راہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔

پھر اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ وہ کبھی تو کئی کئی ہفتے ایک لمحہ کا توقف کئے بغیر شب و روز محو پرواز رہتے ہیں اور غذا و خوراک کی بھی پرواہ نہیں کرتے کیونکہ وہ اپنا سفر شروع کرنے سے پہلے ایک اندرونی الہام کے ساتھ ہی حد سے زیادہ غذا کھا لیتے ہیں جو چربی کی صورت میں ان کے جسموں میں ذخیرہ ہو جاتی ہے تاکہ وہ اپنی طولانی پرواز کے دوران اس ذخیرہ سے اپنے لئے ضروری توانائی حاصل کرتے رہیں۔ کیا وہ اپنی راہوں کا تعین زمین کی مقناطیسی طاقت کے ذریعہ کرتے ہیں یا آسمان میں سورج کی وصفی نوعیت سے، یا رات کے ستاروں کی مدد سے؟ اگر ایسا ہے تو پھر انہیں نہایت ہی ماہر اور لائق ستارہ شناس سمجھنا چاہیے یا کوئی اور صورت حال ہے جو مخفی ذریعہ کہلاتا ہے، جس سے ہم بے خبر ہیں؟

اس سے بھی زیادہ اہم اور باعث تعجب یہ ہے کہ وہ آسمانی بلند یوں میں پرواز کے دوران ہی نیند کرتے رہتے ہیں اور اپنی منزل کی جانب بھی رواں دواں ہوتے ہیں۔ نیز وہ اندرونی الہام کے ذریعہ فضا میں تبدیلی پیدا ہونے کا احساس بھی پہلے سے کر لیتے ہیں۔ اسی لئے وہ فضائی تبدیلیوں کے وجود میں آ جانے سے پہلے ہی حرکت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ [۲]

شاید آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا کہ مہاجر پرندے اجتماعی صورت میں دو طرفہ قطار بنا کر چلتے ہیں جو انگریزی لفظ وی (v) کی صورت میں ہوتی ہے۔ کیا یہ کوئی اتفاقی صورت حال ہوتی ہے یا اس کی کوئی خاص وجہ ہوتی ہے؟ دانشوروں کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ جب

[۱] اس گفتگو کا تتمہ نوح البلاغہ کے خطبہ ۱۶۵ میں ملاحظہ فرمائیں۔

[۲] مجلہ ”دانشمند“، شمارہ شہر پور ۶۳ ۱۳ شمس

کوئی پرندہ فضا میں اپنے پر مارتا ہے اور مسلسل اسے اوپر سے نیچے کرتا رہتا ہے تو اس سے بعد والے پرندے کی پرواز کیلئے آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لئے جب پرندے مذکورہ صورت میں حرکت کرتے ہیں تو بہت کم تھکتے ہیں اور کافی حد تک اپنی توانائی کو ذخیرہ کرتے رہتے ہیں۔ اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہیں یہ سب کچھ کس استاد نے سکھایا ہے؟

مچھلیاں بھی مہاجرت کے دوران اجتماعی صورت میں اور مخروطی شکل میں حرکت کرتی ہیں کہ ان کا سر آگے آگے ہوتا ہے۔ ماہرین فن نے اس بارے میں جو حسابات اور تخمینے لگائے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ طریقہ اختیار کرنے سے مچھلیوں کی رفتار میں انفرادی طور پر حرکت کی نسبت چھ گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔<sup>[۱]</sup>

### ۳۔ پرندے، انسانوں اور ماحول کی خدمت میں

کسی دانشور کا قول ہے کہ انسان کی شقاوت، بے رحمی، غفلت اور کم علمی کی بھی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ پرندوں کے مارے سے اسے کس قدر عظیم نقصان پہنچتا ہے، کیونکہ پرندوں کو مارنے سے اسے ایسے قیمتی مدگاروں اور دوستوں کی امداد اور دوستی سے محروم ہونا پڑتا ہے جو اس کو چوسنے والے موذی اور نقصان دہ حشرات کے ساتھ برسرِ پیکار ہوتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان نقصان دہ اور موذی حشرات کے ساتھ نمٹنے کیلئے دوراں اختیار کرتا ہے۔ ایک تو ابتدائی راستہ ہے اور وہ یہ کہ باغات اور زراعت کیلئے نقصان دہ کیڑوں، ٹڈیوں اور سنڈیوں کو پکڑا جائے یا انہیں زہریلی دواؤں کے ذریعہ تلف کیا جائے، اور دوسرا ایک بائیولوجیکل سائنسی راستہ ہے اور وہ یہ کہ وائرس اور طفیلی کیڑوں کی پرورش کی جائے جو موذی کیڑوں کو ہڑپ کر جائیں۔ لیکن نمٹنے کے یہ دونوں طریقے ایک تو بہت ہی مہنگے پڑتے ہیں اور دوسرے زبردست مشکلات کا باعث ہوتے ہیں، جب کہ اگر پرندوں کو ان کے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور رس چوسنے والے کیڑوں کے دشمن پرندوں مثلاً اُلو وغیرہ کی نسل کشی کی جائے اور کیڑے کھانے والے پرندوں کی حمایت کی جائے تو نمبر درآزمائی اور نمٹنے کی صورت میں آسان بھی ہو اور معمولی بھی۔

ایک سائنسدان بنام ”میشلے“ کہتے ہیں:

”اگر پرندے نہ ہوں تو زمین حشرات الارض کھا جائیں۔“

جب کہ ایک اور سائنسدان بنام ”فیبر“ ان کی تائید میں کہتے ہیں۔

”اگر پرندے نہ ہوں تو قحط سے بنی نوع انسان تباہ ہو جائے، اس موقع پر اعداد و شمار ہمارے ساتھ ہمکلام ہیں کیونکہ اگر صحیح صحیح حساب لگایا جائے کہ پرندے سالانہ کس حد تک کیڑے مکوڑے اور دوسرے حشرات الارض کو ہڑپ کر جاتے ہیں تو یہ بات صاف طور پر واضح ہو جاتی ہے۔“<sup>[۱]</sup> ”روا تو ہے“ نامی ایک پرندہ سالانہ تیس لاکھ موذی اور نقصان دہ کیڑوں کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ”نیلا سار“ ایک چھوٹا سا پرندہ ہے جو ہر سال ساڑھے

[۱] ایضاً، ”شمارہ خرداد ۱۳۶۳ شمسی“

چھ ملیں (پنسیٹھ لاکھ) حشرات کا صفا یا خود کرتا ہے اور چوبیس ملین (دو کروڑ چالیس لاکھ) حشرات اپنے بچوں کو کھلاتا ہے جو بارہ یا سولہ بچوں سے کم نہیں ہوتے۔ ابا نیل روزانہ چھ سو کلو میٹر سفر کرتا ہے اور کئی لاکھ کیڑوں کو چٹ کر جاتا ہے۔ ”ٹرگلوڈیٹ“ ایک اور پرندہ ہے جو انڈے سے باہر نکلنے کے دن سے لے کر گھونسے سے باہر نکلنے کی درمیانی مدت میں نو ملین (نو لاکھ) حشرات کو ”نوش جان“ کر جاتا ہے۔ لوگ کالے کو لے کر بڑا سمجھتے ہیں لیکن اگر کسی کوئے کو ذبح کر کے اس کے پوٹے کو ٹٹولا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ سفید کیڑوں سے بھر پور ہے۔<sup>[۱]</sup>

یہ پرندوں کو کسانوں اور ماحول کی حفاظت کیلئے خدمات کا صرف ایک گوشہ ہے لہذا اگر وہ اپنی اس خدمت کے بدلے میں ہمارے اناج یا پھلوں میں سے کچھ کھاپی لیں تو اس میں کیا حرج ہے، کیونکہ یہ تو ان کی مزدوری کا ایک ہزارواں حصہ بھی نہیں بتا۔ کیا ہم صرف اس بنا پر ایسے خدمتگار پرندوں کو نقصان دہ اور ضرر رساں سمجھیں؟ یہ بھی سوچنا چاہیے کہ یہ خدمات کس نے پرندوں کے ذمہ لگائی ہیں کہ حیوانات اور حشرات کی دنیا میں توازن کو برقرار رکھنے کیلئے یہ فریضہ انجام دیں اور ان کے اپنے بھی فوائد ہیں۔

## ۴۔ پرندوں کے وجود سے توحید کا درس ملتا ہے

توحید کے عظیم معلم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام مشہور حدیث ”توحید مفضل“ میں ارشاد فرماتے ہیں: ”اے مفضل! پرندوں کے اجسام اور ان کی تخلیق کے بارے میں غور و فکر کرو۔ چونکہ ان کے مقدر میں یہ تھا کہ وہ ہوا میں پرواز کریں، لہذا ان کے جسم کو ہلکا اور خلاصہ کی صورت میں بنایا، چار ستونوں کی بجائے ان کے بدن کے دو ستون ہیں پانچ انگلیوں کی جگہ پر چار انگلیاں ہیں، فضلے کے نکالنے کیلئے دو سوراخوں کی بجائے ایک سوراخ ہے، سینہ ”مُحَدَب“ بنایا گیا ہے تاکہ آسانی کے ساتھ ہوا کو چیر سکیں جیسے کشتی کا سینہ ہوتا ہے اور وہ پانی کو چیرتی ہے، ان کے دونوں پروں اور دم میں لمبے اور محکم پر ہوتے ہیں جن کے ذریعہ وہ پرواز کرنے پر قادر ہوتے ہیں، ان کا پورا بدن بالوں سے ڈھکا ہوتا ہے تاکہ ہوا ان کے اندر داخل نہ ہونے پائے اور ان کے حجم کی نسبت ان کا وزن کم ہو جائے، چونکہ یہ بات بھی ان کے مقدر میں ہوتی ہے کہ ان کی غذا اناج یا گوشت ہو اور وہ فوراً اسے نکل جائیں اور چبائے بغیر ہی پرواز کر جائیں، لہذا ان کے وجود سے دانتوں کو حذف کر دیا گیا ہے اور دانتوں کی بجائے ان کی نوکیلی، پختہ، تیز اور لمبی چوچ ہوتی ہے تاکہ وہ دانہ اٹھانے اور گوشت کو جدا کرنے سے تھک نہ جائیں اور کسی زحمت میں نہ پڑیں۔ چونکہ دانتوں سے محروم ہوتے ہیں، اسی لئے ان کے اندر ایک خاص قسم کی حرارت ہوتی ہے جس کی وجہ سے موٹے موٹے دانے بھی ہضم ہو جاتے ہیں اس طرح ان کا اپنا مخصوص ہاضمہ ہوتا ہے جو انسانی ہاضمہ سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ عام طور پر انڈے دیتے ہیں، بچے نہیں دیتے، تاکہ حمل کی وجہ سے ان کا جسم بھاری نہ ہو جائے اور پرواز کرنے پر قدرت رکھیں۔“ پھر امام علیہ السلام نے پرندوں کے بارے میں بہت سے دوسرے دلچسپ اور دقیق نکات بیان فرمائے، جنہیں اختصار کی بنا پر ہم یہاں درج نہیں کر سکتے۔<sup>[۲]</sup>

[۱] کتاب ”نظری طبیعت و اسرار ان“ ص ۱۹۵ تا ۱۹۷ (قدرے تلخیص کے ساتھ)

[۲] بحار الانوار جلد ۳ ص ۱۱۰۳ اور اس کے بعد

## ۱۸۔ شہد کی مکھیوں کی زندگی میں خلاق عالم کی نشانیاں

### اشارہ

شہد کی مکھیوں کی زندگی تخلیق کائنات کی دنیا کا عجیب ترین شاہکار ہے، سائنسدانوں کے مطالعات کی روشنی میں اس چھوٹے سے حشرہ کی زندگی کے کئی عجائبات دریافت ہو چکے ہیں جن کی وجہ سے بعض سائنسدانوں نے یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ ان کی اجتماعی زندگی انسان کی زندگی سے زیادہ پیش رفت اور ترقی یافتہ ہے۔ آپ کو دنیا میں کوئی ایسا ترقی یافتہ معاشرہ نہیں ملے گا جس نے ”بیکاری“ اور ”بھوک“ جیسے مسائل کو مکمل طور پر حل کر دیا ہو، لیکن یہ مسائل شہد کی مکھیوں کے ملک (چھتہ) میں مکمل طور پر حل ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس سارے شہر میں ایک بھی مکھی بیکار اور بھوک نہیں ملے گی۔

گھر کا تیار کرنا، پھولوں کے رس کی جمع آوری کا طریقہ، شہد کا بنانا اور ذخیرہ کرنا، نومولود کی پرورش پھولوں سے معمور علاقے کی دریافت اور دوسری مکھیوں کو ان کا پتہ بتانا، ہزاروں چھتوں کے درمیان میں سے اپنے ہی چھتے کو تلاش کرنا، یہ اور اس قسم کی کئی اور باتیں ہیں جن سے ان کی حد سے زیادہ ذکاوت اور عقل و شعور کا پتہ چلتا ہے۔ البتہ یہ بات یقینی ہے کہ ماضی میں انسان کو ان چیزوں کا علم نہیں تھا، لیکن قرآن مجید نے آج سے چودہ سو سال پہلے ایسی باتوں کا انکشاف کر دیا تھا اور اس کے اندر اسی حشرہ کے نام کی ایک سورہ بھی جس کا نام سورت ”نحل“ ہے، جس میں اس مختصر سے حشرہ کی زندگی کے پچھیدہ اور حیرت ناک پہلوؤں کی طرف کئی اشارے کئے گئے ہیں۔ اس اشارے کے ساتھ ہی مندرجہ ذیل آیات کو گوش جان کے ساتھ سماعت کرتے ہیں:

۱۔۔۔ وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَا بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ (نحل ۶۸)

۲۔۔۔ ثُمَّ كُلِّي مِنْ كُلِّ الشَّجَرِ فَاسْلِكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا يَخْرُجُ مِنْ يَطْوِيَهَا سَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ، فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (نحل ۶۹)

### ترجمہ

۱۔۔۔ تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طرف وحی بھیجی کہ پہاڑوں، درختوں اور ان چھتوں

پر اپنا گھر بنا سکیں جو لوگ بناتے ہیں۔

۲۔۔ پھر تمام پھلوں سے کھا، اور ان راہوں پر آسانی کے ساتھ چل جو تیرے پروردگار نے مقرر کر رکھی ہیں۔ اس کے شکم سے خاص قسم کا مشروب نکلتا ہے، جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں، جس میں لوگوں کے لئے شفاء ہے۔ اس امر میں صاحبانِ فکر کیلئے (خدا کی عظمت کی) نشانیاں ہیں۔

## الفاظ کے معانی اور تشریح

”نخل“، شہد کی مکھی کو کہتے ہیں اور ”نخلہ“ (بروزن قبلہ) بغیر معاوضہ کے بخشش کو کہتے ہیں اور اس کا مفہوم ”ہبہ“ (بخشش) کے مفہوم سے زیادہ محدود ہے، کیونکہ ”ہبہ“ یعنی بخشش بغیر معاوضہ اور عوض کے بخشش کو کہتے ہیں جب کہ ”نخلہ“ صرف اس بخشش کو کہتے ہیں جو بلا عوض ہوتی ہے۔ ”مُحُول“ کا معنی لاغری ہے جیسے شہد کی مکھیاں لاغر (نجیف) ہوتی ہیں اور ”نواحل“ ان تلواروں کو کہتے ہیں جو تیز (لاغر و نجیف) ہوتی ہیں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اصل بنیاد وہی ”نخلہ“ ہے جس کا معنی بخشش ہے۔ اگر نبورِ غسل کو ”نخل“ کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھ عالمِ انسانیت کیلئے شریں عطیہ اور بخشش لاتی ہے۔ [۱]

”أَوْحَى“، ”وحی“ کے مادہ سے ہے جس کے بہت سے معانی ہیں جنہیں ہم نے ”پیام قرآن“ کی جلد اول ”معرفت کے منابع“ کی بحث میں ذکر کیا ہے اور جس کی اصل بنیاد ”سربج اشارہ“ ہے۔ چونکہ خداوند عالم کا فرمان زبورِ غسل کی مختلف اور پیچیدہ سرگرمیوں پر مبنی ہوتا ہے جو سربج اشارے یا قلبی الہام سے ملتا جلتا ہے لہذا یہ لفظ شہد کی مکھیوں کے بارے میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔ گویا ان تمام پیچیدہ کاموں کو خدا کے ایک سربج اشارے سے انجام دیتی ہیں۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### آئیے شہد کا ملک دیکھیں!!

قرآن مجید نے مذکورہ بالا آیت میں شہد کی مکھیوں کی زندگی کے چند مختلف حصوں کو بیان فرمایا ہے جن میں سے ہر ایک دوسرے سے زیادہ جاذب اور عجیب ہے۔ سب سے پہلے تو ان کے گھر بنانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے، ”تیرے پروردگار نے زبورِ غسل کی طرف وحی کی ہے کہ وہ اپنے گھروں کو پہاڑوں، درختوں اور ان چھجوں سے انتخاب کرے جنہیں لوگ بناتے ہیں۔“ (وَأَوْحَى رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنْ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ)



”اختذی“ (تو انتخاب کر) کی تعبیر مؤنث فعل کی صورت میں شاید اس لئے ہے کہ جب شہد کی مکھیاں نیا گھر تلاش کرنے کو نکلتی ہیں تو ایک ”ملکہ“ کے پیچھے چلتی ہیں جو چھتے کی فرما زوا ہوتی ہے۔ بنا بریں اصل انتخاب کرنے والی ملکہ ہوتی ہے

”اولیٰ“ کی تعبیر ایک نہایت ہی خوبصورت تعبیر ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے ایک مخفی الہام کے ذریعہ اس حیوان کو گھر بنانے کی تعلیم دی ہے جو اس کا ایک ظریف ترین کام ہوتا ہے۔ اس کی باقاعدہ تفصیل آگے چل کر بیان ہوگی۔ چنانچہ وہ بھی اسی وحی الہی کے مطابق اپنا فریضہ انجام دیتی ہے کبھی پہاڑوں کی چٹانوں میں کبھی درختوں پر اور کبھی غاروں میں وہ اپنا چھتہ بناتی ہے تو کبھی مصنوعی چھتوں اور گھروں کو انتخاب کرتی ہے جنہیں انسان بناتا اور چھجوں پر رکھتا ہے۔ یا خود بھی وہ چھجوں پر اپنا گھر بناتی ہے، اس طرح سے زبور ان عمل کے مختلف انواع کے گھروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

آیت کی تعبیریں بتاتی ہیں کہ اُن کا یہ گھر بنانا کوئی سادہ سی بات نہیں ہے وگرنہ قرآن اسے وحی سے تعبیر نہ کرتا، اور ہم عنقریب دیکھ لیں گے کہ بات بھی یہی ہے۔

دوسری آیت میں ان مکھیوں کے شہد بنانے کی بات کی گئی ہے کہ ”خداوند عالم نے اپنی وحی اسے حکم دیا ہے کہ تمام میوہ جات سے کھا۔“ (ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ)

”اور میٹھا شہد پیدا کرنے کیلئے ان راستوں پر چل جو تیرے پروردگار نے تیرے لئے خاضع اور مسخر کر رکھے ہیں۔“ (فَاسْأَلِكِ رَبِّكَ ذُلًّا)

”سُئِلَ“، ”سُئِلَ“ کی جمع ہے جس کے معنی آسان راستہ“ ہیں (جیسا کہ مفرداتِ راغب میں آیا ہے۔)

مندرجہ بالا آیت میں راہوں سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کئی احتمال ذکر کئے ہیں بعض نے کہا ہے کہ وہ راستے مراد ہیں جو شہد کی مکھیاں پھولوں کی طرف طے کرتی ہیں۔ (”ذُلٌّ“، ”ذُلٌّ“ کی جمع ہے جس کے معنی رام اور سر جھکائے ہوئے ہیں ”ذُلٌّ“ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ راہیں اس حد تک صاف صاف اور ٹھیک ٹھیک طریقے سے متعین کی گئی ہیں کہ جن کا طے کرنا ان مکھیوں کیلئے آسان اور معمولی سی بات ہے۔

آج شہد کی مکھیوں کے ماہرین بھی اسی بات کی تائید کرتے ہیں۔ وہ کہتے کہ مکھیوں کا جتھ پھولوں کی جگہ کی پہچان کیلئے صبح صبح باہر نکلتا ہے، اس جگہ کے دریافت کرنے کے بعد چھتے کی طرف واپس آجاتا ہے اور آکر اس جگہ کی نشان اور صحیح صحیح پتہ نہایت ہی اسرار آمیز اور حیرت ناک صورت میں دوسرے کو بتاتا ہے۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ راہ میں کچھ نشانیاں چھوڑ جاتا ہے جو ایک مخصوص قسم کا بودار مواد ہوتا ہے جس سے رستے کا تعین خود بخود ہوتا جاتا ہے اور وہ اس کے ذریعہ کسی قسم کی مشکل محسوس کئے بغیر منزل مقصود تک پہنچ جاتی ہے

بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ اس سے مراد چھتے تک پہنچنے کی راہیں ہیں کیونکہ بعض اوقات مکھی دور، دراز کا سفر کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے لیکن واپسی پر کسی بھی صورت میں سرگردانی کا شکار نہیں ہوتی بلکہ بلا تکلف اپنے چھتے تک پہنچ جاتی ہے، حتیٰ کہ ایک جیسے سینکڑوں

چھتوں کے درمیان وہ صرف اپنے ہی چھتے کو پہچان لیتی ہے۔<sup>[۱]</sup>

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ پر ”سبل“ کا معنی مجازی ہے اور شہد کی مکھی کے اس طریقہ کار کی طرف اشارہ ہے جو وہ شہد تیار کرنے کیلئے پھولوں کے رس کو چوسنے کیلئے استعمال کرتی ہے، کیونکہ وہ ایک خاص طریقے سے رس کو چوستی ہے اور چوسنے کے بعد اپنے مخصوص ”پونے“ یا تھیلی میں ذخیرہ کر لیتی ہے جہاں پر کیمیکل طریقہ سے اس میں تبدیلیاں عمل میں آتی ہیں اور شہد تیار ہوتا ہے۔ پھر مکھی اسے مخصوص تھیلی میں واپس پلٹا دیتی ہے۔ مکھی اس کام کیلئے ضروری طریقوں کو اختیار کرتی ہے وہ خدائی الہام کے ذریعہ ایسا کرنا بخوبی جانتی اور اس راہ کو طے کرتی ہے۔

چونکہ ان تینوں تفسیروں میں کوئی تضاد اور اختلاف نہیں ہے لہذا آیت کا ظاہر عام ہے جس سے کہا جاسکتا ہے کہ تینوں تفسیریں اس میں شامل ہیں، شہد کی کھیاں خداداد شعور یا عریزی الہام کے ذریعہ ان پیچ و خم بھرے راستوں کو بڑی آسانی کے ساتھ طے کرتی ہیں اور ان سے استفادہ کرتی ہیں۔ بعد کے مرحلہ میں ”شہد“ کے اوصاف اور اس کی برکتوں اور فوائد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ”ان کے شکم سے ایک خاص قسم کا مشروب باہر آتا ہے جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔“ (يَخْرُجُ مِنْ بُطُونِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ)

”بطون“؛ ”بطن“ کی جمع ہے (جس کا معنی پیٹ ہے) اس تعبیر کو بعض مفسرین نے مجازی معنی پر محمول کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کے معنی ”انواہ“ (منہ) ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ شہد جو پھولوں کا رس ہوتا ہے، مکھیوں کے منہ میں ذخیرہ ہو کر چھتے میں منتقل ہو جاتا ہے۔<sup>[۲]</sup> جب کہ بعض کا گمان ہے کہ شہد، زنبور ان غسل کا فضلہ ہوتا ہے۔<sup>[۳]</sup>

بعض مفسرین اسے بھی ایسے اسرار آمیز مسائل میں شمار کرتے ہیں جو ابھی تک انسان پر منکشف نہیں ہو پائے۔<sup>[۴]</sup> لیکن جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں سائنسدانوں کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے کوئی نظریہ درست نہیں ہے، بلکہ شہد کی کھیاں پھولوں کا رس چوسنے کے بعد اسے بدن میں مخصوص تھیلی میں بھیج دیتی ہے جسے ”پونا“ کہا جاتا ہے اور پھر وہاں وہ مختلف قسم کی تبدیلیوں کے بعد شہد بن کر واپس ان کے منہ آ جاتا ہے۔ ”بطون“ کی تعبیر اسی بات کی گواہ ہے، اور پھر اس سے بھی زیادہ واضح ”کلی“، تو کھا<sup>[۵]</sup> کی تعبیر ہے کیونکہ عرب کبھی بھی کسی چیز کو منہ میں رکھنے کو ”اکل“ (کھانا) نہیں کہتے۔ اس جملہ کی تفسیر ”اٹھانے“ اور ”پکڑنے“ سے بھی ایک مجازی تفسیر ہے جس کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

[۱] ”ذلول“، ممکن ہے کہ ”سبل“ کا حال ہو یا ”نخل“ کا۔ پہلا احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

[۲] مجمع البیان، جلد ۶ ص ۷۳

[۳] تفسیر قرطبی، جلد ۶ ص ۷۵

[۴] اسی تفسیر قرطبی میں ارسطو کی ایک داستان نقل کی گئی ہے کہ ارسطو نے شیشے کا ایک چھتہ تیار کیا تاکہ وہ یہ جان سکے کہ شہد کس طرح تیار کیا جاتا ہے، لیکن جب مکھیوں نے اپنا عمل شروع کیا تو پہلے انہوں نے شیشے کو سیاہ کر دیا تاکہ ان کا راز کسی پر عیاں نہ ہونے پائے۔

[۵] کتاب ”پروش زنبور غسل“، مصنفہ محمد مشری ص ۱۱۳ اور کتاب ”نظری بہ طبیعت و اسرار ان“ ص ۱۲۶

اب اس جگہ پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں پر ”مختلف الوان“ (مختلف رنگوں) سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں بھی مختلف نظریات ملتے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس سے یہی ظاہری ”رنگ“ مراد لئے ہیں، جن میں سے یہ شہد ہوتا ہے۔ بعض شفاف سفید ہوتے ہیں، بعض زرد یا سرخ اور بعض سیاہ ہی مائل بھی ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ رنگوں کا یہ فرق شہد کی مکھیوں کے سن کی وجہ سے ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پھولوں کے مختلف منبع کی وجہ سے ہو اور ہو سکتا ہے کہ دونوں وجوہات شامل ہوں۔

یہ امکان بھی ہے کہ اس سے مراد خود ”شہد کی کیفیت“ ہو کیونکہ بعض شہد گاڑھے ہوئے ہیں اور بعض پتلے۔ یا پھر مختلف پھولوں کے مختلف شہدوں کا اثر جداگانہ ہوتا ہے اور ہر ایک کے اپنے مخصوص خواص ہوتے ہیں۔ اسی طرح خاص قسم کا شہد ”JELLY“ (چھتے کی ملکہ کے لئے تیار کیا جانے والا مخصوص شہد) سے بہت ہی مختلف ہوتا ہے، کیونکہ مشہور ہے کہ JELLY غذائی نقطہ نظر سے اس قدر قیمتی ہے کہ ملکہ مکھی کی زندگی کے طولانی ہونے کا سبب بنتا ہے اگر انسان بھی اس سے کھالے تو اس کی طولانی عمر کیلئے بھی موثر ہوتا ہے۔

بعض ملکوں میں ایک طرح کے پھولوں کے کھیت ہوتے ہیں اور مخصوص شہد کے چھتوں کی وہاں پرورش کی جاتی ہے جس سے ہر قسم کے پھولوں کی قسم کا مخصوص شہد حاصل کیا جاتا ہے اور خواہشمند افراد اپنی پسند کے پھولوں کا شہد خرید سکتے ہیں۔ اس طرح شہد کے ایک اور ایوان مختلف کا سراغ ملتا ہے جو ممکن ہے کہ آیت کے عمومی اور وسیع مفہوم میں شامل ہو۔

”شراب“ (مشروب) کی تعبیر اس لئے ہے کہ بعض مفسرین کے بقول کلام عرب میں شہد کے بارے میں ”اکل“ (کھانے) کی تعبیر میں استعمال نہیں ہوتی بلکہ اس سلسلے میں ہمیشہ ”شرب“ (پینے) کی تعبیر استعمال ہوتی ہے (شاید اس لئے کہ وہاں شہد پتلا ہوتا ہے) [۱] آخر میں عسل (شہد) کی شفاء عطا کرنے والی تاثیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ”اس میں لوگوں کیلئے خصوصی شفاء ہے“ (فِيهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ)

”شفاء“ کی تعبیر نکرہ کی صورت میں اس کی بے حد اہمیت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ انشاء اللہ ”توضیح“ کے عنوان کے تحت تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے گا شہد میں بہت سے پھولوں اور نباتات کے جیتے جاگتے اور زندہ خواص موجود ہیں۔ دانشوروں نے اس کیلئے خصوصاً دور حاضر میں بہت سے خواص کا تذکرہ کیا ہے جس میں حفظانِ صحت کے خواص بھی شامل ہیں اور حفظانِ مقدم کے خواص بھی۔ عسل بہت سی بیماریوں کے علاج کیلئے حیرت انگیز حد تک موثر ہے۔ اس کی وجہ اس کے اندر حیاتیاتی مواد VITAMIN کی موجودگی ہے اور وہ بھی اس حد تک کہ بلا جھجک کہا جاسکتا ہے کہ ”شہد“ انسان کی صحت، سلامتی اور خوبصورتی کی خدمت سرانجام دیتا ہے۔

آیت کے آخر میں گزشتہ تین حصوں، مکھیوں کے گھر بنانے کا مسئلہ، پھولوں کے رس کی جمع آوری و شہد ساز اور اس کے طبی خواص) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا، ”ان میں خداوند عالم کی عظمت کی نشانیاں ان لوگوں کیلئے ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں“ (اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ)

اس طرح شہد کی مکھیوں کی زندگی کے تمام مراحل میں بھی اور اس جفاکش، سبھدار اور ذی استعداد حشرے کی محنت کے ثمرے میں بھی خالق کائنات کی قدرت اور علم کی صرف ایک نہیں کئی آیات نظر آتی ہیں کہ اس نے اس قدر حیرت ناک مخلوق کو پیدا کیا ہے۔

## چند ضروری توضیحات

### ۱۔ شہد کی مکھیوں کا عجیب تمدن

حیوان شناسی ZOOLOGY اور حیات شناسی BIOLOGY جیسے علوم کی وسعت اور با حوصلہ سائنسدانوں کے وسیع مطالعات کی وجہ سے اس چھوٹے سے حشرہ کی زندگی کے کئی اور عجیب اور نئے مسائل کا انکشاف ہوا ہے، جس سے انسان حیران رہ جاتا ہے اس بات کو ہرگز باور نہیں کر سکتا کہ ان مکھیوں پر حکم فرمایا سب نظام و تدبیر اور پروگرام کسی طبعی شعور سے خالی ہے۔ ایک حیات شناس BIOLOGIST سائنسدان ”مترنگ“ نے زنبورانِ عمل کی زندگی کے بارے میں سالہا سال تک کافی تحقیق کی ہے، وہ ان کے شہر میں حکم فرما عجیب و غریب نظام کے بارے میں یوں کہتے ہیں:

”شہد کی مکھیوں کے شہر میں ملکہ اس طریقہ پر حکم فرما نہیں ہوتی جس طرح ہم سمجھتے ہیں بلکہ وہ بھی اس شہر کے دوسرے افراد کی مانند ایک طرح کے آئین و قوانین کی پابند ہوتی ہے۔“ پھر کہتے ہیں:

”ہمیں آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ آئین اور قوانین کہاں اور کیونکر تیار ہوتے ہیں۔ ممکن ہے ایک دن ایسا آجائے جس میں ہم یہ معمہ بھی حل کر سکیں اور قانون وضع کرنے والے کو پہچان سکیں لیکن سر دست ہم اس کا عارضی نام ”شہد کی جان“ رکھتے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ یہ جان کہاں ہے اور اس شہر کے باشندے میں حلول کئے ہوئے ہے؟ البتہ یہ ضرور جانتے ہیں کہ ملکہ بھی دوسری مکھیوں کی طرح ”شہد کی جان“ کی فرمانبردار ہوتی ہے۔ ”شہد کی جان“ پرندوں کے غریزے کی مانند نہیں ہے اور ایک عادت اور اندھے ارادے کی طرح عمل نہیں کرتی۔ ”شہد کی جان“ اس شہر کے ہر ایک باشندے کیلئے اس کی استعداد کے مطابق علیحدہ علیحدہ فرمان جاری کرتی ہے، کبھی تو کچھ افراد کو گھر بنانے کا حکم دیتی ہے اور کبھی سب کو کوچ اور ہجرت کا فرمان صادر کرتی ہے۔“

”غرض ہم اب تک نہیں سمجھ سکے کہ مکھیوں کے ملک کے قوانین جو ”شہد کی جان“ کے ذریعہ وضع ہوتے ہیں، کس ”اسمبلی“ یا ”پارلیمنٹ“ میں پیش ہو کر منظور کئے جاتے ہیں اور کون ہے جو انہیں ایک مقررہ دن میں حرکت کا حکم جاری کرتا ہے۔“ [۱]

لیکن قرآن مجید نے ان تمام سوالات کا جواب ایک مختصر سے جملے سے دے دیا ہے اور وہ ہے ”وَأَوْخِي رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ“ (تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی ہے) وہی تعبیر جو انبیاء بزرگ کے بارے میں استعمال کی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس

[۱] کتاب ”زنبورِ عمل“ از مترنگ ص ۳۵ ص ۳۶ (اختصار کے ساتھ)

وحی اور اُس وحی میں بڑا فرق ہے، لیکن تعبیر کا ایک جیسا ہونا اس علم و دانش کی اہمیت کی دلیل ہے جو خداوند عالم نے زبور ان عسل کو عطا فرمایا ہے، اور وہ بھی اس حدت تک کہ مفکرین عالم کو اس کے بارے میں مطالعہ کی دعوت دی ہے۔

زبور عسل کا گھر بنانا یقیناً خداوند عالم کے الہام کے ساتھ ہے کیونکہ وہ اپنا گھر منظم طور پر مسدس شکل میں بناتی ہے جس پر موم تو بہت کم خرچ آتی ہے لیکن گنجائش بہت زیادہ ہوتی ہے اس کے تمام زاویے استفادہ کے قابل ہوتے ہیں اور دباؤ کے مقابلہ میں اس کی قوت مزاحمت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ان کے گھر دو منزلہ ہوتے ہیں۔ یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب ان کا چھتہ درختوں یا پہاڑوں پر ہو، لیکن مصنوعی چھتوں میں دو دو کر کے اضافہ کرتی جاتی ہیں، جتنا کہ چھتے بنانے کی گنجائش ہوتی ہے۔

ہر ایک گھر کی گہرائی PYRAMID صورت کی ہوتی ہے جس کی تین سطحیں لوزی (بادامی) شکل کی ہوتی ہیں اور ایک منزل کی راس اور اس کا ابھار دوسری اور نیچلی منزل کی تہہ میں ہوتا ہے۔

تجربہ شاہد ہے کہ اگر موم کی کسی سطح کو مربع یا کسی دوسرے شکل میں مصنوعی قابلوں کے ذریعہ ڈھالا جائے، جو شہد کی مکھی کیلئے حسب منشاء نہیں ہے، اور اس میں مکھی کو چھوڑ دیا جائے تو وہ خدائی الہام کی طاقت کے ذریعہ اس غلط بنیاد کی پیروی نہیں کرے گی بلکہ وہ اسے صحیح شکل میں اوپر لے جائے گی۔

کسی دانشور نے زبور عسل کے گھر کی گہرائی لوزی (بادامی) شکل کا اندازہ لیا تو معلوم ہوا کہ اس کا بڑا زاویہ ایک سو نو درجے اور اٹھائیس منٹ ہے۔ پھر اس مسئلے کو جرمنی کے ایک عظیم انجینئر بنام ”کنیک“ کے پاس بھیج کر اس سے سوال کیا کہ اگر کوئی شخص کم سے کم مواد کے ذریعہ بڑی سے بڑی PYRAMID بنا چاہے جس سے لوزی (بادامی) شکل کی تین سطحیں حاصل ہوں تو اس کے زاویے کس اندازے کے ہوں گے؟

اس نے DIFFERENTIAL حساب کے ذریعہ اس مشکل مسئلے کو حل کر دیا اور جواب میں لکھا ”ایک سو نو درجے اور چھبیس منٹ“ حالانکہ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ سوال شہد کی مکھیوں کے گھر کے بارے میں کیا جا رہا ہے۔ اس طرح اس کے جواب میں اور شہد کی مکھیوں کے گھر میں صرف ”دو منٹ“ کا فرق ظاہر ہوا۔

اس کے بعد ایک اور انجینئر بنام ”میگ لورن“ نے مزید غور کے ساتھ اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ”دو منٹ“ کا فرق پہلے انجینئر کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے وگرنہ صحیح جواب وہی ہے جو شہد کی مکھیوں نے انجام دیا ہے۔<sup>[1]</sup>

بلجیئم کے مشہور سائنسدان مسٹر ”مترانگ“ اپنی کتاب ”زبور عسل“ میں ایک اور سائنسدان سے نقل کرتے ہیں جس کا نام ”رائٹ“ ہے وہ کہتے ہیں:

الجبراء میں منظم فاصلوں کو تقسیم کرنے، ان کو آپس میں ملانے اور چھوٹی اور بڑی شکلیں بنانے کیلئے صرف تین علمی طریقہ کار ہیں، اور وہ

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی حاشیہ مرحوم شعرانی جلد ۷ ص ۱۲۳ (قدرے تلخیص کے ساتھ)

ہیں۔ ۱۔ ”مثلث قائم الزاویہ“۔ ۲۔ ”مربع“ اور۔ ۳۔ ”مسدس“ زنبورِ عسل کے ”حجرے“ کی بناوٹ میں تیسرے طریقے یعنی مسدس سے استفادہ کیا گیا ہے اور یہ شکل کسی مکان کی پائیداری کیلئے بہت ہی مناسب ہے (کیونکہ اگر ہم تھوڑے سے غور و فکر سے کام لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ مسدس شکل ہر طرف سے ضربی طاقتوں کی مانند ہوتی ہے جو کہ زیادہ سے زیادہ دباؤ کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے جب کہ مثلث اور مربع میں اس قدر صلاحیت نہیں ہوتی)

علاوہ ازیں شہد کی مکھی کا جسم ستون نما CYLINDRICAL ہوتا ہے جو اس قسم کے گھر میں آنے اور جانے کیلئے نہایت ہی موزوں ہوتا ہے۔

بہر حال قرآن مجید نے شہد کی مکھیوں کے گھر بنانے کے بارے میں جو اشارہ کیا ہے اس بارے میں ہم جس قدر بھی گہرائی میں جائیں گے اسی قدر حیرت انگیز اور تازہ ترین نکات سے باخبر ہوں گے، اور اس عجیب حشرہ کے خالق موجد اور مربی کی عظمت کے سامنے سر تعظیم جھکا دیں گے۔

## ۲۔ پھولوں کے رس سے شہد سازی

دوسری بات جسے قرآن مجید نے تاکید کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ ہے پھولوں کے رس سے شہد کا تیار کرنا، اور درحقیقت یہ بات ہے بھی حد سے زیادہ حیرت ناک اور تعجب انگیز۔ بعض سائنسدان کہتے ہیں: ”ایک کلوگرام شہد کے حصول کیلئے پچاس ہزار شہد کی مکھیوں کو سفر کرنا پڑتا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ صرف ایک گرام پھولوں کا رس حاصل کرنے کیلئے ان مکھیوں کو کتنے پھول چوسنے پڑتے ہیں؟ اس بارے میں بھی سائنسدانوں نے حساب لگایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک گرام رس حاصل کرنے کیلئے اوسط حد تک ساڑھے سات ہزار پھولوں کو چوسیں اور ان سے اُن کا رس نکالیں۔ اس حساب کی روشنی میں ایک کلوگرام شہد حاصل کرنے کیلئے انہیں سات ملین (پچھتر لاکھ) پھولوں کو چوس کر اُن کا رس نکالنا پڑتا ہے۔“<sup>[۱]</sup>

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ شہد کی مکھیاں روزانہ سترہ سے چوبیس بار سے بھی زیادہ مرتبہ رس حاصل کرنے کیلئے سفر کرتی ہیں۔ اگر آپ تعجب نہ کریں تو ہم آپ کو یہ بھی بتاتے چلیں کہ شہد کی کوئی بھی مکھی اپنی ساری زندگی آرام نہیں کر پاتی، بلکہ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ وہ عمر بھر نہیں سوتی، یعنی ساری زندگی بیدار رہتی ہے۔<sup>[۲]</sup>

اس جفاکش حشرہ کے مشقت بھرے کام کا اندازہ لگانے کیلئے اتنا کہنا کافی ہے کہ صرف چار سو گرام شہد کے حصول کیلئے شہد کی مکھی کو چھتے سے صحرا کے درمیان کم از کم اسی ہزار بار چکر لگانا پڑتے ہیں۔ اگر اس آمد و رفت کو پیش نظر رکھ کر تخمینہ لگایا جائے اور اوسط طور پر ہر مرتبہ

[۱] کتاب ”پرورش زنبور عسل“ ص ۱۱۲ و ۱۱۵

[۲] کتاب ”پرورش زنبور عسل“ ص ۱۱۲ و ۱۱۵

کو ایک کلو میٹر حساب کیا جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ چار سو گرام شہد کے حصول کیلئے شہد کی مکھی جو سفر طے کرتی ہے وہ کرہ زمین کے محیط کا دو گنا سفر ہوتا ہے۔ یعنی چار سو گرام شہد کی تیاری کیلئے جس رس کی ضرورت ہوتی ہے اس کے حصول کیلئے یہ محنت کش حشرہ زمین کے گردہ دو مرتبہ چکر لگانے کے برابر سفر طے کرتا ہے۔<sup>[۱]</sup>

اس نکتے کی طرف بھی پوری توجہ کی ضرورت ہے کہ بہت سے پھول ایسے ہوتے ہیں جن میں رس سار دن نہیں ہوتا کہ کسی وقت بھی مکھی جا کر اس سے وہ رس چوس لے، بلکہ دن میں صرف ایک مرتبہ اور وہ بھی مقررہ وقت پر اپنا رس پیش کرتے ہیں۔ وقت کے تعین کا تعلق خود پھول سے ہی ہوتا ہے۔ بعض پھول وہ ہیں جو صبح کے وقت رس دیتے ہیں، بعض ظہر کے وقت اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو بعد از ظہر دیتے ہیں۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ شہد کی مکھیاں ان کے اس طرح کے پروگراموں سے اچھی طرح واقف ہوتی ہیں۔ لہذا وہ ان کے پاس اس وقت جاتی ہیں جب ان کے رس دینے کا وقت ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اپنا وقت فضول ضائع نہیں کرتیں۔<sup>[۲]</sup>

درحقیقت جب انسان ان اعداد و شمار پر نگاہ ڈالتا ہے اور شہد کے حاصل کرنے کیلئے پروازوں کی تعداد اور پھولوں کی تعداد کو پیش نظر لاتا ہے تو اس کا سر شرم سے جھک جاتا ہے کہ اس حیات بخش مادے کے ایک گرام کیلئے جو اس نے دسترخوان پر رکھا ہوا ہے کہ ابھی اُسے نوش جان کرے، کس قدر مشقت اٹھانی گئی ہے۔ لیکن اگر اسی وقت اس جفاکش اور محنت شعار حشرے کے خالق اور پروردگار کی عظمت اور اس کے علم و قدرت کے بارے میں سوچ و بچار اور غور و فکر سے کام لے اور اس کے آگے اپنا سر جھکا دے تو اس کی نعمت کا شکر بجالائے گا۔ ممکن ہے کہ یہ سب کچھ اسی اعلیٰ مقصد کیلئے ہو!!

اس موقع پر آخری نکتہ جو ذکر کرنا ضروری ہے اور تفسیری بحث کی کیفیت سے خارج ہونے سے پہلے اس سلسلے کو ختم کرنا لازمی ہے، وہ یہ ہے کہ شہد کی مکھیوں کا کام، جہاں پھولوں کے رس کو جمع کرنا ہے وہاں وہ پھولوں کے ”زرد رنگ کے سفوف“ کو بھی اکٹھا کرتی ہیں جس کا نام ”پولین“ POLLEN ہے اور اسے شہد میں ملاتی ہیں۔

زرد رنگ کے اس سفوف کے زبردست خواص ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔ اس میں تیزابیت AMINO ACID کی بارہ قسمیں پائی جاتی ہیں، چربی کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں، نشوونما کے ہارمون ہوتے ہیں، شکر SUGAR پائی جاتی ہے وغیرہ۔ جن عنفوتوں اور روموں کا انٹی بیوٹک دوائیں علاج نہیں کر سکتیں۔ وہاں اس کے اثرات کارگر اور نہایت ہی مفید ہوتے ہیں۔<sup>[۳]</sup>

شہد کی مکھی کے پچھلے پاؤں کے پنے کنگھی اور مسواک نما ہوتے ہیں جن کے ذریعہ وہ پھول کے اس سفوف کو جمع کرتی اور اس کی ایک گولی بنا لیتی ہے۔ نیز انہیں پنچوں کے ساتھ ہی ”ٹوکری“ اور ”چمچے“ جیسی چیز ہوتی ہے جس سے اس گولی کو پکڑ کر ٹوکری میں رکھ لیتی ہے اور جب

[۱] کتاب ”جہاں حشرات“ (منقول از کتاب ”شکفتہ آفرینش ۱۳۳

[۲] کتاب ”حواس اسرار آیمیز حیوانات“ منصفہ ویٹس دروشر۔ ص ۱۵۷ قدرے خلاصہ کے ساتھ

[۳] کتاب ”فطریہ طبیعت و اسرار آن“ ص ۱۲۷

وہ چھتے کی طرف پلٹ کر جاتی ہے تو جہاں پھولوں کا رس اپنے ساتھ لے جاتی ہے وہاں زرد رنگ کی دو گولیاں بھی ساتھ لے جاتی ہے۔ یہ اس کا روزانہ کا معمول ہوتا ہے۔<sup>[۱]</sup>

### ۳۔ شہد غذا بھی ہے اور دوا بھی ہے

قرآن مجید نے مندرجہ بالا آیات کی تیسری قسم میں بیماریوں کی شفا کے سلسلے میں شہد کی اہم تاثیر کے مسئلہ پر گفتگو کی ہے اور مختصر سرستہ تعبیر کا استعمال کیا ہے۔ (فیہ شفاء للناس)

آج ماہرین غذا کے مطالعات اور تحقیقات کی روشنی میں اس کے اسرار و موز سے پردہ اٹھ چکا ہے۔ انہوں نے شہد کے ایسے بے شمار خواص اور اسرار ذکر کئے ہیں جنہیں جان کر انسان ورطہ حیرت میں پڑ جاتا ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ عسک ایک ایسا مادہ ہے کہ اگر وہ بالکل صحیح اور خالص ہو تو ہزار ہا سال تک خراب نہیں ہو پاتا کیونکہ وہ کسی بھی قسم کے جراثیم کو قبول نہیں کرتا۔<sup>[۲]</sup> - فراعنہ مصر کی قبروں سے ایسے شہد کے برتن بھی ملے ہیں جس کا تعلق کئی ہزار سال پہلے سے ہے اور یہ شہد بالکل ٹھیک حالت میں صحیح و سالم اور طبعی صورت میں تھا۔ یہ بات مندرجہ بالا دعویٰ کی دلیل ہے۔ چونکہ شہد مختلف پھولوں کے رس سے حاصل کیا جاتا ہے (معلوم ہے کہ ہر ایک پھول کی اپنی مخصوص طبی خاصیت ہوتی ہے) اسی لئے شہد میں ان پھولوں کے مجموعی طور پر خواص موجود ہوتے ہیں۔

سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ شہد وٹامنز اور دیگر خاصیات کے حامل ہونے کی وجہ سے ایک زندہ مادہ ہوتا ہے۔ اس میں چھ وٹامنز یعنی A, B, C, D, E, K پائے جاتے ہیں اور معدنی مواد یعنی پوٹاشیم، آئرن، فاسفورس، سکہ، میگنیشیم، تانبا، سفلر، سوڈیم اور دوسرے کئی مواد پائے جاتے ہیں نیز تیزابیت کی کئی انواع کا حامل بھی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ان مواد میں سے ہر ایک کا انسانی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اسی لئے شہد بھی مندرجہ ذیل خواص کا حامل ہوتا ہے:

شہد، خون بنانے کیلئے مؤثر ہے۔

شہد، عضلات کی تھکاوٹ کے دور کرنے کیلئے کارآمد ہے۔

شہد، معدہ اور آنتوں میں عفونت کو دور کرتا ہے۔

شہد، اس بات کا موجب بن جاتا ہے کہ حاملہ عورتوں سے پیدا ہونے والے بچوں کے پٹھے مضبوط ہوں۔

شہد، ان لوگوں کیلئے مفید ہوتا ہے جس کا نظام ہضم کمزور ہوتا ہے۔

[۱] جملہ ”تندرست“

[۲] کتاب اولین دانش گاہ جلد ۵ ص ۱۲۹ (قدرے اختصار کے ساتھ)



شہد، کا شمار ایسی چیزوں میں ہوتا ہے جو کمزوری کی تلافی کرتی ہیں۔  
 شہد، دل کی تقویت کیلئے مؤثر ہوتا ہے۔  
 شہد، مُسن لوگوں کیلئے کافی حد تک طاقت ایجا کرتا ہے۔  
 شہد، معدہ اور انتڑیوں کے زخم کا مؤثر علاج ہے۔  
 شہد، تنگی نفس (دمہ) کیلئے مفید ہے۔  
 شہد، پھیپھڑے کی بیماریوں کیلئے بہترین معاون ہے۔  
 شہد، جوڑوں کے درد کیلئے معالج دوا ہے۔ پٹھوں کی نشوونما کیلئے مفید ہے اور اعصاب کی تکلیف کیلئے مؤثر علاج ہے۔  
 شہد، اسہال کی تکلیف میں مبتلا افراد کیلئے مفید ہے کیونکہ اس میں جراثیم ختم کرنے کی خاصیت پائی جاتی ہے۔  
 شہد، سے ایسی دوائیں بنائی جاتی ہیں جو جلد کی خوبصورتی اور لطافت کیلئے فائدہ مند ہوتی ہیں اور جلد کی ناہمواریوں کو دور کرتی ہے۔  
 شہد، سے ایسی دوائیں تیار کی جاتی ہیں جن سے منہ کے ورم کو تسکین ملتی ہے اور ان سے خوشبو پیدا ہوتی ہے۔  
 شہد، جلد کی خشکی، اس کے پھٹنے، چلنے، اس پر پھنسیاں پیدا ہوجانے، جانوروں کے دردناک ڈنک، آنکھ کے ورم اور کھانسی کے علاج کیلئے بھی مفید دوا ہوتی ہے۔

بعض دانشوروں نے پھولوں کے رس ایسی گولیاں TABLETS تیار کی ہیں جن میں شہد جیسے خواص ہیں، جن کا اہم ترین اثر جوانی کی توانائیوں میں اضافہ کرنا، خلیوں کو فعال بنانا خوشگوار پیدا کرنا اور عمر کا لمبا بنانا ہے۔<sup>[1]</sup>  
 اسی لئے تو مشہور ہے کہ مشہور دانشور ”فینا غورث“ PYTHAGORAS اپنے شاگردوں کو ہدایت کرتے ہوئے کہتے تھے ”جتنا ہو سکے شہد اور ٹیٹھی کھایا کرو“ اور ”بقراط“ کہا کرتے تھے ”اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری عمر لمبی ہو تو شہد کھایا کرو۔“  
 شہد کے مقوی اثرات اور طبی خواص وغیرہ اس قدر زیادہ ہیں کہ اس مختصر سی کتاب میں نہیں سما سکتے، حتیٰ کہ بعض دانشوروں نے تو شہد کے غذائی اور طبی خواص کے بارے میں مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ قرآن مجید نے ان سب مطالب کو ایک ہی جملہ میں دلچسپ انداز میں بیان فرما دیا ہے: ”فِيهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ“

اگر آپ تعجب نہ کریں تو ہم یہاں پر بھی بتاتے چلیں کہ شہد کی مکھی کا ڈنک اور اس میں موجود ہر بھی بہت سی بیماریوں کے علاج کیلئے مفید ہے، جیسے جوڑوں کا درد، ملیر یا گلٹیوں کا پیدا ہوجانا، اعصاب کا درد، آنکھوں کی بعض بیماریاں وغیرہ۔ یہ ڈنک باقاعدہ پروگرام کے مطابق ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق انجام پایا جانا چاہیے۔ مثلاً پہلے دن ایک ڈنک، دوسرے دن دو، تیسرے دن تین اسی طرح دسویں دن دس ڈنک لگائے جانے چاہئیں جب کہ علاج کا یہ پہلا مرحلہ ہوتا ہے۔ بعد کے مرحلہ کیلئے پروگرام دوسری صورت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی ذہن

[1] کتاب ”اولین دانش گاہ“ جلد 5 ص 212 تا 290، رسالہ ”طب و دارو“ اور دوسری کتابیں۔

نشین رہتی چاہیے کہ ڈنک کے ذریعہ علاج اگر مقررہ حد سے تجاوز کر جائے تو خطرے کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ جو لوگ اس سے حساس ALLERGIC ہیں اُن کیلئے کم مقدار میں مضر ہوتی ہے۔

بعض دانشوروں نے اس بارے میں ایک یا کئی مقالے بھی تحریر کئے ہیں اور کئی لوگوں نے تو ”زنبورِ عسل کی زہر کا حاصل اور اس کے خواص“ کے تحت مقالہ نگاری کر کے ڈاکٹری کی سند بھی حاصل کی ہے۔ (ڈاکٹریٹ کی ہے) [۱]

## ۴۔ زنبورِ عسل کی اور خدمات جو شہد سے بھی زیادہ قیمتی ہیں

شہد کی کھبیوں کی زندگی بڑے بڑے عجائبات کی حامل ہے جو کچھ ابھی تک بتایا جا چکا ہے وہ تو صرف اس کا ایک حصہ ہے موم بنانے کی داستان، جو کہ شہد کی کھبیوں کا گھر ہے، بجائے خود ایک مفصل داستان ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ موم صرف ان کے گھر بنانے کے ہی کام نہیں آتی بلکہ بعض اوقات وہ اس سے ایسے حشرات کو بھی ”مومیا“ دیتی ہے جو اس کیلئے مزاحمت کا سبب بنتے ہیں اور اس طرح وہ اُن کے شر سے محفوظ ہو جاتی ہیں۔ زنبور ان عسل کے ایک ماہر کا کہنا ہے:

”ایک دن چھتے کے اندر موجود ایک گولی نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی جو نسبتاً بڑی سی گولی تھی۔ جب اس نے اُسے کھول کر دیکھا تو اس میں ٹڈی کا ایک ڈھانچہ تھا جو کھبیوں کے ذریعہ ”مومیا“ جا چکا تھا۔“

بعض دانشوروں کا قول ہے کہ ”موم، شہد کی روح اور شہد پھولوں کی روح ہوتی ہے۔ اور اس قدرت لطیف ہوتی ہے کہ زنبورِ عسل کے شہر کے پانچ سو گھروں کا وزن چند گرام سے زیادہ نہیں ہوتا، اگرچہ ہمارے لئے یہ جاننا مشکل ہے کہ شہد کی کھیاں اسے کیونکر تیار کرتی ہیں؟ لیکن آج اتنا ضرور جانتے ہیں کہ موم کا مصنوعات میں اہم مصرف ہوتا ہے۔ پھولوں کے بارور کرنے میں شہد کی کھبیوں کا بڑی حد تک دخل ہے اور یہ اُن کا اہم ترین کارنامہ ہے۔ ایک دانشور کے بقول:

”حشرات کے بغیر ہماری ٹوکریاں، پھل اور میووں سے خالی ہو جائیں کیونکہ جن حشرات کا پھولوں سے واسطہ ہوتا ہے وہ دوسرے تمام عوامل سے بڑھ کر ایک پھول کے سفوف کو دوسرے پھول میں منتقل کر سکتے ہیں۔ جب ایک پھول کا دوست حشرہ اپنی سونڈ کو پھول میں داخل کرتا ہے، یا جیسا کہ عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے وہ اپنے بدن کا ایک حصہ پھول کے کاسہ میں داخل کرتا ہے، تو اُس کا بدن پھول کے زرد رنگ کے سفوف سے ڈھکا ہوتا ہے اور وہ فوراً اسے پھول میں پہنچا دیتا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں پھول کا سفوف ایک مؤثر عامل ہوتا جس کے بغیر نہ توجیح دانے میں تبدیل ہو سکتا ہے اور نہ ہی تمدان میوہ میں۔ فلسفی نکتہ نظر سے یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ پھولوں کے دوست حشرے اپنی پیدائش کے پہلے ہی دن سے پھولوں سے واسطہ رکھتے ہی۔۔۔ یہ دونوں برابر کی سطح پر بڑھتے اور ارتقاء پاتے رہتے ہیں، اور آج اس مرحلہ تک جا پہنچے ہیں کہ ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔۔۔۔۔ پھولوں کے اہم ترین حشرے، جنہیں یقیناً آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں،

پردانے، شہد کی مکھیاں اور بھڑیں ہوتی ہیں۔۔۔ لیکن ان تمام حشرات میں سب سے زیادہ پھولوں کا سفوف منتقل کرنے اور رس حاصل کرنے کیلئے شہد کی مکھیاں زیادہ موثر اور کارگر ہوتی ہیں۔<sup>[۱]</sup>

یہ بات بھی باقل توجہ ہے کہ جن درختوں کے پھول دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک نر اور دوسرے مادہ، ان کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ درخت جواز خود پھول نہیں دیتے کیونکہ ان میں اپنے پھولوں کو بارور کرنے کی قدرت نہیں ہوتی اور دوسرے وہ درخت جو پھل دیتے ہیں، ان میں یہ قدرت ہوتی ہے۔

پہلی قسم کو بارور کرنے کیلئے کسی واسطے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ”واسطہ“ زنبورانِ عسل ہی ہوتی ہیں۔ یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ بارور سازی کا اسی فیصد عمل شہد کی مکھیوں کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ شہد کی مکھیوں کے عمل اور سرگرمیوں کو جاننے کیلئے اس بات کی طرف توجہ ضروری ہے کہ سیب، ناشپاتی، چیری، بادام اور اس قسم کے دوسرے پھلدار درختوں کا شمار پہلی قسم میں ہوتا ہے۔

زنبورانِ عسل کی بجائے کیمیکل، مکینیکل اور دوسرے ذرائع سے درختوں کی باروری کی تمام کوششیں شکست سے رو برو ہو چکی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پھولوں کے حصول کیلئے زنبورانِ عسل کا کس حد تک دخل ہے؟<sup>[۲]</sup>

بعض سائنسدان کہتے ہیں:

”اگر شہد کی مکھیاں ہمیں ایک ہزار روپے کا شہد اور موم عنایت کرتی ہیں، تو کم از کم دو لاکھ روپے کی ہمیں زراعت میں

امداد کرتی ہیں۔<sup>[۳]</sup>

ہم اپنی اس گفتگو کو ماہر حیاتیات مسٹر ”مترلنگ“ کے اس عجیب جملے سے ختم کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

”اگر آج شہد کی مکھیاں (خواہ وہ پالتو ہوں یا غیر پالتو) ختم ہو جائیں تو نباتات، پھولوں اور میووں کی ایک لاکھ قسمیں تباہ ہو جائیں

اور معلوم نہیں کہ اصولی طور پر ہمارا تمدن ہی ختم ہو جائے۔“<sup>[۴]</sup>

## ۵۔ شہد کی مکھیوں کی جسمانی ساخت بھی عجیب ہے!

شہد کی مکھیوں کی جسمانی ساخت کی بھی بجائے خود ایک طویلانی اور حیرت انگیز داستان ہے۔ اس میں اس کی آنکھ سب سے زیادہ عجیب ہوتی ہے۔ سائنسدان کہتے ہیں ”شہد کی مکھی کی آنکھ ڈھائی ہزار چھوٹے صفحات پر مشتمل ہوتی ہے جن کا ایک دوسرے کا باہمی زاویہ دو سے تین

[۱] ”نظری بہ طبیعت و اسرار آن“ ص ۱۲۶

[۲] پرورش زنبور عسل۔ ص ۲۳۳ و ۲۳۴ (اختصار کے ساتھ)

[۳] کتاب جہاں حشرات۔ سے اقتباس

[۴] اولین دانشگاہ جلد ۵ ص ۵۵

درجے ہوتا ہے۔ ان آنکھوں میں اس قدر طاقت ہوتی ہے کہ بادلوں کے پیچھے چھپے ہوئے سورج کے اصل مقام کو دیکھ سکیں اور یہ ماورائے نبض ULTRA.VIOLET شعاعوں کے ذریعہ ہی ہوتا ہے جو ان کی آنکھوں پر اثر ڈالتی ہیں۔ شہد کی مکھیوں کی زبان اور ان کا باہمی مشورہ ایسے علمی حقائق ہیں جو ان آخری چند سالوں میں دریافت ہوئے ہیں [۱]

شہد کی مکھیاں رنگ برنگے پھولوں کو ان کی شکل و صورت میں نہیں دیکھتیں جیسے ہم دیکھتے ہیں، بلکہ وہ انہیں ماورائے نبض ULTRA.VIOLET روشنی کے ذریعہ دیکھتی ہیں۔ یہ روشنی ان کی زینائش اور جلوؤں میں اور اضافہ کر دیتی ہے (اور مکھیوں کو ان کی طرف کھینچ لاتی ہے۔ [۲])

افسوس کہ ہماری بحث کی نوعیب ہمیں اجازت نہیں دیتی کہ ہم اس بارے میں اس سے زیادہ گفتگو کریں، لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ اس حشرہ کے بارے میں خداوند عالم نے قرآن مجید میں جو کچھ فرمایا ہے، ہم اس پر جتنا زیادہ غور و فکر کریں گے اتنا ہی زیادہ اس کے خالق کی عظمت و قدرت کے اسرار ہم پر آشکار ہوتے جائیں گے۔ اور ”حسن اختتام“ کے طور پر ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے کلام کی طرف دل کے کان لگاتے ہیں جو آپ نے ”توحید مفضل“ میں ارشاد فرمایا ہے:

”اے مفضل! شہد کی مکھی، اس کے شہد کی صنعت اور چھ کوٹنے والا گھر بنانے کی طرف نگاہ کرو اور اس کی زندگی اور ہوشیاری کے مختلف گوشوں کی طرف خوب غور کرو۔ اگر تم اس بارے میں خوب اور اچھی طرح غور کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ وہ ایک عجیب اور غریب مخلوق ہے۔۔۔۔۔ اس بارے میں روشن نشانیاں اس بات پر ہیں کہ غسل تیار کرنے کی صنعت میں مندر بالا حکمت شہد کی مکھی کی نہیں بلکہ اس کی ہے جس نے اس مکھی کو پیدا کیا ہے اور انسانی مصلحتوں کے لئے اسے مسخر کیا ہے۔ [۳]

[۱] حواس اسرار آمیز حیوانات ص ۱۳۷، ص ۱۴۰، ص ۱۴۳

[۲] ”راز آفرینش انسان“، ص ۹۳

[۳] بحار الانوار جلد ۳ ص ۱۰۸

## ۱۹۔ جانوروں کی تخلیق میں پروردگارِ عالم کی نشانیاں

اشارہ:

کائنات کی زندہ مخلوق کا ایک عظیم حصہ جانوروں پر مشتمل ہے۔ حیوانات اپنی مختلف ساخت، گونا گوں شکلوں، نوع بہ نوع صورتوں اور عظیم تعجب خیز یوں کی وجہ سے ہر دیکھنے والے کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک جانور کے بارے میں مطالعہ انسان کو ان کے خالق کے بے انتہا علم اور اس کے بے مثال قدرت سے آگاہ کرتا ہے۔ اس مسئلہ کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب ہم ان جانوروں کو ایک جگہ پر اور ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ دیکھیں۔ مثلاً ہم چڑیا گھر چلے جائیں اور مچھلیوں کی قسموں، مختلف پرندوں، بندروں، شیروں، چیتوں، زرافوں اور ہاتھیوں کی مختلف انواع کو یکے بعد دیگرے دیکھیں، ان میں سے ہر ایک کی حرکات و سکنات، عادات و اطوار اور عجائبات تخلیق کو نور سے ملاحظہ کریں، تو ممکن نہیں ہے کہ کوئی بھی شخص جس میں رتی بھر بھی عقل و شعور ہے ان کے دیکھنے کے وقت گہری سوچ میں نہ پڑ جائے اور ان عجیب و غریب جانوروں کے خالق کے سامنے سر تعظیم نہ جھکا دے۔

ان جانوروں میں پالتو جانور بھی ہیں جو انسان کی خدمت کیلئے ہمہ وقت کمر بستہ نظر آتے ہیں اور انسان کیلئے گونا گوں فوائد و برکات کے حامل ہیں۔ ایسے جانور زیادہ قابل توجہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خداوندِ عالم نے قرآن مجید میں اپنی توحیدی آیات میں ویسے تو کلی طور پر روئے زمین پر چلنے والی تمام مخلوق پر، لیکن چوپایوں اور جانوروں پر خصوصی طور پر زور دیا ہے اور متعدد آیات میں ان کی حیرت انگیز زندگی کے مختلف گوشوں کو ذکر فرمایا ہے: اس مختصر سے اشارے کے ساتھ ہم مندرجہ ذیل آیات کو گوش جان سے سماعت کرتے ہیں:

۱۔۔۔ وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا مِنْ دَابَّةٍ وَهُوَ عَلَىٰ

جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَاءُ قَدِيرٌ ﴿۲۵﴾ (شوریٰ ۲۹)

۲۔۔۔ إِنَّ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿۳﴾ وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُذُّ

مِنْ دَابَّةٍ آيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿۴﴾ (جاثیہ ۳-۴)

۳۔۔۔ أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۴﴾ (غاشیہ ۱۴)

۴۔۔۔ وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۖ نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهَا وَلَكُمْ فِيهَا

مَنَافِعَ كَثِيرَةٌ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿۱۱﴾ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ ﴿۲۲﴾

(مومنون ۲۱-۲۲)

۵۔۔۔ وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۖ نُسُقِيكُمْ فِيهَا فِي بُطُونِهِ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ  
وَدَمٍ لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِلشَّهِيبِ ۖ ﴿٦٦﴾

(نحل-۶۶)

۶۔۔۔ وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ جُلُودِ الْأَنْعَامِ  
بُيُوتًا تَسْتَخِفُّونَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ إِقَامَتِكُمْ ۖ وَمِنْ أَصْوَابِهَا  
وَأَوْبَارِهَا وَأَشْعَارِهَا أَثَاثًا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ ﴿٨٠﴾

(نحل-۸۰)

۷۔۔۔ وَمِنَ النَّاسِ وَالْذَّوَابِ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَلِكَ ۖ إِنَّمَا يَخْشَى  
اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ ﴿٨٨﴾

(فاطر-۲۸)

۸۔۔۔ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِنْ مِثْلِ أَيِّدِينَا أَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا  
مِلْكُونَ ﴿٤١﴾

وَذَلَّلْنَاهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوبُهُمْ وَمِنْهَا يَأْكُلُونَ ﴿٤٢﴾ وَلَهُمْ فِيهَا مَنَافِعُ  
وَمَشَارِبٌ ۖ أَفَلَا يَشْكُرُونَ ﴿٤٣﴾

(یس-۷۱، ۷۲، ۷۳)

۹۔۔۔ وَالَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا  
تَرَكَبُونَ ﴿١٣﴾ لِيَتَسْتَوْا عَلَىٰ ظُهُورِهِ ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ  
عَلَيْهِ وَتَقُولُوا سُبْحٰنَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ ﴿١٤﴾

(زخرف-۱۳، ۱۴)

۱۰۔۔۔ اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَنْعَامَ لِتَرْكَبُوا مِنْهَا وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿٤٩﴾ وَلَكُمْ  
فِيهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوا عَلَيْهَا حَاجَةً فِي صُدُورِكُمْ وَعَلَىٰ الْفُلْكِ

## تَحْمُلُونَ ﴿۱۰﴾ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ ۖ فَآيَ آيَاتِ اللَّهِ تُنْكِرُونَ ﴿۱۱﴾

(مؤمن ۷۹ تا ۸۱) ﴿۱۱﴾

### ترجمہ

۱..... اور اس کی آیات میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور ان جانداروں کا پیدا کرنا جو اس نے زمین و آسمان میں پھیلا رکھے ہیں اور جب چاہے ان کے جمع کر لینے پر قادر ہے۔

۲..... اس میں شک نہیں کہ آسمانوں اور زمین میں اس کی ان لوگوں کیلئے بہت سی نشانیاں ہیں جو اہل ایمان ہیں۔ اسی طرح تمہاری پیدائش میں بھی اور ان چلنے والوں کی پیدائش میں بھی جو اس نے زمین پر پھیلا رکھے ہیں ان لوگوں کیلئے بہت سی نشانیاں ہیں جو یقین رکھتے ہیں۔

۳..... کیا وہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے پیدا کیا گیا ہے؟

۴..... اور تمہارے لئے چوپاؤں میں عبرت ہے، اور جو کچھ ان کے پیٹ میں ہے اس سے ہم تم کو (دودھ) پلاتے رہتے ہیں اور چوپایوں میں تمہارے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ ان کا گوشت تم کھاتے ہو، اور ان پر اور کشتیوں پر سوار ہوتے ہو۔

۵..... اور چوپایوں کے وجود میں بھی تمہارے لئے عبرت (کادرس) ہے کہ ان کے پیٹ میں سے ان کی ہضم شدہ غذا اور خون سے ہم تم کو خالص اور خوشگوار دودھ پلاتے ہیں۔

۶..... اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تمہارے گھروں میں (آرام اور) سکون کی جگہ قرار دی ہے اور چوپایوں کے چمڑے سے بھی تمہارے لئے گھر بنائے ہیں۔ جنہیں تم اپنے کوچ اور اپنے قیام کے دن آسانی کے ساتھ جا بجا کرتے رہتے ہو۔ اور ان چوپایوں کی اون، روؤں اور بالوں سے ایک خاص وقت تک کیلئے (تمہاری زندگی کے مختلف وسائل) اسباب اور کارآمد چیزیں بنائی ہیں۔

۷..... اور انسانوں، چلنے والوں اور چوپایوں کی بھی طرح طرح کی رنگتیں پیدا کی ہیں۔ (جی ہاں) حقیقت بھی

﴿۱۱﴾ اس بارے میں قرآن مجید کی اور بھی بہت سی آیات موجود ہیں جیسے شعراء۔ ۳۳، انعام۔ ۱۴۲، زمر۔ ۶ اور زخرف۔ ۱۱

یہی ہے کہ خدا کے بندوں میں سے صرف علماء ہی اس سے ڈرتے ہیں خداوند عالم ہی غالب اور بخشنے والا ہے۔  
۸..... کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ ہم اپنی قدرت کے ساتھ عمل میں لائے ہیں؟ چوپایوں کو ان کیلئے پیدا کیا ہے کہ وہ ان کے مالک ہیں..... انہیں ان کیلئے مطیع بنا دیا ہے، ان میں سے کچھ تو ان کی سواریاں ہیں اور کچھ سے وہ غذا حاصل کرتے ہیں..... اور ان کیلئے ان میں بہت سے دوسرے فوائد بھی ہیں اور پینے کی خوشگوار چیزیں بھی، آیا پھر بھی وہ شکر بجا نہیں لاتے؟

۹..... وہ وہی تو ہے جس نے تمام چیزوں کے جوڑے پیدا کئے ہیں، اور تمہارے لئے کشتیوں اور چوپایوں سے سواریاں بنائی ہیں، جن پر تم سواری کرتے ہو..... تاکہ تم ان کی پشت پر اچھی طرح بیٹھ سکو۔ پھر جب تم ان پر اچھی طرح سوار ہو جاؤ تو اپنے پروردگار کی نعمتوں کو یاد کرو، اور کہو پاک و منزه ہے وہ ذات جس نے اسے ہمارے لئے مسخر کر دیا ہے ورنہ ہم میں تو اس کی طاقت نہیں تھی۔

۱۰..... خداوند عالم ہی تو ہے جس نے چوپایوں کو تمہارے لئے پیدا کیا ہے تاکہ تم ان میں سے کچھ پر سواری کرو اور کچھ سے غذا حاصل کرو اور تمہارے لئے ان میں بہت سے اہم فوائد ہیں، مقصد یہ ہے کہ تم ان کے ذریعہ اپنی منزل مقصود تک جا پہنچو، اور ان پر اور کشتیوں پر سواری کرو..... وہ ہمیشہ اپنی آیات تمہیں دکھاتا ہے، تم اس کی کس کس آیت کا انکار کرو گے؟

## الفاظ کے معانی اور تشریح

”دابة“ جیسا کہ ہم پہلے بیان چکے ہیں۔ ”دبیب“ کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں آہستہ اور نرمی سے چلانا۔ لیکن عام طور پر اس کا اطلاق تمام چلنے والوں پر ہوتا ہے یہ لفظ مذکر، مؤنث اور ان تمام چیزوں کیلئے استعمال ہوتا ہے جو زمین پر چلتی ہیں حتیٰ کہ آسمان کے پرندوں پر بھی بولا جاتا ہے اس کی جمع ”دواب“ ہے جس کے معنی ”چلنے والے“ ہیں۔

کبھی اس کا اطلاق ایک چیز کے دوسری چیز میں حلول کر جانے اور راسخ ہو جانے پر بھی ہوتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے ”دب الشرباب فی لجسمہ ودب السقم فی البدن“ یعنی مشروب جسم میں اور بیماری بدن میں رسوخ کر چکی ہے۔

یہ لفظ انسان پر بھی بولا جاتا ہے اور قرآن مجید میں اس کے استعمال کے بہت سے مقامات اس مدعا کے شاہد ہیں [۱]

[۱] لسان العرب، مفردات راغب اور مجمع البحرین (مادہ دب)



”انعام“، ”نعم“ (بروزن قلم) کی جمع ہے جو اصل میں ”نعمت“ سے لیا گیا ہے پھر اس کا اطلاق ”اونٹ“ پر ہونے لگا کیونکہ عربوں کے نزدیک اونٹ بہت بڑی نعمت تھا۔ دوسرے چوپایوں مثلاً گائے اور گوسفند پر بھی لفظ بولا جاتا ہے بشرطیکہ اونٹ بھی ان میں شامل ہو۔<sup>[۱]</sup>

کچھ ارباب لغت نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ ”نعم“ میں جمع کا معنی پایا جاتا ہے جس کا مفرد نہیں ہے اور ”انعام“ جمع الجمع ہے۔<sup>[۲]</sup>

”ان منظور“، ”لسان العرب“ میں کہتے ہیں ”نعم“ اس جانور کو کہتے ہیں جو چرنے جاتا ہے پھر وہ بعض لوگوں سے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ”نعم“ خصوصی طور پر ”اونٹ“ کو کہا ہے اور بعض دوسرے لوگوں سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں ”نعم“ اونٹ اور گوسفند کو کہا جاتا ہے۔ ”نعامة“ شتر مرغ کو کہتے ہیں کیونکہ وہ جسم کے بڑا ہونے کی وجہ سے ”اونٹ“ سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے پھر اسی مناسبت سے پہاڑوں وغیرہ میں بنائے جانے والے سائبانوں اور راہ پیدا کرنے کیلئے نصب کئے جانے والے جھنڈوں کو بھی ”نعامة“ کہا جاتا ہے۔ بہر حال ”انعام“ پہلا معنی خواہ کچھ بھی ہوں، معمول کی بول چال میں ان جانوروں کو کہا جاتا ہے جو چرنے کو جاتے ہیں جیسے گائے بھیڑ بکری اور اونٹ وغیرہ۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### حیوانات کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟

اس سلسلے کی پہلی اور دوسری آیت میں پہلے تو زمین و آسمان میں خداوند عالم کی نشانیوں انسان کی تخلیق اور زمین و آسمان میں چلنے والی تمام مخلوق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے پھر فرماتا ہے ”خداوند عالم کی نشانیوں میں آسمان و زمین اور چلنے والی وہ چیزیں ہیں جنہیں اس نے پیدا کیا اور پھیلا دیا ہے“ (ومن آياته خلق السموات والارض وما بث فيهما من دابة) ”بث“ دراصل اس چیز کو کہتے ہیں جسے منتشر کیا جائے جیسا کہ ہوا مٹی کو منتشر کر دیتی ہے ان آیات میں اس کے معنی مختلف چیزوں کا ایجاد و خلق کرنا، آشکار کرنا اور مختلف مقامات پر انہیں پھیلانا ہے۔

بہر حال یہ تعبیر تمام چلنے والوں جانوروں اور انسانوں کو شامل ہے۔ خوردبین سے دیکھی جانے والی مخلوق جو ظریف اور موز حرکت

[۱] مفردات راغب

[۲] مجمع البحرین اور اقرب الموارد۔

کرتی ہے سے لے کر غول پیکر جانوروں تک اس میں شامل ہیں کہ جن کی لمبائی بیسیوں میٹر اور وزن سوٹن سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ [۱] ہذا القیاس پرندوں کی مختلف قسمیں، گونا گوں حشرات کی لاکھوں قسمیں جنگلی اور پالتو جانوروں کی ہزار ہا قسمیں، درندے، خزندے، چھوٹی اور بڑی مچھلیاں اور تمام دریائی مخلوق غرض دنیا کی ساری زندہ مخلوق اس میں شامل ہے۔

اگر ہم ”دابتہ“ کے مفہوم کی وسعت اور ہر قسم کی چلنے والی مخلوق کی تمام اقسام پر اس کے اطلاق کے بارے میں غور و فکر کریں تو عجائبات الہی اور اس کی قدرت نمائی کی ایک کائنات ہمارے سامنے مجسم ہو کر آ جاتی ہے جن میں ہر ایک چیز بذات خود خداوند عالم کے علم و قدرت سے آگاہ کرتی ہے۔

مختلف جانوروں کی ساخت اور ان کی زندگی کی خصوصیات کے بارے میں مختلف زبانوں میں ہزار ہا کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور اس بارے میں حد سے زیادہ فلمیں بھی تیار کی جا چکی ہیں، مختلف زبانوں میں اخبارات و مجلات شائع کئے جا چکے ہیں اور کئے جا رہے ہیں کہ جن کا مطالعہ اور مشاہدہ انسان کو حیرت اور استعجاب کے سمندر میں غرق کر دیتا ہے۔ پھر یہ کہ ان چیزوں کی شناخت کیلئے دانشوروں کی طرف سے ہزار ہا سال سے جو کوشش کی جا رہی ہے اور کی جا چکی ہے ابھی تک ان کی زندگی کے ایک گوشے سے ہی پردہ اٹھایا جا چکا ہے۔ اور جوں جوں دن گزرتے جائیں گے نئے انکشافات سامنے آتے جائیں گے۔

بعض دانشوروں نے اپنی زندگی کے بیس سال صرف چیونٹیوں کی تحقیقات پر ہی صرف کر دے ہے، اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا اور تمام جانوروں پر اسی طریقے سے تحقیقات جاری رکھی گئی تو معلوم نہیں کہ انسانیت کی تمام عمر اسی پر صرف ہو جائے۔

پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ہم جو بات کر رہے ہیں۔ وہ سب اسی زمین پر رہنے والی مخلوق کے بارے میں ہے جب کہ ”فیہما“ (آسمان وزمین میں موجود) کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں میں بھی بہت سے چلنے والی مخلوق موجود ہے جو ہمارے دانشوروں کی دسترس سے مکمل طور پر خارج ہے، شاید ایک دن ایسا آجائے کہ انسان خلائی سفر کے ذریعہ دوسرے کرہوں میں موجود دوسرے عجیب و غریب مخلوق تک رسائی حاصل کرے کہ آج جن کی صورت اور خصوصیات کا تصور بھی ہمارے لئے محال ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آسمان میں چلنے والی مخلوق سے مراد فرشتے ہیں۔ حالانکہ ”دابتہ“ کے لفظ کا فرشتے پر اطلاق نہیں ہوتا۔ بعض حضرات نے اس گمان کے تحت کہ آسمان میں فرشتوں کے علاوہ کوئی اور زندہ مخلوق نہیں ہے آیت کی کئی دوسری تفسیریں بیان کی ہیں جب کہ آج یہ بات ہم پر روشن ہو چکی ہے کہ زندہ مخلوق صرف ہماری ہی زمین پر نہیں ہے بلکہ سائنسدانوں کے بقول اس بیکراں فضا میں لاکھوں

[۱] بعض غول پیکر مگر مچھلے بھی ہیں کہ جن کا وزن ایک سو بیس ٹن تک جا پہنچتا ہے۔ کتاب ”نظریہ طبیعت و اسرار آن“ کے مصنف ”پروفیسر لٹون برٹین“ کے مطابق وزن ان کی یہ مقدار پندرہ سو تو ہی ہیکل مردوں یا جو بیس بڑے ہاتھیوں کے وزن کے برابر ہے۔ موصوف نے اس کے اجزاء بدن کا بھی حساب کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کے دل کا وزن چھ سو کلوگرام خون کا وزن آٹھ ہزار کلوگرام بھی پھڑوں کا وزن ایک ٹن، پٹھوں کا وزن پچاس، چمڑے، ہڈیوں معدے اور انتڑیوں کا وزن ساٹھ ٹن بنتا ہے۔

، کروڑوں کڑے موجود ہیں جو مختلف قسم کی چلنے والی مخلوق اور جاندار چیزوں کیلئے سکونت اور رہائش کے قابل ہیں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ زندہ موجودات صرف اپنی ساخت اور زندگی کے مختلف اطوار کے لحاظ سے ہی آیات الہی میں شمار نہیں ہوتیں بلکہ اپنے گونا گوں اور مختلف فوائد و برکات کی وجہ سے بھی جو وہ عالم انسانیت کی خدمت کیلئے انجام دیتے ہیں، خدا کی آیات میں شمار ہوتے ہیں۔

اور اگر وہ یہ فرماتا ہے کہ ”یہ آیات ان لوگوں کیلئے ہیں جو اہل یقین ہیں“ تو اس سے ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو حق کو قبول کرنے اور اس پر ایمان لانے کیلئے آمادہ ہوتے ہیں نہ کہ وہ جو ہٹ دھرم، منکر اور خود خواہ ہوتے ہیں۔

اسی سلسلہ کی تیسری آیت میں جھڑک کر پوچھا جا رہا ہے ”کیا وہ لوگ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے پیدا کیا گیا ہے؟ (افلا یبظرون الی الابل کیف خلقت)

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس کے بعد ہی آسمان کی تخلیق کی عظمت، پھر پہاڑوں اور بعد میں زمین کی عظمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان امور کے ساتھ ہی اونٹ کا قرار پانا بذات خود اس جانور کی عظمت کی دلیل ہے۔

اس حیوان کے حالات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں کچھ ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو اسے دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتی ہیں اور ان خصوصیات کو پیش نظر رکھا کر یہ بات بخوبی روشن ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید نے اس موضوع کو زور دے کر کیوں بیان فرمایا ہے؟ چنانچہ اس کی خصوصیات میں سے کچھ کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ اونٹ کے اندر قوت مزاحمت بہت پائی جاتی ہے بڑی حد تک بھوک کو برداشت کر لیتا ہے اور پیاس جو بھوک سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہے کو دس دن بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصے تک برداشت کر سکتا ہے۔ اسی لئے تو یہ خشک اور جھلسا دینے والے صحراؤں میں سفر کرنے کیلئے بہترین سواری ہے۔ اس کی اس ادا کی وجہ سے ہی تو اسے ”ریگستان کا جہاز“ کہتے ہیں کیونکہ وہ غذائی مواد اور پانی کو اپنے اندر کافی عرصے کیلئے ذخیرہ کر لیتا ہے اور اسے خرچ کرنے میں کفایت شعاری سے کام لیتا ہے۔

۲۔ وہ اپنی غذا کے حصول کیلئے کسی خاص قسم کی خوراک کا پابند نہیں ہے بلکہ عموماً جنگل میں اگنے والی ہرنباتات کو کھا لیتا ہے۔

۳۔ اس سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ وہ گردوغبار سے اٹے ہوئے صحراؤں میں، جن کی ریت انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہے بڑے آرام سے سفر جاری رکھ سکتا ہے وہ اپنے نتھنوں کو وقتی طور پر بند کر سکتا ہے، اپنے کانوں کو ریت اور دوسرے گردوغبار سے بھی بچا سکتا ہے۔ اس کی آنکھ کی دوہری پلکیں ہوتی ہیں اور وہ ایسے مواقع پر ایک کو بند کر کے اس کے اندر سے دیکھتا رہتا ہے اور چلتا بھی رہتا ہے۔ یہ جو مشہور ہے کہ اونٹ آنکھیں بند کر کے چلتا ہے، اس سے مراد یہی چیز ہے، حتیٰ کہ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ وہ تاریک راتوں میں بھی اپنی راہ بخوبی پالیتا ہے۔

۴۔ چوپایوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ بعض وہ ہیں جن سے گوشت حاصل کیا جاتا ہے، بعض وہ ہیں جو سواری کے کام آتے ہیں کچھ وہ ہیں جن سے صرف دودھ حاصل کیا جاتا ہے اور کچھ وہ ہیں جن سے بار برداری کا کام لیا جاتا ہے۔ لیکن اونٹ ان تمام چاروں صفات کا حامل

ہوتا ہے۔ سواری اور بار برداری کا کام بھی دیتا ہے اور اس کے دودھ، گوشت پرست اور اون سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے۔

۵۔ اس جانور کے استثنائی عجائبات میں یہ بات ہے کہ دوسرے جانوروں پر اس وقت بوجھ لادتے ہیں جب وہ کھڑے ہوتے ہیں لیکن اس پر اس وقت بوجھ لادتے یا سوار ہوتے ہیں جب وہ بیٹھا ہوا ہوتا ہے اور بھر ایک ہی حرکت سے کھڑا ہو جاتا ہے جب کہ دوسرے جانوروں میں ایسی قدرت نہیں ہے۔

بعض دانشوروں نے لکھا ہے کہ اس کا سبب اس کی وہ عجیب و غریب طاقت ہے جو اس کی لمبی گردن میں چھپی ہوئی ہے اور ”فرکس“ کے قانون کے مطابق (جو ”ارشمیدس“ ARCHIMEDES کے ذریعہ دریافت ہوا) ”لیور“ LEVER کا کام دیتی ہے (کہا جاتا ہے کہ ارشمیدس کہا کرتے تھے کہ اگر کڑھ زمین کے باہر مجھے کوئی ایسی جگہ مل جائے جہاں میں ”لیور“ کو ٹیک سکوں، تو ایک عظیم لیور کے ذریعہ اس پورے کڑھ ارضی کو اپنی جگہ سے ہلا دوں! اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ لیور کے قانون کے مطابق لیور کی مدد سے تھوڑی دقت لگا کر بھاری وزن آسانی کے ساتھ اٹھایا جاسکتا ہے جس میں لیور کے ایک سرے لیور پر قوت ہوتی ہے اور دوسرے سرے پر وزن ہوتا ہے) اس طرح سے اونٹ کی گردن لیور کی حیثیت پیدا کر لیتی ہے اور ایک سرے اور محکم حرکت سے اپنی پیٹھ پر لدے ہوئے بوجھ کو ہلکا بنا دیتی ہے۔ پھر اونٹ اپنے پچھلے پاؤں کو آزادانہ طور پر کھڑا کر دیتا ہے اور آسانی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔<sup>[۱]</sup>

یہ اور دوسرے عجائبات اور خصوصیات اس بات کا سبب بن گئی ہیں کہ اسے خداوند بزرگ و برتر کی آیات میں سے ایک آیت کے طور پر یاد کیا جائے، نہ صرف اس لئے کہ اونٹ عربوں کی زندگی کا ایک اہم رکن تھا جب انہیں پہلی بار ان آیات میں مخاطب کیا گیا تھا۔ کس کی طاقت ہے کہ یہ سب عجائبات اور برکات اس مخلوق میں پیدا کرے اور پھر اسے اس انسان کا اس طرح مطیع اور فرمانبردار بنادے کہ ایک چھوٹا سا بچہ بھی اونٹوں کی قطار کی مہارت تمام کر جہاں اس کا جی چاہے لئے پھرے، یہ بھی عجیب بات ہے کہ (حدیٰ خوانی جیسی) موزوں آوازیں میں اس پر اثر کرتی ہیں اور اسے شوق و شغف کے ساتھ حرکت پر آمادہ کرتی ہیں۔

کیا یہ سب کچھ خالق کائنات کی عظمت اور قدرت کی نشانیاں نہیں ہیں؟ جی ہاں! بالکل ہیں!! لیکن ان لوگوں کیلئے جو بے اعتنائی کے ساتھ ان آیات کے پاس سے نہیں گزرتے۔ یقیناً ایسے لوگ ہی ان آیات کا ادراک کر سکتے ہیں (یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ”افلاینظرون“ کا جملہ ”نظر“ کے مادہ سے ہے جس کے معنی دیکھنا اور نگاہ کرنا ہیں، لیکن عام اور معمولی آنکھوں سے نہیں بلکہ غور و فکر کے ساتھ دیکھنا مراد ہے۔) (غور کیجئے گا)

چوتھی اور پانچویں آیت میں انسان کیلئے چوپایوں کے مختلف فوائد کے ضمن میں ارشاد فرماتا ہے۔ تمہارے لئے چوپایوں میں زبردست عبرت ہے۔ (وان لکم فی الانعام لعبرۃ)

[۱] کتاب اولین دانشگاہ، جلد ۶، ص ۳۲، میں اس مسئلہ کی طرف مختصر اشارہ کیا گیا ہے جب کہ دوسری کتابوں میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اشارے

یہاں پر ”عبرت“؛ ”تکرہ“ کی صورت میں ذکر ہوئی ہے جو اس کی زبردست اہمیت کی دلیل ہے۔ ”مفردات“ میں ”راغب“ کے بقول ”عبرت“؛ ”عبر“ (بروزن ابر) کے معنی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف گزرنا اور عبور کرنا ہیں۔ چونکہ عبرت حاصل کرنے والا شخص کسی حالت کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس سے ایک ایسی حقیقت کو پالیتا ہے جو قابل مشاہدہ نہیں ہے اسے عبرت کہتے ہیں۔

بنابریں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم چوپایوں کے اسرار و عجائب کو دیکھ کر خداوند بزرگ و برتر کی عظمت و علم اور آفرینش کے مبداء بزرگ کی حقیقت کو سمجھ سکتے ہو۔

پھر قرآن مجید نے اس بات کی تشریح کرتے ہوئے چوپایوں کے چار اہم فوائد کی طرف اشارہ کیا ہے اور فرماتا ہے: ”ہم اس سے جو کچھ کہ ان کے اندر ہے تمہیں سیراب کرتے ہیں (نسقیکم مما فی بطونہا) دودھ جو خوشگوار مادہ و مشروب بھی ہے اور طاقت و راور مکمل غذا بھی ان جانوروں کے اندر سے اور ان کے خون اور گوشت کے درمیان سے باہر آتا ہے یہی بات مزید تاکید کے ساتھ پانچویں آیت میں بیان ہوئی ہے۔ فرماتا ہے: ہم جانوروں کے شکم ہضم شدہ غذاؤں اور خون کے درمیان سے خالص اور خوشگوار دودھ تمہیں پلاتے ہیں (نسقیکم مما فی بطونہ من بین فرث و دم لبناً خالصاً سابعاً للشر بین) [۱]

یہ کون سی قدرت ہے جو اس قدر آلودہ چیزوں کے درمیان سے اس حد تک پاک و پاکیزہ، خالص اور لذیذ غذا باہر نکالتی ہے جس کا رنگ سفید، ذائقہ شیریں بومعطر اور ہر لحاظ سے خوشگوار ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ دانشوروں کے بقول جانور کے پستانوں میں ایک لیٹر دودھ بننے کیلئے اس عضو سے قریباً پانچ سو لیٹر خون کو گزرنا چاہیے تاکہ اس خون سے ایک لیٹر دودھ کیلئے ضروری مواد حاصل کیا جاسکے اور رگوں میں ایک لیٹر خون بننے کیلئے زیادہ مقرر میں مواد کو انٹریوں میں سے گزرنا چاہیے تب کہیں جا کر اس مقدار میں دودھ حاصل ہوگا، یہیں سے ’من بین فرث و دم‘ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

دودھ کی ترکیب، پستانوں میں اس کی پیدائش کی کیفیت، حیاتی مواد اور اس میں موجود حیاتین، طاقت بخشنے والے خواص اور دودھ سے بننے والی دوسری مختلف چیزیں، اس کا ہر سن و سال کے لوگوں کیلئے مفید ہونا وغیرہ کے بارے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے کہ اگر ان سب کو

[۱] ”فرث“ کے معنی ہضم شدہ غذا، ”دم“ کے معنی خون اور سانچ کے معنی خوشگوار ہیں، وہی چیز جو آسانی کے ساتھ خلق سے گزر کر بڑے آرام سے ہضم ہو جاتی ہے، بات یہ قابل توجہ ہے کہ سورہ مومنوں کی آیت میں بطونہا مومنوں کی ضمیر کے ساتھ ذکر ہوا ہے جو ایسے مقامات پر جمع کے معنی کا حامل ہے۔ اور سورہ نحل میں۔ بطونہ مذکر کی ضمیر کے ساتھ ذکر ہوا ہے جن میں مفرد کے معنی ہوتے ہیں بعض مفسرین کہتے ہیں لپ ”انعام“ اسم جمع ہے لہذا اگر ظاہر کو دیکھا جائے تو مفرد کی ضمیر اس کی طرف لوٹ رہی ہے اگر معنی کو ملاحظہ کیا جائے تو جمع کی ضمیر اور بعض کہتے ہیں کہ مفرد کی ضمیر جمع کے مفہوم کی وجہ سے ہے اور مومنوں کی ضمیر جماعت کے مفہوم کی خاطر ہے (دیکھئے تفسیر کشاف، تفسیر فخر رازی، تفسیر روح المعانی اور تفسیر ابوالفتوح رازی)

اکٹھا کیا جائے تو ایک اہم کتاب بن جائے لیکن ہم تفسیر کی اصل بحث سے خارج ہو جائیں گے البتہ ہم یہاں پر حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مختصر لیکن جامع حدیث کو نقل کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ آپ ارشاد فرماتے ہیں:

اذا اكل احدكم طعامًا فليقل اللهم بارك لنا فيه واطعمنا خَيْرًا منه  
، واذ شرب لبنًا فليقل اللهم بارك لنا فيه وزدنا منه ، فاني لا اعلم  
شيئا انفع في الطعام والشراب منه

جب تم میں سے کوئی ایک کھانا کھائے تو کہے: اے اللہ! تو ہمارے لئے اس میں برکت عطا فرما اور اس سے بہتر  
روزی عنایت فرما!! لیکن جب دودھ پئے تو کہے: خدا وندا! تو ہمیں اس میں برکت دے اور زیادہ عطا فرما! کیونکہ  
میں کھانے اور پینے کی چیزوں میں سے دودھ سے بڑھ کر کوئی اور چیز مفید نہیں سمجھتا۔ [۱]

پھر چوپایوں کے دوسرے فائدوں کو بیان کرتے ہوئے ایک مختصر اور سربستہ جملہ ارشاد فرماتا ہے: اس میں تمہارے لئے بہت سے  
فوائد ہیں۔ (ولکم فیہا منافع کثیرۃ)

ممکن ہے یہ تعبیر جانوروں کی اون، پشم اور بالوں کی طرف اشارہ ہو، جس سے مختلف قسم کے لباس، پوشاک اور نیچے بچھانے کیلئے  
چیزیں تیار کی جاتی ہیں۔ ساتھ ہی ان کے چمڑے، رودے، کھل، میٹھے، ہڈیوں اور سینگوں کی طرف بھی اشارہ ہو جن سے زندگی کی مختلف چیزیں  
تیار کی جاتی ہیں، حتیٰ کہ ان کا گوبر بھی درختوں کی پرورش اور زراعت و نباتات کی تقویت کیلئے مفید ہوتا ہے۔

تیسرے مرحلہ پر ایک اور فائدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”اور تم ان سے کھاتے ہو“ (ومنہا تاکلون)  
کچھ غذائیں گوشت کے نقصانات کو بیان کرتے ہیں اور گوشت خوروں کیلئے گوشت کے طبی، اخلاقی اور دوسرے نقصانات بتاتے  
ہیں لیکن پھر بھی بہت سے لوگوں کو نظر یہ ہے کہ تھوڑی مقدار میں گوشت کا استعمال نہ صرف مضر ہی نہیں بلکہ انسانی جسم کیلئے ضروری بھی ہے سبزی  
خوروں کے بارے میں تجربہ شاہد ہے کہ وہ کئی قسم کے اختلالات کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان میں بہت سی چیزوں کی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ ان  
کے چہروں کا اڑا رنگ اس کمی کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ گوشت اور پروٹین میں ایسے حیاتیاتی اجزاء پائے جاتے ہیں جو کسی بھی  
سبزی یا دوسری نباتات میں نہیں پائے جاتے۔ قرآن مجید کا اس مسئلے کو اہمیت دینا بھی اسی بات کی دلیل ہے۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ بے تحاشا گوشت خوری السام کی نظر میں مذموم ہے اور موجود طب کی نظر میں بھی۔

اس آیت کے چوتھے اور آخری حصے میں چوپایوں اور دوسری چیزوں پر سواری کے طور پر استفادہ کرنے کی طرف اشارہ کرتے  
ہوئے فرماتا ہے۔ تم ان پر اور کشتیوں پر سوار ہوتے ہو۔ (وعلیہا وعلی الفلک تحملون)

یہ جانور، ہمیشہ، بار برداری اور سواری کا بہترین ذریعہ ہوتے ہیں، حتیٰ کہ دور حاصر میں بھی جو کہ موٹر کاروں اور دوسری مشینی سواریوں کا دور ہے انسان سواری اور بار برداری کیلئے ایسے جانوروں کے وجود سے بے نیاز نہیں ہے۔ خاص کر بعض کوہستانی علاقوں اور ان راستوں میں جہاں جدید وسیلہ نقلیہ (ٹرانسپورٹ) سے استفادہ ناممکن ہوتا ہے، حمل و نقل کیلئے بھی خجروں اور ٹٹوؤں جیسے طاقت ور جانوروں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں اور ان کے بغیر جنگی اہمیت کی چوٹیوں پر تسلط حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اس طرح خداوند عالم نے ان جانوروں میں سے بہت سے فوائد پیدا کئے ہیں اور اپنی عظمت اور لطف و کرم کے آثار انسانوں کیلئے ظاہر فرمائے ہیں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ آیت کے اس حصے میں چوپایوں کو کشتیوں کے شاہہ نشانہ ذکر فرمایا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جانور ”برئ کشتیاں“ ہیں۔<sup>[۱]</sup>

چھٹی آیت میں خداوند عالم کے تعارف کے طور پر یا ان نعمتوں کی صورت میں جو انسان کو اس کی معرفت کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہیں، جانوروں کے چمڑے اور پشم کے کچھ فوائد کا ذکر فرمایا گیا ہے جو انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ”خداوند عالم نے تمہارے لئے تمہارے گھروں کو سکون و آرام کی جگہ بنایا ہے۔ (وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا)

پھر فرماتا ہے ”اور تمہارے لئے چوپایوں کے چمڑے سے گھر بنائے ہیں جو بہت ہی ہلکے اور کم وزن ہوتے ہیں جنہیں تم کوچ کرنے کے دن اور قیام کرنے کے دن آسانی کے ساتھ جا بجا کرتے ہو۔“ (وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ جُلُودِ الْأَنْعَامِ بُيُوتًا تَسْتَخِفُّونَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ إِقَامَتِكُمْ )

ثابت اور مستقل گھر ہمیشہ کیلئے انسانی ضروریات کو پورا نہیں کرے۔ بہت سے موقعوں پر انسان کو چلتے پھرتے اور متحرک گھروں کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جنہیں وہ آسانی کے ساتھ ادھر ادھر منتقل کر سکے اور وہ سردی، گرمی، ہواؤں اور طوفانوں کا مقابلہ بھی کر سکیں۔ ایسے چلتے پھرتے گھروں کی ایک قسم وہ خیمے ہوتے ہیں جو چمڑے سے بنائے جاتے ہیں جن کی طرف اس آیت میں بھی اشارہ کیا گیا ہے، اور وہ اون یا کپاس سے بنے ہوئے خیموں سے بدرجہہ بہتر، پائیدار اور آرام دہ ہوتے ہیں۔

آیت کے آخر میں ان کے ایک اور اہم فائدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ”ان کی پشم، اون اور بالوں سے تمہارے لئے ایک خاص مقرر وقت تک زندگی کا اثاثہ اور مال و متاع قرار دیا ہے۔“ (وَمِنْ أَصْوَابِهَا وَأَوْبَارِهَا وَأَشْعَارِهَا أَثَاثًا

[۱] اس طرح کی بات سورہ نحل کی پانچوں تا آٹھویں آیت میں بھی آچکی ہے جس میں چوپایوں کے مختلف فوائد کو بتایا گیا ہے۔

وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ ﴿٥٠﴾ [۱]

البتہ ہم جانتے ہیں کہ بھیڑ کے بالوں کو پشم اور اونٹ کے بالوں کی جت یا مٹس اور بکری کے بالوں کو اون یا بال کہتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہے کہ یہ تینوں مادے مختلف قسم کے لباس، فرش، پوشاک، پردے، خیمے دسترخوان اور رسیاں تیار کرنے میں بہت ہی اہم حیثیت کے حامل ہوتے ہیں اور انسانی زندگی سے ان کا گہرا تعلق ہے۔

اگرچہ آج صنعتی اور کیمیائی اجزاء سے لباس اور فرش کی مختلف قسمیں تیار کی جا رہی ہیں لیکن سائنسدانوں کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ انسانی زندگی کی حفظان و صحت کے اصولوں کے مخالف ہیں، جس سے انسان کی صحت و سلامتی پر بُرا اثر پڑ رہا ہے، جب کہ ریشمی اور اونی لباس سالم ترین لباس سمجھے جاتے ہیں۔

”إِلَىٰ حِينٍ“ کی تعبیر کو بعض لوگوں نے ان وسائل کی پائیداری کی مقررہ مدت مراد لیا ہے کچھ دوسرے لوگوں نے اسے اس بات کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ یہ سب وسائل فانی ہیں، لہذا ان سے دل نہیں لگانا چاہیے اور یہی معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

ساتویں آیت میں جو کہ سورہ فاطر کی توحیدی آیات کے ضمن میں ذکر ہوئی ہے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ انسانوں، چوپایوں اور زمین پر چلنے والی دوسری مخلوق کی طرف مبذول کراتے ہوئے فرماتا ہے: جیسا کہ خداوند عالم نے میوؤں اور پہاڑوں میں سے مختلف رنگ کی چیزیں پیدا کی ہیں اسی طرح اس نے انسانوں، زمین پر چلنے والی دوسری مخلوق اور چوپایوں سے بھی ایسی مخلوق پیدا کی ہے جس کے مختلف رنگ ہیں“ (وَمِنَ النَّاسِ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَلِكَ ۗ) [۲]

یعنی جیسا کہ خداوند عالم نے مختلف قسم کے پھلوں کو مختلف رنگوں میں پیدا کیا ہے اور پہاڑوں کے رنگ بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اسی طرح جاندار مخلوق میں خواہ وہ انسان ہوں یا چوپائے اور دوسری چلنے والی مخلوق کو بھی مختلف رنگوں کے معنی میں لیا ہے۔ [۳] لیکن ظاہر یہ

[۱] ”بیوت“، ”بیت“ کی جمع ہے جس کے معنی کمرہ یا گھر یا انسان کے رات بسر کرنے کی جگہ ہیں اور ”بیتوتہ“ کا لفظ بھی اسی سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں ”رات گزارنا“، ”ضعن“ کا معنی ایک نقطہ سے دوسرے نقطہ کی طرف منتقل ہونا اور کوچ کرنا ہے۔ ”اصواف“، ”صوف“ کی جمع ہے جس کے معنی اون ہیں۔ ”اوبار“، ”وبر“ کی جمع ہے جس کے معنی ”جت“ ہیں، ”اشعار“، ”شعر“ کی جمع ہے جس کے معنی ”بال“ ہیں۔ ”اثالث“، ”اث“ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں کثرت اور ایک دوسرے میں لپٹنا۔ یہ لفظ گھر کے مال و اسباب پر بولا جاتا ہے کیونکہ وہ کثیر مقدار میں ہوتا ہے۔ بعض نے اسے لباس، پوشاک اور لحاف کے معنی میں لیا ہے جب کہ بعض دوسرے مفسرین نے اسے اوڑھنے بچھونے کے سامان کے معنی میں لیا ہے۔ جب کہ دوسرے بعض نے اسے ایسے مال و متاع کے معنی میں لیا ہے جو انسان کی زندگی میں اس کے کام آتا ہے۔

[۲] ”وَمِنَ النَّاسِ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ“ کا معنی مختلف رنگوں میں لپٹنا اور مختلف رنگوں میں لپٹنا اور مختلف قسم کے پہاڑوں کی طرف اشارہ ہے جن کا سابقہ آیت میں ذکر ہوا ہے۔

[۳] تفسیر المیزان، ابوالفتوح رازی، فی ظلال القرآن اور تفسیر قرطبی وغیرہ



ہے کہ مذکورہ تعبیر کا مفہوم اس سے بھی وسیع تر ہے اور یہ انسانوں، زمین پر چلنے والوں اور چوپایوں کی مختلف انواع و اقسام کی طرف اشارہ ہے جو تخلیق کائنات کے اہم ترین عجائبات میں شمار ہوتی ہیں۔

کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ آج زمین پر چلنے والے اور چوپایوں کی لاکھوں قسمیں اس دنیا میں موجود ہیں، بلکہ بعض دانشوروں نے تو ان کی انواع و اقسام پندرہ لاکھ سے بھی زیادہ بیان کی ہیں اور یہ عجیب قسم کا تنوع، اپنی ان خصوصیات کے ساتھ، جو اس میں پائی جاتی ہیں، آیات حق کی ایک آیت اور خالق کی قدرت اور علم کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

اس ماہر نقاش نے ایک قلم اور ایک قسم کے رنگ کے ساتھ بے شمار نقوش اور رنگ برنگے نمونے ایجاد فرمائے ہیں، جن میں سے ہر ایک اس کی صنعت تخلیق کا ایک شاہکار ہے۔

ہاں البتہ یہ صرف علماء اور دانشور ہی ہیں جو دل کی آنکھیں کھول کر جانِ جہان کو اس صفحہ ہستی پر دیکھتے ہیں اور ”جو دکھائی نہ دینے والی چیز ہے اسے بھی دیکھتے ہیں“ اسی لئے تو اسی آیت کے ذیل میں فرماتا ہے: ”خداوند عالم کے بندوں میں سے صرف علماء ہی اس سے ڈرتے ہیں اور خدا عزیز اور غفور ہے۔ (اِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۗ اِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُوْرٌ ﴿۱۰﴾)

مخلوق کے مختلف ظاہری رنگ سطحی قسم کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں، لیکن باطنی رنگ اور ان کی مختلف قسم کی تخلیق اہل دل اور معنویت پر کھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں۔

پھولوں کے ظاہری رنگ حشرات اور شہد کی مکھیوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں تاکہ وہ باروری کے معاملہ میں ان کی امداد کریں نیز نر اور مادہ کو (خصوصاً پرندوں کے درمیان) ایک دوسرے کی طرف کھینچتے ہیں۔ لیکن باطنی رنگ اور ان کی مختلف قسم کی ساخت علماء اور صاحبانِ فکر و نظر کو ہی اپنی طرف متوجہ کرتی ہے تاکہ وہ اپنے غور و فکر کو توحید کے بیج کے ذریعہ بارور کریں۔

”خَشْيَتِ“ کے معنی ”تعظیم پر مبنی خوف ہیں جو علم اور آگاہی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، یہ درحقیقت ”ڈر“ اور ”امید“ کا مجموعہ ہوتا ہے اسی لئے خداوند عالم نے فوراً ہی اپنی دو صفات بیان فرمائی ہیں۔ ایک ”عزیز“ اور دوسری ”غفور“ (یعنی غالب اور مہربان) پہلی صفت سے ڈر پیدا ہوتا ہے اور دوسری سے امید لگتی ہے۔ اس طرح آیت درحقیقت علت اور معلول سے مرکب ہے۔

ضمنی طور پر ”انعام“ (چوپائے) کا ذکر ”دواب“ (زمین پر چلنے والے) کے ذکر کے بعد، عام کے بعد خاص کے ذکر کی قسم سے ہے۔ اس کی وجہ وہ اہمیت ہے جو وہ انسانی زندگی کیلئے رکھتے ہیں۔

آٹھویں آیت میں ایک توحیح آمیز استفہام کے ساتھ ان کفار و مشرکین کی سرزنش کرتا ہے جو راہِ راست کو کھو کر اور خالق کائنات کو چھوڑ کر بتوں کی چوٹ پر جہ سائی کئے ہوئے ہیں۔ فرماتا ہے ”کیا انہوں نے نہیں دیکھا ہم نے جو کچھ اپنی قدرت سے پیدا کیا؟ چوپائے ان کیلئے بنائے جن کے وہ مالک ہیں۔ (اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيَنَا اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿۱۰﴾)

”لھم“ (ان کیلئے) کی تعبیر کا مفہوم نہایت ہی وسیع ہے جو ان چوپایوں کے تمام اجزاء کے گونا گوں منافع کو شامل ہے، پس اس کا لطف و کرم تو دیکھئے کہ ”خالق“ وہ ہو اور ”مالک“ دوسرے!!

پھر چوپایوں کے بارے میں ایک تازہ نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ”ہم نے انہیں ان لوگوں کے لئے رام کر دیا اور مطیع بنا دیا ہے اس طرح کہ ان کی سواری بھی انہی میں سے ہے اور ان کا غذا پانا بھی۔ نیز دوسرے مفادات اور پی جانے والی چیزیں بھی“ (وَذَلَّلْنَاهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوبُهُمْ وَمِنْهَا يَأْكُلُونَ ﴿٤٠﴾ وَلَهُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبٌ ۗ) اور آخر میں فرماتا ہے ان تمام نعمتوں کے باوجود بھی جو خدا نے انہیں عطا فرمائی ہیں وہ اس کا شکر نہجا نہیں لاتے اور اس کی پاک ذات کی معرفت حاصل نہیں کرتے؟ (أَفَلَا يَشْكُرُونَ ﴿٤١﴾)

ہو سکتا ہے کہ ”ہما عملت ای دینا“ کی تعبیر زندگی اور موت کے پیچیدہ مسئلہ کی طرف اشارہ ہو، جس کا معنی ابھی تک انسان کیلئے حل نہیں ہو پایا اور صرف اس کی بے انتہا قدرت کے سات ہی اس کا تعلق ہے۔

”مشارف“ (پی جانے والی چیزوں) کا ذکر ”منافع“ کے ذکر کے بعد خاص کا ذکر عام کے بعد کی قسم سے ہے جو اس کی اہمیت کی دلیل ہے۔

ضمنی طور پر یہ بھی بتادیں کہ ”مشارب“، ”مشرب“ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں۔ ”پینے کی چیز“ (کیونکہ یہ مصدر میمی ہے جو کہ اسم مفعول کے معنی میں ہے)۔ ممکن ہے کہ یہ چوپایوں کے دودھ کی مختلف قسموں کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ ان میں سے ہر ایک میں خصوصی اثرات اور خصوصیات ہوتی ہیں، یا پھر دودھ کی مختلف مصنوعات کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ ان سب مصنوعات کا سرچشمہ دودھ ہی ہوتا ہے۔ ”مشارب“ کا لفظ ان سب پر بولا گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ دور حاضر میں بھی انسانی غذا کا اہم حصہ دودھ اور اس کی مصنوعات پر مشتمل ہے [۱]۔

”وَذَلَّلْنَاهَا“ (ہم نے ان چوپایوں کو انسان کیلئے رام اور ذلیل کر دیا ہے) کے بارے میں دلچسپ بحث ہے جو انشاء اللہ ”وضاحتوں“ کے حصے میں بیان ہوگی۔

نویں آیت بھی خدا شناسی اور توحید کی آیات کی سلک میں منسلک ہے کیونکہ اس سے پہلی آیات میں فرماتا ہے ”اگر تم ان سے سوال کرو کہ زمین و آسمانوں کا خالق کون ہے تو وہ کہیں گے ان کا خالق خداوند قادر و دانا ہے“ پھر قادر و دانا خدا کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے ”وہی ہے جس نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعہ مردہ زمینوں کو زندہ فرمایا“ پھر زیر بحث آیات میں فرماتا ہے ”وہ وہی ہے جس نے تمام چیزوں کو جوڑا جوڑا بنایا“ (وَالَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر ”ازواج“ سے مراد جانوروں کے نر اور مادہ جوڑے ہیں، خصوصاً جب اس کے آگے فرماتا ہے ”اور خداوند عالم نے تمہارے لئے کشتیوں اور چوپایوں کو تمہاری سواری کا وسیلہ قرار دیا ہے (کشتی پانی میں اور چوپائے خشکی میں) (وَجَعَلْ لَكُمْ مِنَ الْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ ﴿٥١﴾)

[۱] بعض مفسرین نے ”مشارب“ کو ان مختلف ظروف کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو جانوروں کی کھال سے بنائے جاتے ہیں، جیسے مختلف قسم کی مشکبیں اور دوسرے برتن۔ لیکن یہ تفسیر بہت ہی بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ موضوع بہت زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہے کہ منافع کے ذکر کے بعد اسے اس زور شور سے بیان کیا جائے۔

اس طرح ”ازواج“ کے بعد ”انعام“ کا ذکر خاص کا ذکر، عام کے بعد کی قسم سے ہے۔

لیکن کچھ مفسرین کا عقیدہ ہے کہ یہاں ”ازواج“ کا لفظ دنیا کی مختلف قسموں کی طرف اشارہ ہے، خواہ وہ حیوانات ہوں یا نباتات اور جمادات، کیونکہ ہر جنس کا اپنا ایک مخالف ہوتا ہے۔ حیوانات اور نباتات میں نر اور مادہ اور ان کے علاوہ نور اور ظلمت، آسمان اور زمین، سورج اور چاند، خشک اور تر، حتیٰ کہ خود انسانی افکار کے اندر بھی یہ جوڑے موجود ہیں، جیسے خیر اور شر، کفر اور ایمان، تقویٰ اور فحش وغیرہ۔ اس کائنات میں صرف ایک وجود ایسا ہے جس میں دوگانگی نہیں اور وہ ہر نظر اور ہر لحاظ سے بیگانہ ہے وہ ذات خداوند ذوالجلال ہے۔ لیکن قرینہ کے لحاظ سے پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال اس آیت میں جوڑوں کی تخلیق ایک طرف اور سواری کیلئے چوپایوں کی آفرینش دوسری طرف، خداوند عالم کی نشانیوں کے طو پر انہیں ذکر کیا گیا ہے۔

زندہ موجودات اور حیوانات پر تولید نسل اور تولید مثل کا جو چچا تہا نظام حکم فرما ہے وہ نہایت ہی پیچیدہ اور عجیب و غریب نظام ہے۔ وہ کون سے عوامل ہیں جن کی وجہ سے رحم مادر میں جنین مذکر یا مؤنث بنتا ہے وہ کون سے ایسے اسباب ہیں جن کی وجہ سے نر اور مادہ کی جنس میں توازن برقرار ہے؟ کون سی ایسی وجوہات ہیں جو انہیں ایک دوسرے کی طرف کھینچ لاتی ہیں تاکہ اس طرح سے باروری کے مقدمات حاصل ہوں؟ کون سے عوامل ہیں جو جنین کی نشیب و فراز بھری زندگی کے دوران اسے ہدایت اور ارتقاء عطا کرتے ہیں؟

اگر ہم اچھی طرح غور و فکر سے کام لیں تو ہر قدم پر ہمیں خداوند عالم کی عظیم آیات نظر آئیں گی۔ اسی طرح سواری کے مطیع ہونے کے سلسلے میں بھی یہی کیا جاسکتا ہے۔

پھر ان طاقت ور اور قوی پیکر جانوروں کو انسان کیلئے مسخر کرنے کی بات کرتے ہوئے فرماتا ہے، ”مقصد یہ ہے کہ تم آسانی کے ساتھ ان چوپایوں کی پشت پر سواری کرو، پھر اپنے پروردگار کی نعمت کو یاد کر کے کہو: پاک اور منزه ہے وہ خدا جس نے ان کو ہمارے لئے مسخر کر دیا ہے وگرنہ ہم میں تو اس کی طاقت نہیں تھی۔ (لَتَسْتَوُوا عَلَى ظُهُورِهِ ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُولُوا سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ ﴿٥٠﴾)

یہ ٹھیک ہے کہ ہم روزمرہ کی عادت کے پیش نظر اس بات کو معمول سمجھتے ہیں کیونکہ ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ اونٹوں اور گھوڑوں، بلکہ ان سے بڑے بڑے جانوروں مثلاً ہاتھیوں کے قافلے ہمارے سامنے سے گزرتے ہیں۔ جو ایک کمزور سے بچے کے تابع فرمان ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تو ان کی ایک ایک قطار کی مہار ایک بچہ اپنے ہاتھ میں تھام کر انہیں جدھر چاہے لے جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اگر ان جانوروں میں تھوڑی سی بھی سرکشی اور غصے کی حالت ہوتی تو کبھی بھی ان پر سواری نہ کی جاسکتی، بلکہ انسانی ماحول میں ان کی نگہداشت خطرناک کام ہوتی۔

ہم ایک غصیلے شکاری باز کو، یا ایک غصیلی بلی کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتے چہ جائیکہ ان طاقت ور اور عظیم الجثہ جانوروں کو، جن میں سے بعض کے سینگ ہیں تو بعض کے تیز دانت اور طاقت ور جڑے، اور کچھ کے لات مارنے کیلئے بڑے اور مضبوط پاؤں۔ اگر یہ رام اور مطیع نہ ہوں

تو کس طرح ہم ان کی حفاظت کر سکتے ہیں یا ان پر سوار ہو سکتے ہیں؟ یقیناً اگر خدا کی طرف سے وہ ہمارے لئے مسخر نہ ہوتے تو ہم کبھی بھی ان سے استفادے کی قدرت نہ رکھتے۔ (وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ ﴿٥٧﴾) [۱]

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ چوپایوں کی پشت اس طرح بنائی گئی ہے کہ وہ ہر لحاظ سے انسان کی سواری کیلئے مناسب اور موزوں ہوتی ہے۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ پہلا مقصد ان سواریوں پر سوار ہونا بیان فرمایا ہے، درمیانی مقصد پروردگار کی نعمتوں کی یاد آوری ہے اور آخری مقصد اس کی پاک ذات کی معرفت اور تسبیح و تقدیس بتایا ہے۔ ہمیشہ نعمتوں کی طرف توجہ انسان کو منعم کی طرف لے جاتی ہے۔ لہذا سب عطائیں اور بخششیں معفرت خداوندی کا ذریعہ اور اس کی پہچان کا مقدمہ ہیں۔

یہی چیز اسی سلسلے کی دسویں اور آخری آیت میں دوسرے منافع کے ساتھ ذکر ہوئی ہے درحقیقت اس آیت میں جانوروں میں موجود پانچ عمدہ فوائد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور انہیں خدائی آیات میں شمار کیا گیا ہے۔

پہلے فرماتا ہے ”خداوند عالم وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے چوپائے پیدا کئے ہیں تاکہ تم بعض چوپایوں پر سواری کر سکو۔“ (اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَنْعَامَ لِتَرْكَبُوا مِنْهَا) ”اور بعض سے غذا حاصل کرو“ (وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿٥٨﴾)

میں مختلف فوائد مثلاً دودھ، اون، چمڑا اور ادویات کے مواد وغیرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجموعی طور پر فرماتا ہے: ”اور تمہارے لئے ان میں بہت اہم فوائد ہیں (ولکم فیہا منافع)“

(منافع کا لفظ نکرہ کی صورت میں بیان ہوا ہے تاکہ وہ ان فوائد کی اہمیت پر دلالت کرے)

چوتھے مرحلہ پر فرماتا ہے: ”مقصد یہ ہے کہ ان کے ذریعہ تم اس منزل تک جا پہنچو جہاں تمہارا دل چاہتا ہے۔ (وَلِتَبْلُغُوا عَلَيْهَا حَاجَةً فِي صُدُورِكُمْ)“

اس چیز کو مستقل فائدے کے طور پر بیان کرنا..... باوجودیکہ سواری کی بات کیسے ہو چکی ہے..... شاید اس لئے ہے کہ اس سے مراد سامان اور دیگر ضروریات زندگی کی حمل و نقل ہے جیسا کہ سورہ نحل کی چھٹی آیت میں بھی اسی چیز کی طرف اشارہ موجود ہے، یا پھر تفریحی، سیاحتی مقابلہ بازی کا مقصد مراد ہے، یا میدان جہاد میں حصول قدرت مراد ہے یا وحشی جانوروں کے ساتھ نبرد آزمائی مقصد ہے، یا پھر جانوروں کا پیرا کی کے ذریعہ دریاؤں اور نہروں کو پار کرنا مراد ہے، کیونکہ یہ سب کچھ سفر میں سواری کے علاوہ دوسری ضروریات کے زمرے میں آتا ہے۔ پانچویں اور آخری فائدے کے بارے میں فرماتا ہے ”اور ان پر اور کشتیوں پر سوار کئے جاتے ہو۔ (وَعَلَيْهَا وَعَلَىٰ

[۱] ”ظہورہ“، ”علیہ“ اور ”لہ“ میں مفرد کی ضمیریں ”انعام“ کی طرف لوٹ رہی ہیں۔ کیونکہ جیسے ہم بیان کر چکے ہیں ”انعام“ کے جمع کے معنی ہیں۔ لیکن لفظی طور پر یہ مفرد ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ ضمیریں ”ماترکون“ میں موجود ”ما“ کی طرف اشارہ کر رہی ہیں ایسی صورت میں چوپایوں اور کشتیوں کو بھی شامل ہوں گی، نیز ”مقرنین“، ”اقران“ کے مادہ سے ہے، جس کے معنی ہیں کسی چیز پر قدرت رکھنا اور بعض نے اس کی حفاظت کے معنی میں تفسیر کی ہے۔

## الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ

”حَمَلٌ“ کا مفہوم ”رکوب“ (سوار ہونے) کے مفہوم سے مختلف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ محل اور کجاوے ہیں جو پہلے زمانے میں چوپایوں پر رکھے جاتے تھے جہاں ان عورتوں اور بچوں کو ان میں بٹھایا جاتا تھا جن میں سوار ہونے کی طاقت نہیں ہوتی تھی اسی طرح بیماروں، بوڑھوں اور کمزور اور ناتواں لوگوں کیلئے ان سے استفادہ کیا جاتا تھا۔

”تُحْمَلُونَ“ (تم اٹھائے جاتے ہو) کے جملے کا ذکر فعل مجہول کی صورت میں اور اسے کشتیوں کے ساتھ ساتھ بیان کرنے سے ان کی آپس میں شبہات کا مفہوم ملتا ہے (کشتی تو پانی میں اور چوپائے خشکی میں) مندرجہ بالا تفسیر پر دوسرے قرینے ہیں۔ اس طرح ان تین جملوں (لَتَرْكَبُوا..... وَلِتَبْلُغُوا..... وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ) کا فرق واضح ہو جاتا ہے، ہر چند کہ کچھ مفسرین ان کی تفسیر میں مشکلات سے دوچار ہوئے ہیں اور بعض لوگوں نے ان سے کی ایک ہی معنی سے تفسیر کی ہے۔

اگرچہ بہت سے مفسرین اس بات کے معتقد ہیں کہ اس آیت میں انعام کے معنی صرف اونٹ ہیں، لیکن ”انعام“ کے مفہوم کی وسعت اور آیت میں کسی قسم کی قید کا نہ ہونا اور پھر اسے محدود کر دینے پر کوئی دلیل نہیں ملتی خاص کر جب کہ ”منھا“ کا تکرار (ایسے مقامات پر ”من“، بعض کے معنی میں ہے) یہ واضح کرتا ہے کہ بعض چوپائے صرف سواری کا کام دیتے ہیں بعض سے غذا کا کام لیا جاتا ہے۔ اگر اونٹ مراد ہوتا تو ان سب کے کام آتا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ بعد کی آیت میں ایک کلی نتیجے کے طور پر فرماتا ہے: ”خداوند عالم ہمیشہ اپنی آیات تمہیں دکھاتا ہے۔ پس تم اس کی کون کون سی آیات کا انکار کرو گے؟ (وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ فَآيَىٰ آيَاتِ اللّٰهِ تُنْكِرُونَ)

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان امور میں سے ہر ایک امر علماء اور دانشوروں کے لئے خداوند عالم کی آیات میں سے ایک آیت ہے، ایسی آیت جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا ہے اور جو لوگ اس کے منکر ہیں، وہ ہر قسم کی ملامت اور سرزنش کے مستحق ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کی آیات کی اس قسم میں یعنی حیوانات میں، خصوصاً چوپایوں کی دنیا میں، ہر ہر قدم پر اس کی آیات میں سے ایک ایک آیت اور اس کے علم و قدرت، حکمت، لطف و کرم اور عنایت و مہربانی کی نشانیوں میں سے ایک ایک نشانی ملتی ہے اور ان میں سے ہر ایک قسم اپنی زبان بے زبانی سے ہمیں توحید اور خدا شناسی کا درس دے رہی ہے اور ہماری شکر گزاری کی حس کو بیدار کر رہی ہے اور یہی شکر گزاری ہمیں اس کی معرفت کی دعوت دیتی ہے۔

## چند ضروری وضاحتیں

### حیوانی دنیا کے عجائبات

آفرینش اور تخلیق کی کتاب ایک ایسی کتاب ہے جس کے ہر جملہ بلکہ ہر کلمہ اور ہر حرف میں کئی کئی نکتے مخفی ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ اس کے مطالعہ سے انسان نہ تو تھکتا ہے اور نہ ہی اسے اس میں کوئی تکراری پہلو ملتا ہے اگر وہ اس عظیم کتاب کے صرف ایک جملے کا سو بار بھی مطالعہ کرے تو اسے ہر بار یقیناً ایک تازہ مفہوم ملے گا اور نئے نئے اسرار اس پر منکشف ہوں گے۔

”حیوانات اور چوپایوں کی دنیا“ جو اس عظیم کتاب کا ایک حصہ ہے وہ بھی ان عجائبات و اسرار سے پھر پور ہے۔ اس جگہ ہم ان عجائبات کے صرف ایک حصے کو بیان کرنے پر قناعت کرتے ہیں۔ اس کی مزید تشریح کیلئے ان کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے جو اس بارے میں لکھی جا چکی ہیں۔

### ۱۔ حیوانوں کا رام اور مطیع ہونا

حیوانات کے اندر پالتو ہونے کی صلاحیت ایک نہایت ہی اہم مسئلہ ہے اور کسی نعمت کی اہمیت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ ہاتھ سے چلی جائے۔

اگر آج پالتو جانور وحشی بن جائیں، اونٹ چیتے کی مانند حملہ کرنے لگ جائیں اور اور اپنے طاقت و ردائنتوں سے انسان کو چیرنا پھاڑنا شروع کر دیں، گائے، بیل، سینگ مارنا شروع کر دیں، گھوڑے لاتوں کے ذریعہ انسان کی خیر لینا شروع کر دیں تو اس وقت انسانی دنیا پر قیامت آجائے! اس وقت بھیڑ بکریوں، اونٹوں اور گایوں کے ریوڑ سرمایہ موجودی ہی نہیں سمجھے جائیں گے بلکہ ان کے شر سے نجات حاصل کرنے سے گریز نہیں کیا جائے گا، ان کے نہ ہونے کو ہونے سے ہزار ہا درجہ بہت سمجھا جائے گا۔ اس وقت بھی کبھی کبھار یہ مطیع اور سر جھکائے ہوئے جانور غصے میں آکر خطرناک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ہاتھیوں کو ہندوستان کی یاد ستانے لگ جاتی ہے، اونٹ غصے میں پاگل ہو کر اپنے مالک کو کاٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر تھوڑی سی غفلت سے کام لیا جائے تو مالک کی تباہی ہو جائے اس طرح گویا خداوند عالم ہمیں یہ دکھانا چاہتا ہے کہ دیکھ لو اگر میں ان سے اطاعت و تسلیم کا فرمان واپس لے لوں تو ان کی کیا کیفیت ہو جائے!!

قرآن مجید نے مختلف تعبیرات کے ساتھ اس واقعیت کو ذکر فرماتا ہے۔ کبھی فرماتا ہے: ”وَذَلَّلْنَاهَا لَهُمْ“ (ہم نے انہیں انسان کیلئے ذلیل (اور رام) کر دیا سورہ یس - ۷۲) اور کبھی فرماتا ہے: ”جب تم چوپایوں پر سوار ہو جاؤ تو کہو“ (سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِیْنَ)، (پاک اور منزہ ہے وہ خدا جس نے اسے ہمارے لئے مسخر کر دیا جب کہ ہم میں اس بات کی قدرت نہیں تھی۔ زخرف - ۱۲)

”توحید مفصل“ میں بھی اسی نکتے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور چوپایوں کی تخلیق کے بیان کے بعد فرماتے ہیں:

**ثم منعت الذهن والعقل لتدل للانسان فلا تمتنع عليه اذا كدها**

**الكد الشديدا وحملها الحمل الثقيل**

پھر خداوند عالم نے چوپایوں سے عقل اور ہوش کو روک لیا تاکہ وہ انسان کے لئے مطیع اور رام بنے رہیں اور جب

سخت مشقت اور بھاری بوجھ ان پر لادا جائے تو وہ سر پٹپی نہ کریں۔ [۱]

عقل و ذہن کا نہ ہونا ان کے مطیع اور رام ہونے کی دلیل کا ایک حصہ ہے علاوہ ازیں خداوند عالم نے انہیں اس طرح پیدا کیا ہے کہ وہ بہت جلد رام ہو جاتے ہیں اور ہمیشہ کیلئے وہ اس حال پر باقی رہتے ہیں جب کہ بعض جانور ایسے ہوتے ہیں جن میں عقل و ہوش بھی انہی جانوروں جیسا ہوتا ہے (مثلاً بھیڑ یا اور جیتا وغیرہ۔ اگر مشکل سے وہ رام ہو بھی جائیں تو ان کا یہ عارضی پہلو ہوگا اور پھر بھی ان سے ہر وقت محتاط رہنا پڑے گا کیونکہ کسی بھی وقت وہ مختصر سی غفلت کے باعث اپنے مالک کی نکا بوٹی کر سکتے ہیں۔

## ۲۔ جانوروں کا ہوش و خرد

سابقہ تفصیلی گفتگو کے بعد اس عنوان کا انتخاب شاید عجیب بھی معلوم ہو اور متضاد بھی حالانکہ ایسی بات نہیں ہے کیونکہ حیوانات ظاہری طور پر ایسی مخلوق ہیں جن میں ہوش و خرد کی کمی ہوتی ہے یا بالکل ہی بے عقل ہوتے ہیں اور ہم انسان بھی عام طور پر کوڈن آدی کو چوپایوں سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن وہ بعض مسائل میں اس قدر ہوش و عقل کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ انسان کو حیرت ہوتی ہے۔

ہم میں سے بہت سے لوگوں نے دیکھا ہے کہ جب بھیڑ بکریوں کا ریوڑ جنگل میں چرنے کے بعد دیہات میں واپس آتا ہے (ایسے دیہاتوں میں جہاں بھیڑ بکریاں مختلف گھروں کی ملکیت ہوتی ہیں) تو آبادی کے نزدیک پہنچتے ہی بڑی تیزی کے ساتھ بستی کے گلی کو چوں سے گزر کر سیدھی اپنی مالک کے گھر پہنچ جاتی ہیں۔

ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کوئی مادہ اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اس کے اپنے بچے کے علاوہ کوئی اور بچہ اس کے پستانوں سے دودھ پئے۔ جب بھی رات کی تاریکی میں بھیڑ بکریوں کے بچوں کو ان کی ماں کا دودھ پینے کیلئے چھوڑا جاتا ہے تو ہر بچہ اپنی ماں ہی کی طرف دوڑتا ہے اور ماں بھی اسے پہچان لینے کے بعد دودھ پلانے کیلئے تیار ہوتی ہے۔ یہ پہچان صرف ”سونگھنے“ سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ دنیا بھر کے گوسفندوں کی بو مختلف ہوتی ہے اور ہر گوسفند اپنے بچے کی بو کو ان تمام بچوں کی بو سے پہچان لیتی ہے۔

”کوری مورسین“ اپنی کتاب ”راز آفرینش انسان“ میں کہتے ہیں:

”اکثر حیوانات تاریک راتوں میں اپنی راہ تلاش کر لیتے ہیں اور بڑی آسانی کے ساتھ اس پر چلتے رہتے ہیں۔ اگر ان کی آنکھیں

[۱] ”توحید مفصل“ (بجارا انوار جلد ۳ ص ۹۱)

رات کی تاریکی میں کمزور ہوں تو وہ راستے کی اطراف کی ہوائے اختلاف کو درک کر لیتے ہیں اور راستے کی سطح سے اٹھنے والی نہایت ہی کمزور روشنی جو ”ماورائے قمر“ کہلاتی ہے، ان کی آنکھوں میں اثر کرتی ہے۔“

جانوروں کے گھر بنانے کا طریقہ، بچوں کی پرورش، دشمن سے نبرد آزمانی کی کیفیت، حتیٰ کہ جب وہ بیمار ہوتے ہیں تو ان کے طرز علاج کی کیفیت بھی عجیب ہے اور ان میں سے ہر ایک کی تشریح کیلئے مفصل بحث کی ضرورت ہے۔

مشہور حیاتیات شناس (BIOLOGIST) پروفیسر ”آزمز“ اپنی کتاب میں بعض جانوروں کی اپنی بیماریوں کے علاج معالجہ کی استعداد کے بارے میں لکھتے ہیں:

”بعض طبی دریافتیں ان جانوروں کے طرز علاج سے حاصل ہوئیں، مثلاً مچھلی کھانے والے پرندوں کی ایک قسم ایسی ہے جس کی ٹانگیں لمبی ہوتی ہیں اور اجتماعی پرواز یا زمین پر بیٹھتے وقت اس کی ٹانگ لوٹ جاتی ہے اسے پلاسٹر PLASTOR OF PARIS اور ٹانگ کے ٹوٹنے کے علاج سے اچھی طرح واقفیت حاصل ہے۔ وہ ساحل سمندر اور ایسے دلدلی علاقوں میں چلا جاتا ہے جس کی گیلی مٹی ٹوٹے ہوئے اعضاء کے لئے پلستر کا کام دیتی ہے اور اسی کام کیلئے مخصوص ہوتی ہے۔“

چنانچہ وہ اپنا ٹوٹا ہوا پاؤں ایسی مٹی کے اندر لے جاتا ہے اور اس سے نکال کر دھوپ میں بیٹھ جاتا ہے تاکہ وہ خشک ہو جائے پھر وہ ایک مدت تک اپنے پاؤں کو ایسی ہی حالت میں رکھتا ہے تاکہ ٹوٹی ہوئی جگہ اچھی طرح جڑ جائے۔۔۔ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ جو پلستر PLASTOR OF PARIS ہسپتالوں میں ڈاکٹر صاحبان کام میں لاتے ہیں وہ بھی اسی قسم کا ہوتا ہے کیونکہ اس کی گرفت بڑی مضبوط ہوتی ہے۔ [۱]

سائنسدانوں کا عقیدہ ہے کہ بہت سے جانوروں کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ ایک دوسرے کی باتوں کو سمجھتے ہیں۔ چیونٹیاں ایک دوسرے کے ساتھ اپنا جسم ملا کر یا اپنے سینگ نما بالوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر باتیں کرتی ہیں اور پیغامات پہنچاتی ہیں بعض ایسی چیونٹیاں بھی ہیں جو خطرے کے وقت اپنے بلوں میں اپنا پاؤں زمین پر مار کر (ٹیلیگرام کی طرح) اپنا خفیہ پیغام دوسروں تک پہنچاتی ہیں۔ بہت سے جانور ایسے بھی ہیں جن کی اپنی خصوصی زبان کے علاوہ ایک عمومی زبان بھی ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ ایک دوسرے کی باتوں کو سمجھتے ہیں۔ اسی زبان کے ذریعہ کوئے (جب وہ خطرہ محسوس کرتے ہیں) اپنی مخصوص آواز کے ساتھ دوسرے جانوروں کو خبردار کرتے ہیں تاکہ جتنا جلدی ہو سکے وہ خطرے کی جگہ سے بھاگ جائیں یہ جانور درحقیقت ”جنگلی جاسوس“ ہوتے ہیں۔

”ماہرین حیاتیات“ اپنے مطالعہ کی مدد سے اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ انسانوں کے بعد حشرات الارض ہی ایک ترقی یافتہ رابطہ سسٹم کے مالک ہیں، بالخصوص شہد کی کھیوں کی باہمی گفتگو اور ان کی خبر رسانی کا سسٹم سب سے زیادہ عجیب بھی ہے اور بے نظیر بھی۔ [۲]

[۱] کتاب ”بہترین راہ شناخت خدا“ ص ۱۹۷

[۲] رسالہ ”شکار و طبیعت“ شماره ص ۲۷



سوڈن کے ایک ماہر حیوانات نے ”لینڈ“ یونیورسٹی میں شہد کی مکھیوں کے بارے میں بڑی دلکش تقریر کی اور بتایا کہ مدت کی تحقیق و تجربہ سے جو بات ثابت ہوئی ہے وہ جانوروں کی زبان ہے۔ اس نے اپنی مشینری کے ذریعہ یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان کی زبان کے آسانی سے معنی سمجھے جاسکتے ہیں۔ [۱]

حیوانات کی دنیا کے عجائبات اس قدر زیادہ ہیں جن کا ایک یا دسیوں کتابوں میں بھی حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ہم صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں، اس موضوع کو یہیں پر ختم کرتے اور نہایت ہی خضوع و خشوع کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں عرض کرتے ہیں:

**سبحانك اللهم وبحمدك لا تحصى عجائب خلقتك وانك على كل شيء**

قدیر۔ پاک ہے تو اے میرے اللہ اور ہم تیری حمد کرتے ہیں تیری مخلوق کے عجائبات کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے اور تو یقیناً ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

## ۲۰۔ جسمانی اعضاء کی تخلیق میں باری تعالیٰ کی نشانیاں

اشارہ:

انسان کو اپنے وجود سے باہر کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کیلئے مختلف اوزاروں کی ضرورت ہوتی ہے جن سے خالق نے اس کو آراستہ فرمایا ہے۔ کسی چیز کی صورت رنگ کمیت اور کیفیت کے مشاہدہ کیلئے آنکھ اور بینائی کی حس عطا فرمائی ہے۔ مختلف آوازوں کو محفوظ کرنے اور پہچاننے کیلئے کان اور شنوائی کی حس بخشی ہے۔ لو، سردی، گرمی، سختی اور نرمی وغیرہ کے ادراک کیلئے دوسرے حواس عطا فرمائے ہیں۔ ان اوزاروں کی سخت اس قدر پیچیدہ، ظریف اور دقیق ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی تشریح ایک مستقل علم کا موضوع بن سکتی ہے اور اس بارے میں بڑی تعداد میں کتابیں لکھی جا چکی ہیں جو درحقیقت توحید کے اسرار، خدا شناسی کے درس اور ان اعضاء کی طرف سے انسانی جان کے کانوں میں الاپے جانے والے معرفت الہی کے نعموں کا مجموعہ ہیں۔ یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ کوئی شخص ان اعضاء کی ساخت میں غور و فکر کرے اور ان کے خالق کی عظمت و قدرت کے آگے سر تسلیم خم نہ کرے، خواہ زبان سے اس بات کا اعتراف کرے یا نہ کرے۔

اس اشارے کے ساتھ ہم قرآن مجید کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور ذیل کی آیات کودل کے کانوں سے سنتے ہیں:

۱... وَاللَّهُ أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا ۖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۴۸﴾

(نحل-۷۸)

۲... وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَ لَكُمْ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۖ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ﴿۴۹﴾ (مؤمنون-۷۸)

۳... قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمْ مَنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ..... وَمَنْ يُدَبِّرِ الْأَمْرَ ۖ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ ۖ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿۳۱﴾ (يونس-۳۱)

۴... أَلَمْ نَجْعَلْ لَهُ عَيْنَيْنِ ﴿۸﴾ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ ﴿۹﴾ (بلد-۸-۹)

۵... قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَخَذَ اللَّهُ سَمْعَكُمْ وَأَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلَى قُلُوبِكُمْ مَّنْ

إِلَهُ غَيْرِ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِهِ ۗ أَنْظُرْ كَيْفَ نَصَرَفُ الْآيَاتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُونَ ﴿٣٦﴾

(انعام-۳۶)

۶۔۔۔ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ

(حم سجدہ-۵۳)

## ترجمہ

۱۔۔۔۔ اور اللہ نے تمہیں ماؤں کے پیٹ سے باہر نکالا ہے جب کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے۔ اس نے ہی تمہارے لئے کان، آنکھ اور عقل قرار دی کہ شاید تم اس کی نعمت کا شکر بجالاتے ہو۔

۲۔۔۔۔۔ وہ وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے کان، آنکھ اور دل (عقل) کو پیدا کیا، لیکن تم اس کا شکر کم بجالاتے ہو۔

۳۔۔۔۔۔ کہہ دو کہ کون ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے؟ یا کون ہے جو کانوں اور آنکھوں کا مالک (خالق) ہے؟۔۔۔۔۔ اور کون ہے جو کائنات کے امور کو چلاتا ہے؟ تو وہ فوراً (جواب میں) کہتے ہیں، خدا تو کہہ دیجئے کہ پھر تم تقویٰ اختیار کیوں نہیں کرتے (اور خدا سے کیوں نہیں ڈرتے؟)

۴۔۔۔۔۔ کیا ہم نے اس (انسان) کیلئے دو آنکھیں نہیں بنائیں اور ایک زبان اور دلب؟

۵۔۔۔۔۔ کیا تم نے سوچا بھی ہے کہ اگر خداوند عالم تمہارے کان اور آنکھوں کو لے لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے (کہ کسی چیز کو نہ سمجھ سکو) تو خدا کے علاوہ کون ہوگا جو انہیں واپس لوٹا دے؟ تم دیکھو تو، ہم کس طرح اپنی آیات کی ان کیلئے مختلف طریقوں سے تشریح کرتے ہیں، پھر بھی وہ روگردانی کرتے ہیں۔

۶۔۔۔۔۔ عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں کائنات کے اطراف میں اور خود ان کی جانوں میں انہیں دکھائیں گے تاکہ ظاہر ہو جائے کہ وہ حق ہے۔

## الفاظ کے معانی اور تشریح

”متمع“ دراصل سننے کی قوت کی معنی میں ہے اور بسا اوقات خود کان کو بھی ”سمع“ کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ کبھی کان لگانے، دعوت کو قبول کرنے اور جستجو کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور جب اس کا اطلاق خدا کے بارے میں ہو تو اس کے معنی سنی جانے والی چیزوں کے متعلق

خدا کا علم اور آگاہی ہوتے ہیں۔ ”سمع“ کی جمع ”اسماع“ ہے، لیکن قرآن پاک میں یہ لفظ (اسماع) کہیں بھی استعمال نہیں ہوا شاید اس لئے کہ خود لفظ ”سمع“ جمع کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔<sup>[۱]</sup>

”بصر“ بھی ”عضو بنیائی“ یعنی ”چشم“ اور ”قوت بنیائی“ دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ عقل و ادراک کی طاقت کے معنی میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اور اسے ”بصر“ اور ”بصیرت“ کہتے ہیں (”بصر“ کی جمع ”بصائر“ ہوتی ہے اور ”بصیرت“ کی جمع ”بصائر“)

لیکن آنکھ کیلئے بصیرت کا لفظ کبھی استعمال نہیں ہوتا بلکہ اسے بصر ہی کہتے ہیں البتہ عجیب بات یہ ہے کہ نابینا افراد پر ”بصیر“ کا لفظ بولا جاتا ہے لیکن بظاہر یہ استعمال متضاد تعلق کی وجہ سے نہیں ہوتا، بلکہ اس لئے ہوتا ہے کہ نابینا حضرات رام طور پر زیادہ طاقت و ادراک سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور اپنی حس بنیائی کے معدوم ہونے کی تلافی قوت فکر اور بصیرت سے کرتے ہیں۔<sup>[۲]</sup> جیسا کہ فارسی زبان میں نابینا لوگوں کو ”روشن دل“ کہا جاتا ہے۔

صاحب ”مصباح اللغہ“ جیسے ار باب لغت نے ”بصر“ کا اصل معنی ایسا ہی نور لیا ہے جس سے موجودات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ ”مقابیس اللغہ“ میں اس کے دو معانی ذکر ہوئے ہیں؟ ایک تو کسی چیز سے آگاہی حاصل کرنا اور دوسرے کسی چیز کی موٹائی معلوم کرنا لیکن پہلے معنی جن کو راغب نے بھی مفردات میں ذکر کیا ہے اس لفظ کے استعمال کے مقامات کی وجہ سے زیادہ مناسب اور زیادہ صحیح معلوم ہوتے ہیں۔

”افئدة“، ”فؤاد“ کی جمع ہے اور ”فؤاد“ (بروزن وعد) کے مادہ سے ہے جس کے اصلی معنی بھوننا ہیں۔ اسی لئے پختہ عقول و افکار کو ”فؤاد“ کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ کبھی دل یا دل کی پوست کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جب ان میں فروغ و روشنائی پائی جائے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ”فؤاد“ کا معنی دل کا مرکز ہے جب کہ ”قلب“ اس کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔

”عین“ کے بہت سے معانی ہیں اور مشہور ہے کہ اس لفظ کے عربی زبان میں ستر معانی ہیں۔ اتفاق سے فارسی میں بھی ”چشم“ کے تقریباً اتنے ہی معانی ہیں۔

لیکن ”عین“ کا اصل معنی بنیائی کا وہی مخصوص عضو یعنی ”آنکھ“ ہے کبھی کبھی یہ قوت بنیائی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن کنایہ کے اور مجازی معنی بہت زیادہ ہیں جن میں سے بہت سے معانی کثرت استعمال کی وجہ سے حقیقت بن چکے ہیں۔ مثلاً چشمہ کو ”عین“ کہتے ہیں کیونکہ وہ آنکھ کے مشابہ ہوتا ہے۔ جاسوس اور اطلاعات حاصل کرنے والے افراد کو بھی ”عین“ کہتے ہیں، جیسا کہ یہ لفظ با شخصیت افراد، سورج اور رسو نے پر بھی بولا جاتا ہے کیونکہ سونا دھاتوں کے درمیان وہی حیثیت رکھتا ہے جو اعضاء جسمانی کے درمیان آنکھ کی ہے۔ اسی طرح ستاروں کے درمیان سورج کی اور ایک قوم کے درمیان با شخصیت افراد کی حیثیت ہوتی ہے، جیسا کہ (اردو اور) فارسی میں بھی کہا جاتا ہے کہ فلاح شخص اپنے خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ نیز سرمایہ، اور قابل استفادہ اموال گول چیز کے سوراخ، کسی چیز سے آگاہی اور بصیرت پر بھی مناسبت کے

[۱] لسان العرب، مفردات، مجمع البحرین اور تحقیق فی کلمات القرآن الکریم۔

[۲] مفردات راغب

لحاظ سے اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے۔ ”حورالعین“ کو بھی اس نام سے اس لئے موسوم کیا گیا ہے کہ ان کی آنکھیں خوبصورت اور موٹی ہوتی ہیں۔ ”لسان“ بھی بولنے کے مخصوص عضو (زبان) کے معنی میں ہے کناہیہ کے طور پر ان لوگوں کو بھی لسان کہتے ہیں جو کسی قوم کی ترجمانی کرتے ہیں۔ لغات کو بھی ”السنہ“ لسان کی جمع) کہتے ہیں جیسا کہ ”زبان“ کا لفظ فارسی میں انہی معانی کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ عربی میں مذکر بھی استعمال ہوتا ہے اور مؤنث بھی لیکن قرآن مجید میں مذکر ہو کر استعمال ہوا ہے۔

”شفة“ (بروزن قمر) کا اصل معنی ”ہونٹ“ ہے جو تشبیہ (شففتین یعنی دو ہونٹ) ہو کر استعمال ہوتا ہے۔ [۱] مشافہہ کے لفظ کے معنی کسی کے روبرو ہونا اور اس کے ہونٹوں سے کسی چیز کا سننا ہوتے ہیں۔ یہ لفظ نہر، دریا اور سمندر کے کنارے کے معنی میں بھی آیا ہے کیونکہ کنارہ ان کے ہونٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

سب سے پہلی آیت میں خداوند عالم کی پاک ذات کے تعارف اور انسان کے وجود میں اس کی نشانیوں کو بیان کرنے کے عنوان سے فرماتا ہے ”خدا وہی تو ہے جس نے تمہیں اپنی ماؤں کے شکم سے باہر نکالا۔ اس وقت تم کچھ نہیں جانتے تھے۔“ (وَاللّٰهُ اٰخِرُ جَکُمْ وَاٰبَآءُکُمْ لَیْسَ لَکُمْ اِلٰہٌ اِلَّا هُوَ عَلَیْمٌ غَیْبٍ) [۱]

اس تعبیر سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ انسان کی پیدائش کے وقت اس کے دل کا صفحہ تمام معارف سے خالی ہوتا ہے۔ لیکن بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد انسان کے اپنی ذات کے بغیر دوسری چیزوں کا علم ہے۔ یا بالفاظ دیگر اس سے بیرونی اشیاء کا علم مراد ہے۔ اس پر انہوں نے سورہ نحل کی ۷۰ ویں آیت دلیل کے طور پر پیش کی ہے کہ ”وَمِنْکُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ اِلٰی اَزْ ذٰلِ الْعُبْرِ لَیْسَ لَکُمْ اِلٰہٌ اِلَّا هُوَ عَلَیْمٌ غَیْبٍ“ (تم میں سے بعض لوگ بالائی عمر اور زندگی کے بدترین سالوں کو جانچنے چاہتے ہیں۔ اس طرح کہ جاننے کے باوجود کسی چیز کو نہیں جان پائیں گے) کیونکہ بڑھاپے کی اس عمر میں انسان یقیناً اپنی ذات سے تو باخبر ہوتا ہے، لیکن یہ احتمال بھی موجود ہے کہ نومولود اپنی ولادت کے آغاز میں اپنی ذات سے بھی بے خبر ہوتا ہے اور سب سے پہلے جس چیز سے وہ باخبر ہوتا ہے وہ اس کا اپنا وجود ہوتا ہے۔

پھر فرماتا ہے ”خداوند عالم نے تمہارے لئے کان، آنکھ اور عقل قرار دی ہے تاکہ تم اس کا شکر بجالاؤ“ (وَجَعَلْ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ)

آنکھ اور کان اس لئے کہ تم محسوسات کا ادراک کر سکو۔ عقل کو اس لئے بنایا کہ معقولات کا ادراک کر سکو۔ اور شناخت کے ان تینوں ذریعوں سے اپنے وجود کی بیرونی دنیا سے آگاہی حاصل کر سکو۔ پھر ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کیلئے کھڑے ہو جاؤ اور سب سے پہلے اس مبداء کو تلاش کرو جس نے تمہارے لئے علم و معرفت کے یہ ذرائع بنائے ہیں۔

[۱] بعض لوگوں نے اس کی اصل بنیاد ”شفو“ (ناقص داوی) بتائی ہے اور بعض نے اسے ”شفة“ سمجھا ہے کیونکہ اس کی تفسیر ”شفیہة“ ہے اور جمع ”شفافة“ ہے۔

آنکھ، کان اور عقل کی اہمیت کا اندازہ لگانے کیلئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ اس حالت کو اپنے تصور میں لاؤ جو ان میں سے کسی کے (چہ جائیکہ تمام کے) مفقود ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک اندھے شخص، یا ایک بہرے انسان، یا ایک فاجر عقل آدمی یا تمام صفات سے عاری شخص کی کیا کیفیت ہوتی ہے اور وہ اس عظیم کائنات کی نعمتوں سے کس قدر دور ہوتا ہے؟ سب سے پہلی چیز جس سے وہ محروم ہوتا ہے وہ علم و آگاہی ہے جو بالاترین نعمت اور دوسری نعمتوں سے بہرہ مند ہونے کا مقدمہ ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ مندرجہ بالا آیت میں ”شدیداً“ سے مراد ”منعم کا حق“ ہے جب کہ بعض دوسرے مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد انسان کے اپنے مفادات ہیں۔ بعض نے اس سے سعادت (نیک بختی) اور شقاوت (بد بختی) مراد لیا ہے، یا پھر روز الست کے بیشاق کے معنی میں تفسیر کی ہے لیکن آیت کا مطلق ہونا ہر قسم کی قید و شرط کی نفی کرتا ہے اور ان تمام چیزوں کو شامل ہے۔

”سمع“ (کان) کو ”ابصار“ (آنکھوں) پر کیوں مقدم کیا گیا ہے؟ شاید اس لئے کہ آنکھ سے پہلے کان اپنا کام کرنا شروع کرتا ہے کیونکہ رحم مادر کے ماحول میں جہاں تاریکی مطلق حکم فرما ہوتی ہے، انسان کی آنکھ میں دیکھنے کی آمادگی نہیں ہوتی، پیدائش کے بعد بھی ایک مدت تک روشنی کے سامنے بہت ہی حساس ہوتی ہے اور اسی لئے عام طور پر بند رہتی ہے، اور بالآخر روشنی کے لئے آمادگی پیدا کرتی ہے۔ لیکن کان کی نوعیت اس سے مختلف ہوتی ہے حتیٰ کہ بعض دانشوروں کے عقیدے کے مطابق عالم جنین میں بھی وہ آوازوں کو سنتا ہے اور ماں کے دل کی دھڑکنوں کی آواز سے آشنائی پیدا کر لیتا ہے۔

علاوہ ازیں وحی الہی کے پیغام کے سننے کا ذریعہ کان ہی ہوتا ہے جو تمام سنی جانے والے چیزوں سے بالاتر چیز ہے۔ نیز ایک نسل سے دوسری نسل کیلئے علوم کے منتقل ہونے کا عمومی ذریعہ بھی یہی ہوتا ہے جب کہ آنکھ اس طرح نہیں ہوتی کیونکہ لکھنا اور پڑھنا اگرچہ علوم کے منتقل ہونے کا ذریعہ ہیں لیکن عمومی حیثیت کے حامل نہیں۔

”افتدة“ (پختہ عقلوں) کے ان دو کے بعد مذکور ہونے کی دلیل بھی واضح ہے کیونکہ انسان سنی اور دیکھی جانے والی چیزوں کو عقل کی طرف منتقل کرتا ہے، پھر ان کا تجزیہ و تحلیل کرتا ہے، اس سے تازہ معلومات حاصل کرتا ہے اور کائنات کے کلی قوانین کو دریافت کرتا ہے۔<sup>[۱]</sup> اسی سلسلے کی دوسری آیت میں بھی اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے جو اس سے پہلی آیت میں بیان کی گئی ہے۔ خداوند عالم کی معرفت کیلئے کان، آنکھ اور دل کی تخلیق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور انسانوں کی شکرگزاری کی جس کو بیدار کیا گاہے جو معرفت الہی کی ایک سیڑھی ہے۔ البتہ پہلی آیت میں اور اس آیت میں فرق یہ ہے کہ اس آیت میں اعضاء کی تخلیق کو ”انشاء“ سے تعبیر کیا گیا ہے اور آخر میں ان لوگوں کی سرزنش اور ملامت کی گئی ہے جو خداوند عالم کا کم شکر ادا کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ”وہ وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے کان آنکھ اور دل کو ایجاد کیا ہے لیکن تم (ان عظیم اور بے نظیر نعمتوں کا) بہت کم شکر بجالاتے ہو۔ (وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۗ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ)

[۱] یاد رہے کہ ”سمع“ کا اطلاق مفرد اور جمع ہر دو پر ہوتا ہے اگرچہ بعض اوقات اسے ”اسماع“ یعنی جمع کی صورت میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

”انشاء“ کے بارے میں ”راغب“ کا کہنا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کو ایجاد کرنا اور اسے پروان چڑھانا ہے اسی لئے جو ان لوگوں کو ”ناشی“ کہتے ہیں۔

”انشاء“ کا لفظ عام طور پر جانوروں کی تخلیق کے بارے میں استعمال ہوتا ہے اگرچہ ان کے غیر کے بارے میں بھی کبھی استعمال ہو جاتا ہے جیسے سورہ واقعہ کی ۲۷ ویں آیت میں ہے ”ءَاَنْتُمْ اَنْشَاَكُمْ شَجَرًا تَهْتَا اَمْرًا نَحْنُ الْمَدِيشُونَ“ کیا تم نے آگ پیدا کرنے والے درختوں کو پیدا کیا ہے یا وہ ہم نے ایجاد کئے ہیں؟

ممکن ہے مندرجہ بالا آیت میں جنین کے شکم مادر میں ہونے کے دوران آنکھ، کان اور عقل کے ارتقائی مراحل کی طرف اشارہ ہو اور طفلی کے دوران ارتقائی مراحل کی طرف کہ خداوند عالم نے ان سب کو ایجاد فرمایا اور پھر ان کی پرورش کرتا ہے۔

تیسری آیت میں ایک ”تقریری استفہام“ کی صورت میں ان مشرکین سے سوال کیا جا رہا ہے جو خدا کو چھوڑ کر بت پرستی کی وادی میں سرگردان ہیں۔ فرماتا ہے ”اے پیغمبر! ان سے کہہ دیں کہ تمہیں آسمان اور زمین سے کون روزی عطا کرتا ہے، یا کون تمہارے کان اور آنکھوں کا مالک ہے؟ (قُلْ مَنْ يَزُوقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ اَمْ يَكْفُرُونَ)“

یقیناً جو روزی انسان کو ملتی ہے اس کا تعلق یا تو آسمان سے ہوتا ہے (جیسے بارش، ہوا اور دھوپ وغیرہ) یا پھر زمین سے (جیسے مختلف نباتات، درخت اور معدنیات وغیرہ)۔ اسی طرح انسان کو جو علوم و معارف حاصل ہوتے ہیں وہ بھی غالباً آنکھ اور کان کے ذریعہ ہی حاصل ہوتے ہیں کیونکہ یہ دونوں حسین انسان کیلئے بیرونی دنیا سے تعلق قائم کرنے کا اہم ترین ذریعہ شمار ہوتی ہیں اور یہ سب مادی اور معنوی روزی خداوند عالم کی طرف سے ہے۔

پھر مزید بات یہ ہے کہ یہاں پر مالکیت کی تعبیر کی گئی ہے اور چونکہ یہاں پر مالکیت سے مراد، تکوینی مالکیت ہے، لہذا ”تخلیق اور آفرینش“ کے مسئلہ سے ہرگز جدا نہیں ہ اور نہ ہی ”تدبیر امور“ کے مسئلہ سے جدا ہے۔ اسی لئے آیت کے آخر میں استفہام کی صورت میں ایک بار پھر فرماتا ہے ”ان سے پوچھیے کہ کائنات کے امور کو کون چلا رہا ہے؟ (وَمَنْ يَدَبِّرُ الْاَمْرَ)“

اور پھر فوراً ہی فرماتا ہے: (وہ لوگ فطری نداء کے الہام سے) ”جلدی سے کہیں گے: خدا ہی تو ہے جو ان تمام امور کا مالک و خالق اور چلانے والا ہے۔“ (فَسَيَقُولُونَ اللّٰهُ)“

آپ ان سے کہہ دیں تو پھر تم تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کیوں نہیں کرتے؟“ (فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُونَ)

یعنی بت پرستی اور غیر اللہ کی طرف رخ کرنے سے پرہیز اور گناہوں اور بے اعتدالیوں سے پرہیز۔ چوتھی آیت میں خداوند بزرگ و برتر کی انسان پر کچھ نعمتوں کا تذکرہ کرنے کے ضمن میں اس کی شکرگزاری کی جس کو بید کرتے

[۱] بعض ارباب لغت کہتے ہیں کہ ”ملک“ (میم کے فتح اور لام کے کسرہ سے) اسے کہتے ہیں جو لوگوں میں امر و نہی کے ذریعہ تصرف کرتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ قدرت و طاقت اور تدبیر امر ہوتا ہے۔

ہوئے، جو ”معرفت خدوندی“ کا مقدمہ ہے، فرماتا ہے: ”کیا ہم نے انسان کیلئے دو آنکھیں نہیں بنائیں؟“ (أَلَمْ نَجْعَلْ لَهُ عَيْنَيْنِ) وہ آنکھیں جن کے ذریعہ وہ عالم ہستی کو دیکھتا ہے، تخلیق کے عجائبات کا نظارہ کرتا ہے، سورج، چاند، ستاروں نباتات اور درختوں کی مختلف قسموں اور انواع و اقسام کی زندہ مخلوق اور جانداروں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ صنعت الہی کے عجوبوں کا تماشا دیکھتا ہے، راہ اور چاہ میں فرق سمجھتا ہے دوست اور دشمن کی تمیز کرتا ہے اور خود کو ناخوشگوار حوادث کے چنگل سے چھڑاتا ہے۔

پھر فرماتا ہے: ”اور کیا اس کیلئے ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے“ (وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ)

زبان، جو دوسروں کے ساتھ تعلق کا ذریعہ ہوتی ہے، زبان جو علوم و دانش کے ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف، اور ایک قوم سے دوسری قوم کی جانب منتقل کرنے کا سبب ہوتی ہے زبان جو اپنی ضروریات کو بیان کرتی ہے اپنے معبود کے ساتھ راز و نیاز کا کام دیتی ہے اور انسان کے وجود کے تمام ذروں کی ترجمان ہے۔

اسی طرح ہونٹ ہیں جو گفتگو کرنے کا اہم فریضہ انجام دیتے ہیں اور بہت سے حروف کے مقطع کو تشکیل دینے کا کام بجالاتے ہیں۔ [۱] اور ازیں پانی پینے غذا کھانے اور چبانے میں امداد کرتے اور منہ کی رطوبتوں کی حفاظت کرتے ہیں، وہ بھی اس طرح کہ اگر لبوں کا ایک حصہ کٹ جائے تو نہ صرف یہ کہ یہ کام انجام دینے انسان کیلئے مشکل ہو جائیں گے بلکہ اس کے چہرے کا منظر بھی افسوس ناک حد تک بگڑ جائے گا۔

غور طلب بات یہ ہے کہ ان دو آیات کے بعد قرآن مجید نے انسان کی خیر و شر کی طرف ہدایت کی بات کی ہے اور فرماتا ہے: ”کیا ہم نے اسے دو بلند سرزمینوں (خیر و شر کی پہچان) کی ہدایت نہیں کی؟“ (وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ)

یہ واضح تعبیر آنکھ، زبان اور ہونٹوں کے خیر و شر کے مسئلہ کی شناخت اور ہدایت کے ساتھ رابطے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ چیزیں اس عظیم ہدف کیلئے ایک ذریعہ شمار ہوتی ہیں۔

پانچویں آیت اس حالت کی طرف توجہ دلا رہی ہے جو کان، آنکھ اور عقل کے مفقود ہونے کی صورت میں انسان میں پیدا ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، ”کہہ دیجئے، اگر خداوند عالم تمہارے کان اور آنکھوں کو تم سے لے لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے (جس سے تم نہ تو کسی کی بات کو سن سکو اور نہ ہی کسی چیز کو دیکھ سکو اور نہ ہی حق اور باطل اور اچھے اور بُرے میں تمیز کر سکو) تو کون ہو سکتا ہے جو تمہیں یہ چیزیں

[۱] یہ حروف فارسی میں پانچ ہیں۔ (ب۔ پ۔ ف۔ م۔ و) اور عربی میں چار ہیں (پ کے علاوہ) اور چونکہ یہ چند حروف بہت زیادہ استعمال ہوتے ہیں لہذا لبوں کے مفقود ہوجانے کی صورت میں انسان بڑی حد تک قوت گویائی سے ہاتھ دھوسکتا ہے۔ ان حروف کو ”حروف شفوی“ کہتے ہیں۔



پلٹادے؟“ (قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَخَذَ اللَّهُ سَمْعَكُمْ وَأَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلَى قُلُوبِكُمْ مَنِ اللَّهُ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُم بِهِ ط) [۱] پھر آیت کے آخر میں فرماتا ہے ”دیکھو تو، ہم اپنے آیات اور نشانیوں کو مختلف صورتوں میں ان کیلئے کیونکر وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں، پھر بھی وہ حق سے روگردانی کرتے ہیں؟“ (أَنْظُرْ كَيْفَ نَصِّرُ الْآيَاتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُونَ) [۲] درحقیقت قرآن مجید ایک طرف تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ معرفت کے یہ اہم اوزار و وسائل تمہارے اپنے نہیں ہیں کیونکہ اگر تمہارے اپنے ہوتے تو ہرگز واپس نہ لئے جاسکتے ایسے لوگ دنیا میں کم نہیں ہیں جو مختلف عوامل کی وجہ سے کان، آنکھ اور عقل کھو بیٹھتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب چیزیں کس یا اور کی طرف سے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ہر چیز کی اہمیت اس کی ضد سے معلوم ہوتی ہے۔ قرآن مجید اس دردناک حالت کے ذریعہ جو ان اعضاء کے کھودینے سے انسان کو لاحق ہوتی ہے، انسان کو ان نعمتوں کے لاحق اور عطا کرنے والے کی عظمت کی طرف متوجہ کرتا اور اس ذریعہ سے اس کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر خالق کے آگے تسلیم خم کرنے کیلئے آفادہ کرتا ہے۔

آنکھ اور کان کیلئے ”اخذ“ (پکڑنے) کی تعبیر ممکن ہے خود ان اعضاء کے پکڑنے کے معنی میں ہو، یا پھر سننے اور دیکھنے کی طاقت کے یادوں کے۔

اسی سلسلے کی آخر آیت میں توحید اور خدا شناسی کی جامع ترین آیات میں سے ہے، پوری کائنات میں موجود اس کی نشانیوں پر نظر ڈالتے ہوئے فرماتا ہے: ”ہم ان کو ہمیشہ اپنی آیات کائنات کے اطراف میں اور خود ان کے اپنے وجود میں دکھاتے رہتے ہیں تاکہ ان پر اچھی طرح واضح ہو جائے کہ خداوند عالم برحق ہے“ (سَأُورِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ط) ”افاق“، ”افق“ کی جمع ہے جس کے معنی اطراف اور کنارے ہیں بنا بریں ”افاق ارض“ سے مراد زمین کی اطراف اور ”افاق آسمان“ سے مراد آسمان کے اطراف ہیں چونکہ قرآن مجید میں مطلق صورت میں اس کا ذکر ہوا ہے لہذا تمام جہان کو شامل ہے خواہ وہ شمال ہو یا جنوب، مشرق ہو یا مغرب۔

”انفس“ بھی یہاں پر وسیع معنی کا ذکر ہے جو روح، جسم اور بدن کے تمام اعضاء کو شامل ہے، جو ہماری بحث کا موضوع ہے۔

[۱] ”ارءیتکم“ اور ”ارءیتکم“ اس قسم کے جملوں کا بہت سے مفسرین نے ”اخبرونی“ (مجھے بتاؤ) سے معنی کیا ہے۔ یا پھر ”هل علمتکم“ (آیا تمہیں معلوم ہے) سے کیا ہے لیکن بعض محققین کے عقیدہ کے مطابق یہ جملے اپنے اصلی معنی دے رہے ہیں۔ مثلاً ”ارءیتکم“ کے جملے کے معنی ”تم نے مشاہدہ کیا ہے؟“ لیکن چونکہ اس قسم کے مواقع پر مشاہدہ کرنا کے معنی جاننا اور خبر دینا ہوتے ہیں کبھی تو معنی کے لازم سے تفسیر کیا گیا ہے۔ صورت حال خواہ کچھ ہو ان جملوں کے ذکر سے مراد مخاطب کو متوجہ کرنا اور غور کرنے کیلئے آمادہ کرنا ہوتا ہے اور اگر ان کی لازم معنی سے تفسیر کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ”غور کرو“

[۲] ”نصرف“ کا کلمہ ”تصریف“ کے مادہ سے تفسیر کیا گیا ہے اور یہاں پر ایک حقیقت کو مختلف لباسوں اور بیانیوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ ”یصدفون“، ”صدف“ (بروزن ہدف) کے مادہ سے ہے جو یہاں پر منہ پھیرنے کے معنی میں ہے۔

”انہ الحق“ میں ضمیر کس طرح لوٹ سر ہی ہے اس بارے میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید ہے اور آفاقی آیات سے مراد وہ کامیابیاں ہیں جو مسلمانوں کو دنیا کے مختلف گوشوں میں حاصل ہوئی ہیں اور انفسی آیات سے مراد ان کی عرب ملکوں میں کامیابیاں ہیں۔ گویا یہ کہنا چاہتا ہے کہ ہم مسلمانوں کو ساری دنیا میں اور عرب ممالک میں کامیابیاں دکھائیں گے تاکہ وہ جان لیں کہ قرآن برحق ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ”رسول خدا“ ﷺ ہیں، یا پھر ان کا دین و آئین ہے، جو پہلی تفسیر سے قطعاً مختلف نہیں ہے۔ لیکن ظاہر یہ ہے (جیسا کہ بہت سے مفسرین نے سمجھا ہے) کہ اس سے مراد ”خداوند عالم“ ہے یعنی ہم اپنی آفاقی اور انفسی آیات انہیں دکھائیں گے تاکہ خدا کی حقانیت ان پر واضح ہو جائے۔

”آیات“ کی تعبیر ایک طرف ”آفاق و انفس“ کی تعبیر دوسری طرف اور توحید پر مبنی بعد کی آیت، غرض یہ سب اسی تفسیر کے گواہ ہیں۔ ضمنی طور پر یہ بات بھی ذہن نشین کر لیں کہ یہ آیت قرآن مجید کی کئی دوسری آیات سے بھی ہم آہنگ ہے جو خدا کی آیات کو تخلیق کائنات اور خود انسان کے وجود میں موجود انسان کو دکھاتی ہیں۔ مثلاً ”وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ وَ فِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ“ (اور زمین میں خدا کی نشانیاں ہیں مومنین کیلئے اور خود تمہارے اندر بھی (نشانیاں ہیں)۔ کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو؟) (سورہ ذاریات ۲۰-۲۱)

علی بن ابراہیم کی تفسیر میں بھی یہی معنی مذکور ہیں۔ ہر چند کہ بعض روایات میں ”انہ“ کی ضمیر کا مرجع حضرت امام مہدی علیہ السلام کو بتایا گیا ہے، لیکن یہ تفسیر آیات کے بطون سے لی گئی ہے۔ (البتہ سب تفسیروں کو بھی جمع کیا جاسکتا ہے۔)

بہر حال ہم اس کی جس آیت کو بھی دیکھتے ہیں اسی میں اس کی ذات کے علم اور قدرت کو پاتے ہیں، اور

ہر گیا ہی کہ از زمین روید  
وحدہ لاشریک لہ گوید

(جو سبزہ بھی زمین سے اُگتا ہے، وہ وحدہ لاشریک لہ کہتا ہے)

اور

دل ہر ذرہ را بشکافیم  
آفتاب در میان آئینیم

(جس ذرے کو بھی توڑتے ہیں، اس کے اندر ایک آفتاب نظر آتا ہے)

”سَنُؤِيهِمْ“ (ہم انہیں دکھاتے رہیں گے) کی تعبیر (اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ فعل مضارع ایسے مقاما پر استمرار کے معنی میں آتا ہے) اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ انسان کی عمر کا جو دن بھی گذرتا رہتا ہے اس پر اس کائنات کے نت نئے حقائق

واضح ہوتے رہتے ہیں اور نئے سے نئے راز کھلتے رہتے ہیں۔ دانشور اور علماء اپنی تجربہ گاہوں اور لائبریریوں میں نئی نئی دریافتوں سے بہرہ مند ہوتے رہتے ہیں، ہر روز ان پر آیات الہی میں سے کوئی نہ کوئی نئی آیت ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اگر لاکھوں کروڑوں برس انسانی عمر پر گزرتے رہیں پھر بھی صورت حال اسی طرح برقرار رہے گی۔ مجبوراً کہنا پڑتا ہے کتنی عجیب ہے تخلیق کی عظیم کائنات اور کس قدر با عظمت ہے اس کا پیدا کرنے والا!!

پھر یہ کہ یہ سب کچھ تو ہم اس دور زندگی کے متعلق کہہ سکتے ہیں جب کہ اس سے اربوں کھربوں سال پہلے کا علم بھی نہیں اور نہ ہی اس کے اربوں کھربوں سال بعد کا پتہ ہے اور اگر کچھ جانتے بھی ہیں تو وہ بہت ہی ناچیز ہے جو اس عظیم کائنات کے صرف ایک حصے سے تعلق رکھتا ہے اور اس کتاب کی ایک فصل ہے ”العظمة لله الواحد القهار“

گذشتہ آیات سے مجموعی طور پر جو بات سامنے آتی ہے اور ان کا جو خوبی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ انسانی جسم کا ہر عضو بلکہ ہر عضو کی ایک ایک جزو حق کا مکمل آئینہ اور خالق عالم کے علم و قدرت اور حکمت و تدبیر کی ایک مستقل اور روشن نشانی ہے۔

## چند ضروری وضاحتیں

### ۱۔ اعضاء بدن کے عجائبات

اگر ساری کائنات میں سوائے انسانی بدن کے ایک جزو کے اور کچھ بھی نہ ہوتا اور جسم انسان میں صرف ایک آنکھ یا ایک کان ہی ہوتا تو وہی اس خالق کائنات کی ذات پاک اور اس کے علم و قدرت کی شناخت اور معرفت کیلئے کافی تھا کیونکہ ان کی ساخت اس قدر ظریف، پیچیدہ، دقیق اور چچی تلی ہے کہ کوئی بھی عقل یہ باور نہیں کر سکتی کہ یہ ”اتفاق“ یا اندھی اور بہری فطرت کی پیداوار ہے، بلکہ اس کے مطالعہ کے ہر ایک مرحلہ پر اس حکیم خالق اور صانع عالم کے علم و قدرت کی نئی نئی آیت اور جدید نشانی کا پتہ چلتا ہے۔

عضو بنیائی یا آنکھ کی سینکڑوں خصوصیات اور ریزہ کاریوں میں سے صرف ان چند موضوعات پر ہی غور کیا جائے تو پتہ چل جائے گا کہ اس میں کیا محشر برپا ہے۔

### ۱۔ متغیر عدسہ

عام طور پر آنکھ کو کیمرے سے تشبیہ دی جاتی ہے جب کہ دنیا کے جدید ترین اور ترقی یافتہ ترین کیمرے انسانی آنکھ کے سامنے باز بچہ اطفال معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ان سب میں غیر متحرک عدسے ہوتے ہیں اور مختلف مناظر کی تصویر کشی کے وقت فلم لینے والے شخص کے ذریعے ہمیشہ مرتب اور کنٹرول کئے جاتے ہیں۔ لیکن آنکھ کے عدسے جو آنکھ کی پتلیوں کے پیچھے ہوتے ہیں، ہمیشہ خود کار AUTOMATIC طریقے سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں کبھی تو ان کا قطر بہت ہی کم یعنی ۱/۵ ملی میٹر تک جا پہنچتا ہے اور کبھی اس قدر زیادہ ہو جاتا ہے کہ ۸ ملی میٹر سے بھی بڑھ

جاتا ہے جس سے دور ترین اور نزدیک ترین مناظر کی تصویر کشی کی جاسکتی ہے۔

## ۲۔ آنکھ کے سات طبقے

عمدہ طور پر آنکھ سات پردوں یا سات طبقوں سے تشکیل شدہ ہے جن کے نام یہ ہیں: ۱۔ ’صلیبیہ‘ (آنکھ کی سفیدی)، ۲۔ ’صنہبیہ‘، ۳۔ ’مشیبیہ‘، ۴۔ ’جلیدیہ‘، ۵۔ ’زلالیہ‘، ۶۔ ’زجاجیہ‘، اور ۷۔ ’شبکیہ‘۔ ان میں سے ہر ایک کی اپنی مخصوص ساخت اور مخصوص فریضہ ہوتا ہے۔ ان کی تشریح بہت لمبی ہے۔ ہمارے لئے بس اتنا جاننا ہی کافی ہے کہ ان میں تھوڑی سی تبدیلی بھی بنیائی کے نظام میں گڑبڑ پیدا کر دیتی ہے، البتہ ’شبکیہ‘ کے پیچھے بھی بنیائی کے کچھ اعصاب ہیں جن کے ذریعہ شبکیہ کے مناظر مغز تک پہنچائے جاتے ہیں۔

## ۳۔ روشنی کے سامنے حساسیت

فلم تیار کرنے اور تصویر لینے کا کام ایک مشکل ترین کام ہے۔ بسا اوقات اس کام کے لئے ماہرین کی ٹیم کو مامور کیا جاتا ہے جب کہ آنکھ کم یا زیادہ روشنی کے مقابلے میں اپنی حساسیت کے ذریعہ اس بات پر قادر ہوتی ہے کہ بہت زیادہ طاقت دریا بہت زیادہ کمزور روشنی میں مختلف مناظر کی نہایت ہی دقیق اور نہایت ہی خوبصورت تصویر لے سکتی ہے۔

## ۴۔ تیز ترین تحرک

فلم لینے والے اپنے سیٹ کو ہمیشہ دائیں، بائیں اور اوپر نیچے گھماتے رہتے ہیں اور اس کام کیلئے مختلف آلات و اوزار کا سہارا لیتے ہیں جب کہ اطراف چشم میں موجود عضلے (پٹھے) بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آنکھ کو چاروں طرف مکمل طور پر گھماتے رہتے ہیں اور فلم لینے کیلئے اس کی طاقت میں حد سے زیادہ اضافہ کر دیتے ہیں۔

## ۵۔ سادہ اور لطیف پرزے

فلم برداری کیلئے تیار کئے جانے والے کیمروں کیلئے محکم ترین شیشوں اور دھاتوں کو کام میں لایا جاتا ہے جب کہ آنکھ نہایت ہی لطیف اور نازک پرزوں سے بنائی گئی ہے۔ اس کے باوجود بسا اوقات وہ ایک سو سال تک مسلسل کام کرتی رہتی ہے اور یہ صرف اس لئے ہے کہ وہ ایک زندہ سیٹ ہے جو ہمیشہ خود کو بناتی اور اپنی تجدید کرتی رہتی ہے جب کہ انسانی ہاتھوں کے بنے ہوئے سیٹ مردہ ہوتے ہیں۔

## ۶۔ فلم بنانے کا مسئلہ

فلم لینے والے سیٹوں کیلئے خود فلم کی تیاری بھی کوئی معمولی کام نہیں ہے، فلم برداری کیلئے مسلسل متعدد اور مختلف فلمی حلقے جات سے استفادہ کیا جاتا ہے جب کہ آنکھ کا ’شبکیہ‘ خود کار طریقہ پر مسلسل فلم تیار کرتا رہتا ہے۔ جب اسے مغز میں منتقل کر کے اس کا ریکارڈ

تیار کر دیتا ہے تو فلم کو صاف کر کے دوسرے مناظر کی تصویر کشی کیلئے آمادہ کر دیتا ہے اور یہ کام نہایت ہی حیرت انگیز حد تک تیزی کے ساتھ فوراً عمل میں آتا ہے۔ البتہ یہاں پر ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ اس جگہ پر فلم ”دھلائی“ اور ”چھپائی“ کی بات نہیں ہو رہی جو ایک علیحدہ اور مستقل مسئلہ ہے اور نہایت ہی مشکل کام ہے۔

## ۷۔ ضمنی طور پر کام کرنے والی مشینری

آنکھ کے بخوبی اور بہتر طور پر کام کرنے کیلئے اسے بہت سے لطیف پرزوں سے آراستہ کیا گیا ہے تاکہ وہ اپنا کام بخوبی اور بہتر طریقے سے انجام دے سکے۔ یہ لطیف پرزے بھی اپنے طور پر حیرت انگیز اور مجرا العقول ہیں۔ آنکھ میں موجود پانی کے چشمے جن کا مائع مخصوص اور شفاف کنندہ ہوتا ہے، مسلسل آنکھ میں ٹپکتا رہتا ہے، پلکوں کو آنکھ کے ڈھیلے پر کسی قسم کی رکاوٹ کے بغیر گردش کرنے کی اجازت دیتا ہے، اس کے نچلے حصے میں فاضل پانی موجود رہتا ہے، جو اس مائع کو ہمیشہ باہر جانے کی ہدایت کرتا اور ناک کے گڑھوں میں بھیجتا رہتا ہے اسی طرح خود پلکیں اور ان کا وہ سرج رد عمل ہوتا ہے جن سے وہ آنکھ کو چوٹ لگنے کے موقع پر یا گرد و غبار کے حملے یا شدید اور تیز روشنی کے وقت فوراً اسے ڈھانپ دیتی ہیں۔ اسی طرح آنکھ کے پپوٹے ہیں۔ جو آنکھ کیلئے پردے کا کام دیتے ہیں۔ اسی طرح آنکھ کا پیالے نما ہڈی کے اندر قرار پانا جو کہ بہت ہی قوی اور محکم ہوتی ہے، جیسے محفوظ قلعہ ہوتا ہے اور پھر اس ”محفوظ و مضبوط قلعہ“ کا جسم کے بلند ترین مقام قرار پانا اسے اس بات کے مواقع فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنے اطراف و جوانب کو اچھی طرح دیکھ سکے۔ جیسے فوج کی دیدبان چوکی ہوتی ہے اسی طرح آنکھ کے ابرو ہوتے ہیں۔ جو حفاظت کے لیے پر کا کام دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سے دوسرے امور ہیں جن میں سے ہر ایک کی اپنے مقام پر ایک علیحدہ، دلچسپ اور حیرت ناک داستان ہے

اگر ہم ان تمام جہات اور سارے پہلوؤں کو ایک ساتھ ملا کر اس بارے میں قدرے غور و فکر سے کام لیں تو یقیناً اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ آنکھ کا بنانے والا عدسے، نور کے منعکس ہونے اور اس قسم کے کئی دوسرے پیچیدہ امور سے اچھی طرح واقف اور پوری طرح آگاہ تھا اور اس نے اپنی علم و بے پناہ قدرت کی بدولت اس قسم کی عجیب و غریب روزگار چیز کو خلق فرمایا۔

## ۲۔ ہر فن مولا عضو..... زبان

مذکورہ بالا آیات میں جن اعضاء کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان میں سے ایک زبان کا مسئلہ ہے جو صحیح معنی میں خالق کائنات کے عجائبات میں سے ایک ہے۔ اگر زبان کی ”زبان“ ہوتی اور وہ اپنا ماجرا خود بیان کرتی، باوجودیکہ ہم اس سے مانوس ہیں، پھر بھی اس سے ایسے مجرا العقول کارنامے بیان ہوتے جس سے ہمیں پتہ چل جاتا تا کہ قرآن مجید نے کیوں اس کا تاکید کے ساتھ بیان کیا ہے۔  
زبان کے فرائض اور اس کی ذمہ داریاں ویسے تو بہت زیادہ ہیں لیکن اس کے چھ عمدہ کام مندرجہ ذیل ہیں:

## ۱۔ غذا کو دانتوں کے نیچے بھیجنا

اگر زبان نہ ہوتی تو غذا کا کچھ حصہ پوری طرح چبایا جاتا اور کچھ حصہ مکمل طور پر چبائے جانے سے رہ جاتا اور ہم مجبور ہوتے کہ غذا کو انگلی کے ذریعہ جا بجا کرتے، یہ زبان ہی ہے جو اپنی سرلیج اور ماہرانہ حرکتوں سے غذا کو مسلسل طور پر تینوں طرف سے دانتوں کے نیچے پہنچاتی رہتی ہے لیکن خود ان کے نیچے آنے سے بچ جاتی ہے۔ ہاں البتہ بعض اوقات جب وہ تھک جاتی ہے اور کمزور ہو جاتی ہے تو ممکن ہے دانتوں کے درمیان پھنس جائے اور اچھی خاصی چوٹ کھا جائے، تو یہ اور بات ہے۔ گویا اس طرح خداوند عالم ہمیں یہ بتانا چاہتا ہے کہ وہ عجیب مہارت جو خداوند عالم نے زبان کو عطا فرمائی ہے اگر اسے عطا نہ کرتا تو ہر روز یہ صورت حال پیش آتی رہتی اور زبان دانتوں میں آکر مجروح ہوتی رہتی۔

## ۲۔ غذا کو لعابِ دہن سے مخلوط کرنا

وہی لیسیدار مادہ جو ایک طرف تو غذا کو نرم، متحرک اور نگلنے کے قابل بناتا ہے اور دوسری طرف اس میں خاص کیمیکل تبدیلیاں عمل میں لاتا ہے، اسے جذب اور ہضم ہونے کیلئے تیار کرتا ہے یہ زبان ہی ہے جو اس مادہ کے ساتھ غذا کو مخلوط کرنے کا کام انجام دیتی ہے۔

## ۳۔ غذا اور پانی کے نگلنے میں کمک کرنا

غذا بلکہ پانی کو نگلنے کیلئے زبان کا بڑی حد تک دخل ہے۔ غذا اور پانی کے نگلنے کیلئے زبان پہلی ہو جاتی ہے، پھر منہ کے بلائی حصہ پر دباؤں ڈالتی ہے اور اسے فوراً ہی گلے کی طرف بھیج دیتی ہے۔ اگر بالفرض کسی دن زبان مفلوج ہو جائے تو ایک لقمہ غذا کا نگلنا ممکن ہی نہ رہے بلکہ محال بھی ہو جائے۔

## ۴۔ غذائی مواد پر ضبط و اختیار

زبان میں پچکنے کی زبردست حس موجود ہے۔ اسی لئے وہ بدن کیلئے بہت سے نامناسب مضر اور مسموم مواد کی پہلے پہچان کرتی ہے۔ پھر اسے فوراً باہر نکال دیتی ہے۔ اگر بدن کے بیرونی دروازے پر ”یہ خبردار چوکیدار“ نہ ہوتا تو انسان نامناسب غذا کے استعمال کی وجہ سے بہت جلد بیمار ہو جاتا اور اس کی جان خطرے میں پڑ جاتی۔ ایک کڑوی اور بہت ہی نمکین یا زبردست تیز قسم کی یا فاسد اور خراب غذا سے سب سے پہلے زبان باخبر ہوتی ہے اور اسے ”جسم کے ملک“ میں داخل ہونے سے روک دیتی ہے۔ یہ فداکار سپاہی چوبیس گھنٹے کیلئے تمام کھانے پینے کی اشیاء پر قابو رکھنے کیلئے کمر بستہ رہتا ہے۔

## ۵۔ منہ کی صفائی کا کام

یقیناً آپ نے تجربہ کیا ہوگا کہ کھانا کھا لینے کے بعد منہ اور زبان کافی دیر تک حرکت کرتے رہتے ہیں۔ ان کی یہ حرکت منہ میں بچی

کچھی غذا کی صفائی کیلئے ہوتی ہے، جو منہ کی فضا میں ادھر ادھر رہ جاتی ہے۔ زبان اسے ہر طرف اکٹھا کر کے اندر بھیج دیتی ہے اور عام طور پر یہ کام زبان کے ذمہ ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ دانتوں کو بھی بڑی حد تک صاف کر دیتی ہے۔ خلاصہ کلام زبان صحیح معنوں میں ”منہ کا صفائی کرنے والا ملازم“ شمار ہوتی ہے۔

## ۶۔ بولنے کا کام

آخر میں زبان کا اہم ترین اور حساس ترین فریضہ ”بیان“ ہے جسے قرآن مجید نے سورہ رحمن کے آغاز میں خدا کے تعارف کے طور پر خصوصی طور پر بیان فرمایا ہے ارشاد ہوتا ہے:

الرَّحْمٰنُ ﴿۱﴾ عَلَّمَ الْقُرْآنَ ﴿۲﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿۴﴾

خداوند رحمن نے قرآن کی تعلیم، انسان کو پیدا کیا اور اسے بات کرنا سکھایا۔

اگرچہ بار بار کی مشق کرنے کی وجہ سے بات کرنے کا مسئلہ ہمارے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ معمولی بات معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک نہایت ہی پیچیدہ کام ہے جسے انسان اپنی ”زبان“ اور ”سوچ“ کے ذریعہ انجام دیتا ہے۔

سب سے پہلی ہزاروں، لاکھوں بلکہ اس سے بھی زیادہ کلموں کے درمیان سے اُسے پہلے کلمہ کا انتخاب کرنا پڑتا ہے پھر زبان کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے سربلج اور ماہرانہ بیچ و تم کے ذریعہ حروف کے مقطع کے گرد چکر لگائے، پھیپھڑے، نخرے اور صوتی تاروں کی مدد سے منظور نظر حروف مرتب کرے، ان کو آپس میں ملا کر ایک کلمہ بنائے، پھر اسی تیزی سے دوسرے کلمہ کا انتخاب کرے مقررہ آوازیں ایجاد کرے اور اس سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے ایک جملہ مقرر کرے۔ اگر کلمات کے انتخاب میں سوچ اور فکر تھوڑی سی غلطی کر جائے، یا منہ کے اطراف میں قدرے کوتاہی رونما ہو جائے، تو پورے کا پورا جملہ غلط ہو جائے گا۔

اب آپ خود ہی اندازہ لگائیں کہ ایک مقرر جب ایک گھنٹہ موزوں اور فصیح و بلیغ تقریر کرتا ہے اور اس کی زبان کئی ہزار مرتبہ منہ کے اطراف میں گردش کرتے ہوئے حروف کے مقطع پر نکیہ کرتی ہے..... وہ بھی مختصر اور محدود ماحول میں جہاں پر مشق کرنے کی قدرت بہت ہی کم ہوتی ہے..... کس قدر عجیب اور معجزانہ کام انجام دیتی ہے۔ یہ سب کچھ پروردگار عالم کی قدرت نمائی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یقینی طور پر ہونٹ بھی زبان کے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں اور حروف کا کچھ حصہ بنانے میں اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ وہ اعضاء کے درمیان یہ ہم آہنگی بذات خود ایک دلچسپ، حیران کن اور تعجب آور موضوع ہے۔ ان سب سے بڑھ کر اس کے ساتھ فکری تعاون ایک اور اہم کام ہے۔

خلاصہ کلام ظاہری اعضاء اور اندرونی اعضاء مثلاً دل، مغز، رگیں اور اعصاب کا دوسرا سلسلہ غرض ہر ایک کی ایک مفصل اور دلچسپ داستان ہے۔ اگر ہم ان میں سے ہر ایک کے اسرار لکھا چاہیں تو ”ایک عمر چاہئے اس داستان کیلئے“ کے مصداق ہزاروں کتابیں درکار ہوں گی۔

کتنی اچھی بات ہے کہ یہاں ہم اپنے قصور کا اعتراف کریں اور خالق کائنات کے آگے سر تسلیم جھکا دیں، اور شاعر کے بقول اپنی تخلیق کے بارے میں درج ذیل اشعار زبان پر لائیں اور کہیں کہ اے انسان!

عجب تراز توند ارد جہاں تماشا گاہ  
چراہہ چشم تعجب یہ خود نظر کنی !

اس کائنات میں تجھ سے بڑھ کر اور کوئی تماشا گاہ نہیں ہے۔ لہذا تو اپنی طرف تعجب کی نگاہ سے کیوں نہیں دیکھتا۔ یا کہیں

عالم ہمہ در تو است و لیکن از جہل  
پنداشتہ ای تو خویش را در عالم!

ساری کائنات تیرے اندر سموی ہوئی ہے لیکن تو اپنی نادانی کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے تو خود کائنات کے اندر سمویا ہوا ہے۔



## ۲۱۔ انسان کی اجتماعی زندگی میں ذات پروردگار کی نشانیاں

اشارہ:

اس میں شک نہیں کہ انسان ایک اجتماعی مخلوق ہے اور اپنی ہر چیز کو اجتماعی زندگی میں ہی حاصل کرتا ہے۔ انسان کی معنوی اور مادی لحاظ سے ارتقاء علم و دانش، تمدن اور مصنوعات اور آداب و رسوم، غرض اس کا سب کچھ اجتماعی زندگی کا مرہون منت ہے۔ گویا یہ بات بڑی آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ اگر انسان اجتماعی زندگی سے محروم ہو جائے تو وہ اپنی ہر چیز گنوا بیٹھے اور ایک حیوان کی حد تک جا گرے۔

انسان کا اس قسم کا طرز زندگی اس کے فطری تقاضوں کے علاوہ اس کی گونا گوں اور کثیر تعداد میں ضروریات اور بلند ترین اور کامل ترین مراحل تک پہنچنے کیلئے اس کی ہمت عالی کو بھی بڑی حد تک عمل دخل حاصل ہے۔ ان جسمانی اور روحانی ضروریات کو اجتماعی زندگی کے بغیر پورا نہیں کیا جاسکتا، ایک فرد کیا کام کر سکتا ہے؟

لیکن یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ انسان کو اجتماعی زندگی کیلئے بہت سے روحانی اور جسمانی عوامل کی ضرورت ہوتی ہے۔ جنہیں خالق کائنات نے اس کے اختیار میں دے رکھا ہے۔ اگر انسانی زندگی کے اس پہلو کا تجزیہ و تحلیل کیا جائے تو یہ بڑا ہی دلچسپ اور خالق کی آیات میں سے ایک آیت معلوم ہوگا۔

اس اشارے کے ساتھ قرآن کی ان آیات کی تلاوت کرتے ہیں جو اس چیز کو بیان کرتی ہیں اور انہیں گوش جان سے سماعت

کرتے ہیں:

۱۔۔۔ وَمَنْ آيْتَهُ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ  
بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۱﴾

(سورہ روم - ۲۱)

۲۔۔۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ  
إِلَيْهَا ۗ (سورہ اعراف - ۱۸)

۳۔۔۔ إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ ۗ نَبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا  
بَصِيرًا ﴿۲﴾ (سورہ دھر - ۲)

۴۔۔۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ

لِتَعَارَفُوا ۗ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۗ ط

(سورہ حجرات - ۱۳)

۵۔۔۔ هُوَ الَّذِي آتَاكَ بِنَصْرِهِ ۖ وَالْمُؤْمِنِينَ ﴿٦١﴾ وَالْفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ۗ ط لَوْ  
أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلْفَتْ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ۗ وَلَكِنَّ اللَّهَ أَلْفَ  
بَيْنَهُمْ ۗ ط إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٦٢﴾

(سورہ انفال - ۶۲-۶۳)

## ترجمہ

۱..... اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہاری اپنی جنس سے تمہارے لئے جوڑ کو پیدا کیا، تاکہ تم ان کے ساتھ سکون حاصل کر سکو۔ اور تمہارے درمیان مودت اور رحمت کو قرار دیا۔ اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔

۲..... خدا تو وہ ہے جس نے تمہیں ایک ہی نفس سے پیدا کیا ہے اور اس کا جوڑ بھی اسی سے بنایا ہے تاکہ اس کے ساتھ اسے سکون مل سکے۔

۳..... ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا اور اسے آزمائیں گے (اسی لئے) ہم نے اسے سننے والا اور دیکھنے والا بنایا۔

۴..... اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور گردہ اور قبیلے بنایا ہے تاکہ تم ایک دوسرے پہچان سکو، لیکن تم میں سے زیادہ باعزت خدا کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے۔

۵..... وہ وہی تو ہے جس نے اپنی مدد اور مومنین کی مدد سے تجھے تقویت بخشی ہے اور اس نے دلوں میں الفت ایجاد کی، اگر تم روئے زمین پر موجود سب کچھ اس لئے خرچ کرتے کہ ان کے دلوں میں الفت ایجاد کرتے، تو ایسا نہ کر سکتے، لیکن خدا نے ان میں الفت ایجاد کی ہے یقیناً وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

## الفاظ کے معانی اور تشریح

”زَوْج“ کا اصل معنی مذکر اور مؤنث حیوان ہیں جن میں سے ہر ایک پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے، کبھی وسیع تر معنی کیلئے بھی بولا جاتا ہے۔ دو چیزیں جو ایک دوسرے کا جوڑ ہوتی ہیں ”زوج“ کہلاتی ہیں خواہ ان کا جوڑ ہونا ایک دوسرے سے مشابہت کی وجہ سے ہو یا ایک دوسرے سے تضاد کی بنا پر، جیسے جوتوں کا جوڑا یا جرابوں کا جوڑا یا دن اور رات اور خیر و شر وغیرہ۔ جو اعداد دو پر مساوی تقسیم ہوتے ہیں انہیں بھی زوج (جفت) کہا جاتا ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک حصہ دوسرے کا جوڑ ہوتا ہے۔ لیکن انسانوں کے بارے میں ”زوج“ ان دو افراد کو کہا جاتا ہے جو آپس میں زناشوی کا پیمانہ باندھتے ہیں۔

بعض ارباب لغت کہتے ہیں کہ ”زوج“ ایسی شکل و صورت کا نام ہے جس کی نظیر اور مثال ہو، جیسے مختلف صنفیں اور مختلف رنگ ہوتے ہیں، یا جس چیز کی ضد ہو، جیسے تر اور خشک، مذکر اور مؤنث، رات اور دن، شیریں اور تلخ وغیرہ، نیز انہوں نے یہ تشریح بھی کی ہے کہ ”زوج“ کا لفظ دو افراد میں سے ایک پر علیحدہ بولا جاتا ہے نہ کہ دونوں کیلئے بیک وقت بلکہ دونوں کیلئے ”زوجان“ کا لفظ بولا جاتا ہے اور دونوں افراد پر ”زوج“ کا اطلاق جاہل اور انجان لوگ کرتے ہیں۔ [۱]

”کتسکنوا“، ”سکون“ کے مادہ سے ہے جس کے اصل معنی کسی چیز کا حرکت کے بعد ٹھہر جانا ہیں۔ کتاب ”مقائیس اللغۃ“ میں ہے کہ اس کے اصل معنی ٹھہراؤ اور اضطراب و حرکت کے خلاف حالت کا نام ہیں۔ کبھی اس کا اطلاق طوفان، ہوا، گرمی، سردی، بارش یا غیظ وغیب کے ختم جانے پر بھی ہوتا ہے۔ کشتی کے ”ساکنین“ کو اس لئے ساکنین کہتے ہیں کہ وہ کشتی کے ٹھہراؤ اور اس کے صحیح راستوں پر چل نکلنے کا سبب ہوتے ہیں۔ چھری کو اس لئے ”سکین“ کہتے ہیں کہ وہ جانور کا سر کاٹنے کے بعد اس کی حرکتوں کو روک دیتی ہیں۔ اندرونی آرام اور اطمینان ان کو ”سکینہ“ کہتے ہیں ”مسکین“ اس شخص کو کہتے ہیں جو سخت اور شدید فقر و فاقہ کی وجہ سے گویا ساکن ہو چکا ہوتا ہے۔ اور ”مسکن“ ایسی جگہ کو کہتے ہیں جو انسان کے سکونت اور آرام کا مقام ہوتی ہے۔ [۲]

”شعوب“ کے بارے میں بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ”شُعْب“ (بروزن صعب) کی جمع ہے اور بعض کے بقول ”شُعْب“ (بروزن فعل) کی جمع ہے جب کہ صاحب مجمع البحرین جیسے بعض دوسرے مفسرین کے نزدیک ”شُعْب“ کی جمع ”شعوب“ اور ”شعْب“ کی جمع ”شعاب“ ہے۔ دونوں حالتوں کے بارے میں ”لسان العرب“ کا کہنا ہے کہ اصل میں ان کے معنی جمع اور تفریق کے معنی ہیں یا پھر کسی کے بنانے یا بگاڑنے کے معنی میں ہے۔ (یہ اس لئے ہے کیونکہ اس کی اصل پہاڑ کے درے کے معنی میں ہے جس کا وہ حصہ جو پہاڑ کی طرف ہوتا ہے تنگ اور جو دوسری طرف ہوتا ہے وہ کھلا ہوتا ہے اور اس سے راہیں جدا ہوتی ہیں۔) مفردات میں راغب کے بقول اس میں دونوں مفہوم جمع

[۱] مفردات راغب، مصباح اللغۃ، التحقیق فی کلمات القرآن الکریم اور لسان العرب۔

[۲] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، لسان العرب، مفردات راغب، مجمع البحرین اور کتاب العین۔

ہیں) اسی لئے ”شعب“ اس قبیلے کو کہتے ہیں جو ایک عظیم خاندان سے جدا ہوا ہو۔ (اجتماع کا معنی بھی اس میں پایا جاتا ہے اور جدائی کا بھی)۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ”شعوب“ کا لفظ عجمی گروہوں پر بولا جاتا ہے اور ”قبائل“ کا لفظ عرب گروہوں پر [۱] نیز اسی دلیل کی بنا پر ”شعب“ کا معنی منتشر ہونا بھی آتا ہے اور مجمع بھی سنوارنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور بگاڑنے کے بھی۔

”الْف“، ”الف“ (بروزن جلف) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ایسا اجتماع ہیں۔ جس میں ملنے اور جڑنے کو دخل ہوتا ہے۔” تالیفِ قلوب“ کے معنی دلوں کے درمیان الفت، ربط اور پیوند ایجاد کرنا ہیں (کتاب کی تالیف کو اس لئے تالیف کہتے ہیں کہ اس کے الفاظ و معانی اور مباحث کے درمیان ایک طرح کی الفت اور باہمی جوڑ ہوتا ہے اور ”ہزار“ کے عدد کو اسی لئے ”الف“ کہتے ہیں کیونکہ عربوں کے عقیدے کے مطابق تمام اعداد اس میں جمع ہیں، کیونکہ عدد، اکائی، دہائی، سینکڑہ، اور ہزار سے تشکیل پاتا ہے اور ہزار کے بعد کوئی اور عدد نہیں ہے۔ [۲] بلکہ وہی عدد پھر اکائی، دہائی، سینکڑہ اور ہزار سے مرکب ہوتا ہے۔ دس ہزار سو ہزار، ہزار ہزار وغیرہ۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### انسان کی اجتماعی روح..... خدا کا بہت بڑا عطیہ

سورہ روم میں جب خداوند متعال نے اپنی آیات اور نشانیوں کو یکے بعد دیگرے سات آیتوں میں بیان فرمایا تو ہر ایک آیت کا آغاز ”وَمِنْ آيَاتِهِ“ سے فرمایا، چنانچہ کائنات میں خداوند عالم کی عظمت کی نشانیوں کی نہایت دل نشین، جاذب، دلکش، لطیف اور دلپذیر انداز میں کیا۔ اس سلسلے کی پہلی آیت بھی انہیں میں سے ایک ہے۔ [۳]

اس آیت میں پہلے تو انسانی معاشرے کے بنیادی پہلو یعنی خاندانی اکائی، اس کے باہمی تعلق اور اس پر حکم فرما روحانی رابطے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ”اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تمہاری ہی جنس سے تمہارے جوڑ پیدا کئے تاکہ تم ان کے ساتھ سکون حاصل کر سکو“ (وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا) لطف کی بات یہ ہے کہ یہاں پر زنا شوقی اور ازدواجی زندگی کا مقصد نسل کی بقا نہیں بتایا گیا، بلکہ حصول سکون ذکر کیا گیا ہے۔ ازدواجی زندگی سے جو سکون میسر ہوتا ہے وہ اس لئے ہے کہ یہ دونوں (نروادہ کی) جنسیں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں اور ایک دوسرے کے پروان، نجات اور پرورش کا موجب ہوتی ہیں کہ ایک دوسرے کے بغیر وہ نامکمل ہیں اس طرح وہ اپنے ارتقاء کو حاصل کرتی رہتی ہیں۔

[۱] مجمع البیان، جلد ۹، ص ۱۳۸

[۲] مجمع البحرین، لسان العرب اور مفردات راغب۔

[۳] آیات کا یہ سلسلہ اسی سورت کی بیسیوں آیت سے شروع ہو کر پچیسویں آیت پر ختم ہو جاتا ہے۔ (مسلل چھ آیات)

یہ آرام و سکون جسمانی حد تک ہی نہیں ہے بلکہ اس کا روحانی پہلو زیادہ اہم اور قوی ہے۔ ترک ازدواج اور تجرد پر مبنی زندگی سے نفسیاتی بے چینی اور بے آرامی، روحانی سکون کا فقدان اور کئی قسم کی دوسری بیماریوں کا ظہور اس بات کا واضح ثبوت ہے۔

پھر فرماتا ہے: ”اور خدا نے تمہارے درمیان مودت اور رحمت کو پیدا کیا ہے۔“ (وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً ط)

وہی محبت اور رحمت جو درحقیقت لوگوں کے درمیان اتصال، رابطہ، جوڑ اور ملاپ کا کام دیتی ہے، بکھرے ہوئے منتشر لوگوں کو ایک جگہ پر اکٹھا کرتی ہیں اور اس سے ایک طاقتور معاشرہ تشکیل دیتی ہے جس طرح دیوار کی چنائی کیلئے مٹی اور گار کا مڈ دیتا ہے اور پتھروں، اینٹوں کو آپس میں ملا کر اور جوڑ دے کر ایک عظیم و پر شکوہ عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ آیت کے آخر میں ایک بار پھر اسی وحیدی نکتے پر زور دے کر فرماتا ہے ”اس میں ان لوگوں کیلئے آیات اور نشانیاں ہیں جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔“ (إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ)

گر ہم ازدواجی زندگی کی تشکیل کے بارے میں سوچیں جو سب سے پہلی اجتماعی اکائی ہے اسی طرح ان دو مختلف اجتماعی جنسوں کے درمیان طاقت اور عجب کشش پر غور کریں جو ان کے درمیان پیدا کی گئی ہے، پھر اس سے بڑی بڑی اجتماعی اکائیوں کی تشکیل مثلاً خاندان، قوم، قبیلہ، عشیرہ، پھر شہر ملک اور آخر کار کل انسانی معاشرے میں غور و فکر سے کام لیں تو ہمیں ہر قدم پر خدا کی ایک ایک آیت نظر آئے گی۔

وہ کون ہے جس نے زن و مرد، ماں باپ اور اولاد کے درمیان محبت اور مودت کے رشتے استوار کئے ہیں، بلکہ کلی طور پر تمام انسانی معاشرے کے درمیان محبت اور مودت کا پیوند لگایا ہے؟

وہ کون ہے جس نے انسانی معاشرے میں مرد اور عورت کی جنس میں توازن پر قرار رکھا ہوا ہے، یہاں تک کہ انسانی معاشروں میں وفات اور ولادت کے لحاظ سے جو بھی پیچیدہ تبدیلیاں اور حوادث رونما ہوتے رہتے ہیں، یہ توازن ہر صورت میں برقرار رہتا ہے۔

وہ کون ہے جس نے سروں میں مختلف ذوق اور دلوں میں مختلف تعلقات ایجاد کئے ہیں، اور ہر گروہ کو اپنے اپنے کام اور پروگرام کی طرف بھیج کر لے جاتا ہے تاکہ مجموعی طور پر انسانی معاشرہ ایک مکمل اکائی کی صورت اختیار کر لے؟

شاید یہی وجہ ہے کہ بعد کی آیت میں زبانوں کے اختلاف اور رنگوں کے تفاوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں بھی خدا کی آیات میں شمار کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ السِّنِّتِكُمْ وَاللَّوَانِكُمْ ط إِنَّ

فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالَمِينَ ﴿۲۲﴾ (روم - ۲۲)

کیونکہ زبانوں اور رنگوں کے اختلاف کی تفسیروں میں سے ایک تفسیر وہ اختلاف اور تفاوت ہے جو لوگوں کی بولیوں، ذوق اور فکری کشش میں پایا جاتا ہے جو اس تاب کا موجب ہوتا ہے کہ انسانی معاشرہ مکمل طور پر متحد اور بے نیاز ہو اور انسان کی مادی و معنوی ضروریات میں کسی قسم کا خلا واضح نہ ہونے پائے۔

”مَوَدَّتْ“، ”وَدَّ“ [۱] (بروزن حُب) کے مادہ سے ہے نیز اس کا اطلاق ”کسی چیز کے پورا ہونے کی آرزو“ پر بھی ہوتا ہے (اوردونوں معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں) ”وَدَّ“ (بروزن عَدَّ) زمانہ جاہلیت کے بتوں میں سے ایک بت کا نام ہے بوجہ اس شدید تعلق کے جو لوگ اس کے ساتھ رکھتے تھے، یا اس وجہ سے کہ لوگوں کا تصور تھا کہ اس بت کے اور خدا کے درمیان مودت کا رابطہ ہے۔ ”میخ“ پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے، حتیٰ کہ بعض لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ”وَدَّ“ کا لفظ جو عربی زبان میں ”میخ“ کے معنی رکھتا ہے، اسی ”وَدَّ“ ہی سے لیا گیا ہے کیونکہ مضبوط میخیں دیوار یا کسی اور چیز سے چٹ جاتی ہیں۔ اسی لئے محبت کے مفہوم سے ملتی جلتی ہیں۔

”رَحْمَتٌ“ کا معنی وہ نرمی کی حالت ہے جو انسانی دل میں پیدا ہوتی ہے اور اسے قابل رحم چیز پر نیکی کرنے کیلئے مائل کرتی ہے۔ جب اس کا استعمال خداوند عالم کے بارے میں ہوتا ہے تو اس کے معنی انعام، بخشش اور احسان ہوتے ہیں۔

اس آیت میں دو لفظوں (مودت اور رحمت) میں کیا فرق ہے؟ اس بارے میں مفسرین نے متعدد احتمالات ذکر کئے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ ان تمام تفسیری معانی میں جو جامع معنی ہیں وہ یہ ہیں کہ ”مودت“ کا اطلاق وہاں پر ہوتا ہے جہاں فریقین کا تعلق اور دونوں کی طرف سے برابر کا اظہار محبت کیا جائے جیسے زن و مرد یا دو بھائیوں کے درمیان محبت موجود ہوتی ہے اور ہر ایک کو دوسرے کی خدمت کیلئے آمادہ کرتی ہے جب کہ ”رحمت“ یک طرفہ ہوتی ہے اور اس میں ایثار کا پہلو پایا جاتا ہے جیسے والدین کا چھوٹے بچوں کے ساتھ محبت کا رابطہ یا زن و شوہر میں سے کسی کا دوسرے کے ساتھ تعلق جب وہ ناتوان اور بوڑھے ہو جاتے ہیں۔

اس مقام پر ایک اہم نکتہ پوشیدہ ہے وہ یہ کہ ازدواجی اور اسی طرح اجتماعی زندگی میں کلی طور پر دو طرح کا معنوی رابطہ ہونا چاہیے ایک تو برابر کی خدمات کی صورت میں اور ہر فرد اور ہر قوم دوسرے فرد اور قوم کی برابر کی خدمت کرے، دوسرا ”اعزازی خدمات“ کے طور پر، کیونکہ ہمیشہ انسانی معاشروں میں یا خاندانوں میں جو چھوٹے چھوٹے معاشروں کی حیثیت رکھتے ہیں، کمسن اور ضعیف و کمزور اور ناتوان قسم کے لوگ رہتے ہیں، جن سے برابر کی خدمت کی توقع نہیں کی جاسکتی، وگرنہ وہ ہمیشہ کیلئے اس سے محروم ہو جائیں۔ ایسے مواقع پر ”مودت“ اپنا مقام ”رحمت“ کو دے دیتی ہے اور برابر کی خدمات کی بجائے ایثار پر مبنی نکات کس قدر لطیف ہیں، جن پر عملدرآمد کئے بغیر انسانی معاشرہ آرام و سکون کا حامل نہیں ہو سکتا۔

دوسری آیت میں بھی اسی حقیقت کو بیان کیا جا رہا ہے جو اس سے پہلی آیت میں بیان ہو چکی ہے فرق صرف یہ ہے کہ اس آیت میں فرماتا ہے ”وہ وہی تو ہے جس نے تم سب کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا ہے اور اس کے جوڑے کو بھی اسی جنس ہی سے بنایا ہے تاکہ اسے اس کے پاس سکون مل سکے۔ (هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا)“

[۱] مفردات راغب ”مادہ وَدَّ“

بہت سے مفسرین کے عقیدہ کے مطابق ”نَفْسٍ وَاحِدَةٍ“ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔<sup>[۱]</sup> لیکن جو تعبیریں اس آیت کے ذیل میں ذکر ہوئی ہیں ان سے شرک کی بو آتی ہے اور یہ شرک یقیناً نہ تو عقیدے میں شرک کے معنی میں ہے اور نہ ہی عبادت میں بلکہ ممکن ہے اس سے مراد وہ رجحان اور میلان ہو جو آدم کا اپنی اولاد کی طرف ہوتا ہے جو بعض اوقات جلد گزر جانے والے لمحات میں انسان کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور دوسری تمام باتوں سے غافل کر دیتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ ”نَفْسٍ وَاحِدَةٍ“ سے مراد ”نوع کی اکائی“ ہو یعنی ”تم سب کو ایک اکائی سے پیدا کیا ہے۔“  
 ”وَجَعَلْ مِنْهَا زَوْجَهَا“ کے جملہ سے یہ مراد نہیں ہے کہ حضرت آدم کی زوجہ جناب حوا کو ان کے بدن کے جزو سے پیدا کیا گیا ہے، جیسا کہ جعلی روایات میں منقول ہے کہ حضرت حوا کو جناب آدم کے بائیں پسلی سے پیدا کیا گیا ہے اسی لئے مرد کی بائیں طرف کی پسلیوں میں دائیں طرف کی پسلیوں کی نسبت ایک پسلی کم ہے کیونکہ یقینی بات ہے کہ انسان کے دونوں طرف کی پسلیوں کی تعداد ایک جیسی ہے ان میں کوئی فرق نہیں ہے یقین نہ آئے تو گن کر دیکھ لیں۔

بلکہ آیت میں یہ مراد ہے کہ آدم کی زوجہ کو ان کی جنس سے پیدا کیا ہے تاکہ ان کے درمیان جنسیت کی کشش برقرار رہے نہ کہ کسی اجنبی اور ناواقف جنس سے، جیسا کہ ہم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پڑھتے ہیں:

”هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمَمِينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ“ خدا وہ ہے جس نے درس نہ پڑھے ہوئے لوگوں میں ان ہی کی جنس سے ایک رسول کو بھیجا (جس نے نہ تو کسی سے پڑھنا سیکھا اور نہ ہی لکھنا، لیکن ساری دنیا کا استاد ٹھہرا)

تیسری آیت میں انسان کی ایک مخلوط نطفے سے پیدائش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا ہے اور اسے آزمائیں گے اسی لئے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا ہے۔“ (إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ آمِشَاجٍ ۚ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا)

اس آیت میں انسان کی تین خصوصیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ پہلی خصوصیت اس کے نطفہ کا مخلوط ہونا ہے۔ اس کا یہ اختلاط ’’آمِشَاجٍ‘‘ کے لفظ سے سمجھا جاتا ہے جو ’’مشبیج‘‘ یا ’’مشبج‘‘ (بروزن مدد) کی جمع ہے جس کے معنی ہیں مخلوط چیز اس معنی میں وسعت پائی جاتی ہے جو وزن و مرد کے نطفہ کے مخلوط ہونے کو بھی شامل ہے اور معدنی اور غیر معدنی مواد کو بھی جن کی وجہ سے نطفہ وجود میں آتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد مختلف طاقتیں، مختلف لیاقتیں اور گونا گوں ذوق ہوں جو انسان کے نطفہ میں موجود ہوتے ہیں اور اسے ان تمام امور میں اجتماعی زندگی کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔

دوسری خصوصیت ’’نَّبْتَلِيهِ‘‘ کا جملہ ہے جو انسان کی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونے اور اس کی مسلسل

[۱] تفسیر مجمع البیان جلد ۴، ص ۵۰۸، تفسیر فخر رازی جلد ۱۵، ص ۸۵، تفسیر روح البیان جلد ۳، ص ۲۰۹۲، تفسیر المیزان جلد ۸، ص ۳۹۱، اور تفسیری قرطبی میں یہ معنی جمہور مفسرین سے نقل کیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو جلد ۴، ص ۲۷۷-۲۷۸)

امتحانی اور آزمائشی تبدیلیوں کی طرف اشارہ ہے جس سے وہ ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اس سے انسان کی ذمہ داریوں اور اس پر عائد شدہ فرائض کا پتہ چلتا ہے کیونکہ ارادے کی آزادی اور ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی طاقت رکھے بغیر امتحان و آزمائش ناممکن ہوتے ہیں۔

تیسری خصوصیت شناخت و معرفت کے وسائل و ذرائع کا حامل ہونا ہے جن میں سے اہم ترین ذریعہ کان اور آنکھ ہیں۔ کانوں سے منقولہ علوم اور دوسروں کے افکار سے استفادہ کرنے اور آنکھوں سے حقائق جہان کو دیکھنے اور براہ راست رابطہ قائم کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اس قسم کا انسان جو اس طرح کی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے، خلافت الہیہ کے منصب کی لیاقت اور اجتماعی زندگی کی طاقت رکھتا ہے۔ چوتھی آیت میں روئے سخن تمام بنی نوع انسان کی طرف کر کے فرماتا ہے ”اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے۔“ (يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ)

بنابریں انسانوں کی ذاتوں، قوموں اور قبیلوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہے کیونکہ سب کی بنیاد ایک ہے، جڑ ایک ہے اور اصل ایک ہے۔ ”ابوہم آدم والام حواء“ (ان سب کا باپ آدم اور ماں حوا ہے) پھر انسانوں کے قبائل، اقوام اور ذاتوں کی طرف تقسیم ہونے کے فلسفہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے، ”ہم نے تمہیں شعوب اور قبائل قرار دیا ہے تاکہ تم پہچانے جاؤ۔“ (وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۗ)

کیونکہ اجتماعی زندگی کی ابتدائی ترین شرائط میں سے ایک افراد کی ایک دوسرے کی شناخت ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ایک دن انسانی معاشرے کے نظام کی عمارت دھڑام سے گر جائے، نہ گناہگار کا پتہ چلے اور نہ بے گناہ کا، نہ قرض خواہ کا علم ہو سکے نہ مقروض کا، نہ فرمانروا کی پہچان ہو سکے نہ فرمانبردار کی نہ پیشوا پہچانا جائے نہ پیروکار۔۔۔۔۔ وغیرہ یہ خداوند عالم ہی ہے جس نے انسان کو اس قسم کی زندگی کیلئے پیدا کیا ہے اور اسے مختلف قبیلوں، ذاتوں اور برادریوں میں بانٹ دیا ہے، جن میں سے ہر ایک کی اپنی علیحدہ شناخت اور پہچان ہے اور ہر ایک اپنی خصوصیات سے مختص ہے۔ اس طرح سے تعارف کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔

آیت کے آخر میں اس اجتماعی مسئلہ سے ایک اخلاقی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ مختلف اور گونا گوں قبائل و اقوام کی طرف نسبت کسی قسم کی فضیلت کی دلیل نہیں ہے بلکہ ”خداوند عالم کے نزدیک تم میں سے زیادہ باعزت شخص وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے“ (إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۗ)

”تقویٰ“ صرف ایک اخلاقی مسئلہ ہی نہیں بلکہ اہم اجتماعی اور معاشرتی مسئلہ بھی ہے۔ انسان کی اجتماعی زندگی کو سدھارنے کیلئے صرف تقویٰ ہی ہے جو اسے ہر مرحلہ پر سدھارتا ہے۔ اقتصادی مرحلہ ہو تو تقویٰ ضروری ہے سیاسی مرحلہ ہو تو تقویٰ ضروری ہے، حتیٰ کہ فکری مرحلہ ہو تو بھی تقویٰ ضروری ہے۔ غرض ہر موقع اور ہر مرحلہ پر تقویٰ

اسی سلسلے کی پانچویں اور آخری آیت میں پیغمبر اسلام ﷺ کی کامیابی کے اہم دلائل میں سے ایک دلیل کو ذکر کیا گیا ہے اور وہ ہے ”تالیفِ قلوب“ (دونوں کو ملانا) ارشاد ہوتا ہے ”خدا تو وہ ہے جس نے اپنی اور مومنین کی مدد کے ذریعہ آپ کی تائید کی اور ان کے دلوں میں



الفت ایجاد کی۔“ (هُوَ الَّذِي آتَاكَ بِبَصَرٍ ۖ وَالْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۰﴾ وَاللَّفَّ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ۗ ط)

اس تعبیر سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی مشکلات پر قابو پانے کیلئے تالیف قلب ضروری ہے اور خداوند عالم نے انسان کے اندر یہ استعداد و آماجگی پیدا کر دی ہے کہ اگر یہ آماجگی نہ ہوتی تو دلوں میں الفت پیدا کرنا ناممکن ہوتا۔ اگر تالیفِ قلوب حاصل نہ ہوتی تو انسان کی اجتماعی زندگی دگرگوں ہو کر رہ جاتی۔

پھر ایک اور لطیف نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گویا یہ بتانا چاہتا ہے کہ تالیفِ قلوب مادی طریقوں سے ناممکن ہے بلکہ ایمان، روحانیت اور اعلیٰ انسانی اقدار کے ذریعہ ہی اس کا امکان ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ”جو کچھ کہ روئے زمین پر ہے اگر آپ اسے خرچ بھی کر دیتے، پھر بھی ان کے دلوں میں الفت ایجاد نہ کر سکتے۔ یہ خدا ہی تو ہے جس نے ایمان کے ذریعہ ان کے درمیان الفت پیدا کر دی ہے۔“ (لَوْ

أَنْفَقْتُ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلْفَتْ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ أَلْفَ بَيْنَهُمْ ۗ ط)

”کیونکہ وہ صاحب قدرت و صاحب حکمت ہے“ (إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ)

ٹھیک ہے کہ یہ آیت اصحابِ پیغمبر کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن واضح سی بات ہے کہ اس کا مفہوم عام اور تمام اہل ایمان کو شامل ہے جیسا کہ المیزان جلد ۱، ص ۱۲۰ میں بھی اسی بات کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

اصولی طور پر چونکہ مادی وسائل محدود ہوتے ہیں، اسی لئے ہمیشہ سے باعث نزاع اور موجب کشمکش چلے آ رہے ہیں اور اگر بالفرض کسی وت وحدت و اتحاد کا سبب بن بھی جائیں تو ایسا اتحاد ناپائیدار ہوتا ہے پائیدار اتحاد صرف اور صرف ایمان تقویٰ اور معنوی اقدار کے سایہ ہی میں حاصل ہوتا ہے۔

اسی سے ملتی جلتی ایک اور تعبیر بھی ہے جو سورہ فتح کی ۲۹ ویں آیت میں بیان ہوئی ہے اور جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یارانِ با وفا کے بار میں ہے:

”أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ“ یعنی وہ دشمن کے سامنے سخت ہیں اور اپنے درمیان (یعنی آپس میں) رحیم

اور مہربان ہیں

لیکن زیر بحث آیت کے سلسلے میں جو چیز ہماری توجہ کیلئے زیادہ نمایاں شان ہے وہ ہے ”ہو الذی“ کی تعبیر جو آیت کے اول میں ذکر ہوئی ہے، جو خدا کا تعارف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت اور مومنین کے دلوں کی تالیف کے ذریعہ کر رہی ہے اور اسے وجود حق کی دلیل بتا رہی ہے۔ ایسی الفت جو دوسری تمام الفتوں سے بالاتر حتیٰ کہ نسبی اور قریب کی رشتہ داری سے بھی برتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قبائلی تعلقات بھی اس الفت کے آگے ماند پڑ گئے جو زمانہ جاہلیت میں عرب کے مختلف قبائل میں شدید تعصب کی بنا پر وہ جو دیں آچکے تھے اور اس کی جگہ ایمان اور تقویٰ پر مبنی تعلقات نے لے لی جو اس کے انفرادی اور اجتماعی آثار زندگی کے ہر شعبے میں ظاہر ہو کر رہے اور دنیا نے بہت ہی جلد اس کی عظمت کے ساتھ سر تسلیم خم کر دیا ہے۔

## چند ضروری وضاحتیں

### کیا معاشرہ کی روح ہوتی ہے؟

جانداروں کی دو قسمیں ہیں جن میں سے اکثریت ایسے جانداروں کی ہے جو انفرادی طور پر زندگی بسر کرتے ہیں حتیٰ کہ ان میں چھوٹی سے چھوٹی اجتماعی زندگی کے آثار بھی دکھائی نہیں دیتے۔ یعنی ان میں جاندارانی اجتماعی زندگی بھی نہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو ایک قدیم ان سے بھی آگے ہیں اور اپنے جیون ساتھی کے ساتھ رہتے ہیں، جب کہ کچھ ایسے بھی ہیں جو گروہوں کی صورت میں رہتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو پیش رفت اور ترقی یافتہ تمدن کے مالک ہیں جیسے شہد کی مکھیاں چیونٹیاں اور دیک وغیرہ۔

لیکن ان (اجتماعی حیوانات کے) گروہوں میں دو طرح کی کمی پائی جاتی ہے، ایک تو یہ کہ ان مختلف گروہوں (دو یا اس سے کچھ زائد چھتوں کی مکھیوں) کیلئے ممکن نہیں ہے کہ وہ آپس میں ایک مشترک زندگی گزار سکیں۔ دوسرے یہ کہ ان کی زندگی ہمیشہ ایک طرز کی چلی آتی رہی ہے، یعنی دور حاضر کی شہد کی مکھیاں بھی اسی طرح رہ رہی ہیں جس طرح آج سے لاکھوں سال پہلے رہتی تھیں۔

ان میں سے صرف ایک جاندار مخلوق ایسی ہے جو غیر محدود اجتماعی زندگی گزار رہی ہے اور ہمیشہ ترقی، پیش رفت اور ارتقاء کی منزلوں پر گامزن ہے، وہ ہے نوع انسانی، اس کی اس وسعت اور تغیر و تبدل کی وجہ اس کی اجتماعی زندگی پر علم و عقل کی فرمانروائی ہے۔ اس مقام پر کافی حد تک بحث کی جاسکتی ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیں تو اپنی تفسیری بحث سے خارج ہو جائیں گے۔ البتہ ان میں سے چند ایک نکات کی یاد آوری ضروری ہے۔

۱۔ انسان کے اجتماعی زندگی کی طرف رجحان کا کیا سبب ہے؟ اس بارے میں مختلف نظریات ہیں۔ ان میں سے جو نظریہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ سبب تین عوامل کا مجموعہ ہے اور وہ ہیں: ”غریزی“، ”عاطفی“، اور ”فکری“، عوامل۔ عقل کہتی ہے کہ ارتقاء صرف باہمی متحد اور اجتماعی زندگی کے زیر سایہ ہی ممکن ہے۔ اور ارتقاء خواہ مادی ہو یا معنوی اور روحانی کیونکہ ظاہری بات ہے کہ اگر ہر فرد یا ہر خاندان ایک دوسرے سے علیحدہ رہ کر زندگی بسر کرے تو نہ تو یہ علوم و دانش وجود میں آئیں اور نہ ہی اس قدر مصنوعات ایجادات و انکشافات منصفہ شہود میں آئیں، کیونکہ یہ سب کچھ فکری اور جسمانی طاقتوں کے باہمی میل و ملاپ اور اجتماع کی بدولت حاصل ہوتا ہے اور ہر نسل اپنے تجربات بعد کی نسلوں کو منتقل کرتی ہے اور ان تجربات کے باہمی اجتماع سے ایک عظیم ترین نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔

پھر ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ انسان اپنے اندر کچھ خواہشات اور تمنا نہیں رکھتا ہے جو اسے اس قسم کی یعنی اجتماعی زندگی سے ہی حاصل ہوتی ہیں۔ وہ تنہائی سے بیزار ہوتا ہے اور اپنے ساتھ ہم دل اور ہم آہنگ دوستوں کے ساتھ رہ کر بہت بڑی لذت اور عظیم لطف حاصل کرتا ہے۔ تجربہ اور تنہائی کی زندگی اس کیلئے اذیت ناک ہوتی ہے۔ دانشوروں کے تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ اگر تنہائی کا یہ سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہے تو انسان کئی نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اجتماعی زندگی کے فوائد سے قطع نظر بذات

خود ایسی زندگی کو دوست بھی رکھتا ہے۔

۲۔ اسلام نے انسان کی اجتماعی زندگی کو ایک اہم ترین اصول کے طور پر بھی تسلیم کیا ہے اس کے نزدیک صرف سیاسی اور اقتصادی رابطے ہی قابل احترام نہیں ہیں، عبادتوں کے مسئلہ کو بھی جو مخلوق کا خالق کے ساتھ رابطہ ہوتا ہے، لائق احترام سمجھتا ہے اور (نماز باجماعت نماز جمعہ اور مراسم حج جیسی) اجتماعی عبادتوں پر اس کی خصوصی نظر عنایت ہے۔

نماز کی ترکیب اور اذان و اقامت بھی اجتماعی صورت میں نماز کی ادائیگی کی دعوت دیتی ہیں اور سورہ حمد میں جمع کی ضمیروں کو استعمال، نماز کا آخری سلام غرض اس قسم کی دوسری تعبیریں ظاہر کرتی ہیں کہ نماز میں اجتماعی روح شامل ہے اور اس کی انفرادی صورت میں بجا آوری ایک فروعی حیثیت کی حامل ہوتی ہے۔

اسلام میں اجتماع اور انسان کی اجتماعی زندگی کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ اختلاف و انتشار کے ہر طرح کے عامل کو گناہ کبیرہ شمار کیا گیا ہے (جیسے حسد، چغلی، غیبت اور تفرقہ اندازی وغیرہ) اور جو چیز انسانی معاشرے میں صلح و صفائی اور اصلاح و سدھار کا موجب ہوتی ہے۔ اسے بلند ترین عبادت شمار کیا گیا ہے۔

۳۔ انسان کی اجتماعی زندگی کا وقوع پذیر ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے کیونکہ اس امر کیلئے استعدادوں اور مختلف فکری اور جسمانی جذبوں کی تقسیم کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور دلوں میں ہم آہنگی، ہم نوائی اور الفت کی ضرورت بھی، جیسا کہ آیات کی تفسیر میں ابھی بتایا جا چکا ہے کہ افراد بشر کی مثال ایسے ہے جیسے کسی عمارت کیلئے پتھر اور اینٹ وغیرہ، جب تک ان کو آپس میں جوڑنے کیلئے موثر گل گارا کی چٹائی نہ کی جائے اس وقت تک کوئی بھی عالی شان عمارت معرض وجود میں نہیں آسکتی۔ یہاں پر بھی خداوند عالم کا دست قدرت بنی نوع انسان کی امداد کیلئے آگے آیا اور تالیف قلوب، فکری اور جسمانی استعدادوں کی تقسیم اور مختلف قسم کے ذوق اور ہنر کی صحیح صحیح منصوبہ بندی کی اور بنی نوع انسان کو ایسی عظیم نعمتوں سے نوازا جن کے بغیر بنی نوع انسان کی اجتماعی زندگی کا پہیہ ہرگز نہیں گھوم سکتا۔ انہی امور کے مجموعہ کو کبھی ”معاشرے کی روح“ کا نام دیا جاتا ہے، وگرنہ ہم جانتے ہیں کہ مذکورہ چیز کے علاوہ معاشرہ کی کوئی اور خاص روح نہیں ہے۔

سچ بتائیے کہ انسان کو ارتقاء کی اربوں پر چلانے کیلئے اس معاشرتی روح کو اپنی تمام خصوصیات سمیت کس نے نعمت و جود عطا کی ہے؟ کیا اندھی اور بہری فطرت (نیچر) نے جو خود عقل و شعور سے عاری ہے؟ کیا ایسی بے عقل اور لاشعور فطرت اس قسم کی منصوبہ بندی کر سکتی ہے؟ اس نوع کی محبت، مودت اور رحمت کے وجود کے زیور سے مرصع کر سکتی ہے؟ اس طرح کے آرام و سکون کو خلق کر سکتی ہے؟ اس نوعیت کے نقطہ امتحان کو پیدا کر سکتی ہے؟ اس تعارف اور عمومی شناخت اور اس طرح کی تالیف قلوب کا فریضہ انجام دے سکتی ہے؟

یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا آیات میں ان امور کو خداوند جل شانہ کی عظمت، علم اور قدرت کی عظیم نشانیاں قرار دیا گیا ہے۔

ہم اپنی اس گفتگو کو حضرت رسول خدا ﷺ کی ایک پاک و پاکیزہ حدیث پر ختم کرتے ہیں جس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام نے

انسان کی اجتماعی روح کو کس قدر اہمیت دی ہے۔ ارشاد رسالت ہے:

ان المسلم اذا لقي اجاه المسلم فاخذ بيده تحاتت عنهما ذنوبهما كما  
تتحات الورق عن الشجرة اليابسة، في يوم ريح عاصف  
و(لا يفترقان) الا غفر لهما ذنوبهما ولو كان مثل زبد البحار

جب کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی سے ملاقات کرتا ہے اور اس کا ہاتھ پکڑتا (اور اسے محبت سے دباتا) ہے تو اس وقت ان دونوں کے گناہ ایسے جھڑ جاتے ہیں جس طرح طوفانی ہوا کی وجہ سے خشک درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں اور وہ دونوں ایک دوسرے سے ابھی جدا نہیں ہوتے کہ خداوند عالم ان کے گناہوں کو بخش دیتا ہے، خواہ وہ گناہ سمندروں کی جھاگ کے برابر ہی ہوں۔ [۱]

## حرف آخر

اس کتاب کی مختلف بحثوں میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے یہ حیثیت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ بے پردہ محبوب ہر درود یوار سے ظاہر ہو گیا ہے، اپنے جلوے موجودات عالم کی ہر چیز میں دکھا چکا ہے اور ہر چیز کی پیشانی پر اس کے اسماء و صفات کی مہر لگی ہوئی ہے۔

وہ لاکھوں جلووں کے ساتھ باہر آچکا ہے تاکہ ہم لاکھ بینائیوں کے ساتھ اس کا دیدار کریں۔ اس نے ہر ذرہ کے دل میں ایک آفتاب چھپایا ہوا ہے اور آسمان وزمین میں اپنے علم و قدرت کے مظاہر کو عیاں کر دیا ہے۔

قرآنی آیات کی ایک ایک جگہ پر اس کا تعارف کرایا گیا ہے اور اس کی نشانیاں آفاق و انفس میں دکھائی ہیں جن کے دیدار کیلئے دیکھنے کی دو آنکھیں، سننے کے دو کان اور بیدار دل کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ انسان اچھی طرح اس کے جلووں کو دیکھ سکے، اس کے توحیدی نغموں کو سن سکے، اس خوب خوباں کو اپنے دل کی سراء میں دعوت دے سکے، اس انس کی خلوت گاہ میں جو خدا کا ایک عرش عظیم ہے اس کی خاطر تواضع کر سکے اور ایک روحانی جذبہ کے ساتھ اسے مخاطب کر کے ان اشعار کا ورد شروع کر دے۔

اے	جلوگراز	ہر درود یوار	توئی	تو
ظلمت	بوداین	عالم	وانوار	توئی
بی	خارنباشدگی	اندر ہم	عالم	تو
درگشن	ہستی	گل	بے	خارتوئی
از عشق	تو بلبل	کنداین	نغمہ	سرائی

[۱] ”طبرانی“، منقول از تفسیر ”فی ظلال القرآن“، جلد ۴ ص ۵۷

چون حسن گل وگہت گلزار توئی تو  
عالم از تو ظاہر شد از علوی و سفلی  
برہر دو جہان جملہ نگہدار توئی تو  
نور تو بود جلوہ گر انداز ہمہ اشیاء  
ہر لحظہ بہ صد جلوہ نمودار توئی تو

یعنی: اے وہ ذات جو ہر دردِ دیوار سے ظاہر ہے، وہ تو ہی تو ہے، یہ کائنات ایک ظلمت کی حیثیت رکھتی ہے اور تو مجسم نور ہے، اس عالم میں کوئی پھول کانٹوں کے بغیر نہیں ہے۔ اگر گلشن ہستی میں کوئی پھول بغیر کانٹے کے ہے تو وہ صرف تو ہی ہے تیرے ساتھ عشق کی وجہ سے ہی بلبل اس قدر نغمہ سرائی کرتی ہے کیونکہ گل کا حسن اور گلزار کی زینت صرف اور صرف تو ہے۔ تیری ہی ذات سے علوی و سفلی عالم کا ظہور ہوا۔ دونوں طرح کے جہانوں پر مکمل نگہبانی تجھے ہی حاصل ہے تیرا ہی نور ہر ایک چیز کا جلوہ گر ہے ہر لمحے تو سینکڑوں جلووں کے ساتھ نمودار ہوتا ہے خدا ندا! ہمارے دلوں کو اپنے عشق و ایمان اور معرفت سے لبریز اور مالا مال فرما دے! پروردگار! ان تشنہ کاموں کو اپنے صہبائے عرفان کا ایک گھونٹ پلا اور ہمیں اس کے روحانی جذبہ میں تا ابد سرمست رکھ۔

بارالہا! تیری پاک ذات کی معرفت کی راہوں کو طے کرنا، تیرے لطف و کرم، عنایت اور توفیق کے بغیر ناممکن ہے۔ ہمیں اپنے عنایات و الطاف اور توفیقات میں شامل فرما۔ آمین بارب العالمین

پیام قرآن کی دوسری جلد تمام ہوئی  
بتاریخ ۱۱-۴-۱۳۶۷ ہجری شمسی  
مطابق ۱۷-ذیقعدہ ۲۰۰۸ ہجری قمری